قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ❖ شمارہ 02 ❖ جنوری 2015ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی بخش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: 63-C، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

اسی شعر کے مصداق ہمارا ملک جل رہا ہے مگر جلانے والے اربابِ اختیار کو نظر نہیں آرہے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق 16 دسمبر 2014ء تک صرف پختون خواہ میں 106 چھوٹے بڑے دھماکے ہوئے۔ مذہبی اور عوامی مقامات، عدالت اور تعلیمی ادارے نشانہ بنے۔ شرم کی بات یہ ہے کہ ہر مہذب معاشرے میں عوامی مقامات، عدالت و تعلیمی ادارے کو نشانہ بنانے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اسلام میں تو سختی سے اجتناب کا حکم ہے مگر دہشت پسند ٹولے ہر وہ کام کررہے ہیں جو اسلام کو مسخ کرکے پیش کرے۔ گویا یہ اسلام کے خلاف سازش ہے تاکہ لوگ مسلمانوں سے نفرت کرنے لگیں۔ یہی ان کی منشا ہے۔ پاکستان مسلم ممالک میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے دشمنانِ اسلام اس ملک کی بنیاد پر ضرب لگا رہے ہیں۔ سنجیدگی سے غور کریں۔ پولیو ٹیم پر حملہ، آنے والی نسل کو معذور بنانے کی سازش اسکول کالج پر حملہ تاکہ والدین خوف کے سبب بچوں کو اسکول نہ بھیجیں اور آئندہ نسل جہالت کے اندھیرے میں بھٹکتی رہے اور ترقی کی دوڑ میں شامل نہ ہوسکے۔ پھر وہ وقت قریب آجائے کہ ترقی یافتہ کوئی بھی قوت باآسانی غلام بنالے۔ سانحہ پشاور بھی اسی سازش کا حصہ ہے۔ وہاں جو کچھ ہوا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں کہ اس کے اثرات کہاں تک پہنچتے ہیں۔ لیڈی ٹیچر کو معصوم بچوں کے سامنے زندہ جلایا گیا۔ معصوم پھولوں کو چن چن کر گولی ماری گئی پھر اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں جس نے شہادت میں اضافہ کیا۔ اس اسکول میں گیارہ سو بچے پڑھتے ہیں جن میں سے زندہ بچ جانے والے ان واقعات کے عینی شاہد بن گئے۔ ان کے سامنے ان کے ساتھیوں کو شہید کیا گیا وہ خود بھی زخمی ہوئے ہوں گے۔ کیا وہ ان باتوں کو کبھی بھول سکیں گے۔ تاعمر انہیں یہ خوف ستائے گا۔ وہ نفسیاتی بیمار بھی بن سکتے ہیں۔ انہیں اسکول سے خوف آنے لگے گا۔ یعنی ہماری ایک پوری نسل کو جاہل رکھنے کا سامان ہے اگر ہم نے اس سازش کا مقابلہ نہ کیا تو پھر ہماری آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک و قوم کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

معراج رسول

سائنسدانِ پاکستان

سرگزشت

یوں تو وہ گھرانا فتح پور کا تھا مگر مستقل رہائش لکھنو میں تھی۔ لکھنو جو علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ اس گھرانے کا موجودہ سربراہ دنیائے اردو ادب کا ایک اہم ستارہ تھا۔ اس کے جریدے کو لوگ اہمیت دیتے تھے۔ برصغیر میں اس کا بڑا نام تھا۔ اسی کے ہاں 10 جولائی 1949ء کو وہ پیدا ہوا۔ گھر میں ادبی فضا قائم ہو تو بچے کے ذہن پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ بچہ بھی ادب سے شغف رکھنے لگا تھا۔ جب کہ ادبی خدمات کی وجہ سے والد کو ہند کے صدر راجندر پرشاد کے دست سے بھارت کا سب سے بڑا ایوارڈ پدم بھوشن ملا تھا، پھر بھی وہ 1962ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور بیٹے کو کراچی کے تعلیمی ادارے میں داخل کرا دیا۔ بیٹے نے 1969ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی فارمیسی کیا اور پھر امریکا کا رخ کرلیا۔ وہاں واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی سے فارمیسی میں ایم اے کیا اور پھر 1974ء میں الینائے یونیورسٹی سے فارمیسی میں ہی ڈاکٹریٹ کی۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد شکاگو منتقل ہوا۔ پھر الینائے یونیورسٹی کے کالج آف فارمیسی میں پڑھانے لگا۔ 1988ء میں وطن کی محبت نے زور مارا اور وہ کراچی آگیا۔ یہاں آکر اس نے ایک مشہور عالمی بین الاقوامی ادویہ ساز کمپنی کو بحیثیت ڈائریکٹر ٹیکنیکل افیئرز جوائن کرلیا۔ اسی دوران میں آغا خان یونیورسٹی سے بھی بہ حیثیت پروفیسر فارماکولوجی منسلک رہا۔ پھر وہ 1996ء میں متحدہ عرب امارات کی ادویہ ساز کمپنی گلف فارماسیوٹیکل کمپنی منتقل ہوگیا۔ اب وہ ادویہ سازی میں ایک مقام حاصل کر چکا تھا اس لیے لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ احترام سے پیش آتے۔ 2003ء میں اپنی ادویہ ساز کمپنی تھراٹیک پروٹیز کی بنیاد رکھی جو آہستہ آہستہ بین الاقوامی ادارہ بن گیا۔ ادارے کی مصروفیت کے بعد بھی وہ ایچ ای جے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری (کراچی یونیورسٹی) اور نیسٹ (اسلام آباد) میں بھی لیکچر دیتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ نئی نئی ایجاد بھی سامنے لاتے رہے۔ 2014ء تک 70 سے زیادہ ایجادات رجسٹرڈ (پیٹنٹ) کرا چکے تھے۔ ان تمام ایجادات کا محرک ”کام کو زیادہ سے زیادہ آسان بنایا جائے“ رہا۔ ساتھ ہی ساتھ تیکنیکی و ادبی موضوعات پر مضامین اور کتب بھی لکھتے رہے۔ طبیعت تو ابتداء سے ہی سخن کی جانب مائل تھی۔ 1962ء میں زیڈ اے بخاری نے ریڈیو پر مشاعرہ کرایا۔ اس مشاعرہ میں ایک تیرہ سالہ بچے نے ایک غزل سنائی ”دل بے تاب کسی طرح بہلتا ہی نہیں۔ شاید اس دردِ محبت کا مداوا ہی نہیں“ غزل سن کر زیڈ اے بخاری بھی داد دینے پر مجبور ہوگئے لیکن اس وقت بھی اس بچے کے ذہن میں ادب پروری کا جذبہ تو تھا مگر سائنس کی خدمت کا جذبہ زیادہ قوی تھا۔ تب ہی تو وہ سائنس کی اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرتا رہا تھا۔ اب ان کی دوا ساز کمپنی عالمی شہرت کی حامل بن چکی تھی مگر ذہن میں اب تک دولت کمانے کی جگہ جذبۂ خدمت زیادہ تھا۔ سائنس کے میدان میں اتنا آگے جانے کے باوجود وہ اردو ادب سے رشتہ توڑ نہیں سکے تھے۔ خود بھی غزلیں کہتے اور وائس آف امریکا سے ہر اتوار کو اردو شاعری پر ایک پروگرام بھی کرتے۔ اساتذہ کا کلام بالخصوص غالب کی غزلیں سناتے۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ وہ ایک ساتھ سائنس اور ادب کو لے کر چل رہے تھے۔ میڈیکل سائنس میں بھی وہ سب سے بلند مقام پر نظر آتے۔ ایسے وقت میں جب دواؤں کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں وہ اس نہج پر کام کررہے ہیں کہ قیمتی دواؤں کا بدل انتہائی سستی دوائیں مارکیٹ میں لائی جائیں مثلاً Neulasta اور Neupoger جیسی مہنگی دوائیں جن کے دو ہفتے کے کورس پر چار لاکھ روپے خرچ آتے ہیں اس کا بدل وہ ڈیڑھ لاکھ میں تیار کرکے مارکیٹ میں لے آئے۔ Humira کا انجکشن جو گٹھیا کے درد میں لگایا جاتا ہے اب تک وہ پونے دو لاکھ میں آتا تھا جوان کی کمپنی ساٹھ ہزار میں مارکیٹ میں لے آئی ہے۔ فی الوقت وہ امریکا میں رہ کر بحیثیت پاکستانی کام کررہے ہیں مگر پاکستان سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف سائنسداں ہیں بلکہ معروف فوٹوگرافر، مصور، شاعر، ادیب اور موسیقار بھی ہیں۔ 14 اگست 2012ء میں ان کی خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں ستارۂ امتیاز دیا گیا۔ اس قابلِ فخر پاکستانی کا پورا نام سرفراز خان نیازی ہے۔ یہ نیاز فتح پوری کے بیٹے ہیں۔

شہر خیال

☆شاہد جہانگیر شاہد کا مکتوب خاص پشاور سے۔ ''2014ء آخر اپنے اختتام کو پہنچا۔ کہیں سے کوئی خوشی کی خبر نہیں آئی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں 2014ء کو ہنگاموں، ہڑتالوں، دھرنوں، جلسوں، جلوسوں، حکومت اور اپوزیشن کے درمیان رسہ کشی کی۔ اندرونی و بیرونی دہشت گردی کے سال کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ کوئی تعمیری کام نہ ہوسکا۔ لوڈ شیڈنگ کا عذاب اسی طرح مسلط رہا۔ مہنگائی کا جن بھی بے قابو ہی رہا۔ وطن عزیز غربت کی لائن سے مزید نیچے آیا۔ اب چلتے ہیں نئے شمارے کی طرف۔ دسمبر کا سرورق مشرقی حسن کا نمونہ تھا۔ اس سے متعلق سچ بیانی بھی اچھی تھی۔ صحابی رسولؐ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ایمان افروز مجاہدانہ کارناموں پر مبنی تذکرہ فرد صالح بے حد پسند آیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے گزارش ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کے حالات زندگی کے بارے میں یہ سلسلہ آیندہ بھی جاری رکھیں۔ ''زرد صحافت'' کے بانی جوزف پلیٹزر کا زندگی نامہ ایک معلوماتی مضمون تھا۔ ایک نیوز رپورٹر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والا کیسے ایک بہت بڑے اخبار اور اشاعتی ادارے کا مالک بن کر صحافتی دنیا پر راج کرتا رہا۔ ''دریائے نیل'' جغرافیہ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے بہت معلوماتی مضمون ہے لیکن اس کی دریا کے کنارے بسنے والی تہذیبوں کے تاریخی پس منظر پوری طرح اُجاگر نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے طالب علم یقیناً یہ مضمون پڑھتے ہوئے تشنگی محسوس کریں گے۔ منظر امام کا ''کاروان'' اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ لگتا ہے دسمبر میں رونما ہونے والے واقعات دو صفحات میں مکمل کر کے صرف خانہ پری کی گئی۔ ''سراب'' اپنے انجام کی جانب گامزن ہے۔ اُمید ہے کہ جلد ہی کوئی دوسرا خوبصورت سلسلہ منظر عام پر آئے گا جو سراب سے بڑھ کر مقبولیت حاصل کرے گا۔ ''فلمی الف لیلہ'' نئے فنکار خوش قسمت اور قابل تعریف ہیں کہ بھارت جیسے متعصب ملک کی فلمی صنعت میں اپنے فن کا لوہا منوا رہے ہیں۔ کاش کہ ہمارے ماضی کے فنکاروں کو بھی ایسے مواقع میسر آتے تو فلم انڈسٹری اس برے انجام کو نہ پہنچتی۔ کیسے کیسے فنکار گم نامی کے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ آفاقی صاحب درست فرماتے ہیں کہ فن اور خوب صورتی کے لحاظ سے (دلیپ کمار کو چھوڑ کر) کوئی بھی بھارتی فنکار پاکستانی فنکاروں سے بڑھ کر نہ تھا۔ سنتوش کمار، سدھیر اور شاہد۔ سب ہی مردانہ وجاہت کا نمونہ تھے۔ اسی طرح مصنفین، ہدایت کاروں، موسیقاروں اور گلوکاروں کی ایک کہکشاں تھی جو آسمان فلم کو جگمگا رہی تھی۔ ان فنکاروں میں سے اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل تھی۔ گریجویٹ تو سب ہی تھے وحید مراد ایم اے انگلش اور اداکار حبیب تو ٹرپل ایم اے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آفاقی صاحب نے اداکار حبیب کے بارے میں ہمیشہ سرسری انداز میں تذکرہ کیا۔ جب کہ آفاقی صاحب کی شروع کی انتہائی کامیاب فلموں آدمی اور ایاز کے ہیرو حبیب ہی تھے اس کے علاوہ بھی حبیب نے بہت سی فلموں میں یادگار کردار ادا کیے تھے۔ آفاقی صاحب سے گزارش ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے فنکاروں میں اب صرف حبیب اور اعجاز ہی زندہ ہیں اور گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا جلد از جلد ان کے بھرپور انٹرویو کرلیے جائیں کیوں کہ کہیں پھر دیر نہ ہوجائے اور آفاقی صاحب کو ان کے بارے میں صرف یادداشتوں سے کام چلانا پڑے کہ یہی ہمارا المیہ ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اتنی پڑھی لکھی انڈسٹری میں آفاقی صاحب کو چھوڑ کر کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ اپنی فلموگرافی لکھتے۔ جب کہ دنیا بھر میں خصوصاً ہمسایہ ملک کے تقریباً سب ہی بڑے ہیروز بلکہ اب تو ویلن تک نے بھی اپنی جدوجہد اور کامیابی کی داستان رقم کی ہے۔ 11 دسمبر دلیپ کمار کی سالگرہ کا دن ہے اور وہ اپنی زندگی کے 93 ویں سال میں داخل ہوجائیں گے جب کہ تادم تحریر ٹی وی پر یہ سرخی چل رہی ہے کہ شہنشاہ جذبات کو پھر سے نمونیا کا دورہ پڑا ہے اور وہ لیلاوتی اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ ''شہر دل'' سید انور عباس شاہ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ افسوس کہ محکمۂ ڈاک کے عالمی دن کے موقع پر نشر ہونے والا پروگرام میں ریڈیو سے سن سکا۔ اگر سن لیتا تو ضرور ان کی خبر لیتا۔ ہم نے تنگ آکر اب اپنے خطوط TCS کے ذریعے بھیجنے شروع کردیے ہیں۔ گو کہ یہ ذرا مہنگا ذریعہ ہے لیکن یہ تسلی رہتی ہے کہ خط بروقت پہنچ جاتا ہے۔ ناصر حسین رند، احمد خان توحیدی، سدرہ بانو، قیصر خان تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اس ماہ کے تبصروں میں آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ سب سے اچھا تھا۔ منشی ایم عزیز، قیصر خان، سدرہ بانو، طاہرہ گلزار اور انور عباس شاہ کے تبصرے بھی بہت پسند آئے۔ وحید ریاست بھٹی گزشتہ کئی ماہ سے غیر حاضر ہیں۔ آپ فوراً حاضری لگوائیں اور 2014ء کا سالانہ تجزیہ پیش کر کے اپنی غیر حاضری کی تلافی کریں۔ تمام قارئین سرگزشت کو نیا سال مبارک ہو۔''

☆سدرہ بانو ناگوری کا خط کراچی سے۔ ''سال کا آخری شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ 2014ء کیسے گزرا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ ابھی کل ہی کی تو بات لگتی ہے جب 2014ء کے آغاز کا جشن منایا تھا اور اب اختتام اور اختتام بھی ایسا کہ سکھ اور امن و سکون سے خالی۔ دامن میں دکھ اذیت اور خوف کے سوا کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ ''اداریے'' میں معراج انکل موجودہ ملکی صورت حال پر اپنے دکھ کا اظہار فرما رہے تھے۔ معراج انکل، آپ کے شکوے بالکل بجا ہیں لیکن ہمارے

حکمرانوں کو کون سمجھائے کہ جن کی آپس کی رنجشوں نے ہمیں ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ ٹی وی آن کرو تو ہر لمحہ ایک نئی خبر اور خبر بھی ایسی کہ ہم اپنی قبر کو ہی بھول جائیں۔ خدا ہمارے حالوں پر رحم کرے۔ ''شہر خیال'' میں شاہد جہانگیر نے صدارت کی کرسی پر تبصرے کا بھرپور حق ادا کیا۔ انور عباس شاہ ''سلور جوبلی'' نمبر کے حوالے سے ہم بھی آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔ واقعی اگر ایسا ہوجائے تو مزہ آجائے۔ (آپ سب کی فرمائش پوری کرنے کی تیاری شروع کردی ہے) ناصر حسین پرانے ساتھیوں کو یاد کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ خود بھی اکثر شہر خیال سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ طاہرہ گلزار کے خط کو پڑھ کر جب انہیں تصور میں دوڑے دوڑے سرگزشت لینے کے لیے جاتے دیکھا تو عجیب سا لگا کہ ایک سنجیدہ سی خاتون دوڑتے ہوئے کیسی لگتی ہوں گی؟ دل کو منور کرتی ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر ''مرد صالح'' نے دینی معلومات میں اضافہ کیا۔ خوب صورت اور شوخ جملوں سے بھرپور حسن رزاقی کی تحریر اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ''فلمی الف لیلہ'' کی قسط بے حد شاندار رہی۔ ابتداء میں آفاقی انکل کچھ خفا خفا سے لگے لیکن خاص طور پر سری لنکا کے بارے میں پڑھ کر مزہ آگیا۔ فواد خان کے انٹرویو میں ایک بات عجیب سی لگی۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ ''میں عملی اور اصلی زندگی میں بورنگ، خاموش پسند نہیں ہوں'' لیکن ذرا آگے ان کا بیان ہے کہ ''میں عملی زندگی میں ایک ریزرو اور الگ تھلگ خاموش رہنے والا شخص ہوں'' دونوں جملوں میں کتنا تضاد ہے۔ منظر امام کا سلسلہ بھی اختتام پذیر ہوا۔ دیکھتے ہیں کہ آگے پٹاری سے کیا نکلتا ہے۔ ''عشق عشق'' میں مختصر عشق کا قصہ اچھا لگا۔ ''خونخوار'' پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ظالم بادشاہ نے جس تخت کے لیے ظلم کی داستان رقم کردی وہ تخت بھی اسے موت کے منہ سے نہ بچا سکا۔ ظالم کو آسان موت تو مل گئی مگر اس سے بڑی اذیت اور کیا ہوگی کہ وہ مرا تو خالی ہاتھ تھا۔ ''بہروپیا'' میں ارم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ نئی بات نہیں ہے۔ ارم صاحبہ نے اپنی آنکھوں میں سنہری خواب سجا کر اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا اس لیے ہر زیادتی کی ذمہ دار وہ خود بھی اتنی ہے کہ جتنا کہ یاسر تھا۔ سعدیہ کی ''نادانی'' پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ ''بھنگڑ'' ایک ہلکی پھلکی ہنسی مسکراتی تحریر تھی اچھی لگی۔ کرب نے کرب میں مبتلا کردیا۔ ایک لاجواب تحریر تھی۔ تمام کی تمام تحریریں تعریف کے لائق تھیں۔''

☆ملک رحمت، میانوالی سے رقم طراز ہیں۔ ''سال 2014ء کا آخری شمارہ موسم سرما کا پیارا ساتحفہ، ہماری جان سرگزشت ہر بار کی طرح اس بار بھی متوقع تاریخ کو ہی ملا۔ کبھی ایک دو دن لیٹ ہوجاتا ہے تو ہمارا برا حال ہوجاتا ہے۔ کاٹر پر کالز کرتے ہیں بک شاپ والے کو، حالانکہ وہ ہمارا رسالہ الگ رکھ دیتے ہیں کہ کہیں بک ہی نہ جائے۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی بے اختیار ٹائیکل گرل کو بے بی ڈول کا خطاب دے ڈالا۔ سلور جوبلی کی آمد آمد ہے۔ جنوری 2015ء کو انشاء اللہ آپ اور ہم سب سرگزشت کی سلور جوبلی منا رہے ہوں گے۔ پلیز سلور جوبلی کے موقع پر خاص الخاص نمبر نکالیں یہ موقع ایک ہی بار آئے گا۔ پھر 25 سال بعد گولڈن جوبلی تک نہ جانے ہم ہوں نہ ہوں۔ (انشاء اللہ تیاری جاری ہے) خاص نمبر میں مضمون کہانیاں سلور جوبلی کی مناسبت سے ہوں اور اس نمبر میں اوّل نمبر پر آنے والے خط کو انعام بھی ملنا چاہیے۔ صفحات بھی ڈبل ہوں چاہے قیمت بھی ڈبل کردیں۔ شاہد جہانگیر شاہد کا خط بھی ماشاء اللہ بہت مزیدار ہے۔ مین گیٹ پر تیحاتی مبارک ہو، تبصرہ بہت اچھا تھا۔ اویس شیخ صاحب نے پوچھا ہے؟ نواب آف کالا باغ کے بارے میں کہ یہ کون تھے۔ تو عرض ہے ان کا اصل نام امیر محمد ملک تھا۔ میرا ملک، عائلہ ملک اور ملک عماد خان کے دادا تھے۔ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے گھر میں بھی ان کا نام نہیں لیتا تھا، اتنی وحشت تھی ان کی۔ کیوں تھی آپ خود سمجھ دار ہیں سمجھ جائیں۔ ان کو اپنے ہی بیٹے ملک اسد نے قتل کیا تھا اور ملک اسد بعد میں خود بھی قتل ہوگیا۔ گزارش ہے کہ ان پر مفصل مضمون لکھا جائے۔ مجھے لکھنا نہیں آتا ورنہ خود کوشش کرتا۔ عمران جونانی بھائی اور طاہرہ گلزار صاحبہ کو موجود پا کے بہت خوشی ہوئی۔ میرا اندازہ ہے کہ بہت سے قارئین سچ بیانی ''کرب'' کو پہلا نمبر دیں گے۔ مضامین میں سے پہلا ''مرد صالح'' دوسرا ''زرد صحافت'' تیسرا ''خونخوار'' چوتھا ''الوداع'' اور پانچواں ''دریائے نیل'' ہے۔ ''عشق عشق'' مختصر ترین تحریر بہتر رہی اور ''سراب'' بہت ہی اچھی جا رہی ہے مگر اقساط زیادہ ہوگئی ہیں۔ اب اختتام ہوجانا چاہیے۔''

☆بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ''اپنی محفل میں حاضر ہوئے اپنا تبصرہ پاکر شکر کا سانس لیا۔ شاہد جہانگیر آپ کا تبصرہ تفصیلی تھا، بہترین تھا۔ کرسی صدارت مبارک ہو۔ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنے کا بہت شکریہ! اویس شیخ میں آپ کی باتوں اور رائے سے اتفاق کرتی ہوں یہی کچھ ہو رہا ہے، لوگ سامنے کچھ پیٹھ پیچھے کچھ ہوتے ہیں۔ ناصر حسین رند، یاد کرلیا آپ کا شکریہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ آفتاب احمد نصیر میں تو نئی کہانی کی بات کررہی تھی جو میں نے بھیج رکھی ہے، یہ آپ نے کیا بات کہہ دی۔ دوبارہ تو کوئی کہانی نہیں لگ سکتی ناں۔ منشی محمد عزیز ہمیں یاد رکھا شکریہ۔ سدرہ بانو ناگوری آپ نے سچ بات کی، ہر کوئی تو ملالہ نہیں بن سکتی ناں! انکل جی! ایک ووٹ تو میرا ہوگیا باقی لوگ بھی اگر ساتھ شامل ہوجائیں تو بشریٰ افضل کی واہ واہ ہوجائے۔ طاہرہ گلزار میں آپ کا خط پڑھ کر خوب ہنسی! ویسے اس محفل میں ان سب نے خود پر ہی پابندی لگا رکھی ہے۔ چلیں جی اگلے تبصرے میں نوک جھوک ہونی چاہیے۔ ''احتیاط'' میں نصیحت کا پہلو نمایاں تھا۔ آج کل کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ ''فلمی الف لیلہ'' میں دلچسپی کے سارے سامان ہیں۔ پڑھنے والوں کو آخر تک سحر میں جکڑ کر رکھتے ہیں۔ ''دوسری موت'' اگر رشید انتقام نہ لیتا اور اپنا فیصلہ خدا پر چھوڑ دیتا تو اس طرح سزا نہ کاٹتا۔ ''بیت بازی'' میں معیاری اشعار تھے۔ عائشہ اختر آپ کا شعر پسند آیا۔ ''دسمبر'' معلومات کے خزانے میں اضافہ ہوا۔ یہی تو ہمارے سرگزشت کا خاصا ہے۔ پارہ بھی دلچسپ تھے۔ ''کڑوا گھونٹ'' نجمہ کی عقل مندی کی داد دینی چاہیے مگر اس سے غلطی ہوئی کہ رضیہ کو بتا دیتی خدا کی حکمت ہی تھی کہ رضیہ نے گھر بچانے کے لیے انتہائی قدم اٹھایا۔ ''بہروپیا'' میں ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو اپنی بیٹیوں کی شادی غیر ممالک کے جھانسے میں بیاہ دیتے ہیں۔''

☆قیصر عباس خان نے بھکر سے لکھا ہے۔ ''اداریے میں انکل جی گندم کو بجری میں تبدیل کرنے پر نالاں تھے۔ درد دل رکھنے والے پاکستانی سب حیران ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مہنگائی، غربت، بے روزگاری کے ساتھ ساتھ امداد میں بھی ملاوٹ؟ زلزلے کے بعد بہت سے لوگوں نے امداد دی جو کن لوگوں نے استعمال کیں بعد میں سب عیاں ہوا۔ کس پر اعتبار کریں۔ گزشتہ سیلاب میں ہمارے ضلع کے متاثرہ علاقوں پر جو بیتی وہ نہ پوچھیں۔ جو ٹینٹ ملے وہ سب کے سب آڑھتیوں کی ترپالیں بنیں اور خورونوش کی اشیا مارکیٹ میں بکیں۔ ''شہر خیال میں'' شاہد صاحب! اچھے تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر تھے، مبارک باد

جی۔ سید انور عباس شاہ کی سلور جوبلی والی تجویز کو رد نہ کیا جائے۔ ہم پڑھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ حاضر تھیں لیکن ساتھ ملالہ کے بارے میں کوئی تحریر نہیں، جب کہ میں خود انتظار میں تھا۔ آپا بشریٰ افضل جیسی پیاری ہستی سے لوگوں کو بھلا کیا دشمنی ہوگی اور پتا نہیں کیوں ہوگی۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہمیشہ فاتح رہیں گی۔ آپا سدرہ بانو ناگوری، شاہد صاحب کی درستی کے ساتھ حاضر تھیں۔ آفتاب اشرفی صاحب بہت سخت نالاں تھے۔ نوبل انعام پر اور بہت سخت تنقید کی ملالہ یوسف زئی کو بھی لتاڑا۔ ان سے میرا سوال ہے، ہم پاکستانی کبھی متحد ہو کر ایک سوچ کے حامل ہو سکتے ہیں؟ میری مخالفت نہیں ہے آفتاب صاحب لیکن عرض ہے ہم کہاں جائیں، کس دانشور کی سنیں یا کس کو نہ سنیں؟ اب شہر خیال کی ہر دلعزیز شخصیت آپا طاہرہ گلزار کی طرف آتے ہیں۔ آخر میں جگہ ملی اور شکر ہے سال کے آخری پرچے میں بلیک لسٹ نہیں تھیں اور بہت خوب صورت خواب کے ساتھ حاضر تھیں۔ ہماری دعا ہے آپ کے خواب آپ کے سامنے پورے ہوں۔ "بہروپیا" اسلام کے نام پر یا مذہب کا لبادہ اوڑھ کر یاسر واقعی غلیظ سوچ کا حامل تھا لیکن خوشی ہے ارم کو سنبھالنے والا راشد ایک اچھا انسان تھا۔ "کڑوا گھونٹ" بہت افسوس ہوا پڑھ کر یہ کیسا مرد تھا جس نے زندہ جمشی نگلی، حیرت ہے مجھے۔ خدا کے فیصلے نہ ماننے والوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ "دوسری موت" واقعی اللہ کے نافرمانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ رشید کے واسطے دعا گو ہوں اللہ اس کو صبر اور اجر عظیم دے، معافی دے۔ "تہی داماں" میں زین اور یاسر دونوں ایک جیسے تھے لیکن اس میں ارم خواہشات کی غلام اور نور حد درجہ کی کم عقل۔ جب چاہنے والا مل رہا ہے پھر خباثت کیوں اور پھر بھی عمیر کا بڑا پن ہے۔ واقعی عمیر اور راشد دونوں قابلِ عزت ہیں۔ "کرب" اس کہانی کے لیے الفاظ نہیں، کیا اور کیسے لکھوں کہ ہمارے سیاستدانوں نے کیا کیا۔ انعام صاحب آپ سنجیدہ کو لے آتے کیوں کہ وہ آپ کے انتظار میں تھی لیکن آپ بھی جواں سالہ رضیہ کو لے کر آئے۔ عورت وفا کی دیوی ہے۔ سنجیدہ کو راضی کر لیتے بہت مان تھا اس کو آپ پر لیکن آپ نے پاکستان آنے کے بعد شادی کر لی وہ آپ کا انتظار اور حکمرانوں کی بے حسی کی داستان ہے۔"

☆ صوبی شاہ نے ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے۔ "بہت کوشش کے باوجود دسمبر کے شمارے میں شامل ہونے والا خط نہ لکھ سکی۔ اب یہ خط شاید جنوری 2015ء کے شمارے میں ہی شامل ہو سکے۔ اگر بروقت پہنچ گیا تو۔ نومبر کے شمارے میں شادو کی کہانی "احسان" پڑھی۔ پڑھ کے بہت دل متاثر ہوا اور کتنی دیر تک آنسوؤں کی جھڑی لگی رہی۔ میں شادو کی ہمت اور حوصلے کو بھی سلام پیش کرتی ہوں۔ محمد حنیف قادری صاحب کی کہانی بھی پسند آئی۔ اس کے علاوہ "سراب" بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ طاہرہ گلزار، بشریٰ افضل اور ڈاکٹر قرۃ العین کے تبصرے اچھے لگے۔ زیادہ کیا لکھوں تمام قارئین و اسٹاف کو بہت بہت سلام۔"

☆ محمد سلیم قیصر نیو سینٹرل جیل ملتان سے لکھتے ہیں۔ "معراج انکل، میں آپ کو ماہنامہ سرگزشت کی پوری ٹیم کو اور اس خوب صورت شمارے کے خوب صورت پڑھنے والوں کو آداب السلام علیکم کہتا ہوں۔ اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔ ماہ دسمبر کا شمارہ آج ہی ملا ہے۔ معراج انکل میں آپ کے خیالات کی تائید کرتا ہوں۔ اللہ ہم پر لطف و کرم فرمائے۔ "میر کارواں" سے مستفید ہوتا ہوا "شہر خیال" جا پہنچا۔ مجھے میری تحریر نظر آئی نہ تاخیر والوں میں نام لیکن افسوس اس لیے بھی نہیں ہوا کہ جو تحریریں "شہر خیال" میں شامل ہیں وہ بھی تو میرے اپنے پیاروں کی ہیں کوئی بات نہیں پھر سہی۔ شاہد جہانگیر شاہد، اویس شیخ، احمد خان توحیدی، آفتاب احمد نصیر اشرفی، منشی محمد عزیز مے، قیصر خان آپ سب نے عبدالستار ایدھی صاحب کے متعلق جن جذبات کا اظہار کیا ہے میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ کے تبصرے بھی کافی جاندار ہیں۔ قابلِ عزت ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ آپ نے ماہ نومبر کے شمارے میں خوب تبصرہ کیا اور اب کے بار بھی۔ پلیز مجھے اتنا بتا دیں کہ اکتوبر کے شمارے میں، میں نے جو خط لکھا اور "شہر خیال" کا حصہ بنا وہ آپ نے پڑھا تھا یا نہیں اور اگر پڑھا ہے تو میں نظر انداز کیوں ہوا۔ 2010ء میں بد قسمتی سے جب مجھ پر مقدمہ قائم ہوا تو اس وقت میری عمر 26 سال تھی اور آج 30 کا اختتام ہونے کو ہے۔ میں نے اسلام آباد اور پنڈی کے پیارے باسیوں سے مدد مانگی جو شاید میرا حق ہے۔ آپ سب بھی تو میرے پیارے ہی ہیں۔ پلیز شفقت فرمائیں میں بی اے، بی ایڈ کرنے کے بعد گورنمنٹ سیکٹر میں بطور کلرک اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا کہ بد قسمتی نے مجھے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ آپ وہیں اسلام آباد کی حدود میں رہ کر میری ہیلپ کر سکتی ہیں۔ دعائیں دوں گا۔ آپ کا مختصر تبصرہ بھی بہت اچھا ہے۔ جناب منشی عزیز کا تبصرہ اور باتیں بہت خوب رہیں۔ میری بہن بشریٰ افضل بھی ڈاکٹر صاحبہ سے نالاں نظر آتی ہیں، تبصرہ اچھا ہے۔ بہن سدرہ بانو ناگوری کی پیاری باتیں اچھی لگیں۔ بھائی محمد عمران جونانی آپ نے جناب عبدالستار ایدھی کی بابت درست بات کی ہے۔ آپ نے جو درود بتایا تھا اس کو باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ باقی مانسہرہ، ایبٹ آباد، بگرام کی کیا بات ہے۔ بندہ ناچیز نے دو سال انہی راستوں کی مدد سے اسکردو کا سفر کیا۔ میری قابلِ عزت و قابلِ احترام طاہرہ گلزار صاحبہ آپ آخر میں سہی، شامل ہو ہی گئیں۔ اللہ آپ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر فرمائے۔ میں آپ کی پیاری باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیارے لوگ آپ بھی اپنی پیاری بہن اور میرے لیے قابلِ عزت ڈاکٹر قرۃ العین سے کہیں کہ وہ میری ہیلپ کریں۔ ممکن ہے میری زندگی بچ جائے۔ مجموعی طور پر تبصرے بہت پسند آئے۔ میری طرف سے جناب شاہد جہانگیر، محمد عامر ساحل۔ سید انور عباس شاہ، اویس شیخ، احمد خان توحید، ناصر حسین رند، آفتاب احمد نصیر اشرفی، منشی محمد عزیز، قیصر خان، محمد عمران جونانی، سلطان مسعود اور قابلِ عزت ڈاکٹر قرۃ العین، بشریٰ افضل، سدرہ بانو ناگوری، طاہرہ گلزار، ثروت یا اعجاز، عظمیٰ شکور اور دیگر کو السلام علیکم۔"

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل خوشاب سے لکھتے ہیں۔ "سب دوستوں نے مجھے مسند صدارت پر فائز ہونے کی مبارک باد دی ہے۔ بندہ سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہے اور سچی بات ہے کہ ہمیں پڑھنے اور لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ بس کبھی محکمۂ ڈاک کی مہربانیوں کی زد میں آ جاتے ہیں جیسا کہ اس ماہ بھی ہوا ہے ورنہ کبھی تبصرہ بھیجنے کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ قیصر خان، بھائی پڑوسی ہونے کے ناطے بھکر کے تمام لکھنے والوں سے ہم بھی محبت کے جذبات رکھتے ہیں لیکن آپ نے ہمیں چار لفظوں میں ٹرخا دیا۔ "مرد صالح" میں جنگ احد کا ذکر پڑھ کر ہم لمحوں میں سعودی عرب پہنچ گئے اور کتنی نئی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ تیر اندازوں والی پہاڑی جو ٹیلہ نما ہے کا نام جبل رماۃ اور عینین ہے۔ آدھے کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر جبل احد شمال کی طرف اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ کئی بار گاڑی اور ایک بار پیدل زیارت کے لیے جانے کا موقع ملا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص جنت البقیع میں قبہ سیدنا ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں آسودہ خاک ہیں۔ مدینہ المنورہ جانا ہو تو چند روزہ قیام کے دوران کئی بار فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ "فلمی الف لیلہ" میں فلم مولا جٹ کا ذکر پڑھا تو اپنی نوجوانی یاد آ گئی۔ میں نے یہ فلم سرگودھا کے تاج سینما (یہاں آج اسٹیل کے سامان کا اسٹور ہے) میں دیکھی تھی لیکن بڑھتی عمر، ذہنی و جسمانی پریشانیوں اور بیماریوں نے پوری کہانی کے زیادہ حصوں کو ذہن کی تختی سے صاف کر دیا ہے۔ اس کے باوجود سلطان راہی کا وحشت زدہ چہرہ اور بڑھکیں کسی حد تک یاد ہیں۔ فواد خان کی کامیابیوں اور مقبولیت پر فخر ہے۔ ہماری بد قسمتی کہ پاکستان میں ان کے نام اور کام سے ناواقفیت رہی۔ ہمارے علاقے میں کیبل کی سہولت کی عمر چند سال ہے۔ میں نیشنل جیوگرافک اور علاقائی گلوکاروں کو شوق سے دیکھتا اور سنتا ہوں۔ البتہ گھر کے دیگر افراد جی ٹیلی ویژن کے پروگرام توجہ سے دیکھتے اور زور و شور سے تبصرے کرتے ہیں۔ ہم کسی ایسی معلومات کی تصدیق کے لیے انہی کے مرہونِ منت رہتے ہیں۔ پہلی سچ بیانی "بہروپیا" میں جس بے دردی سے یاسر نے مذہب کو اپنی غرض کے لیے استعمال کیا مثال ہے۔ وہ اپنے کرتوتوں کے بدلے میں انتقامِ قدرت کی زد میں آئے گا جب اس کا بلبلانا اور رحم طلب کرنے کے لیے التجا کرتا چہرہ دیکھنے والا ہوگا۔ "نادانی" میں سعدیہ جن شوخیوں اور جھوٹ سے ساتھی لڑکیوں کو مرعوب کرتی تھی گویا انتہائی بری اور خطرناک عادت تھی لیکن میرے خیال کے مطابق یہ اس کی ضرورت بن گئی تھی۔ پہلا قدم ہی وبالِ جان بن گیا۔ اب پیچھے ہٹنا شرمندگی اور بدترین شکست تھا۔ وہ اپنی تمام نادانیوں کی سزا پا گئی ہے لیکن اپنے بڑے پن کے زعم میں جو کردار ماریہ اور عذرا نے ادا کیا گویا اسے ایسے اقدام پر راغب کیا۔ اس مسئلے کو سمجھانے اور تنبیہ کر کے سلجھایا جا سکتا تھا لیکن پورے خاندان میں وہ تماشا بنایا کہ یہ سانحہ ہو گیا۔ بات یہیں آ کر ٹھہر جاتی ہے کہ حقیقت سے نظریں نہ چراؤ کیوں کہ خواب، خواب ہی کی صورت بھلے لگتے ہیں۔ یہ ٹوٹتے ہیں تو دیکھنے والے کی آنکھیں لہولہان کر جاتے ہیں۔ "آزمائش" میں ایسی سزا مقدر میں لکھ دی گئی تھی البتہ یہ چوک ہوئی کہ جب عظیم کے کردار کی کمزوری پکڑی گئی تھی تو یہ بات خان صاحب کے علم میں لانی چاہیے تھی۔ وہ علاقہ سخت ہے اور لڑکی کے معاملے میں کم ہی معافی ملتی ہے۔ اگر کوئی لڑائی یا قتل تک نوبت آ جاتی تو ساری ذمہ داری اسد پر آنا تھی اور وہ لمبے پھڈے میں پھنس جاتا۔ اب تو اسے شکر ادا کرنا چاہیے کہ ناکردہ گناہوں کا بھی کفارہ ادا ہو گیا ہے۔ "کڑوا گھونٹ" معاشرے کے بھیانک سچ کی نشاندہی ہے۔ جب بندہ کسی محرومی یا مجبوری کے ہاتھوں کھلونا بنتا ہے تو زہر کا پیالہ بھی منہ سے لگانا پڑتا ہے۔ گاؤں میں مولوی، جادو، ٹونا، وڈیرا ازم اور پیر کا کردار مدتوں تک رہے گا۔ تعلیم کی روشنی عام ہو جائے، اللہ کی رضا پر شاکر رہنے کا سلیقہ آ جائے اور ہمارے ذہن اتنے وسیع ہو جائیں کہ چاہے اپنے حق میں بہتری نہ ہو لیکن تلخ بات سننے، غور کرنے اور برداشت کرنے کی سوجھ بوجھ آ جائے تب ایسی باتوں کا قلع قمع ممکن ہو سکے گا لیکن اب بھی تدبیر سے سلجھاؤ کے کئی راستے ہیں۔ تھوڑا صبر اور وقت کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔ "دوسری موت" کے واقعات پڑھ کر حیران بیٹھا ہوں۔ کوئی بھی کہانی پڑھ اور سن کر اپنے مزاج اور سوچ کے مطابق رائے دی جاتی ہے۔ رشید نے چودھری کے بیٹوں کو مار کر انتقام لے لیا۔ وہ خود کس جرم کی سزا پا تا رہا حالانکہ اسے انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔ کتنی اذیتیں اٹھائیں، رتجگے کاٹے، دماغ سوچوں کے نشانے پر رہا اور تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ بھلا ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب کوئی اچھی خوشیوں بھری زندگی سے دہکتے انگاروں کی وادی میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس کا کیا قصور ہوتا ہے۔ کبھی فرصت کے لمحوں میں اس پہلو پر ضرور سوچے گا۔"

☆ عمران جونانی کی خیال آفرینی کراچی سے۔ "تمام دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔ اللہ ہم سب کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ دسمبر کا مہینا کراچی والوں کے لیے سکون کی نوید ہے۔ ان دو تین ماہ کے علاوہ سارا سال شدید گرمی میں لوڈشیڈنگ اور پانی کی کمی کا عذاب بھگتتے گزرا۔ میری پیدائش اور کچھ ذاتی واقعات اسی ماہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سو یہ دل کے بہت قریب ہے۔ اداریے میں آپ نے سوال "سیاست دان ہمارے حالات سے کب تک کھیلتے رہیں گے" کا سیدھا جواب یہ ہے کہ جب تک ہم اپنے انفرادی اعمال کی اصلاح نہیں کریں گے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ ہم من حیث القوم بے حس اور کرپٹ ہیں۔ مانیں یا نہ مانیں۔ اللہ ساجد صاحب کے علم، عمر اور قلم میں مزید برکت ڈالے۔ اب کی بار کیسی شاندار شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ دل خوش کر دیا۔ حضرت سعدؓ کے بارے میں مضمون دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے لائق ہے۔ جنگی واقعات کی منظر نگاری نہایت عمدہ ہے۔ حسن رزاقی نے اس مرتبہ بھی دلچسپی کم نہ ہونے دی۔ ایک ہی نشست میں بالی کی سیر بھی ہو گئی اور آج کی ترقی یافتہ سعودی ائرلائن کے ابتدائی دور کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ معیاری قسط وار سلسلہ ہے۔ آفاقی صاحب نے ابتدا فواد خان کے تذکرے سے کی ساتھ ہی "ہم سفر" کا ذکر آیا جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور اردو ڈراموں کو نئی زندگی بخشی۔ احمد راہی سے متعلق باتیں بھی پسند آئیں۔ پنجابی شاعری سے متعلق معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ہیر رانجھا کے گیت "سن ونجلی دی مٹھڑی تان" کی پہلی ہی لائن آج بھی کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔ اس کے بعد سری لنکا کے ذکر نے حسد میں مبتلا کر دیا، جانے کیسے پاگل لوگ ہیں جو قوانین کا احترام کرتے ہیں اور خواہ مخواہ ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ پاکستان جیسی شاندار مملکت سے بھی کچھ نہیں سیکھتے۔ امتیاز احمد صاحب کی "دوسری موت" پسند آئی۔ انداز بیان خوب صورت ہے۔ غیر ضروری تفصیلات سے گریز نے کہانی دلچسپ کر دی۔ انعام انصاری صاحب کی "کرب" پڑھ کر میں سکتے میں آ گیا۔ اس کم علم کے پاس وہ الفاظ نہیں جو اس شاہکار پر تبصرے کا حق ادا کر سکیں۔ محبت، انتظار، غریب الوطنی، جذبات، امید، سیاست کیا نہیں ہے ان چند صفحات میں۔ یہ تحریر دسمبر کے شمارے کا عطر ثابت ہوئی۔ نہ جانے کیا سوچ کر آپ نے اس کہانی کو آخری نمبر پر رکھا ہے (یاد رکھیں پہلی اور آخری کہانی عمدہ ترین لانے کی کوشش ہوتی ہے) "شہر خیال" کی کرسیٔ صدارت اس ماہ بھی بجا طور پر شاہد جہانگیر صاحب کا حق ٹھہری۔ سید انور عباس کی سلور جوبلی نمبر والی تجویز قابلِ غور ہے۔ 25 کم نہیں ہوتے۔ اویس شیخ کی اس بات میں وزن ہے کہ بیت بازی میں شاعر کا نام بھی ہونا چاہیے۔ اس طرح معیار بلند ہوگا۔ ناصر حسین کو دل سے سالگرہ مبارک۔ ڈاکٹر روبینہ کی طرف سے اب تشویش ہونے لگی ہے، اللہ آسانی والا معاملہ کرے۔ آفتاب نصیر کا نوبل انعام کے حوالے سے بے لاگ تبصرہ پسند آیا۔ سدرہ بانو کا رواں زبان میں لکھا گیا خط بازی لے گیا۔ الفاظ کا چناؤ خوب صورت ہے، اس مرتبہ آپ نے کراچی کا ذکر نہیں کیا؟ طاہرہ گلزار اپنے الطوط میں لگاتار ناچیز کا ذکر کرتی ہیں۔ بہن ہو تو ایسی۔ آپ کے خواب عمدہ ہیں لیکن ان کی تعبیر کا تعلق ہمارے اپنے رویوں سے بھی ہے۔"

☆ فقیر حسین ضیا کا مکتوب خاص بھکر سے۔ ”دسمبر کا شمارہ سرگزشت دیکھا۔ اچھی تحریریں اور انتخاب کے لیے آپ اور رائٹرز حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان کہانیوں اور سچ بیانیوں پر تبصرہ کرنے کے لیے میں الفاظ کہاں سے لاؤں۔ انعام انصاری صاحب نے کراچی سے ”کرب“ کے عنوان سے جس درد کو کاغذ پر جگہ دی بلاشبہ یہ انتہائی دکھ بھری تحریر ہے۔ پتا نہیں لکھنے والے صاحب نے کس طرح اتنے بڑے حادثے کو الفاظ میں سمویا ہے۔ معراج صاحب! ہم جیسے کمزور دل والوں کو یوں نہ رلایا کریں۔ ہم تو پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔ ”زندگی گریہ پیہم ہی تو ہے۔ کھلکھلاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا۔“ (یہ سو فیصد سچی کہانی ہے کہ اس کے کردار کراچی میں موجود ہیں) ”کڑوا گھونٹ“ نجمہ فیصل آباد ایک ایسے ناسور کی نشاندہی ہے جو ہمارے معاشرے کی تباہی کا باعث ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ گھرانے اندھی تقلید اور جعلی پیروں کے ہاتھوں لٹ رہے ہیں اور عزتیں سر بازار نیلام ہو رہی ہیں۔ ”بہروپیا“ امیمہ سلیم کی بہت اچھی کاوش اور نصیحت ہے۔“

☆ سید انور عباس شاہ کا بھکر سے نوازنامہ۔ ”اس دفعہ دسمبر کا شمارہ اس قدر تاخیر سے ملا کہ ہم سمجھے کہ آپ شمارہ شائع کرنا بھول گئے ہیں لیکن جب یہ ہمارے ہاتھوں تک پہنچا تو وہ ساری کوفت رفو چکر ہوگئی جو ہمیں اس کے بھرپور انتظار میں اٹھانا پڑی (حیرت ہے 20 نومبر کو کراچی کے اسٹالز پر پہنچ چکا تھا) یہ شمارہ ہر لحاظ سے ہمارے معیار پر پورا اترا۔ ”شہر خیال“ میں شاہد جہانگیر شاہد ایک دفعہ پھر کرسی صدارت کی زینت بنے۔ بہت خوشی ہوئی خدا اور بھی کامیابیاں نصیب کرے۔ نیز آپ نے کراچی کے حالات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اب تو کراچی جیسے حالات واقعات ہمارے اردگرد یعنی پورے پاکستان میں تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ غریب عوام کو تیزی سے کچلا جارہا ہے کیوں کہ ہمارے حکمرانوں نے غربت کو ختم کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ نہ غریب زندہ رہے گا نہ غربت ہوگی۔ محمد عامر ساحل اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ ”شہر خیال“ کی زینت بنے۔ بہت خوشی ہوئی آتے رہا کریں بھائی۔ اویس شیخ اور احمد خان توحیدی کے خط مختصر لیکن خاصے جاندار تھے جو دل کو بہت بھائے۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ نے بھی ہمارے دل کی بات کہہ دی کہ ہر شمارے میں ایک آدھ کہانی پُراسراریت بھری ہونی چاہیے۔ ناصر حسین، آفتاب احمد، نصیر اشرفی، منشی محمد عزیز اور قیصر عباس خان کے خطوط شاندار تھے۔ اس دفعہ بلیک لسٹ میں شامل تمام نام مشہور لوگوں کے تھے۔ ان کے خطوط کے نہ شامل ہونے کا ہمیں افسوس ہے۔ پر کیا کریں محکمہ ڈاک زندہ باد۔ ”احتیاط“ ایک مختصر اور خاصی جاندار تحریر تھی۔ اس مختصر سی تحریر میں مصنفہ نے بھی بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ جیسے دریا کوزے میں بند ہو۔ اسی قسم کے بے شمار واقعات اب بھی ہمارے اردگرد ہو رہے ہیں۔ واقعی ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔ ”جنگجو“ بھی ایک دلچسپ اور ڈرامائی تحریر تھی۔ نام نہاد ڈاکٹر قریشی کو سزا تو کافی مل گئی اُمید ہے وہ اپنے گھناؤنے کاروبار سے باز آچکے ہوں گے۔ ”دوسری موت“ ایک دکھ بھری تحریر تھی۔ رشید ایک سیدھا سادہ مہذب شخص تھا لیکن حالات نے اسے مجرم بنا دیا۔ یہ تو ہم نے بہت پہلے سے سن رکھا ہے کہ تمام مجرم بذات خود مجرم نہیں بنتے، حالات و واقعات ان کو مجرم بنا دیتے ہیں۔ ”کڑوا گھونٹ“ اپنے نام کی طرح ایک کڑوی تحریر تھی۔ امجد خاصا بے غیرت شخص نکلا۔ اسی طرح نام نہاد پیر بھی ہمارے معاشرے میں سرعام دندناتے پھر رہے ہیں اور خوب لوٹ رہے ہیں۔ اسی قسم کے بہت سے نام نہاد پیروں فقیروں کو ہمارے میڈیا نے ڈرامائی طور پر بے نقاب بھی کیا ہے اور ان کے گھناؤنے کرتوت مکمل ثبوت کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیے کہ یہ سب کچھ فراڈ ہے۔ ان نام نہاد پیروں سے بچیں اور صدق دل سے اللہ سے مدد مانگیں اللہ تمام مرادیں پوری کرے گا۔ ”بہروپیا“ بھی ایک جاندار تحریر تھی۔ کیسے کیسے فراڈیوں نے اس دنیا میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان جیسے فراڈیوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ معلوم ہونے پر پکڑ کر قانون کے حوالے کر دینا چاہیے کیوں کہ یہ لوگ کسی قسم کی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ ”سراب“ بھی بھرپور ایکشن کے ساتھ اپنے سفر پر گامزن ہے۔ عیسوی سن کے بارہویں اور آخری مہینے کے بارے میں معلومات نے ہمارے علم میں مزید اضافہ کیا۔ ”فلمی الف لیلہ“ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پُرکشش رہی۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ”ہر مہینے معراج رسول انکل کی فکر انگیز باتیں پڑھ کے دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن ہائے نصیب! ہم مجبور لوگ صرف آہ وزاری ہی کر سکتے ہیں۔ جب تک ہم مظلوم عوام زندہ ہیں یہ بے حس حکمران ہماری زندگیوں کے ساتھ کھیلتے رہیں گے۔ یک ‌‌صفحی ”میر کارواں“ میں میر خلیق کے بارے میں پڑھا۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنے والی بات ہے۔ کاش کہ اس ماہ کی سرگزشت F.A کے اسٹوڈنٹ پڑھیں تو ان کو کتنا تعلیمی فائدہ ہوگا۔ اس بار دوستوں کے خطوط پڑھنے سے پہلے میں نے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ”مرد صالح“ پڑھی جو حضرت سعد بن ابی وقاص کے بارے میں ہے۔ یہ جلیل القدر صحابی رشتے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماموں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ساجد کی تحریر نے دل و دماغ کو ایک پاکیزہ سی روحانی ٹھنڈک پہنچائی۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو خوش و خرم رکھے۔ دوسری تحریر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی مختصر سی تحریر ملکہ کریچیانا کے بارے میں ”عشق عشق“ کے نام سے پڑھی۔ مختصر لیکن ایک جامع تحریر ہے۔ ملکہ کریچیانا نے ایک معمولی سپاہی سے عشق کر کے شادی کرلی اور محبت کی معراج پالی۔ ویلڈن بھٹی صاحب اب دوستوں کے خطوط پر تبصرہ دیکھوں کہ کس کس نے مجھ ناچیز کو یاد کیا ہے۔ Good پہلے نمبر پر میرے شہر کے شاہد جہانگیر شاہد صاحب کا تبصرہ آیا، مبارک ہو۔ جہانگیر صاحب واقع یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ عبدالستار ایدھی جیسے حقیقی خادم کو لوٹا گیا۔ جہانگیر صاحب یہ بے حس قوم اور بے حس حکمران کبھی نہیں بدلنے والے، ہم صرف اپنا خون دل و جگر جلا سکتے ہیں یا اللہ سے رحم کی بھیک مانگ سکتے ہیں۔ شاہد جہانگیر صاحب آپ کا آنا میری عزت افزائی ہوگی۔ میں انتظار کروں گی۔ محمد عامر ساحل آپ کا خط بہت زبردست تھا۔ سید انور عباس شاہ بھائی شکریہ کہ آپ نے مجھے ہر دلعزیز بہن کا خطاب دیا۔ آپ کی سلور جوبلی نمبر والی بات سے میں بھی متفق ہوں۔ اویس شیخ صاحب مجھ ناچیز کا خط آپ کو بہت بھایا، شکریہ شکریہ۔ احمد خان توحیدی آپ نے سب کو یاد کیا۔ کیا ہم سے کوئی ناراضگی ہے؟ قرۃ العین سسٹر چائے اور ہمارے بغیر یہ تو اچھی بات نہیں۔ کم از کم اپنا رخ مبارک تو پشاور کی طرف کرلیتیں۔ ناصر حسین رندجی Happy Birthday 2U ویسے بھائی کتنے سال کے ہوگئے ہو؟ ہاں بھائی جاوید سرکانی آفتاب احمد نصیر، تنویر عباس بابر، سہیل احمد عباسی، ابن مقبول اور معراج الدین آف مردان بہت عرصہ سے غائب ہیں۔ لیکن شکر ہے اس بار آفتاب احمد نصیر اشرفی حاضر تھے۔ واہ واہ جی اس بار تو تقریر کے Mood میں نظر آئے۔ کہیں سیاست میں آنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ شکریہ منشی محمد عزیز مے بھائی، آپ نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ قیصر خان بھائی شکریہ کہ آپ اتنے پیار سے آپا کہتے ہیں۔ جب کہ میرے بہن بھائی اور کزن مجھے

باجی گل کہتے ہیں۔ قیصر خان اچھا لکھتے ہو۔ بشریٰ افضل جی دشمن تو کئی ہیں لیکن ہمت تو میں نے بھی نہیں ہاری۔ بشریٰ جی آپ، روبینہ نفیس، قرۃ العین اور تمام شہر خیال کے بھائی میری دعاؤں میں حاضر ہوتے ہیں۔ سدرہ بانو ناگوری میں دو مرتبہ ”شہاب نامہ“ پڑھ چکی ہوں۔ کاش کہ شہاب نامہ میں 1970ء سے لے کر 1976ء تک کے حالات بھی تحریر ہوتے تو چار چاند لگ جاتے اس شہاب نامہ کو۔ سدرہ بانو ناگوری یہ آپ کی محبت ہے جو آپ میری اتنی تعریف کرلیتی ہیں۔ آپ خود بہت سویٹ ہیں۔ سدرہ بانو بہت زبردست تبصرہ رہا آپ کا۔ واہ جی واہ عمران جونانی بھائی خط تو آپ کا بڑا زبردست رہا لیکن تھوڑی میری تعریف بھی کرلیتے تو چار چاند لگ جاتے۔ اس بار سرگزشت بہت زبردست رہا۔“

☆ محمد اشفاق نے گجرات سے لکھا ہے۔ ”ہر ماہ جب سرگزشت ملتا ہے تو خط لکھنے کا سوچتا ہوں لیکن ٹائم نہیں ملتا۔ میں 1989ء سے تینوں پرچوں کا مستقل قاری ہوں۔ سرگزشت منفرد پرچہ ہے۔ خط لکھنے کی وجہ جناب شاہد جہانگیر شاہد کا خط ہے۔ جس میں آپ نے ان کے تبصرہ میں جو انہوں نے ”سراب“ کے بارے میں کیا ہے اور آپ نے یہ عرض کیا کہ کہانی اختتام کی جانب گامزن ہے۔ بے شک ہر کہانی پہلی قسط کے بعد ہی اختتام کی جانب چل پڑتی ہے لیکن ”سیراب“ کو زبردستی ختم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میں وہ شخص ہوں جس کے پاس 2007ء تک سارے شمارے تھے لیکن پھر ایک حادثے کی وجہ سے سارے شمارے میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ اس بات پر نہ میں نے ابھی تک خود کو معاف کیا ہے اور نہ ہی جس کی وجہ سے نکلے تھے اس کو معاف کیا ہے۔ فیصلہ اللہ پر چھوڑا ہے۔ طاہرہ گلزار، اقلم علیم صاحب اب کیسے ”موت کے سوداگر“ جیسا شاہکار دے سکتے ہیں۔ ”موت کے سوداگر“ جیسی نایاب کہانیاں جوانی میں لکھی جاسکتی ہیں بڑھاپے میں نہیں۔ (شیر بوڑھا ہوکر زیادہ تجربے کار ہو جاتا ہے)۔ رسالہ ابھی پورا نہیں پڑھا۔ ”سیراب“ کے بعد چند سچ بیانیاں پڑھی ہیں۔ ”بہروپیا“ میں ارم جو کچھ چاہتی تھی۔ وہ آج کل سو میں سے نوّے فیصد لڑکیاں چاہتی ہیں۔ شوہر ایسا ہو جو سیدھا امریکا لے جائے۔ ”تہی داماں“ میں عمیر نے مایوس کیا۔ نور کی سزا یہ ہونی چاہیے تھی کہ ساری زندگی شادی کے بغیر رہتی۔ نور کے والدین کا بھی بہت سا قصور تھا۔“

☆ منشی محمد عزیز مے لندن سے لکھتے ہیں۔ ”بہروپیا سرورق کی کہانی بہت ہی سبق آموز ہے۔ خصوصاً ان والدین کے لیے جو ظاہری نمود و نمائش کے بہکاوے میں آکر اپنی بچیوں کی زندگی خراب کر دیتے ہیں۔ راشد کا جذبہ قابل تعریف ہے۔ ”نادانی“ پڑھ کر دل بہت رنجیدہ ہوگیا۔ سعدیہ کو اس کے خوابوں کی بہت بڑی سزا ملی بلکہ اس کے ساتھ اس کے غریب والدین کو بھی بے عزت ہونا پڑا اور ماریہ پر شدید غصہ آیا۔ جس نے اپنی امارت کے غرور میں پورا ایک گھرانا تباہ کر دیا۔ اداریہ میں حکومت کی بے حسی اور بے غیرتی کا ذکر تھا۔ اب کیا کہیں اس بارے میں لگتا ہے کہ حکومت اور اپوزیشن ”بانٹ کر کھاؤ“ کے فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔ مرد صالح ایک صحابی رسولؐ کی داستان پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ اس حوالے سے محترم ساجد امجد اور دیگر محقق حضرات سے یہ کہنا چاہوں گا کہ جنگ جمل اور ایسے دیگر واقعات تفصیلاً بیان کریں جن میں مسلمان ہی مسلمان کے خلاف نبرد آزما تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور دیگر واقعات سے متعلق مکمل آگاہی دیں۔ مہربانی ہوگی۔ (معذرت! ایسے واقعات ہم شائع کرنے سے گریز کرتے ہیں)۔ ”زرد صحافت“ میں جوزف کے ابتدائی حالات زندگی کا پڑھ کر حیرت ہوئی۔ یہ جنون محنت کا صلہ تھا جس کی وجہ سے وہ اتنے عروج پر پہنچا۔ طارق عزیز خان نے دریائے نیل سے متعلق بے بہا معلومات فراہم کیں۔ بہت شکریہ۔ ”الوداع“ تو ان ون ہے۔ ”فلمی الف لیلہ“ میں ایک پاکستانی خان فواد خان کا ذکر تھا۔ ”شہر خیال“ کی صدارت ایک بار پھر محترم شاہد جہانگیر شاہد کے حصے میں آئی، مبارک باد قبول فرمایئے۔ جن دوستوں نے خط پسند کیا ان کا شکریہ اور خصوصاً مشکور ہوں جناب اویس شیخ کا۔ بہت شکریہ پیارے بھائی۔ آپ کی باتوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا ورنہ تو یہاں لوگ باتوں سے ہی لمحہ لمحہ مارنے کا سامان کرتے ہیں اور آہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ بقول شاعر ”چھپایا ہے غم کو اس نشاط میں۔ دنیا سمجھتی ہے بہت شاد ہوں میں۔“ طاہرہ گلزار اللہ کرے کہ آپ کا یہ خواب حقیقت میں بدل جائے۔ رانا شاہد، سعید جاوید اور عظمیٰ شکور وغیرہ غیر حاضر ہوگئے۔“

تجزیہ سال 2014ء وحید ریاست بھٹی، کلر سیداں راولپنڈی

اس سال ... جناب سید نصیح اقبال صدر APNS سابق صدر CPNE اور سابق سینئر، معروف قلم رائٹر جناب عزیز میرٹھی اور ادارے کے مصور جناب شاہد حسین خالق حقیقی سے جاملے۔

ادار یے

معراج رسول انکل نے پورا سال دردمندی کے جذبات و احساسات کے تحت بالعموم عالم اسلام اور بالخصوص پاکستان کے حوالے سے نہایت اعلیٰ انداز میں معاشرتی ناہمواریوں اور دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب فرمایا۔

یک صفحی سرگزشت اس ترتیب کے تحت نظر نواز ہوئی۔ 1- نامور اشتراکی (خواجہ احمد عباس۔ جنوری) 2- قلم کا دھنی (علامہ تاجور نجیب آبادی۔ فروری) 3- عہد ساز (شریف ہاشمانی۔ مارچ) 4- پہلوان مبلغ (انوکی محمد حسین۔ اپریل) 5- ادب کا سپاہی (قاضی عبدالودود۔ مئی) 6- پیر صاحب (خواجہ حسن نظامی۔ جون) 7- شاعر جاوداں (حضرت داغ دہلوی۔ جولائی) 8- ادب کا بابا آدم (حافظ ابراہیم۔ اگست) 9- خطاکار (بہرام سقا عرف بہرام بردوانی۔ ستمبر) 10- مبلغ (محمد مارماڈیوک پکتھال۔ اکتوبر) 11- عالم اردو ادب (مولانا محمد حسین آزاد۔ نومبر) 12- میر کارواں (میر خلیق۔ دسمبر)

سرگزشت شہر خیال

جنوری 2014ء سے دسمبر 2014ء تک شہر خیال کے باسیوں کے شائع شدہ خطوط و ای میلز کی تعداد 225 رہی، مرد کی 171 اور خواتین 54 تھیں۔ محترمہ سدرہ بانو ناگوری مسلسل بارہ ماہ تک شہر خیال کی بلاشرکت غیرے حکمران ٹھہری جاسکتی ہیں۔ محترمہ بشریٰ افضل صاحبہ گیارہ خطوط کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہیں منشی محمد عزیز مے دس خطوط کے ساتھ تیسری پوزیشن پر مرد حضرات کی لاج بچانے میں کامیاب رہے۔

کرسیِ صدارت پہ براجمان ہونے والوں کی ترتیب کچھ یوں ہے، خالد کبیر۔ لاہور (جنوری) محمد عمران جونانی۔ کراچی (فروری) وحید ریاست بھٹی۔ کلرسیداں (مارچ) منشی محمد عزیز مے۔ لڈن وہاڑی (اپریل) عبدالخالق بھٹی۔ بہاولپور (مئی) شاہد جہانگیر شاہد۔ پشاور (جون، اکتوبر اور دسمبر) رانا محمد سجاد۔ مظفر گڑھ (جولائی) محمد ایاز راہی۔ مانسہرہ (اگست) طاہر الدین بیگ۔ میرپور خاص (ستمبر) اعجاز حسین سٹھار۔ نو پور تھل (نومبر) دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی بھی خاتون کرسیِ صدارت حاصل نہ کر سکی اور کوئی بھی مرد پورا سال مسلسل شہرِ خیال کی رونق نہ بن پایا۔ جبکہ شاہد جہانگیر شاہد صاحب کو تین مرتبہ یہ اعزاز حاصل ہوا سال کا بہترین خط یا تجزیہ جناب شاہد جہانگیر شاہد صاحب کا ہی تھا جون 2014ء یوں جناب شاہد جہانگیر شاہد صاحب پورا سال آسمان سرگزشت پہ چھائے ہوئے نظر آئے۔

ادبی تجزیہ برائے سال 2014ء

ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ہمیشہ کی طرح اس سال بھی بلاناغہ علم دوست قارئین کے لیے علم و دانش کے خزانے لٹاتے رہے، ان کے تحقیقی و علمی مقالات کچھ اس ترتیب سے منصۂ شہود پہ آئے۔

1- سفر مزاج (نعیم صدیقی۔ جنوری) 2- طلوعِ مہر (مولانا غلام رسول مہر۔ فروری) 3- شہزادی (عابدہ سلطان۔ مارچ) 4- درویش عالم (علامہ عبدالعزیز میمن۔ اپریل) 5- عقل نشیں (چارلس ڈارون۔ مئی) 6- چراغِ ادب (اثر لکھنوی۔ جون) 7- رہنما (چو این لائی۔ جولائی) 8- نشان حیدر (راشد منہاس۔ اگست) 9- خطائے اوّل (قصۂ آدمؑ و حواؑ۔ ستمبر) 10- گل فارس (حضرت سلمان فارسیؓ۔ اکتوبر) 11- مقتول آزادی (انور سادات۔ نومبر) 12- مردِ صالح (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ۔ دسمبر) یوں تو ہر ایک مقالہ ڈاکٹر صاحب کی علم دوستی کا بین ثبوت تھا مگر جس مقالے نے قلب و روح کو گرما دیا وہ گل فارس تھا، بلاشبہ ڈاکٹر صاحب اس ایمان افروز تحقیق پر داد و تحسین کے مستحق قرار دیے جاسکتے ہیں۔ دیگر معزز مصنفین کی تخلیقات کا جائزہ برائے سال 2014ء

ابن کبیر: بارہ تخلیقات

ابن کبیر صاحب بھی ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی طرح پورے سال ہمیں اپنے تعمیری و تخلیقی کام سے محظوظ فرماتے رہے، ان کی نگارشات کچھ اس ترتیب سے ذوقِ مطالعہ کا باعث بننے میں کامیاب رہیں۔

1- جاپانی ہنری فورڈ (سوئیشرو۔ جنوری) 2- پاپارازی (رون گوگیلا۔ فروری) 3- بابائے ادب (مارک ٹوئن۔ مارچ) 4- پُراسرار پسینا (عجیب بیماری۔ اپریل) 5- دغاباز (جرم نامہ۔ مئی) 6- تتلیاں (تین باکمال بہنوں کا تذکرہ۔ جون) 7- ایک برفانی رات (جرم و سزا۔ جولائی) 8- اُمید پرست (لویزا۔ اگست) 9- تلاشِ منزل (خطائے رہبر۔ ستمبر) 10- خطائے ہواباز (حادثات۔ اکتوبر) 11- جہنمی آگ (حادثات۔ نومبر) 12- خونخوار (تاریخی داستان۔ دسمبر)

ابن کبیر صاحب کے قلم کی جولانی پڑھنے لائق تھی مگر میری نظر میں ابن کبیر صاحب کی سب پر بھاری تحریر تتلیاں رہی ہے، جس پر وہ سراہے جانے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی: آٹھ تخلیقات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب اس سال بھرپور فارم میں نظر آئے اور مطالعے کے شوقین حضرات کو چند نادر تحاریر سے محظوظ فرمایا، ان کی تحاریر بلحاظ ترتیب کچھ یوں تھیں۔

1- بعد قید (جرم و سزا۔ فروری) 2- عجائب شاہانہ (داستان عشق نپولین۔ مارچ) 3- جرم وفا (جنگ عظیم۔ جون) 4- جنگ و محبت (تاریخ نامہ۔ جولائی) 5- دولت کی خاطر (کشش خطا۔ ستمبر) 6- دانائی (تاریخی روداد۔ اکتوبر) 7- کسن جنگجو (واقعات عالم۔ نومبر) 8- عشق عشق (تذکرہ خاص۔ دسمبر) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی تحریر عشق عشق خامے کی چیز تھی جس نے میرے خیال میں ہر قاری سے داد ضرور وصول کی ہوگی۔

شکیل صدیقی: سات تخلیقات

محترمی شکیل صدیقی صاحب کو اگر مورخ ہالی ووڈ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، موصوف اس سال بھی ہمیں ہالی ووڈ کے نامور ستاروں سے متعارف کراتے نظر آئے ان کی دلکش تحاریر کچھ اس طرح قارئین سرگزشت کے مطالعہ کا باعث بنیں۔

1- ڈزنی (والٹ ڈزنی۔ فروری) 2- عمر شریف (اداکار۔ اپریل) 3- شوبزمین (ضیا محی الدین۔ مئی 4- تاریکی آسیب (اسٹیفن ایڈون کنگ۔ جولائی)

5- مدر ٹریسا دوم (انجلینا جولی۔ اگست) 6- لائف (عالمی شہرت یافتہ جریدہ۔ اکتوبر) 7- باکمال بہنیں (تین باکمال بہنوں کا تذکرہ۔ نومبر)

شکیل صدیقی صاحب کی ہر تحریر لطفِ مطالعہ کا سبب بنی مگر جس پہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہا وہ ڈزنی تھی، جو ہمارے بچپن کے خوابوں کے امین والٹ ڈزنی کے حوالے سے تھی۔

محمد ایاز راہی: پانچ تخلیقات

جناب محمد ایاز راہی صاحب کا قلم اس سال بھی محوِ پرواز رہا اور بہت اعلیٰ تحقیقی مواد پڑھنے والوں کے لیے پیش کرنے میں کامیاب رہے، راہی صاحب کی تحقیقی تخلیقات کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔

1- عشق حشر ساماں (تذکرہ خاص۔ جنوری) 2- مجذوب اردو (خراجِ تحسین۔ اپریل) 3- بھوک (تحفہ خاص۔ جون) 4- عجلت کی سزا

(خطائے جلد بازی۔ ستمبر) 5- بگرام (سیر پاکستان۔ نومبر)

ایاز راہی صاحب کی ہر تحریر اپنا جواب آپ ہوتی ہے مگر بھ ناچیز کی دانست میں ان کی سال میں سب سے خوبصورت تحریر بگرام تھی، جو پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافے کا باعث بنی۔

مریم کے خان: چار تخلیقات

محترمہ مریم کے خان صاحبہ کی چار تحریریں موتی بکھیرتی نظر آئیں، جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

1- تاریخ عکس (فوٹوگرافی کی تاریخ۔ مئی) 2- غلط نظریہ (خطائے سائنس۔ ستمبر) 3- تباہ کن (تحقیق۔ نومبر) 4- زرد صحافت (صحافتی روداد۔ دسمبر)

محترمہ مریم کے خان صاحبہ کی سب سے جاذبِ نظر تحریر میرے خیالِ ناقص میں تاریخ عکس تھی، جسے بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔

طارق عزیز خان: تین تخلیقات

مکرمی طارق عزیز خان صاحب قارئین سرگزشت کے جانے مانے لکھاری ہیں، وہ اس سال بھی گزشتہ سالوں کی طرح قارئین کے دل جیتنے میں کامیاب ٹھہرائے جاسکتے ہیں، گو انہوں نے کم لکھا مگر جتنا بھی لکھا حق ادا کر دیا، ان کے شہ پاروں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1- عزم مصمم (داستان رانی فیس۔ جنوری) 2- منجمد روح (مہم جوئی۔ اکتوبر) 3- دریائے نیل (تحقیق۔ دسمبر)

طارق عزیز خان صاحب کی تحقیقی کاوش دریائے نیل اس سال کا بہترین تحفہ قرار دی جاسکتی ہے۔

صائمہ اقبال: تین تخلیقات

محترمہ صائمہ اقبال صاحبہ نے اس سال گو کم لکھا لیکن جو لکھا وہ پڑھنے لائق ہے ان کی تین تحریریں سامانِ دلچسپی لیے ہوئے تھیں وہ یہ ہیں۔

1- کہرے کا قہر (حادثات۔ فروری) 2- وہ کون تھا (دلچسپ روداد۔ مئی) 3- کہرے کا قہر (خطائے کپتان۔ ستمبر)

محترمہ صائمہ اقبال صاحبہ جیسی مسلمہ قلمکار نے ایک ہی نام سے دو تحریریں قارئین کی نذر کیں، سمجھ نہیں آتا انہوں نے ایسا کیوں مناسب خیال کیا، بہرحال ان کی پہلی تحریر کہرے کا قہر رگوں میں خون منجمد کرنے والی تحریر تھی جو میرے خیال میں ایک بہترین تحریر تھی۔

سید احتشام: تین تخلیقات

سید احتشام صاحب نے اس بار صرف تین تحاریر سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا، ان کی علمی کاوشیں کچھ اس حساب سے معرضِ وجود میں آئیں۔

1- خانماں برباد (روداد خونچکاں۔ جولائی) 2- زہر کا سفر (جرم و سزا۔ اکتوبر) 3- سونے کی سڑک (جرم و سزا۔ دسمبر)

سید احتشام صاحب کی سال 2014ء کی بہترین کاوش خانماں بربادی قرار دی جاسکتی ہے، جس نے پڑھنے والوں سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔

انجم فاروق ساحلی: تین تخلیقات

محترم انجم فاروق ساحلی صاحب ہمارے شہرِ خیال کے ساتھی ہیں اور انہوں نے اس سال ہمیں تین یادگار تحریریں پڑھنے کے لیے عنایت فرمائیں، جنکی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

1- تذکرہ چین (تحقیق۔ جنوری) 2- پہاڑیوں کا آدم خور (شکار کتھا۔ فروری) 3- خونی شیرنیاں (شکار کتھا۔ اگست)

محترمی انجم فاروق ساحلی صاحب کی سال کی بہترین تحریر تذکرہ چین تھی، جو معلومات کا خزانہ لیے ہوئے تھی۔

امجد رئیس: تین تخلیقات

مکرمی امجد رئیس صاحب اسال کچھ زیادہ لکھنے کے موڈ میں نظر نہیں آئے صرف تین تخلیقات ان کے زورِ قلم کا نتیجہ قرار پائیں، جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

1- برفانی ریگستان (مہم جوئی۔ جنوری) 2- سیل نمبر 14 (جرم کتھا۔ جولائی) 3- کسن فتنہ (سائبر کرائم۔ اکتوبر)

جناب امجد رئیس صاحب کی تحریر کسن فتنہ ان کی ایک بہترین تحریر تھی جو جدیدیت کا عکس لیے ہوئے تھی۔

شکیل ادریس: دو تخلیقات

محترمی شکیل ادریس صاحب اسال جوہر قلم دکھانے کے موڈ میں نظر نہیں آئے، ان جیسے کہنہ مشق لکھاری سے قارئین سرگزشت کو ہرگز یہ اُمید نہیں تھی، ان کی دو عدد تحریریں نظر نواز ہوئیں۔

1- مارلن برانڈو (نامور ہالی ووڈ اداکار۔ جنوری) 2- اصلی ہیرو (حادثات۔ اپریل)

مارلن برانڈو بہت بڑھیا تھی جسے قلم پسند طبقے نے بہت سراہا۔

امین بھایانی: دو تخلیقات

ملک کے معروف قلمکار جناب امین بھایانی صاحب کی صرف دو تحریروں سے ہم قارئین مستفید ہو پائے، وہ دو تحریریں یہ تھیں۔

1- جناح وے (معلومات عالم۔ فروری) 2- شہر گزشت (شہر نامہ۔ مئی)

جناب امین بھایانی صاحب نے اپنی دونوں تحریروں سے پڑھنے والوں سے خوب داد وصول فرمائی مگر کراچی شہر کے گزرے بیتے دنوں کی یادوں کو بہت خوبصورتی اور نفاست سے ہم پڑھنے والوں کے لیے یادگار بنانے میں نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی۔

عقیل عباس جعفری: دو تخلیقات

محترمی و مکرمی جناب عقیل عباس جعفری صاحب نہ صرف وطن عزیز بلکہ دنیائے تحقیق میں ایک معتبر نام کے حوالے سے جانے جاتے ہیں، یہ ادارہ سرگزشت کا بڑا احسان ہے جو ان جیسے عظیم محقق سے ہمیں مستفید فرمایا، ہماری معراج رسول انکل سے یہ قلبی التماس ہے کہ جناب عقیل عباس جعفری صاحب کو ہمارے لیے کچھ نہ کچھ سوغات کے لیے مجبور کرتے رہیں، خاص کر ان سے علماء و شعراء کی تحریک پاکستان کے حوالے سے خدمات کے موضوع پر ضرور نذر قارئین کرنے کے لیے لکھوائیں جناب عقیل عباس جعفری صاحب کی دو تحریریں سال 2014ء میں ہمیں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

1-یوم آزادی (تحقیق۔اگست) 2-نوبل انعام یافتہ (خراج تحسین۔نومبر) میری دانست میں جناب عقیل عباس جعفری صاحب کی دونوں تحریریں ایک دوسرے پر برتری لیے نظر آئیں، انہوں نے اپنے تحقیقی کام سے حق تحقیق ادا کردیا، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

مختار آزاد: دو تخلیقات

جناب مختار آزاد صاحب نے ہمیشہ کی طرح اس سال بھی گو تھوڑا لکھا مگر جو لکھا خوب لکھا، ان کی تخلیقات کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہیں۔

1-وہ کون تھے؟ (معلومات۔جون) 2-واخانی خان (تذکرہ خاص۔اگست)

محترمی مختار آزاد صاحب کی دوسری تحریر واخانی خان زیادہ بہتر طور پہ قارئین سرگزشت کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہری۔

خالد قریشی: دو تخلیقات

مکرمی خالد قریشی صاحب کے انداز فکر سے ضرور قارئین متاثر ہوئے ہوں گے، ان کی دو تحاریر نظر نواز ہوئیں۔

1- گرہٹی کا شیطان (شکار کتھا۔مارچ) 2-انسانی گارا (شکار کتھا۔اکتوبر)

جناب خالد قریشی صاحب کی تحریر گرہٹی کا شیطان زیادہ جاذب نظر ثابت ہوئی، انہیں اور زیادہ لکھنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔

حسن رزاقی جہاز بیتی۔ کے ماہر ہوا باز جناب حسن رزاقی صاحب اپنی خود نوشت بڑی خوبصورتی سے بیان کرنے میں کامیاب رہے۔ اب ہم ان معزز قلمکاروں کی تحریرات کا تذکرہ کرنا چاہیں گے جنہوں نے اپنی ایک تحریر سے ہی پڑھنے والوں کے قلوب میں گھر کرلیا، وہ راہنما تحاریر کچھ اس ترتیب سے صفحہ قرطاس کی زینت بنیں۔

1-ذوالفقار ارشد گیلانی (مردہ کا مجنوں۔جنوری) 2-عائشہ جو نیجو (قصص القرآن۔جنوری) 3-اے آر راجپوت (جلا وطن۔فروری) 4-شاہد جہانگیر شاہد (شاعر اعظم۔اپریل) 5-صبا شفیق (معذور مسیحا۔مئی) 6-کاشف خان (خطا در خطا۔ستمبر) 7-کے زیڈ خان (حکمرانوں کی خطا۔ستمبر) 8-روا بتول (غلط فیصلے۔ستمبر) 9-آصف ملک (جنگی خطائیں۔ستمبر) 10-زین مہدی (تباہی کی دیوی۔ستمبر) 11-نعمان احمد اعوان (معمولی چوک۔ستمبر) 12-انور فرہاد (دیر کردیتا ہوں۔اکتوبر) 13-شیراز خان (تلاش۔دو حصے۔اکتوبر۔نومبر) 14-سلیم انور (کائنات۔اکتوبر)

پورا سال پندرہ معزز مصنفین کی جاندار تحاریر نے ہمارے فکر و نظر کے زاویے بدلنے میں اہم کردار ادا کیا، یوں تو سب تحاریر انتھک محنت و تحقیق کا منہ بولتا ثبوت تھیں مگر جن دو تحاریر نے سب سے زیادہ قارئین کی توجہ حاصل کی ان میں جناب شیراز خان صاحب کی "تلاش" اور شاہد جہانگیر شاہد صاحب کی تحریر شاعر اعظم تھیں، مگر جس تحریر نے بازی سر کی وہ محترمی و مکرمی جناب شاہد جہانگیر شاہد صاحب کی تحریر "شاعر اعظم" تھی، شاہد صاحب نے حضرت مرزا عبدالقادر بیدل" جیسے عظیم صوفی شاعر کے متعلق لکھ کر ہم ادب دوست قارئین پر ایک بڑا احسان فرمایا، اللہ پاک انہیں سلامت رکھے، آمین ثم آمین

مستقل سلسلے

- ہمارا محبوب ادارہ قارئین کی دلچسپی کی خاطر جہاں ہر مہینے نت نئے عنوانات کے تحت جامع اور دقیق علوم کی آبیاری فرماتا رہتا ہے وہیں قارئین کی بھرپور دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چند طویل سلسلے بھی شدومد سے پیش کرتا رہتا ہے، ان طویل سلسلوں کے حوالے سے ہم ان سطور میں کچھ عرض کیے دیتے ہیں۔

ترکی نمی دانم (علی سفیان آفاقی) ترکی کے حوالے سے معروف علمی و فلمی شخصیت جناب علی سفیان آفاقی صاحب گزشتہ کئی مہینوں سے ہمیں برادر اسلامی ملک ترکی کے شہر در شہر کی سیر کراتے رہے جو ماہ جولائی میں اختتام پذیر ہوا۔

سرگزشت ماہ (منظر امام) ملک کے معروف قلمکار و ڈرامانگار جناب منظر امام صاحب سال کے بارہ مہینوں کا تعارف اور ان میں وقوع پذیر واقعات کو قارئین کی نذر کرنے میں انتہائی کامیاب رہے، ان کی اس تحقیقی کاوش سے ڈائجسٹ کے وقار میں اور اضافہ ہوا، میں جناب منظر صاحب سے ملتمس ہوں گے اب وہ عیسوی مہینوں کی طرح اسلامی مہینوں کے حوالے سے بھی ہمیں ضرور بہرہ ور فرمائیں۔

الوداع (حسن رزاقی) ماہر ہوا باز جناب حسن رزاقی صاحب دوران پرواز دنیا کے بے شمار ممالک کے لیے عازم سفر ہوتے رہے انہوں نے ان ممالک کو کس زاویہ نگاہ سے ملاحظہ فرمایا، ہم یہ سب جان پائے ان کا سفر نامہ الوداع پڑھ کر، جو ماہ اگست سے نہایت کامیابی سے جاری و ساری ہے ماسوائے ماہ ستمبر کے بوجوہ خاص نمبر۔

فلمی الف لیلہ (علی سفیان آفاقی) معروف علمی و فلمی شخصیت جناب علی سفیان آفاقی صاحب پورا سال دنیائے فلم کی شخصیات کے متعلق بہترین

انداز میں معلومات فراہم کرتے نظر آئے، 234 مہینے جاری رہنے والی یہ تحریر خاصے کی چیز رہی۔ انہوں نے سال 2014ء میں جن موضوعات و شخصیات کے حوالے سے خامہ فرسائی فرمائی وہ یہ تھے۔ ریاض شاہد، نوشاد علی، ناصر خان، محمد علی، زیبا، امریش پوری، جیفڈ یک، مشرقی پاکستان کی فلمی تاریخ، لاہور کی فلمی تاریخ، اے آر کاردار، محبوب خان، سنیل دت، شبنم، دیو آنند، شیام، ابن بطوطہ، راجکمار، فیض احمد فیض، خواجہ خورشید انور، امیتابھ بچن انٹرویو، شاہ رخ خان انٹرویو، دلیپ کمار، ایچ ایم وی ریکارڈز، قوالی کی تاریخ، راج پنڈت، سلیم رضا، عزیزن بائی، خوشونت سنگھ، پشاور کی فلمی تاریخ، نازیہ حسن، حدیقہ کیانی، جدن بائی، نرگس، احسان دانش، سعادت حسن منٹو، وحید مراد، راجکپور، رشی کپور، کرینہ کپور، کرشمہ کپور، اقبال یوسف، رجنی کانت، رخسار امروہی، مینا کماری، کمال امروہی، گیتا بالی، رحمان، ناصر کاظمی، مہ جبیں قزلباش، بابا جی اے چشتی، احمد رشدی، گوہر بائی، چندو لال شاہ، علی اعجاز، بدر منیر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ و حضرت امیر خسروؒ، نہا، رنگیلا، ناشاد، مولانا ظفر علی خان، شیاما، تاریخ اردو ادب، زیبا بختیار، عدنان سمیع خان، آندرے ہیپ برن، ممتاز شانتی، ولی صاحب، ناظم پانی پتی، زینت امان، سہیل رعنا، دلیپ کمار، فواد خان، احمد راہی، سری لنکا یاترا، مصطفیٰ قریشی وغیرہ اس سال کی خاصے کی چیز دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور شاہ رخ کے انٹرویوز تھے، اسی سلسلے میں شوکت رحمان خٹک صاحب کی تحاریر بھی بے حد پسند کی گئیں مثلاً راجکمار، رحمان، بدر منیر اور مہ جبیں قزلباش کے حوالے سے ان کی تحقیق سراہے جانے کے قابل ہے، فلمی الف لیلہ کا سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

سراب (کاشف زبیر) جناب کاشف زبیر صاحب کی زندگی کی پُر پیچ راہوں پہ محیط تحریر اس سال اپنی 192 اقساط مکمل کرچکیں اور ہنوز جاری و ساری ہے۔

بیت بازی تجزیہ برائے سال 2014ء

سال 2014ء میں قارئین سرگزشت نے اپنے شعری و ادبی ذوق کا بھرپور انداز میں مظاہرہ فرمایا اور نہایت اعلیٰ معیار کے اشعار نذر سرگزشت فرمائے جسے شعری ذوق کے حامل افراد نے بے حد پسند فرمایا، سال 2014ء میں کل 385 اشعار سرگزشت کے صفحات کی زینت بنے۔

علمی آزمائش تجزیہ برائے سال 2014ء

قارئین کی ذہنی و علمی جانچ کے لیے ادارے نے ایک انعامی سلسلہ شروع کر رکھا ہے، جس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر درست جواب دینے والوں کی تعداد بھی ناقابل یقین حد تک بہت زیادہ ہے، سال 2014ء میں علمی آزمائش میں کامیاب امیدواروں کی تعداد 3446 بنتی ہے، اندرون ملک سے درست جواب ارسال فرمانے والے کرم فرماؤں کی تعداد 3367 اور بیرون ملک سے درست جواب دینے والوں کی تعداد 79 رہی، اوسطاً ہر مہینے 287 قارئین نے درست جواب ارسال فرمائے۔

سچ بیانیاں، تجزیہ برائے سال 2014ء

ادارہ سرگزشت نے معاشرے کے ہر طبقے کی خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے سال 2014ء میں 105 سچ بیانیاں شائع فرمائیں، جنہیں قارئین نے بے حد سراہا، ہر کہانی سچائی اور اظہار سچائی کا منہ بولتا ثبوت تھی، جنہیں ماہر ترین مصنفین نے نہایت اعلیٰ علمی و معاشرتی رنگ دے کے زندہ و جاوید بنا دیا، یوں تو ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی مگر کچھ کہانیاں تاریخ کا حصہ بن گئیں بجھ ناچیز کی دانست میں سال 2014ء کی سب سے بہترین سچ بیانی احسان (شادو۔لاہور۔نومبر) قرار دی جاسکتی ہے، دوسرے نمبر پر آنے والی سچ بیانی کاروان زیست (نسرین۔کراچی۔فروری) قرار دی جاسکتی ہے، تیسرے نمبر پر آنے والی سچ بیانی میرے خیال میں خزاں کی فصل (سونیا اسحاق۔اسلام آباد۔مارچ) قرار دی جاسکتی ہے، اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان تینوں سچ بیانیوں کو ایک بار پھر مطالعہ فرمالیں۔

پارچہ جاتی تجزیہ برائے سال 2014ء

سال 2014ء میں قارئین نے اپنی پسند کے پارچہ جات ارسال فرما کر سرگزشت کو چار چاند لگائے۔

سال 2014ء میں 253 پارچہ جات شامل اشاعت تھے نہایت معلوماتی و علمی معیار کے حامل تھے مگر میری دانست میں ماہ اکتوبر کے لیے ارسال کیا گیا جناب انور فرہاد صاحب کا پارچہ سب سے بہترین رہا۔

مفید آراء

شاید سرگزشت کی پچیس سالہ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ پورا سال کھیل اور کھلاڑی کے حوالے سے کوئی تحریر نظر نواز نہیں ہوئی، ادارے کو چاہیے کہ نوجوان نسل کا خیال رکھتے ہوئے سال میں کم از کم تین جاندار تحریریں کھیل کے حوالے سے شائع فرما کر ممنون احسان فرمایا کریں۔

ڈائجسٹ کی قیمت بے شک دس روپے بڑھا دیں مگر اس کے صفحات 300 کردیے جائیں، ایک صفحہ صرف ایک کتاب کے تعارف کے لیے مختص فرمایا جائے اس سے قارئین کی علمی و فکری نشوونما ہوتی رہے گی اور ساتھ میں ہر قاری کے گھر ایک ایک کرکے خوبصورت کتابیں جمع ہوتی رہیں گی، جو آنے والی نسل کی راہنمائی کے لیے بے حد مفید ثابت ہوں گی۔

ہر ماہ ایک شاعر کی صرف ایک غزل شامل اشاعت ہو جائے تو بیاض قارئین سرگزشت میں باعث اضافہ ہوگی اور اس افراتفری کے دور میں انہیں چند ساعتیں روح کو تر و تازہ کرنے کے لیے میسر آسکیں گی۔

بصد افسوس مندرجہ ذیل قارئین کے خطوط تاخیر سے موصول ہوئے۔

محمد ضیا الاسلام ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، راولپنڈی۔ اسلم عالم، ممبئی۔ عالیہ رومی، کراچی۔ منظر علی خان، لاہور۔ اویس شیخ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ احمد خان توحیدی، شگفتہ مشتاق، لاہور۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ محمد مبارک علی نقشبندی، ساہیوال۔ عدنان حسین خان، ابن شمشاد، وجیہ ارشاد، کراچی۔ جوریہ خان ایم اے، بھکر۔ محمد سلیم قیصر، ملتان۔ محمد جنید، چنیوٹ۔ ارباز خان، پشاور۔ علی شاہ، نگر ہوپر گلگت۔ نازش ملک، خانیوال۔

شکوہِ سخن

ڈاکٹر ساجد امجد

انیسویں صدی کے اواخر میں جب ناکام انقلاب (1857ء) کی افراتفری اور مسلمانوں کے مسلسل زوال کو ذرا قرار نصیب ہوا تو قوم کے "بڑے" نصب العین لے کر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سیاست، مذہب، معاشرت اور ادب میں ترقی و تخلیق کی نئی راہیں کھولیں۔ ادیب و شاعروں نے فکر و بیان کے نئے نئے دفاتر کھولے۔ شاعروں کے ضمن میں سلسلۂ خیال ایک بزرگ کے کلام پر آکر رکتا ہے جنھوں نے عملی جدوجہد بھی کی۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور وہ تھے منیر شکوہ آبادی۔ اسی شاعر خوش بیان کا ذکر خاص۔

کالا پانی کی سزا پانے والے شاعر کی سوانح حیات

وزیر شاہ اودھ کے بیٹے نظام الدولہ بہ ارادۂ سیر آگرہ میں قیام فرما تھے۔ انہیں شاعری سے شغف تھا لہٰذا ان کی دلداری کے لیے مہاراجا بہ جیت سنگھ بہادر کے دولت کدے پر مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ ایک لڑکا بڑی دیر سے اہلِ مشاعرہ کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چہرہ کتابی، رنگت گندمی، پیشانی کشادہ، ابرو پیوستہ، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن، گال بھرے ہوئے، ناک ستواں، کون ہیں یہ صاحبزادے؟ کوئی پوچھ سکتا تھا لیکن تعارف کے بغیر مخاطب ہونا خلافِ تہذیب تھا۔ ہر شخص یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ کسی کے ساتھ آئے ہوں گے۔ شاعر ہوتے تو آگرہ کے کسی مشاعرے میں کسی نے دیکھا ہوتا۔ اتنی دیر میں ایک صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور مہاراجا کے قریب جا کر سرگوشی میں کچھ کہا پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے۔ ان صاحب کو بہت سے لوگ جانتے تھے۔ یہ سید اولاد حسین تھے جن کا شمار اس وقت کے مجتہدین میں ہوتا تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ جو لڑکا نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے وہ ان کا سوتیلا چھوٹا بھائی ہے۔ یہ پھر بھی معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے مہاراجا کے کان میں کیا کہا۔

مشاعرے کا آغاز ہوا۔ صاحبِ خانہ نے اپنی غزل سپردِ سماعت کی۔ داد کے ڈونگرے برسے۔ سبحان اللہ کی آوازوں کا شور مچا۔

اب مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہونا تھا۔ ایک نام پکارا گیا جو سب کے لیے اجنبی تھا "منیر شکوہ آبادی" وہ لڑکا اپنی جگہ سے اٹھا اور اس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں شمع محفل روشن تھی۔ اس کے دائیں بائیں مہاراجا بہادر اور نواب بہادر جلوہ فرما تھے۔

وہ ابھی سنبھل کر بیٹھا بھی نہیں تھا کہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"اب ایسے مشاعروں میں بچوں کو بھی بلایا جانے لگا ہے۔"

"نواب صاحب کیا سوچیں گے کہ آگرہ میں مشاعروں کا معیار یہ رہ گیا ہے۔"

"نہ جانے کیا پڑھ دے۔ ہم سب کی سبکی ہوگی۔"

اس سے پہلے کہ باتیں طول پکڑتیں منیر نے مطلع پڑھا۔

دنیا سے ہے باہر دل دیوانا کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانا کسی کا

مطلع ایسا تھا کہ اہلِ کمال فریفتہ ہو گئے۔ ہر طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ دوسرا شعر پڑھا تو وہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔

وہ پڑھتا جا رہا تھا اور اس کی نازک خیالیاں دلوں میں گھر کرتی جا رہی تھیں لیکن کچھ وہ بھی تھے جنہیں حسد کی آگ نے پکڑ لیا تھا۔ ان کے داد دینے کے انداز میں طنز پوشیدہ تھا۔ اشاروں کنایوں میں کہا جا رہا تھا۔ یہ عمر اور یہ کلام! ضرور کسی استاد کا کلام ہے جو ان صاحبزادے کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ دبی دبی یہ آوازیں منیر تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ وہ مقطع تک پہنچ گیا۔ خدا جانے پہلے سے کہا گیا تھا یا ان حضرات کے تیور دیکھ کر اسی وقت گھڑ لیا۔

عاشق ہوں منیر اپنے ہی اندازِ سخن کا
وارفتہ کسی کا ہوں نہ دیوانا کسی کا

اس مقطع پر ایسی داد ملی کہ پوری غزل پر نہ ملی ہوگی۔

وہ غزل ختم کر چکا تھا لیکن اپنی جگہ جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ مخالف آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں جو دورانِ غزل وہ سنتا رہا تھا۔ اب اس کی باری تھی۔

"صاحبو! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بعض اساتذۂ سخن کو میری شعر گوئی پر شک ہے۔ یہ باور کیا جا رہا ہے کہ یا تو یہ اشعار سرقہ کیے گئے ہیں یا میرا کوئی استاد ہے جس نے غزل مجھے لکھ کر دے دی ہے۔ ان میں سے دونوں باتیں درست نہیں۔ اگر پھر بھی کسی کو شک ہے تو اسی وقت طرح کا مصرعہ دیا جائے۔ میں اس وقت مصرعہ لگا کر ثابت کر دوں گا کہ میں شاعر ہوں۔ زبان کی کوئی قید نہیں۔ میں فارسی پر بھی اتنا ہی عبور رکھتا ہوں جتنا اردو پر۔"

لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چودہ پندرہ سال کی عمر تھی اور اتنا بڑا دعویٰ... نواب نظام الدولہ کو بھی دلچسپی ہوئی کہ اس کے دعوے کی تصدیق کی جائے انہوں نے مہاراجا کی طرف دیکھا۔

"میں اردو کا مصرعہ تجویز کرتا ہوں آپ فارسی کا مصرعہ دیجیے۔ ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے لڑکے کی باتوں میں کتنی سچائی ہے۔"

دونوں صاحبِ ذوق تھے۔ اساتذہ کے دواوین حفظ تھے۔ مصرعوں کی کیا کمی تھی۔ دو مصرعے دے دیے گئے۔ منیر کی طبیعت ایسی حاضر تھی کہ دونوں مصرعوں پر برجستہ مصرعے لگائے اور اہلِ مشاعرہ کو سنا دیے۔ سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔

"اسے عطیۂ خداوندی کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ اگر اب بھی کسی کے دل میں کوئی شک تھا تو وہ دل ہی میں دبا کر رہ گیا۔

"میاں، آپ کس کے شاگرد ہیں؟" نظام الدولہ نے سوال کیا۔

"میں ابھی تک کسی کا شاگرد نہیں۔ اپنا استاد میں خود ہوں۔"

"حسن و قبح کی تلاش کے لیے نگاہِ غیر کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں اس کا انکاری نہیں۔ کسی اچھے استاد کی تلاش میں ہوں۔"

"کسی وقت ہماری قیام گاہ پر تشریف لائیے۔ ہم نے آپ کے لیے بہت کچھ سوچا ہے۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ کل کسی وقت حاضری دوں گا۔"

منیر کم عمر تھا۔ نظام الدولہ جیسے بڑے نواب سے ملاقات کے لیے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن انہوں نے جس طرح اس کی پذیرائی کی تھی اور جس شفقت سے ملے تھے اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان کی دعوت کو ٹھکراتا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی سے ذکر کیا کہ انہی کی تربیت کا یہ طفیل تھا کہ اس نے بچپن ہی میں اردو اور فارسی پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ بڑے بھائی نے بھی اجازت دے دی کہ نواب صاحب سے ملنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ تو تمہارے لیے فخر کا باعث ہے۔

دوسرے دن شام کے سائے دراز ہوئے تو اس نے گھر سے باہر قدم نکالا اور نظام الدولہ کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ بھی ایسے منتظر تھے کہ تمام ملازموں کو ہدایت کر دی تھی کہ منیر نام کا ایک نوجوان آئے گا اگر وہ سو بھی رہے ہوں تو انہیں بیدار کر دیا جائے۔ انتظار کی زحمت اسے نہ ہو۔

منیر کو تعارف کرانے کی زحمت بھی نہ ہوئی۔ ملازموں نے اسے ایک طویل راہداری سے گزار کر نواب صاحب کی خلوت گاہ تک پہنچا دیا۔

"برخوردار! ہم نے بہت شاعر دیکھے ہیں لیکن عطیۂ خداوندی کا جیسا ظہور آپ کی طبیعت میں دیکھا، کہیں نہیں

دیکھا۔"

"اسے میں ذرہ نوازی کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"ہر منظر کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ آپ کی استعداد علمی کا یقیناً کوئی پس منظر ہوگا۔ میں آپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہوں گا۔ آپ کس گلشنِ خاص کے گلِ تازہ ہیں۔"

"میرا نام محمد اسماعیل ہے اور منیر تخلص کرتا ہوں۔ میرے والد میر احمد حسین شاد ہیں جو خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں۔ میرے جدِ اعلیٰ حضرت سید بہاء الدین سلطان علاؤ الدین غوری (خلجی) کے عہد میں ہندوستان آئے۔ ان کے پڑپوتے سید شرف الدین کو عہد محمد شاہ میں شکوہ آباد کی صوبہ داری عطا ہوئی تھی۔

میری پیدائش 1818ء میں شکوہ آباد میں ہوئی۔ میری والدہ میرے والد کی دوسری بیوی تھیں جن کا میکا آگرہ میں ہے۔ میں گیارہ سال کا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں آگرہ آتا جاتا رہتا ہوں۔ اس کے علاوہ لکھنو میں بھی ہمارے کچھ عزیز ہیں لہٰذا وہاں بھی آنا جانا رہتا ہے۔ میں نے تعلیمی مراحل اپنے والد اور بڑے بھائی کے سائے تلے طے کیے۔ فارسی اور عربی سے مجھے والد صاحب نے آشنا کیا جب کہ دینی تعلیم سے بڑے بھائی نے بہرہ ور کیا۔ یہ کوئی قابلِ ذکر تعلیم نہیں لیکن حافظہ اور ذکاوت خداداد ہے جس نے مجھے اپنے ہم عمروں میں ممتاز کیا ہے۔

شکوہ آباد تو خیر بہت چھوٹا شہر ہے لیکن جب کبھی آگرہ یا لکھنو آنا ہوتا تھا اور یہاں کی ادبی فضا دیکھتا تھا تو دل مچل جاتا تھا۔ دل میں ارمان جاگتا تھا کہ میں شعر کہوں۔ آگرہ اور لکھنو کی ادبی محافل نے مجھے شعر گوئی پر آمادہ کیا۔ اساتذہ کے دواوین کھنگال ڈالے اور مصرعوں کی پیوندکاری کرتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری طبیعت کو اس جوہر خاص سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اب بھی میں آگرہ آیا ہوا تھا کہ جناب سے ملاقات ہو گئی۔"

"واللہ آپ پیدائشی شاعر ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے استاد کی ضرورت ہے جو آپ کے اندر چھپے ہوئے ہیرے کو تراش سکے۔ آپ کی طبع سخن پرست ہے لیکن آپ کو جامع الکمالات ہونا چاہیے۔ خیال کی ندرت کے ساتھ بیان کی فصاحت بھی درکار ہوتی ہے جو کسی لائق استاد کے بغیر نہیں آتی۔ اگر تم ہماری مصاحبت قبول کرو تو ہم تمہیں شیخ ناسخ کا شاگرد کرا دیں۔"

"یہ تو میرا خواب تھا جسے آپ پورا کر دیں گے۔ استاد ناسخ سے بڑھ کر ان دنوں اور کون استاد ہے۔" ان دنوں کسی شاعر کے لیے اس سے بڑی ملازمت کوئی نہیں تھی کہ وہ کسی نواب کے مصاحبوں میں شامل ہو جائے۔ بڑے سے بڑا شاعر کسی نہ کسی دربار سے وابستہ تھا۔ شعرا اس منصب کے حصول کے لیے دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے۔ تب کہیں جا کر گوہرِ مقصود ہاتھ آتا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اسے گھر بیٹھے یہ نعمت میسر آ رہی تھی۔

شیخ امام بخش ناسخ ان دنوں شاہی عتاب کی زد میں آ کر لکھنو سے نکال دیے گئے تھے اور کان پور میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ وہ کوئی معمولی شاعر نہیں تھے کہ کان پور پہنچ کر گوشہ نشیں ہو کے رہ جاتے۔ انہوں نے یہاں بھی شاگردوں کا بازار لگا لیا تھا۔ کان پور کو دوسرا لکھنو بنا دیا تھا۔ معرکہ آرائیوں کا زور تھا۔ داد و تحسین کا شور تھا۔ آج ایک شاعر کے گھر مشاعرہ ہے تو کل دوسرے شاگرد کے گھر محفلِ سخن جمی ہے۔ پہلوانِ سخن امام بخش ناسخ ہر جگہ جلوہ افروز ہیں۔

وہ نظام الدولہ کے ساتھ بہ صیغہ مصاحبت و ملازمت آگرہ سے کان پور چلا گیا۔ کان پور میں ناسخ، نواب امین الدولہ مہر کے یہاں بطور مہمان قیام پذیر اور جلاوطنی کے دن کاٹ رہے تھے۔

کان پور پہنچنے کے بعد نواب نظام الدولہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ناسخ کے پاس لے گئے۔ ناسخ کو دیکھ کر منیر کا مایوس ہونا لازمی تھا۔ گھٹا ہوا سر، قدرے سیاہ رنگ، کسرتی بدن۔ یہ تھے ناسخ جو شاعر سے زیادہ پہلوان معلوم ہو رہے تھے۔ اگر منیر نے ان کا کلام نہ پڑھا ہوتا۔ قواعد و لغت میں ان کے کارنامے اس کے کانوں میں نہ پڑے ہوتے، ہندوستان بھر میں ان کی شہرت کے چرچے نہ سنے ہوتے تو شاید انہیں دیکھتے ہی واپس ہو گیا ہوتا۔

اصلاحِ زبان اور صحت الفاظ ناسخ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اس وقت بھی وہ کسی لفظ کی اصل پیدائش اور مختلف معنی سے بحث کر رہے تھے۔ منیر خاموشی سے اس گفتگو کو سنتا رہا اور ان کے علم کا قائل ہوتا رہا۔ جب احباب رخصت ہو گئے تو نواب نظام الدولہ نے ان سے منیر کا تعارف کرایا اور اصلاح شعر کے لیے سفارش کی۔ ناسخ اتنی آسانی سے کسی کو شاگرد نہیں بناتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ہچکچا رہے تھے۔ منیر کی کم سنی بھی پیشِ نظر تھی۔ ناسخ نے منیر کو آزمانے کے لیے لسانی و تنقیدی بحث چھیڑ دی۔ منیر کو بھی

تحقیق لفظی کا بہت شوق تھا۔ اپنی عمر سے زیادہ مطالعہ بھی کر چکا تھا۔ اس نے اس انداز سے گفتگو کی اور اساتذہ کے اشعار اس کثرت سے پیش کیے کہ ناسخ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ غزلیں سنیں تو اور بھی محظوظ ہوئے۔ نظام الدولہ کی سفارش بھی پیش نظر تھی۔ منیر کو حلقہ شاگردی میں لے لیا۔

ناسخ کی صحبتوں کا اثر تھا کہ وہ ابتدا ہی میں تحصیل فن اور تحقیق مسائل کی راہ پر چل نکلا۔ اس نے ان تمام روایات کو اپنا لیا جو متروکات، لفظی صناعی اور فصاحت و بلاغت کے اصولوں کی شکل میں ناسخ کے زیر اثر قائم ہو چکی تھیں۔

ایسے مشاعرے بھی تواتر سے منعقد ہوتے تھے جو صرف اعتراضات کے لیے مقرر تھے۔ کوئی شاعر اپنا کلام پیش کرتا تھا اور دوسرے لوگ اعتراضات کرتے تھے۔ یہ نکتہ چینی بیشتر زبان و بیان کے نکات سے متعلق ہوتی تھی۔ منیر ان مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگا۔ یہ مشاعرے اس کے رنگ طبیعت پر اثر انداز ہوئے اور اس کا کلام ناسخ کے رنگ کلام میں ڈوبتا چلا گیا۔ ناسخ کی خارجیت، لفظی صنعت گری، رعایت لفظی، مرصع کاری سب کچھ اس کے کلام کا حصہ بن گیا۔ استاد کی ایسی پیروی کسی اور شاگرد کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ استاد ناسخ کو بھی اس کا احساس تھا وہ اکثر یہ رائے دیا کرتے تھے کہ ایسا ذہین اور فہم رسا کا مالک کوئی اور شاگردان کے شاگردوں میں نہیں۔

یہ سلسلہ یونہی رواں دواں تھا۔ شاعری کی محفلیں آباد تھیں۔ نظام الدولہ کی عنایات سے قدرے آرام و سکون سے گزر رہی تھی۔ منیر کو کسی مالی پریشانی کا سامنا نہیں تھا کہ وہ معاملات حل ہو گئے جن کی وجہ سے ناسخ کو لکھنو چھوڑنا پڑا تھا لہٰذا اب وہ کان پور میں نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر لکھنو جانے کی ٹھانی۔

''استاد مجھے کس پر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔''

''میں تمہارا ہاتھ علی اوسط رشک کے ہاتھوں دے کر جاؤں گا۔ وہ تمہاری تربیت کریں گے۔''

منیر ان کے ساتھ لکھنو چلا جاتا لیکن وہاں جاتا تو کھاتا کیا۔ کان پور میں نظام الدولہ کا سہارا تھا۔ ان کی مصاحبت سے نکل کر کہاں جاتا۔ مجبوراً جناب رشک کے دامن استادی سے وابستہ ہو گیا۔

دیا استاد ناسخ سا شہنشاہ
کہ جس کا سکہ ہے ماہی سے تاماہ
اسی سے اختر اقبال اردو
ثریا سے ہوا پہلو بہ پہلو
اٹھا جب میرے سر سے ان کا سایہ
جناب رشک سے پھر فیض پایا

سید علی اوسط رشک نے اس کی اس طرح تربیت کی کہ حق استادی ادا کر دیا۔ منیر کو بھی ان پر فخر تھا اور سمجھتا تھا کہ ناسخ کا نعم البدل اسے مل گیا۔

فخر جناب شیخ ہوئے رشک اے منیر
ترجیح ہو سکی مرے استاد پر کسے

......

یکتائے عصر و عالم و فاضل جناب رشک
علامہ و محقق کامل جناب رشک
استادِ شاعرانِ جہاں سید جلیل
محتاط و عابد و متوکلِ جناب رشک
اردو لغات و قاعدہ فن شاعری
طے کر چکے تمام منازل جناب رشک

منیر کو کان پور میں رہتے ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ اس تمام عرصے میں کئی واقعات رونما ہوئے۔ شکوہ آباد میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوا۔

کان پور کے قیام کے چھٹے سال میں اس کے بڑے بھائی سید اولاد حسین کا انتقال ہو گیا۔ بھائی کے انتقال نے اسے بالکل ہی توڑ دیا۔ منیر نے قطعہ تاریخ لکھا۔

میرے بھائی متقی و فاضل اولاد حسین
واصلِ حق ہو گئے وہ صاحب ادراک ہائے
پیشوائے عارفاں و مقتدائے زاہداں
چھپ گیا وہ نور بارے آج زیرِ خاک ہائے
قبلہ و کعبہ کے شاگرد اور دریائے علوم
سید دیندار آل صاحب لولاک ہائے
جس کے سر سے باغ عالم میں اٹھے ایسا بزرگ
کیوں نہ ڈالے مثل صرصر اپنے سر پہ خاک ہائے
مصرعہ تاریخ رحلت میں نے پایا اے منیر
آج ڈوبا آفتاب علم و شرع پاک ہائے

(1256ھ)

نواب نظام الدولہ کی مصاحبت میں قدرے سکون سے بسر ہو رہی تھی لیکن اس کے اخراجات، آمدنی سے زیادہ تھے۔ وہ قرض لے لے کر اپنی ضروریات کو پوری کرتا رہا لیکن قرض کا بار اتنا بڑھ گیا کہ اب کان پور میں اس کا رہنا دوبھر ہو گیا۔ قرض اتارنے کی فکر ہوئی۔ پڑوس میں لکھنو آباد تھا۔ قدر داں موجود تھے۔ دولت کا دریا بہہ رہا تھا۔ وہ کان پور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن ''حوادث گوناگوں'' سے مجبور ہو گیا۔

اس وقت اس کی عمر چوبیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ زمانہ محمد علی شاہ کا دور آخر تھا۔ ان کے حسنِ انتظام کا نتیجہ تھا کہ فارغ البالی اور آسودہ حالی عام تھی۔ شعر و شاعری کی محفلیں عام تھیں۔ امرا کے دستر خوان کشادہ تھے۔ رقص و سرور کے جلسے عام تھے۔ طوائفیں تھیں عیش و نشاط سے بھرپور زندگی تھی۔ ایک نوجوان آدمی کے لیے جو شاعر بھی ہو یہ بستی جنت سے کم نہیں تھی۔ وہ یہاں پہنچا۔ نظارے آنکھوں میں اترے تو بے اختیار کہہ اٹھا۔

پیشِ نظر آج گلستان لکھنو
ہر ایک سمت نور کا جلوہ ہے دیکھ لو
جلسے مشاعروں کے ہیں یاروں کی صحبتیں
ہر ایک فنِ شعر میں یکتا ہے دیکھ لو
پریوں کی دید ہے سرِ بازار رات دن
ہر کوچہ طلسم کا میلہ ہے دیکھ لو
کس طرح حال حشمت سلطاں بیان ہو
بس قدرت خدا کا تماشا ہے دیکھ لو
فیاض ہیں تمام امیر اس دیار کے
گھر گھر میں رقص و عیش کا جلسہ ہے دیکھ لو
اس شہر کو میں کیوں نہ کہوں جنت نعیم
اس کا نظیر ہند میں عنقا ہے دیکھ لو

یہ ایک فوری تاثر تھا جو اس کے قلم سے کاغذ پر ابھر آیا تھا۔ یہ تاثر اس عہد کے لکھنو کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔

وہ تو اس امید پر یہاں چلا آیا تھا کہ دریا اس کی پیاس بجھا دے گا۔ یہاں کے عیش میں کچھ حصہ اس کا بھی ہو گا۔ اتنے دروازے ہیں کوئی دروازہ اس پر بھی کھلے گا لیکن اب وہ دیکھ رہا تھا کہ بارش ہو رہی ہے لیکن اس کے بدن سے بچ بچ کر ہو رہی ہے۔ قدر دان بہت ہیں لیکن قدر کے لائق بھی ہزاروں ہیں۔ اہلِ کمال اتنے ہیں کہ ان کے درمیان اپنی جگہ بنانا معمولی بات نہیں۔ مالی مشکلات ہی تو تھیں جو اسے کان پور سے بھگا کر لکھنو لے آئی تھیں اور اب لکھنو بھی اس سے آنکھیں پھیر رہا تھا۔ اب مالی پریشانی محض پریشانی نہیں رہی تھی۔ عسرت میں داخل ہونے لگی تھی۔ ہر دروازہ کھٹ کھٹایا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے استاد علی اوسط رشک کو پکارا۔ خط لکھا اور کان پور کی طرف روانہ کر دیا۔

انہوں نے دست گیری کی اور ظفر الدولہ نواب علی اصغر خان بہادر کے زمرۂ ملازمین میں داخل کرا دیا۔

نواب علی اصغر خان بہادر، وزیر ابوظفر بہادر شاہ مولوی علی اکبر کے فرزند اور خواجہ حیدر علی آتش کے تلامذہ میں تھے۔ لکھنو میں دو قابلِ ذکر اساتذہ تھے ناسخ اور آتش، دونوں کا طرز سخن جدا تھا۔ ایک خارجیت کا علم بردار تھا تو دوسرا داخلیت کا۔ منیر ناسخ کا شاگرد رہ چکا تھا۔ جب کہ نواب صاحب آتش کے حلقہ تلامذہ میں تھے۔ دونوں کے انداز جدا تھے لیکن منیر کو لفظی بازی گری پر جو عبور حاصل تھا نواب صاحب اس کے عاشق ہو گئے۔ انہوں نے ایسی قدر دانی کی کہ وہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو گیا۔

منتظر ہیں ظفر الدولہ علی اصغر خاں
جلد حاضر ہو کر حاصل ہو صلہ خدمت کا
باادب ناصیہ فرسا ہو بجا لا تسلیم
سرمہ آنکھوں میں لگا خاک درِ دولت کا
رنگ دینا ہے طلائی تری فیاضی سے
دل میں مفلس کے اثر بھی نہ رہا حسرت کا
تیرے باعث سے ضعیفوں کے ارادے ہیں قوی
قد خم گشتہ ہے تیغا کمر ہمت کا
ایک ہیں شاہ و گدا واہ رے اخلاق عمیم
نام لیتے نہیں بھولے سے کبھی نخوت کا
علم میں فضل میں دنیا کے کمالوں میں طاق
ہر گھڑی اہل ہنر سے ہے مزا صحبت کا

اہلِ لکھنو میں اہلِ کمال وہ سمجھا جاتا تھا جو کسی سرکار سے وابستہ ہو۔ جتنی بڑی سرکار اتنا بڑا شاعر۔ وہ بادشاہ کے دربار سے وابستہ نہیں تھا لیکن نواب علی اصغر خان بھی خاندانی وجاہت میں کچھ کم نہ تھے۔ ان کی سرکار سے وابستگی نے اس کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ لکھنو میں ہونے والے مشاعرے اس کی موجودگی سے جگمگانے لگے۔ لکھنو پر ہی منحصر نہیں کان پور، مرشد آباد اور نزدیک و دور کے دوسرے شہروں کے مشاعروں میں بھی اسے بلایا جانے لگا۔ اس کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کا کلام بھی قابلِ توجہ ہونے لگا۔

اسے لکھنو میں رہتے ہوئے ابھی ایک سال گزرا تھا کہ اس پر کلکتہ جانے کی دھن سوار ہوئی۔ کلکتہ میں اردو گو شعرا کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اتنی تعداد ہو گئی تھی کہ کلکتہ ایک دبستان کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اردو کی اس گرم بازاری نے بیرونی شعرا کی اہمیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اسی صورتِ حال

نے اسے بھی اکسایا کہ وہ کلکتہ چلا جائے۔ اس سفر میں یہ نیت یقیناً پوشیدہ تھی کہ کسی قدر دان کی تلاش کی جائے۔ وہ یہ بھی سن چکا تھا کہ غالب اپنی پینشن کی بحالی کے سلسلے میں کلکتہ گئے تھے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

غالب کی زبانی کلکتہ کے حسن نسوانی کا قصیدہ بھی سن چکا تھا۔ کلکتہ میں رائج مغربی بود و باش کے تذکرے سنتا رہا تھا۔ آنے جانے والے مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ جو بھی کلکتہ ہو آیا تھا، یہ ضرور بیان کرتا تھا کہ وہاں انگریز عورتیں بے پردہ بگھیوں میں سوار ہو کر سیر کے لیے نکلتی ہیں۔ ان سب باتوں نے اسے آمادہ کیا کہ وہ کلکتہ جائے۔ کوئی سفارش نہیں تھی وہاں کوئی آشنا نہیں تھا۔ معمولی سا زاد راہ تھا کہ ساتھ تھا۔ اسی کے سہارے نکل کھڑے ہوئے۔ پیسے بچانے کے لیے ڈاک کی پالکی میں سوار ہو گئے۔ اس زمانے میں ڈاک، پالکی کے ذریعے بھیجی جاتی تھی جس کو مزدور کندھوں پر اٹھا کر چلتے تھے۔ دو مزدور پالکی کے آگے اور دو پیچھے ہوتے تھے۔ چار چھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ مزدور تبدیل ہو جاتے تھے اور ان کی جگہ تازہ دم نئے مزدور لے لیتے تھے۔ ان مزدوروں کی رفتار چار میل فی گھنٹا سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

وہ یہ سوچ کر ڈاک پالکی میں بیٹھا تھا کہ سفر پیدل کا ہے۔ دنوں کا فاصلہ ہفتوں میں طے ہوگا لیکن پالکی کی خلوت میں فکر سخن کرتا غزلیں کہتا چلا جاؤں گا۔

وہ جیسے ہی لکھنو کی حدود سے باہر نکلا اس نے قلم کو رہنما بنایا۔ قافیے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ مطلع زبان پر آیا۔

جینا خلاف وضع بسانِ ممات ہے
اے خضر! آرزو مجھے آبِ حیات ہے

اس شعر میں اپنی عزت نفس کا خیال اور زندگی کی دشواریوں کی طرف واضح اشارہ موجود تھا۔ اس نے نہایت سرشاری کے عالم میں یہ غزل مکمل کی اور مقطع تک پہنچ گیا۔

کلکتہ کو میں ڈاک میں جاتا ہوں اے منیر
فکر غزل ہے راہ میں کیا خوب بات ہے

ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اسے اپنی بغل میں کچھ تکلیف محسوس ہوئی۔ دیکھا تو ایک دانہ سا نظر آیا۔ اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ توجہ دیتا بھی تو کیا ہوتا یہاں کون سا حکیم یا جراح تھا جسے وہ دکھا سکتا۔ آنکھیں بند کر کے پڑا رہا کہ اب تو جو بھی ہوگا کلکتہ پہنچ کر ہی ہوگا۔ یہ دانہ بڑھتا گیا اور پھوڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ پالکی اٹھانے والے مزدور چل نہیں رہے تھے۔ دوڑ رہے تھے۔ انہیں جلد از جلد مسافت طے کرنی تھی۔ ان کے چلنے سے جو ہچکولے لگ رہے تھے ان سے پھوڑے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ باہر نکل کر ان مزدوروں سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آہستہ چلیں۔ وہ سخت اذیت میں یہ سفر طے کرتا رہا۔

کلکتہ کو ڈاک میں چلا ہوں جو میں آہ
غیروں کے پاؤں سے قطع ہوئی یہ راہ
ہیں تیز کہار پالکی میں ہوں سوار
کیا خانہ بدوش میں چلا ہوں واللہ

......

پھوڑے نے سفر میں سخت گھبرایا ہے
کلکتہ کی راہ میں یہ دکھ پایا ہے
کیا دردِ کنار نے ستایا ہے منیر
یہ گرگ بغل راہ میں ہاتھ آیا ہے

یہ سفر اتنا طویل ہو گیا تھا کہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ کلکتہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ آنکھیں موندے پڑا تھا کہ اس کے کانوں میں آوازیں آئیں کلکتہ آگیا۔ اس نے اپنی تکلیف بھول کر باہر جھانکا پھر باہر نکل آیا۔ لکھنو سے مختلف ہندوستان پوری حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے دامن پسارے کھڑا تھا۔ وہ کبھی آسمان کی طرف دیکھتا تھا کبھی آسمان پر نظریں جما دیتا تھا۔ شہر تھا کہ کوئی بے نقاب حسینہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بے پردہ انگریز حسینائیں بگھیوں میں سوار چلی جا رہی تھیں۔ ایک گھوڑا گاڑی اس کے قریب بھی آکر رک گئی۔

"شاب کہاں زائے گا؟"

وہ حیران تھا کہ اس فقرے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے پھر اس نے ترجمہ کر لیا۔ کہنے والا اس سے کہہ رہا تھا۔ "صاحب کہاں جاؤ گے۔" یا اللہ اردو کا یہ کون سا انداز ہے۔ کیا مجھے یہاں رہنا ہوگا اور یہ زبان سننے کو ملے گی؟ غالب آئے ہوں گے تو انہوں نے بھی تو یہی زبان سنی ہوگی۔ جب انہوں نے برداشت کر لیا تو میں کیوں نہیں۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس فقرے میں الجھ کر وہ ان فرنگی عورتوں کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا جو خوشبو کے جھونکے کی طرح اس کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ گاڑی بان نے پھر پکارا۔

"شاب کہاں زائے گا۔"

"کسی سرائے میں لے چلو جہاں میں رہ سکوں اور اپنا سامان رکھ سکوں۔"

گاڑی بان نے اثبات میں گردن ہلائی اور دانت نکال کر ہنسنے لگا جیسے کہہ رہا ہو میں سمجھ گیا۔

اس کی عجیب حالت تھی۔ کپڑے میلے ہو گئے تھے۔ بغل کا پھوڑا از حد تکلیف دے رہا تھا۔ اسی حالت میں وہ سرائے تک پہنچا۔ گاڑی بان نے سامان اتار کر سرائے میں پہنچا دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کبھی میر تقی میر لکھنو آئے ہوں گے تو اسی طرح کسی سرائے میں ٹھہرے ہوں گے۔

وہ سرائے کے مالک سے ملا تو اس کی زباندانی کو ایک مرتبہ پھر جھٹکا لگا۔ وہ بھی اسی طرح کی اردو بول رہا تھا جیسی اردو سرائے کا مالک بولتا چلا آیا تھا۔ میر تقی میر کو کم از کم اس اذیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ اذیت کے لفظ پر اسے اپنی بغل کا پھوڑا یاد آگیا۔ اس نے اپنی تکلیف کا ذکر سرائے کے مالک سے کیا۔ اس نے تسلی دی اور ایک جراح کو بلا لیا۔ جراح نے پھوڑا دیکھا نشتر لگا کر مواد نکال دیا اور پٹی کر دی۔ تب جا کر کہیں آرام آیا۔

جراح کے سامنے جو کھولا پھوڑا
میزانِ نظر میں اس نے تولا پھوڑا
پھوڑے کی جگہ بغل میں دیکھی جو منیر
سب کہنے لگے دل کا پھپولا پھوڑا

اس دوا دارو میں دو تین دن لگ گئے۔ اس عرصے میں کسی کو معلوم ہو گیا کہ لکھنو سے کوئی شاعر آیا ہے اور فلاں سرائے میں ٹھہرا ہے۔ کلکتہ میں دو شاعروں کے رنگ سخن کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ایک طرف ناسخ کے چاہنے والے تھے دوسری طرف آتش کے قدر دان۔ ناسخ کے کئی مشاعرے ایسے بھی تھے جو ناسخ کی شاگردی کے دعویدار تھے۔ لکھنو جا کر ناسخ کی شاگردی اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے جو سنا کہ آنے والے شاعر کا نام منیر شکوہ آبادی ہے اور وہ ناسخ کا شاگرد رہ چکا ہے تو ملنے کا اشتیاق ہوا۔

اس رات کی صبح نہیں ہوئی تھی کہ کلکتہ کے شعرا اس سے ملنے کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ لکھنو کی باتیں ہوتی رہیں۔ ناسخ مرحوم کا تذکرہ نکل آیا۔ کسی نے آتش کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ شاگرد تو ناسخ کا ہے لیکن آتش کا نام بھی عقیدت سے لے رہا ہے بلکہ معترضین کے اعتراضات میں آتش کا دفاع بھی کر رہا ہے۔ یہ اس کی شرافت نفس نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ شخص علم کا شیدائی ہے۔

یہ لوگ رخصت ہوئے ہی تھے اور وہ آرام کرنے کے لیے لیٹا تھا کہ ایک صاحب اس سے ملاقات کے لیے آ گئے۔ اس کے تصور نے تاڑ لیا تھا کہ وہ شاعر نہیں ہو سکتے۔ پھر میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

"میں صدر الصدور ہوں۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ میں اس قابل ہوا۔"

"شرمندہ تو میں ہوں کہ آپ کے پائے کا شاعر اس سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"یہاں مجھے ہر طرح کا آرام ہے۔"

"آپ سے ایک درخواست ہے۔"

"حکم کیجیے۔"

"میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ جب تک آپ کلکتہ میں ہیں میرے گھر قیام کیجیے۔"

یہ تو آپ کے لیے زحمت کا باعث ہوگا۔ میں شاعر ہوں۔ میری شہرت ہوئی تو لوگ مجھ سے ملنے بھی آئیں گے۔ آپ کی خلوت میں فرق پڑے گا۔"

"میں شاعر تو نہیں ہوں لیکن شاعر نواز ضرور ہوں۔ شعراء کی آمد و رفت تو یوں بھی میرے گھر میں رہتی ہیں۔ آپ تشریف لے چلیں گے تو ستاروں میں چاند نکل آئے گا۔"

انہوں نے اتنی محبت سے کہا اور اتنا مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔

ان کی پر شکوہ کوٹھی دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے وہ لکھنو میں ہے اور کسی نواب کی مصاحبت میں آ گیا ہے۔ ایک آرام دہ کمرے میں اس کا سامان رکھ دیا گیا۔

"آپ آرام فرمایئے۔ میرا ملازم وقفے وقفے سے آ کر آپ کو دیکھ جایا کرے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرما دیجیے گا۔" کئی دن بعد اسے آرام دہ بستر ملا تھا۔ آرام کرنے لیٹا تھا کہ ایسی نیند آئی کہ شام کی خبر لی۔

لان میں کرسیاں بچھ گئی تھیں۔ صدر الصدور بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ملازم اسے بلانے گیا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لان میں پہنچ گیا۔ وہ یہ دیکھے اور چونکے بغیر نہ رہ سکا کہ میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس رکھے ہوئے ہیں۔

"بھئی آپ شاعر ہیں، نوجوان ہیں یہ شغل ضرور کرتے ہوں گے لہٰذا میں نے اہتمام کر لیا ہے۔"

''معاف کیجیے گا میں اس سے دور ہوں۔ آپ نے مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔''

''کمال ہے! اگر آپ تکلف نہیں کر رہے تو کمال ہے۔'' انہوں نے اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے حصے کی بھی ہمیں پینا پڑے گی۔''

''ضرور آپ شوق سے یہ شوق پورا کیجیے۔''

ملازم نے اس کے لیے کوئی شربت لا کر رکھ دیا اور صدر الصدور صاحب شراب سے شغل فرمانے لگے۔ جب ذرا نشہ چڑھا تو کلام کی فرمائش ہوئی۔ منیر کو یہ فرمائش شاق گزری تھی۔ موصوف نہ تو شاعر ہیں نہ عالم فاضل ان کے سامنے کلام سنانا کلام کی بے توقیری ہے۔ صاف انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ میزبان تھے۔ کچھ نہیں تو اس کے قدر دان تو تھے۔ اس نے بے دلی سے کسی غزل کا مطلع پڑھا پھر باقی اشعار کی طرف آیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ صدر الصدور صاحب شاعر نہیں لیکن زبان کے پارکھ ہیں۔ شعر کی فہم خوب رکھتے ہیں۔ لفظ پکڑ پکڑ کر داد دے رہے ہیں۔ جو شعر کمزور ہے اس پر خاموش بھی رہتے ہیں۔

غزل ختم ہوئی تو خود اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کچھ اور سنائے۔ سامع اچھا ہو تو شاعر کا دل لگتا ہے۔ اس نے ایک غزل اور پڑھی۔ دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

''منیر صاحب ہم نے سوچا ہے آپ کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ یہاں کے شاعروں کو معلوم تو ہو شاعری کیا چیز ہوتی ہے۔''

''میں بھی اس کے حق میں ہوں۔ اس طرح شعرا سے میرا تعارف بھی ہو جائے گا۔''

صدر الصدور نے دعوت نامے جاری کر دیے۔ مصرعۂ طرح دے دیا گیا۔ منیر نے بھی اس ''طرح'' میں غزل تیار کر لی۔ مشاعرے کی شب آئی تو وہ کلکتہ کے ادبی ذوق کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مشاعرہ گاہ سامعین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کلکتہ کے شعرا پرے جمائے بیٹھے تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ مقامی شعرا دادِ سخن بٹورتے رہے۔ پھر اس کا نام پکارا گیا۔ مشاعرے میں جیسے زندگی آ گئی ہر آنکھ اس کی منتظر تھی ہر چہرہ اس کا شیدائی تھا۔ کلام پڑھنے سے پہلے ہی ''واہ واہ'' کا شور بلند ہو گیا۔ وہ غزل سرا ہوا۔

پلکیں رخ گلگوں سے تماشا نظر آیا

آئینہ انہیں پھولوں کا دونا نظر آیا

خوبی میں دوبالا وہ سراپا نظر آیا

پر نور بدن پیکر جوزا نظر آیا

نیرنگی حیرت سے رواں رہتے ہیں آنسو

تصویر کا دریا ہمیں بہتا نظر آیا

خلعت مجھے وحشت نے دیا وسعت دل کا

جامہ میں مرے دامنِ صحرا نظر آیا

اس بت کے نہانے سے ہوا صاف یہ پانی

موتی بھی صدف میں تہ دریا نظر آیا

شمعیں جو بجھیں بزم طلسمات کو دیکھا

آنکھیں جو ہوئیں بند تو کیا کیا نظر آیا

مل مل گئے ہیں خاک میں لاکھوں دل روشن

ہر ذرہ مجھے عرش کا تارا نظر آیا

کلکتہ میں ہر دم ہے منیر آپ کو وحشت

ہر کوٹھی میں ہر بنگلے میں جنگلا نظر آیا

اس مشاعرے کی دیر تھی کہ جگہ جگہ مشاعرے ہونے لگے۔ طرحی مشاعروں کا عہد تھا۔ وہ ہر مشاعرے کے لیے نئی غزل کہتا رہا اور اپنی دھاک بٹھاتا رہا۔

قیام کلکتہ کے دوران میں اسے مغربی طرز بود و باش کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ طور طریقے لکھنو سے بالکل مختلف تھے۔ وہ انہیں دیکھتا بھی رہا اور اپنے کلام میں سموتا بھی رہا۔

ہوا کھاتے پھرا کرتے ہیں صبح و شام بگھی میں

لگایا ہے بتوں نے ابلق ایام بگھی میں

جسے ٹھنڈی سڑک پر دیکھتے ہی ہوش جاتے ہیں

شراب بے خودی کے چل رہے ہیں جام بگھی میں

ان سب دل فریبیوں، دلچسپیوں اور قدر دانیوں کے باوجود کلکتہ میں اس کا جی نہیں لگا۔

محروم ہوں میں خدمت استاد سے منیر

کلکتہ مجھ کو گور سے بھی تنگ ہو گیا

قدر دانوں نے بہت روکا لیکن اس کا دل اکھڑ گیا۔ اسے لکھنو یاد آ رہا تھا۔ استاد اوسط علی رشک یاد آ رہے تھے جن کی خدمت سے وہ محروم ہو گیا تھا۔ اس نے پائے سفر اٹھایا اور لکھنو کی راہ لی۔

رہے کلکتہ میں بے خبر منیر

صدقے اپنے امام ضامن کے

لکھنو پہنچا تو جیسے جان میں جان آ گئی۔ حسینانِ کلکتہ یاد آتے تھے لیکن لکھنو تو لکھنو تھا۔

اب وہ ایسا گمنام نہیں رہا تھا کہ ملازمت کے لیے

دروازے کھٹ کھٹانے پڑتے۔ تھکن کی دھوپ اتری ہی تھی کہ وزیر اودھ کے فرزند نواب معین الدولہ ظفر جنگ باقر علی خاں کی طلبی آ گئی۔ وہ اپنی مصاحبت میں اسے کان پور لے جانا چاہتے تھے۔ اسے جانے میں عار نہیں تھا لیکن قرض خواہوں کا خوف غالب تھا۔ وہ ابھی تک قرض نہیں اتار سکا تھا پھر کس منہ سے کان پور جاتا۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ کے ساتھ کان پور جانا میری خوش قسمتی ہو گی لیکن وہاں کی زمین مجھ پر تنگ ہے فلک دشمن ہے اور میں اس دشمنی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔''

''ہم سمجھے نہیں۔''

''آپ کی فہم پر مجھے ناز ہے دراصل مجھے ہی سمجھانا نہ آیا۔ میری فضول خرچیوں نے میری بساط سے زیادہ قرض مجھ پر چڑھا دیا ہے۔ میں اس قرض کو اتارنے کے لیے اپنے دو دواین فروخت کر چکا۔ ایک مثنوی بھی کسی کے ہاتھ فروخت کر دی لیکن قرض اتارتا تو کھاتا کیا۔ زندگی بھر کا سرمایہ بھی گیا اور قرض جوں کا توں ہے کان پور گیا تو قرض خواہ میری جان کو آ جائیں گے۔''

''اگر یہ قرض اتر جائے۔''

''کان پور لکھنو کے بعد میرا دوسرا ٹھکانا ہے۔''

''تم کان پور چلو جس کا جو کچھ ہے وہ ہم اتاریں گے۔''

ایک مرتبہ پھر اس کی قسمت نے یاوری کی۔ وہ نواب باقر علی خاں کے ہمراہ کان پور چلا گیا۔ نواب صاحب نے اپنے پاس سے اس کا قرض اتار دیا۔ غریب شاعر کے پاس اور کیا تھا۔ اس نے ایک قطعہ لکھ کر نواب صاحب کی نذر کر دیا۔

ظفر جنگ باقر علی خاں امیر

سپہر آسمانِ علوم و عطا

جگر بند دستور شاہِ اودھ

فن شعر و طب میں نہایت رسا

انہوں نے بلایا سوئے کان پور

کیا قرض ہمت سے میرا ادا

مکرر کیا لکھنو سے طلب

مرا نام اہل سخن میں لکھا

کہی میں نے تاریخ اس کی منیر

ادا قرض نواب نے اب کیا

نواب ظفر جنگ نے ایسے مشکل وقت اس کی مدد کی تھی کہ وہ ان کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا چنانچہ جب عید آئی تو اس نے نہایت عمدہ قطعہ لکھ کر ان کی نذر کیا۔

نذر جشن عید لے چل اس سخی کے سامنے

فیض جس کا گلشن ہمت کا طوبیٰ ہو گیا

شاعر معجز بیاں و قدر دانِ شاعراں

شعر جس کا مطلعِ مہ سے دوبالا ہو گیا

آپ نے ایسی بڑھائی قدر ارباب کمال

اختر بخت ہنر کیوں ان سے اونچا ہو گیا

ہے وہ نواب معین الدولہ فیاض جہاں

دست ماتم نقش پا جس کا سراپا ہو گیا

مدح کر اس کی کہ وہ مخدوم خاص و عام ہے

نام اس کا آبرو بخش مسیحا ہو گیا

نواب ظفر جنگ کی دریا دلی نے منیر کو فارغ البال کر دیا تھا۔ ایک طرف اس کے سخن کا چرچا تھا۔ دوسری جانب اس کی خوش حالی تھی۔ حاسدین دشمنی پر کمربستہ ہو گئے۔ اس کے کلام پر بے جا اعتراضات ہونے لگے۔ وہ جواب دیتا۔ دوسری جانب سے بھی جواب آتے۔ وہ ایک تھا، حاسد ہزار تھے۔ یہ سلسلہ ہفتوں چلتا رہا۔ یہ معرکہ آرائیاں اس کی سخن گوئی پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ ایک بحث ختم ہوتی تو لوگ اسے دوسری بحث میں الجھا لیتے۔ وہ تحقیق لفظی کا شائق تھا کسی مروجہ لفظ کو کسی دوسرے انداز میں باندھ دیتا تو کانپور میں جیسے قیامت آ جاتی۔ وہ وضاحتیں دیتا پھرتا۔ اس کی طرف سے نواب صاحب کے کان بھی خوب بھرے جاتے تھے۔ اس سے منسوب کر کے نواب صاحب کی شان میں گستاخیاں کی جانے لگیں تو اسے اپنی ملازمت کی فکر دامن گیر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ کانپور سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ اس کے متین لہجے میں تلخی آ گئی

میں ارزاں بک رہا ہوں اے منیر اس پر نہیں لیتے

مجھے چوری کا مال ارباب دنیا کیا سمجھتے ہیں

کچھ فائدہ تحریر غزل سے نہیں ملتا

خامہ کو سمجھتا ہوں میں بے برگ و ثمر شاخ

اسے مخالفین نے اتنا تنگ کیا کہ وہ اپنے کان پور آنے کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے لگا۔

اوقات کانپور میں ضائع نہ کر منیر

چل لکھنو میں صحبت اہلِ کمال دیکھ

وہ مخالفین سے چومکھی لڑ رہا تھا کہ نواب یوسف علی خاں والی ریاست رام پور نے ازراہِ قدردانی اسے رام پور طلب کیا۔ انہوں نے اپنے خط کے ساتھ مصارف سفر بھی بھیجے۔

نواب یوسف علی خاں نہایت علم دوست، ہنر پرور اور شعرا کے مربی تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور ناظم تخلص کرتے تھے۔ یہ تخلص انہیں غالب نے عطا کیا تھا جن کے وہ شاگرد تھے۔ ان کی سخن نوازی نے ریاست رام پور کو شاعر کدہ بنا دیا تھا۔ جو وہاں گیا انہی کا ہو رہا۔ فکر دنیا سے آزاد ہو گیا لیکن افسوس کہ منیر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اس وقت وہ دشمن کی ریشہ دوانیوں میں ایسا جکڑا ہوا تھا کہ کانپور سے باہر قدم نہیں نکال سکتا تھا۔ اگر وہ اس وقت رام پور چلا جاتا تو ان مصائب سے بچ جاتا جو بعد میں اسے پیش آئیں۔

اس نے شکریہ کے ساتھ زادِ راہ واپس کر دیا اور خط کے ذریعے ان حالات سے بھی انہیں آگاہ کر دیا جو اسے ان دنوں درپیش تھے۔

اس عرضی کے ساتھ ایک قطعہ بھی کہہ کر روانہ کیا۔

شقہ بھی زادِ راہ بھی بھیجا حضور نے
حکم طلب سے باغ تمنا ہرا ہوا
معذور طوف کعبۂ مقصد سے ہوں مگر
ان روزوں سنگ راہ بڑا حادثہ ہوا
ناچار پھیرتا ہوں عطیہ حضور کا
عرضی میں حال ہے یہ مفصل لکھا ہوا
ہو میری یاد بعد محرم تو خوب ہے
اس وقت مرحمت ہو جو کچھ اب عطا ہوا
دربار میں منیر غزل خوانیاں کرے
طوطی حضور مول لیں یہ بولتا ہوا

اب اس کے پاس لکھنؤ کی یادوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔

غم خانہ کان پور اگر ہے تو ہو منیر
صد شکر لکھنؤ تو ہے دولت سرائے عیش

لکھنؤ دولت سرائے عیش ضرور تھا لیکن وہ اس سے دور تھا۔ وہ برابر کوشش کرتا رہا تھا کہ اسے لکھنؤ میں کوئی مضبوط سہارا مل جائے اور وہ لکھنؤ چلا جائے۔ اب اس کے حاسد بھی جی سے چاہنے لگے تھے کہ وہ کانپور چھوڑ دے۔

اس کی آرزو بر آئی۔ نواب اسد الدولہ سید محمد ذکی نے اپنے کلام پر اصلاح کے لیے اسے لکھنؤ طلب کیا۔ اسے زیادہ تنخواہ کی اُمید نہیں تھی لیکن کانپور سے نکلنے کی خوشی تھی۔ اس نے رختِ سفر باندھ لیا۔ نواب معین الدولہ سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے بھی اس کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے اجازت دے دی۔ وہ یہ کہتا ہوا کانپور سے چل دیا۔

”بارے دعا قبول کی پروردگار نے“

نواب سید ذکی، منیر کی دل سے عزت کرتے تھے۔ منیر بھی ان کی عنایات کا دل سے قائل تھا۔ لکھنؤ کی رنگینیاں اسے نصیب سے ایک مرتبہ پھر میسر آگئی تھیں۔

☆......☆

منیر شکوہ آبادی کو انیسویں صدی کا جو زمانہ ملا اس میں استادی شاگردی کے تعلق کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ کسی استاد کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاتا تھا کہ اس کے شاگردوں کی تعداد کتنی ہے۔ اسی طرح جب کوئی شاعر شاعری کا دعویٰ کرتا تھا تو اس سے یہ معلوم کیا جاتا تھا کہ وہ شاگرد کس کا ہے۔ استاد کے بغیر یہ تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا کہ کوئی شاعری کر سکتا ہے۔ بے استاد پر ہمیشہ انگلیاں اٹھتی تھیں۔ کسی شاعر کو اپنا لوہا منوانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شاگرد بنائے۔

منیر اس روایت پر عمل پیرا تھا۔ وہ جہاں بھی گیا شاگردوں کا ایک دبستان قائم کر دیا۔ اس کے فیض تربیت سے ہزاروں کی تربیت ہوئی۔ جس شہر میں جاتا نوآموز شعرا اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے۔ مشاعروں کی محفلیں جمنے لگتیں۔ دوغزلے سہ غزلے پڑھے جانے لگتے۔ بہت سے ایسے شعرا جو صاحبِ دیوان تھے اس کے حلقہ تلامذہ میں محض اس لیے شامل ہو جاتے کہ اس کے سبب سے ان کا تعلق ناسخ سے قائم ہو جائے گا کیوں کہ وہ ناسخ کا شاگرد رہ چکا تھا۔

منیر چونکہ ایک شہر میں ٹک کر نہیں بیٹھا۔ ہمیشہ سفر میں رہا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ وہ جس شہر میں گیا لوگ اس کے شاگرد ہوئے۔ جہاں بھی چند روز قیام کیا اس شہر کو ادبی مرکز بنا دیا۔

اصلاح کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ اپنی طرف سے غزل پر اصلاح کر کے غزل واپس کر دی جائے بلکہ وہ فنی نکات بھی سمجھاتا تھا جس کی وجہ سے اصلاح ضروری ہوئی۔ کوئی لفظ بدلا گیا تو کیوں بدلا گیا۔ یہ بتانا ضروری تھا اگر کوئی شاگرد ان اعتراضات پر بحث کرتا تو وہ یہ سوچ کر ناک بھوں نہیں چڑھاتا کہ شاگرد ہو کر بحث کرتا ہے بلکہ پوری توجہ سے اس کی غلط فہمی کو دور کرتا۔

☆......☆

لکھنؤ کی بہاریں لوٹتے ہوئے اسے ایک سال ہو چکا تھا لیکن وہ طبعاً ایسا نہیں تھا کہ ایک جگہ کا ہو کر رہ جائے۔ کبھی مرشد آباد کی طرف نکل جاتا کبھی الٰہ آباد میں دیکھا جاتا۔ کبھی کان پور میں ہے تو کبھی کلکتہ میں۔ لکھنؤ سے وابستگی ایسی تھی کہ گھوم پھر کر لکھنؤ آ جاتا۔ یہاں اس کے محبوب بھی تھے اور قدردان بھی۔ اس معاشرے میں طوائف کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ارباب نشاط سے ربط وضبط معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی کئی زلفوں کا اسیر تھا۔ عیش و نشاط کی بھی محفلیں اسے لکھنؤ میں رہنے پر مجبور کرتی تھیں۔

آفت کے ہیں بتانِ فرنگی محل منیر
باتیں دمِ مسیح چلیپا ہے دامِ زلف
تڑپ رہا ہے منیر آج وہ کرے پامال
کئی برس ہوئے دیکھا نہیں ہے جس کا رقص
لکھنؤ کے کسی بت کی یہ امانت تھی منیر
فرخ آباد میں دل آپ کا بے جا ٹوٹا

......

لکھنؤ کا مجھ کو سودا ہے منیر
دل حسین آباد پر دیوانہ ہے

اس کا ایک تعلق ریاست فرخ آباد سے بھی تھا۔ خط کتابت ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ جشن نوروز کے موقع پر اس نے ایک قطعہ تہنیت نواب حشمت جنگ تجمل حسین خاں کی خدمت میں بھیجا۔

مرے نواب کے گھر آج ہے نوروز کا جلسہ
فروغِ اختر و دولت خداوندہ ابد تک ہو
بطرز بنیات اے دل کہی تاریخ یوں میں نے
الٰہی جشن کامل رنگ مسعود و مبارک ہو
(1259ھ)

یہ وہی تجمل حسین خاں تھے جن کے لیے غالب نے کہا تھا

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

وہ خود شاعر تھے۔ ظفر تخلص کرتے تھے۔ شعرا کے از حد قدردان تھے۔ انہوں نے ازراہ قدردانی منیر کو فرخ آباد طلب کر لیا۔ منیر نے یہ قطعہ اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ وہ فرخ آباد طلب کر لیا جائے اور لکھنؤ چھوڑ دے لیکن جب بلاوا آ گیا تو تجمل حسین خاں کی قدردانی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ فرخ آباد میں اس کے بعض شاگرد بھی تھے۔ ان کی طرف سے بھی اصرار ہوا لہٰذا وہ بادل نخواستہ لکھنؤ چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا لیکن ان جذبات کے ساتھ۔

چلا ہوں لکھنؤ سے سوئے فرخ آباد آج
ہزاروں حسرتیں رنج و ملال ہیں صدہا

اس نے نہایت دل گرفتگی کے عالم میں محض تجمل حسین خاں کی خوشنودی کے لیے لکھنؤ چھوڑا تھا لیکن فرخ آباد پہنچتے ہی اس کے رنج و غم دور ہو گئے۔ اسے احساس ہو گیا کہ اس نے نہایت صحیح فیصلہ کیا تھا۔ یہاں لکھنؤ کی طرح رنگینیاں تو نہیں تھیں لیکن تجمل حسین خاں نے جس طرح انعام و اکرام کی بارش کی وہ اس کے لیے نہایت غیر متوقع تھی۔ اس نے پہلا ہی قصیدہ پیش کیا تو نواب نے اسے خلقت زریں اور زنجیر طلائی عطا فرمائی اور بے بہا مشاہرہ مقرر کر دیا۔

بسنت کا تہوار آیا تو اس نے ایک مسلسل غزل دربار میں پیش کی۔

کرتا ہے باغ دہر میں نیرنگیاں بسنت
آیا ہے لاکھ رنگ سے اے باغباں بسنت
جوبن پہ ان دنوں ہے بہار نشاط باغ
لیتا ہے پھول بھر کے یہاں جھولیاں بسنت
موباف زرد رنگ ہے سنبل کی چوٹی میں
کھوتا ہے بوئے گل کی پریشانیاں بسنت
نواب نامدار ظفر جنگ کے حضور
گاتی ہے آ کے زہرۂ گردوں مکاں بسنت
جامِ عقیق زرد ہے نرگس کے ہاتھ میں
تقسیم کر رہا ہے مے ارغواں بسنت
کمرے تمام زرد ہیں دولت کے رنگ سے
کوٹھی میں ہو گیا ہے سراپا عیاں بسنت

اس غزل پر بھی ایسا انعام واکرام ملا کہ اس کا دامنِ فقر دولت بے پایاں سے بھر گیا۔ نواب تجمل حسین خاں کو تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ کثرت سے تعمیرات ہو رہی تھیں۔ کہیں نہر تعمیر ہو رہی ہے، کہیں باغ لگوایا جا رہا ہے، کہیں کوئی کوٹھی تعمیر ہو رہی ہے۔ وہ درباری شاعر ہونے کی حیثیت سے ہر تعمیر کے لیے قطعہ تاریخ رقم کرتا تھا۔ تجمل حسین خاں اسے تحائف سے نوازتے رہتے۔ ان تحائف کے جواب میں شکریہ کا قطعہ لکھتا۔ اس کے جواب میں اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جاتا۔ ریاستوں میں امرا اور نواب تو نواب کا منہ

تکتے ہیں۔ جس سے نواب خوش اس سے سب خوش۔ تجمل حسین خاں اس کے شیدائی تھے لہٰذا ہر جگہ اس کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ مشاعروں میں بڑی شان سے بلایا جاتا۔ قلیل مدت میں اس کی شہرت کا ڈنکا فرخ آباد میں بجنے لگا۔ وہاں کے اہل علم اور امرا اس کے شاگرد ہونے لگے۔

فرخ آباد میں اس کی دونوں ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی یہ دور اس کی زندگی کا شاندار دور تھا۔ عزت و مرتبہ میں بھی ان دنوں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔ قدردانی کے پھولوں سے اس کا پیرہن مہک رہا تھا۔ علمی و فنی پیاس بھی سیراب ہو رہی تھی۔ نواب فرخ آباد کے یہاں صاحبان علم کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ دور دور سے علما و شعرا کھنچے چلے آرہے تھے۔ ان صاحبان علم کی موجودگی میں علمی و مذہبی نکات زیر بحث آتے تھے۔ منیر ان سب میں شامل اور اپنا لوہا منوا رہا تھا۔ طبع شاعرانہ کو اپنی جولانی کے لیے وسیع میدان ہاتھ آگیا تھا۔ اس کے تراشے ہوئے گوہر ریزے فرخ آباد کے مشاعروں میں اپنی چمک دکھلا رہے تھے۔ زبانوں پر اس کے اشعار تھے جو گلی کوچوں میں گونج رہے تھے۔ اس کے باوجود لکھنو کی یاد اب بھی اس کے دل میں کانٹا بنی ہوئی تھی۔

لکھنو مجھ سے چھڑایا مری قسمت نے منیر
کردیا بلبلِ شیدا کو چمن سے باہر

تین برس میں منیر کی مالی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اس کی شہرت کو پر لگ گئے۔ آرام و سکون اس کے گھر پر پہرہ دے رہے تھے لیکن فلک کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نواب تجمل حسین خاں کا عین عالم شباب میں جب کہ ان کی عمر صرف چوبیس سال تھی انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے گھر میں بیٹھا فکر سخن میں غلطاں تھا۔ اس رات ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ وہ غزل کہہ چکا تھا اب اس پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شاہی کارندے باہر کھڑے تھے۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ نواب صاحب نے طلب کیا ہے لیکن جو الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے انہیں سن کر اسے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دوبھر ہو گیا۔ ہاتھوں میں غزل لکھا پرچا تھا۔ مٹھی کھل گئی اور پرچا ہوا برد ہو گیا۔

''نواب تجمل حسین خاں انتقال فرما گئے۔''

اس نے گھبرا کر دیوار تھام لی۔ نواب صاحب کی انگلی ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اب وہ دیوار ہی تھام سکتا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے گھر میں گیا ضرور لیکن یوں گھبرا کر نکلا جیسے گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ آگ تو لگ ہی گئی تھی۔ اس کا مربی اس کا سرپرست اس کا سب کچھ رخصت ہو گیا تھا۔ فرخ آباد میں ماتم تھا۔ وہ بھی اس ماتم میں شامل ہو کر مرحوم نواب کے سرہانے پہنچ گیا۔ آج وہ کچھ طلب نہیں کر سکتا تھا آج اسے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔

نواب کی تدفین کے بعد جب ذرا خانۂ غم سے باہر آیا تو وہ آخری مرتبہ نواب سے مخاطب ہوا۔

جہان تیرہ ہوا مثل فرخ آباد آج
ہجومِ یاس سے ہے خانۂ اُمید خراب
ہوئے نہ تھے ابھی چوبیس سال بھی پورے
ہزار حیف یہ موت اور ابتدائے شب
پری کے ساتھ بھی سونا جو جانتا تھا ننگ
عروس مرگ سے افسوس ہو گیا ہم خواب
ہزار حیف وہ ماہِ کمال و ظلمتِ گور
ہزار حیف وہ جسمِ لطیف و فرشِ تراب
منیر نے لکھی تاریخ اس شب غم کی
چھپا زمین میں ہائے آفتاب عالم تاب

دھوپ کی شدت صحن سے گزر کر کمروں تک آگئی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر وہیں کھڑا تھا جہاں لکھنو آنے سے پہلے کھڑا تھا۔ اس کا دستر خوان اس سے چھن گیا تھا۔ اندھیرے میں کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ فیض کا دریا اس سے دور چلا گیا تھا۔ اسے اب یہ دیکھنا تھا کہ نواب کا جانشین اس پر مہربانیوں کے کتنے پھول نچھاور کرتا ہے۔ وہ دل گرفتہ ضرور تھا لیکن فرخ آباد نے اسے اتنا دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ راجا الور اور فرماں رواں دھول پور اسے بار بار خط لکھ رہے تھے کہ ان کے پاس چلا آئے لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔ اس کے شاگرد یہاں تھے۔ اس کی محبت یہاں تھی۔ محبت...... یہ ایک طوائف تھی جو ناچ گانے کے علاوہ علمِ مجلس میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ جب تک اس کے حالات اچھے تھے وہ اس طوائف کو نوازتا رہا تھا۔ اب اس کے ہاتھ خالی تھے۔ ڈرتا تھا کہ اب وہ بھی کہیں عام طوائفوں کی طرح اس سے منہ نہ موڑ لے۔ اس کے مکان پر گئے اسے بہت دن ہو گئے تھے۔ ایک دن ہمت کر کے وہ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ملازموں نے اسے اس وسیع دالان میں بٹھا دیا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ اسے کچھ شک گزرا کہ ملازموں کے انداز اب وہ نہیں ہیں جو ہوا کرتے تھے۔ اب وہ اس رقاصہ کو دیکھنا چاہتا

تھا کہ اس میں کیا تبدیلی آئی ہے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ ریشمی پردوں کو جنبش ہوئی اور وہ ننگے پاؤں اس طرح بھاگتی ہوئی آئی جیسے پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے۔ آتے ہی اس کے گلے میں جھول گئی۔

''اللہ آپ کہاں چلے گئے تھے۔ کوئی اس طرح بھی کسی کو ستاتا ہے۔ اتنے دنوں سے خبر ہی نہیں لی۔ دشمنوں نے تو یہ خبر اڑا دی تھی کہ آپ ''الور'' چلے گئے۔ وہاں کے راجا نے آپ کو بلایا تھا۔''

''لوگوں نے کہا اور تم نے یقین کر لیا؟''

''آپ آئے جو نہیں تھے۔''

''میں تمہیں چھوڑ کر بھلا کہیں جا سکتا ہوں۔''

''چلیے بھی۔ آپ تو باتیں بناتے ہیں۔''

''تمہاری جان کی قسم بات یہی ہے۔''

''پھر ہمارے بغیر اتنے دن آپ کو چین کیسے آیا؟''

''میں اتنے دنوں میں کتنی مرتبہ مر چکا اور پھر زندہ ہوا صرف تمہارے لیے۔''

''اے ہے، ایسی کیا افتاد تھی۔''

''میں اب یہاں آنے کے لائق نہیں رہا۔ تجمل حسین خاں کے انتقال کے بعد اب مفلسی میرا گھر دیکھنے کو ہے۔''

''آپ کی یہ باتیں سن کر جی چاہتا ہے ہم زہر کھا لیں۔'' وہ اس سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔ ''کیا ہم آپ کی دولت سے محبت کرتے ہیں؟ ہمیں تو آپ کی شاعری سے محبت ہے۔ آپ کی ذات سے محبت ہے۔ ہم کسی امیر کبیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے ورنہ فرخ آباد میں ہمارے چاہنے والے امیرزادوں کی کمی نہیں۔''

''ہمارا یہ گمان اس لیے تھا کہ آپ کے پیشے سے تعلق رکھنے والیاں صرف دولت کا منہ دیکھتی ہیں۔''

''ایسا خیال بھی دل میں نہ لایئے گا بلکہ ہم سمجھتے ہیں ان دنوں آپ کو ہماری پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہو گی۔ یہاں روز آیا کیجیے۔ آپ کی باندی سے جو خدمت ہو گی کرے گی، اس وقت فرمایئے کیا سنیں گے۔''

''کچھ نہیں اس وقت تو جی چاہتا ہے آپ پر قربان جاؤں۔''

''باتیں تو کوئی آپ سے بنوا لے۔ اچھا شربت اور پان کی تکلیف تو مجھے دیجیے۔''

''ہاں اس کے لیے مضائقہ نہیں۔''

منیر کو اس کی باتوں سے اتنی تقویت ملی کہ فرخ آباد چھوڑنے کا ارادہ بالکل ہی ترک کر دیا۔ مہاراجا الور کی طرف سے پھر خط آیا۔ زادِ راہ بھی بھیجا تھا۔ اس نے معذرت کر لی اور زادِ راہ واپس کر دیا۔

اس کی محبوبہ نے ٹھیک کہا تھا۔ ان دنوں اسے دل بہلنے کا سامان زیادہ ہی درکار تھا۔ وہ اس سے ملاقات کے لیے تقریباً روزانہ ہی جانے لگا۔ شام ہوتی اور اس کے قدم خانۂ محبوب کی جانب اٹھ جاتے۔

منیر اور اس کی پُرخلوص محبت کے قصے زبان زد عام تھے۔

اس دوران میں اس نے تجمل حسین خاں کے جانشین نواب تفضل حسین خاں سے راہ و رسم قائم رکھی۔ مختلف مواقع پر تاریخی قطعات کہہ کر خدمت میں پیش کیے۔ انعام و اکرام کا سزاوار بھی ہوا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی، تجمل حسین خاں کی زبان کا عیش کہاں میسر آسکتا تھا۔

قسمت کو ابھی کچھ اور دکھانا مقصود تھا۔

ایک دن وہ اس سے ملنے گیا تو عجیب ماجرا دیکھا۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا بدن چنوں کی طرح بھن رہا تھا۔ منیر کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری اور پھر اس پر غفلت طاری ہو گئی۔ اس کی ماں نے بتایا کہ وہ رات سے بخار میں جل رہی ہے۔

''آپ لوگوں نے کمال کر دیا۔ کسی حکیم کو نہیں دکھایا۔''

''حکیم صاحب کو میں نے رات ہی میں بلا لیا تھا۔ وہ دوا دے کر گئے ہیں۔''

''کچھ افاقہ ہوا؟''

''کچھ بھی تو نہیں۔ اب بھی آپ نے دیکھ لیا۔ وہی حالت ہے۔ کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولتی ہے پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔''

''میں حکیم مہدی کو آپ کی طرف بھیجتا ہوں۔ نواب تجمل حسین خاں کے خاص حکیم تھے۔ اب تک میرا ادب کرتے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔''

وہ اسی وقت وہاں سے اٹھا اور حکیم مہدی کو لے کر آگیا۔ انہوں نے اچھی طرح معائنہ کیا اور نسخہ لکھ دیا۔ جتنی دیر میں ملازم بازار سے نسخہ بنوا کر لاتا منیر اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔

پہلی خوراک پلوا کر وہ گھر چلا آیا۔

اب وہ اسے روزانہ دیکھنے کے لیے جانے لگے۔ دو

چار دن میں وہ تقریباً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ البتہ کمزوری بہت ہوگئی تھی۔ حکیم مہدی نے بھی کہہ دیا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

وہ اس رات اسے اچھی خاصی چھوڑ کر آیا تھا لیکن صبح معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

اسے طوائف سے زیادہ منیر کی محبوبہ کا درجہ حاصل تھا۔ یہ ایسا صدمہ نہیں تھا جسے وہ آسانی سے برداشت کرسکتا آنکھوں کی برسات تھی کہ تھمنے میں نہ آتی تھی۔

وہ صرف اس کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ اس راستے سے بھی نہیں گزرا جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ ایک روز اس کی یاد نے بہت شور مچایا تو اس نے خونِ دل سے چند اشعار کاغذ پر اتار دیے۔

دے دیا داغ فراق ابدی دل کو مر کے
ہائے اے جان جہاں تیری جوانی ہے ہے
ہائے وہ حسن وہ ناچ اور وہ گانا تیرا
رہ گئی سارے کمالوں کی کہانی ہے ہے
تیرے اخلاق کو روؤں کہ وفاداری کو
کوئی آفاق میں تیرا نہیں ثانی ہے ہے
ہائے اٹھارہ برس ہی میں ہوا کام تمام
لٹ گیا گلشن آغاز جوانی ہے ہے
اہلِ مقدور سے میرے لیے پرہیز کیا
قدر میرے لیے دولت کی نہ جانی ہے ہے
کی طبیبوں نے دوا خاک شفا کھلوائی
موت نے ایک بھی تدبیر نہ مانی ہے ہے
ہائے میں مر نہ گیا تیرے عوض اے گل رو
رہ گیا دل میں ترا داغ جوانی ہے ہے

وہ مر تو نہیں گیا لیکن محبوبۂ دل نواز کی بے وقت موت نے فرخ آباد کو اس کے لیے جنگل بنا دیا۔ نواب تفضل حسین خاں اب اس پر مہربان ہونے لگے تھے لیکن اب وہ دوسرے سہارے ڈھونڈنے میں مصروف ہوگیا تھا تاکہ کسی ملازمت کا بندوبست ہو جائے تو وہ فرخ آباد چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ وہ دوسرے امرا و نوابین سے مراسلت جاری رکھے ہوئے تھا۔ ایک مدحیہ قصیدہ کانپور کے رئیس نواب احمد حسین خاں بہادر کی طرف روانہ کیا۔ اس قصیدے میں اس نے اپنی ضرورت مندی کا اظہار نہایت سلیقے سے کیا تھا۔

آئی ہے آج صبح طرب بہر تہنیت
العیش کا ہے غل دل ناداں کے سامنے
لکھتا ہوں کس امیرِ ہمایوں کو عرضداشت
مضمون نو کی صف ہے دل و جاں کے سامنے
بالی ہمائے اوج ہے یہ قطعہ بندھ گیا
جاتا ہے کس امیر سخن داں کے سامنے
کوٹھی کے آگے گنبد گردوں بھی پست ہے
میلی ہے صبح، دامن درباں کے سامنے
پیش بہار طبع مبارک ہے یوں بہشت
سادی کتاب جیسے گلستاں کے سامنے
حاتم کے ہاتھ آپ کی ہمت کے روبرو
جیسے بگولے گنبد گردوں کے سامنے

اس نے یہ قصیدہ اس اُمید میں لکھا تھا کہ نواب احمد حسین خاں اسے اپنے پاس طلب کرلیں گے۔ ابھی وہ ان کے جواب کا انتظار کر رہا تھا کہ کانپور میں ایک مشاعرہ ہوا۔ منیر کو بھی دعوت دی گئی۔ وہ یہ سوچ کر عازم سفر ہوگیا کہ نواب احمد حسین خاں بھی کانپور میں ہیں ان سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے گا۔

وہ بہت دن بعد کانپور آیا تھا۔ اب اس کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ اس کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ شہرت کا ڈنکا ہر طرف بج رہا تھا۔ وہی مخالفین جنہوں نے اسے کانپور سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا، اب خندہ پیشانی سے پیش آرہے تھے۔

چند روز مجلسوں کا لطف اٹھانے کے بعد مشاعرے کی شب آئی۔ وہ اپنے چند شاگردوں کے ساتھ مشاعرے کی زینت بنا۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ اس کی غزل کو اتنا پسند کیا گیا کہ طرحی غزل کے بعد بھی کئی غزلیں اس سے سنی گئیں۔ وہ مشاعرہ اپنے نام کر کے مشاعرے سے اٹھا۔ اتفاق سے نواب زادہ علی بہادر خاں آف باندہ بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ شاعر تھے اور شعر و ادب کے قدر دان تھے۔ انہیں منیر کا رنگ سخن ایسا بھایا کہ ان کی شاگردی کا دم بھرنے لگے۔ التجا کی کہ وہ ان کے ساتھ باندہ چلیں ان کی مصاحبت میں رہیں اور ان کے کلام کو حسن کلام بنا دیں۔ انہوں نے یہ اصرار کچھ اس انداز سے کیا اور مستقبل کی تصویر کشی اس خوبی سے کی کہ وہ "باندہ" جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

باندہ کی ریاست ہندوستان کے شمال مغربی صوبے میں واقع تھی۔ ریاست کا کل رقبہ تین ہزار مربع میل کے لگ بھگ تھا۔ زرعی اعتبار سے یہاں کی زمینیں زیادہ زرخیز نہیں تھیں۔ آج کل یہ جھانسی کمشنری کا ضلع ہے۔ اس علاقے کو بندیلکھنڈ بھی کہا جاتا ہے۔ نواب علی بہادر، حکمران باندہ، نواب ذوالفقار علی خاں کے فرزند تھے۔ ابھی مسند نشیں نہیں ہوئے تھے لیکن والد کے بعد انہی کو جانشین ہونا تھا۔

وہ نواب کے ساتھ باندہ چلا تو گیا کچھ دن نواب ذوالفقار علی خاں کے دربار سے وابستہ بھی رہا لیکن جو توقعات وہ لے کر آیا تھا وہ پوری ہوتی نظر نہیں آرہی تھیں۔ نواب علی بہادر ابھی مسند نشیں نہیں ہوئے تھے جو اس کے ارمان نکالتے۔ نواب ذوالفقار اس کی اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ یہاں اور کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی کہ ٹکا رہتا۔ کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ فرخ آباد واپس آگیا۔

فرخ آباد آنے کے بعد بھی نواب زادہ علی بہادر سے بذریعہ مراسلت اس کی وابستگی برقرار رہی۔ ایک تعلق مشورۂ سخن کا بھی برقرار رہا۔ نواب زادہ اپنی غزلیں بہ غرض اصلاح بھیجتے رہے اور وہ ان کی اصلاح کر کے واپس کرتا رہا نواب صاحب کی طرف سے عطیات بھی آتے رہے جو اس کی پریشانیوں میں کمی کرتے رہے۔

ایک مرتبہ خط آیا کہ استاد ایک ایسی غزل کہیے جس میں سراپا نظم کیا گیا ہو۔ اس نے ان کی فرمائش پوری کی اور غزل لکھ کر بھیج دی۔

تمہارے زلف و رخ کا لطف ہم اے مہ لقا سمجھے
اسے بال آئینہ کا اور اس کو آئینہ سمجھے
اگر اس صاف چھبتی پر ہوئے برہم تو جانے دو
کسوٹی زلف کو عارض کو ہم لوح طلا سمجھے
یہ قلبوں کی صورت کھوٹی باتیں کیوں کریں توبہ
پری چہرے کو سمجھے زلف کو کالی بلا سمجھے
خزانہ زرد رو ہے سانپ ان پر زہر کھاتے ہیں
گہن زلفوں کو عارض کو مہ برج ضیا سمجھے
غزل یہ نظم کی فرمائش نواب سے میں نے
قصور اس کا ہے میری فکر کو جو نارسا سمجھے

یہ ایک طویل غزل تھی جس میں اس نے صرف زلف ورخ کے مضمون کو طرح طرح سے بیان کیا تھا۔ اس کے صلے میں نواب نے اسے تین سو ساٹھ روپے نقد اور کچھ تحائف بھیجے۔ غرض ادھر سے فرمائشیں ہوتی رہیں ادھر سے فرمائشیں پوری ہوتی رہیں۔ کلام پر اصلاح بھی جاری رہی۔

1849ء میں نواب ذوالفقار علی خاں کا انتقال ہوگیا اور علی بہادر ان کے جانشین ہوئے۔ منیر نے قطعہ تاریخ لکھ کر بھیجا۔

آج جشنِ جلوس والا ہے
کھل رہی ہے نشاط و عیش کی راہ
آج ارض و سما میں لٹتا ہے
زرِ خورشید اور نقرۂ ماہ
مسند آرا ہوئے مرے نواب
تہنیت سنج ہیں گدا و شاہ
زر فشانی کی دیکھ کر کثرت
عقد بر گو بنا ہے تارِ نگاہ
ہے یہ تاریخ اس خوشی کی منیر
بزمِ زیب و جلال و ثروت و جاہ

فرخ آباد میں سب کچھ تھا۔ دل بستگی کا ہر سامان موجود تھا لیکن تہی دستی تھی۔ اسے دور کرنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ باندہ میں ملاقات کا آرزومند بھی تھا۔ علی بہادر کے مسند نشیں ہونے کے بعد یہ آرزو مزید ترقی کرنے لگی تھی۔ دبے لفظوں میں وہ اس کا اظہار علی بہادر کے نام خطوں میں بھی کر چکا تھا لیکن خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا۔ تحائف برابر آرہے تھے لیکن مستقل ملازمت کا مژدہ سننے کے لیے کان ترس رہے تھے۔ بالآخر 1850ء میں نواب علی بہادر نے انہیں "باندہ" بلایا۔ ادھر سے کیا دیر تھی۔ وہ تو کب سے آرزومند تھا۔ فرخ آباد کو خیر باد کہا اور باندہ چلا گیا۔ نواب نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ اپنے کلام کی اصلاح پر مامور کیا اور دو سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا۔

نواب علی بہادر نے اس کے رہنے کے لیے علیحدہ بنگلا دیا جو تمام ضرورتوں کی چیزوں سے آراستہ تھا۔ یہاں صبح شام علما، فضلا اور شعرا کا اجتماع ہوتا اور علمی و تحقیقی مسائل زیرِ بحث آتے۔ شعر و سخن کی محفلیں جمتیں۔ ان محفلوں میں کبھی کبھی نواب علی بہادر بھی شریک ہوتے۔ وہ اس پر ایسی جان چھڑکنے لگے تھے کہ ہوا خوری کے لیے نکلتے تو اسے بھی اپنی سواریٔ خاص پر اپنے ہمراہ لے لیتے۔ کسی خوشگوار منظر کو دیکھتے تو حکم ہوتا اس منظر کو شعر کے قالب میں ڈھال لیے۔ وہ فی البدیہہ کہنے میں کمال رکھتا تھا۔ اسی وقت قطعہ، رباعی یا مختصر غزل کہہ کر نواب کو پیش کر دیتا۔ نواب سن کر محظوظ ہوتے اور انعام سے نوازتے۔ رفتہ رفتہ اس کی برجستہ گوئی کا سکہ نواب کے دل پر بیٹھ گیا۔

اصلاحِ سخن کا سلسلہ کب سے چل رہا تھا لیکن منیر کی قدر و منزلت میں اس وقت بے تحاشا اضافہ ہوگیا جب نواب نے ایک جلسے میں اسے خلعت استادی عطا کیا۔ اس

نے تاریخ رقم کی۔

میرے شاگرد اگرچہ تھے نواب
لطف توقیر لیکن آج ملا
خلعت آبروئے استادی
سرِ عزت کو مثل تاج ملا
میں نے تاریخِ نظم کی یہ منیر
خلعت عزوجاہ آج ملا

اس عزت وتوقیر اور مالی حیثیت نے اس کا نام بہت بلند کردیا۔ اس دور دراز ریاست میں کوئی شاعر اس کا ہم پلہ نہیں تھا لہٰذا ٹکراؤ کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ صرف درباری شاعر نہیں تھا استادِ نواب ہونے کی حیثیت سے وہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا اس کی خوش حالی کا اب وہی دور تھا جو کبھی اسے نواب تجمل حسین خاں کے زمانے میں فرخ آباد میں حاصل ہوا تھا۔ دنیا کی ہر نعمت میسر تھی۔ اسے تاریخ گوئی پر عبور حاصل تھا۔ ریاست میں کوئی واقعہ رونما ہوتا کوئی تعمیر ہوتی وہ اس کی تاریخ نظم کر کے نواب کو پیش کرتا۔ یہ اشعار نواب کی خوشنودی کا باعث بن رہے تھے کیوں کہ اس طرح ان کی ریاست کی تاریخ رقم ہو رہی تھی، اب نواب اس پر اتنا بھروسا کرنے لگے تھے کہ ریاست کے انتظامی معاملات میں بھی اس سے مشورہ کرنے لگے تھے۔

اب منیر کو معاشی اعتبار سے فراغت حاصل تھی۔ اسے یہ موقع میسر آگیا کہ وہ دل جمعی کے ساتھ ادبی و تخلیقی سطح پر کام کر سکے۔ اس نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اپنا دیوان اوّل ”منتخب العالم“ مرتب کیا (اس کی اشاعت بہت بعد میں 1879ء میں ہوئی) اس دیوان کے لیے معرکتہ الارا فارسی دیباچہ تحریر کیا۔ نواب علی بہادر نے اس دیوان کی تاریخ کہی۔

استاد کے دیوان کی ہے مدح محال
برج معنی کا منیرِ اعظم لکھ
تھی فکر علی کو نام تاریخی کی
ہاتف نے کہا منتخب العالم لکھ

اس سال اس نے اپنا دوسرا دیوان تنویر الاشعار مکمل کیا۔

قیام باندہ کے دوران میں اس کی شاعری نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ لکھنؤ اور پھر فرخ آباد میں بھی ناسخ کے طرز شاعری کی دھوم تھی۔ اسی رنگ کو پسند کیا جاتا تھا۔ اس کی شاعری بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دور از کار تشبیہات، رعایت لفظی، صنعت گری، مشکل الفاظ ان سب چیزوں کو پسند کیا جاتا تھا۔ باندہ میں آکر اس کی شاعری سے یہ اثر کم ہونے لگے۔ اب اس کا آہنگ شاعری سادگی کی طرف گامزن تھا جو سہل ممتنع کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ آسان الفاظ، چھوٹی بحریں، سامنے کی تشبیہات یہ تھیں ان کی موجودہ غزلوں کی شان۔ اب اس کی غزلیں یہ شان دکھا رہی تھیں۔

چھپ کے اس بت کی چاہ کرتے ہیں
دل میں چوری سے راہ کرتے ہیں
ہم کو عادت ہوئی تغافل کی
اس طرف کیوں نگاہ کرتے ہیں
دیدہ و دل کی کچھ نہیں سنتے
فیصلہ بے گواہ کرتے ہیں
بچھے جاتے ہیں دیکھنے والے
آنکھیں ہم فرشِ راہ کرتے ہیں
اس طرف دیکھ کر ذرا کہیے
آپ کس سے نباہ کرتے ہیں
مالک اپنا علی بہادر ہے
شکر فضلِ الٰہ کرتے ہیں

مشکل دن دنوں میں گزرتے ہیں۔ سہل گھڑیاں گھڑی میں بیت جاتی ہیں۔ باندہ کے عیش میں پلک جھپکتے دن گزر گئے۔ دیکھا کہ انگریز لکھنؤ کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ یہ تو دیکھتا رہا تھا اور پڑھتا رہا تھا کہ انگریز تجارت کرنے آئے تھے اور اب حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ انگریزوں نے میسور کے حیدر علی اور ٹیپو کے ساتھ اور دلی میں شاہ عالم کے ساتھ کیا کیا، ہوش تو آدمی کو اس وقت آتا ہے جب آگ اپنے گھر میں لگی ہو۔ اسے بھی ہوش اس وقت آیا۔ آگ کی تپش اس وقت محسوس کی جب 1856ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو صفائی کا موقع دیے بغیر اودھ کی ریاست کو ضبط کرلیا اور واجد علی شاہ کو مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا۔

واجد علی شاہ کے دربار کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور تعلقہ داروں کے دربار بھی تھے جن سے شاعروں کی پرورش ہوتی تھی۔ حکومت اودھ کے ختم ہوتے ہی یہ محفلیں بھی درہم برہم ہوگئیں۔

اسے لکھنؤ سے جتنی محبت اور واجد علی شاہ سے جتنی عقیدت تھی ظاہر ہے اس واقعے نے اسے دل گیر کردیا ہوگا۔

ایک اسی کو نہیں مرکز تہذیب اودھ کی بربادی نے ہر مسلمان کے دل میں انگریزوں کی طرف سے نفرت کے جذبات بیدار کردیے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سلسلہ رکے گا نہیں، واجد علی شاہ کے بعد بہادر شاہ ظفر انگریزوں کا شکار بنیں گے۔ اب بھی برائے نام حکومت ہے مکمل خاتمے کے لیے بہانہ درکار ہے۔ ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ہندوستانی فوج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی اور جنگ آزادی کا آغاز ہوگیا۔ ابتدا میں مجاہدین کو فتح ہوئی لیکن پھر انگریزوں نے اس شورش کو دبا لیا۔ دہلی میں انگریزوں نے انتظام سنبھال لیا لیکن دور دراز کی ریاستوں میں انگریزوں کے خلاف یہ انتقام بیدار ہوگیا۔ مجاہدین اس بہادری سے لڑے کہ انگریزوں کو یہ چنگاریاں بجھانے میں عرصہ لگ گیا۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوگئی۔ جھانسی کی ریاست باندہ کے پڑوس ہی میں تھی لہٰذا منیر کے مربی باندہ کے نواب علی بہادر خاں بھی بے چین ہوگئے۔ رانی جھانسی نے انہیں بھی جنگ آزادی میں شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے ریاست کے امرا اور منیر شکوہ آبادی سے رائے طلب کی۔ منیر بھی جاں بازی اور فروشی کے لیے تیار ہوگئے۔ فوج کی تعداد بھی معقول تھی اور خزانہ بھی معمور تھا۔ قلعہ باندہ میں مقیم انگریز عہدے دار قتل کردیا گیا۔ یہ گویا جنگ کا آغاز تھا۔ انگریزی افواج باندہ پر حملہ آور ہوگئیں۔ منیر اپنے نواب کے ہمراہ تھا۔ وہ ان کے ہر معرکے کی تاریخ رقم کر رہا تھا اور نواب کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو
سب عدو مقتول تیغ و بستہء زنجیر ہیں
کیوں نہ فضل خدا چشمِ عنایاتِ رسول
آپ ہم نام جناب شاہِ خیبر گیر ہیں

باندہ پر پہلا حملہ تو پسپا کردیا گیا تھا لیکن دوسرے حملے میں نواب کو شکست ہوگئی۔ نواب تو جھانسی کی رانی کے ساتھ ملنے کے لیے کالپی چلے گئے اور منیر نے فرخ آباد کا رخ کیا۔

ادھر جن لوگوں کو مجھ باندہ سے گرفتار کیا گیا انہوں نے نواب علی بہادر کا ساتھ دینے والوں میں منیر کا نام بھی لیا ایسے اشعار بھی پکڑے گئے جو انگریزوں کے خلاف کہے گئے اور جن میں مجاہدین آزادی کی تعریف کی گئی تھی لہٰذا ان کی گرفتاری کے اشتہار شائع ہوگئے۔ اب وہ انگریزوں کا مجرم

تھا۔ اسے کسی وقت بھی گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ اس پر بغاوت اور فساد پر اکسانے کا الزام تھا۔

ریاست باندہ ضبط کی جاچکی تھی اور منیر فرخ آباد میں تھا جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔

نواب تفضل حسین خاں اس کے قدیم بہی خواہ جنگ آزادی میں مجاہدین کے ساتھ تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ فرخ آباد کے مسلمان انگریزوں کے خلاف بے جگری سے لڑے۔ آٹھ نو مہینے تک اپنا دفاع کرتے رہے بالآخر اسپیشل کمشنر کی اس یقین دہانی پر کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی انہوں نے اپنے دوسرے سرداروں کے ساتھ اچانک ہتھیار ڈال دیے۔ وعدے کے مطابق نواب صاحب کو جلا وطن کر دیا گیا اور وہ سرزمین عرب کی طرف ہجرت کر گئے۔ ریاست فرخ آباد ضبط کر لی گئی لیکن انگریزوں کے جذبہ انتقام سے فرخ آباد کے دوسرے امرا نہ بچ سکے۔ ان میں نواب صاحب کے چھوٹے بھائی بھی تھے جنہیں پھانسی دے دی گئی۔ منیر نے تاریخ لکھی

وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول
مشام روح ہو جس طرح عاشق نکہت
منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیر و دلیر باہمت

یہ زمانہ منیر کے لیے سخت آزمائش اور ابتلا کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچاتا پھر رہا تھا۔ کبھی کسی کے گھر میں روپوش ہے کبھی کسی کے گھر میں۔ اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا اور وہ بچتا پھر رہا تھا۔ پھر لوگ اس سے بچنے لگے۔ انگریز کے باغی کو پناہ کون دیتا۔ اس نے بھیس بدل لیا۔ ایسا حلیہ بنا لیا کہ کوئی دیکھتا تو یہی کہتا کوئی فقیر ہے۔ حالت ایسی ہوگئی کہ احباب کے لیے بھی پہچاننا دوبھر ہو گیا۔ ایک فقیر تھا جو فرخ آباد کی گلیوں میں گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ بہت سے لوگ نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے اور کبھی کیا تھا۔

ایک رات ایک فقیر نے جو ایک تہمد باندھے ہوئے تھا جس پر ایک میلا کچیلا کرتہ تھا ایک دروازے پر دستک دی۔ صاحب خانہ باہر آئے تو ایک فقیر کو کھڑے دیکھا۔ اس کا ہاتھ دراز تھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ جب ذرا غور سے دیکھا تو ان کی سانس اکھڑنے لگی۔ انقلاب زمانہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ جو کبھی نوابوں کا ہم نشین تھا، دولت میں کھیلتا تھا ایک فقیر کے روپ میں کھڑا تھا۔ یہ کوئی اور منیر شکوہ آبادی تھا۔

''منیر صاحب!'' صاحب خانہ نے کہا۔ ''میں نے آپ کو پہچان لیا مگر افسوس میں آپ کو گھر کے اندر نہیں لے جاسکتا نہ آپ کے چھپنے کا کوئی بندوبست کر سکتا ہوں۔ آپ کا اشتہار گرفتاری جاری ہو چکا ہے۔ میں آپ کو چھپا بھی لوں تو بھی آپ گرفتار ضرور ہو جائیں گے۔ میں آپ کی مدد تو کر سکتا ہوں کہیں چھپا نہیں سکتا۔''

صاحب خانہ نے چند اشرفیاں اس کے ہاتھ پر رکھ دیں اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ فقیر اندھیرے میں اندھیرا بن کر کہیں غائب ہو گیا۔ شاید رحم کھا کر اسے کسی نے پناہ دے دی ہو۔ اس پر اس کا ایک شعر صادق آرہا تھا۔

اک دوست وقت بد میں نہ مجھ کو چھپا سکا
میں خانماں خراب خوشی کی خبر ہوا

اس عالم دربدری میں بھی اس نے سخن طرازی نہیں چھوڑی۔ اپنی محرومیوں کے دکھ، ترک وطن کی صعوبتیں، یاروں کی بے وفائیاں، دربدری، رسوائی، بے بسی، بے کسی کو غزل کے لطیف اشاروں میں بیان کرتا رہا۔

ہر روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں اضطراب سے
کس درجہ تنگ جامۂ زخم جگر ہوا
جب بیٹھتا ہوں تھک کے اٹھاتی ہیں ٹھوکریں
میں نقش پا ہوں یا کوئی گرد سفر ہوا
ایک دوست وقت بد میں نہ مجھ کو چھپا سکا
میں خانماں خراب خوشی کی خبر ہوا
ابنائے دہر کہتے ہیں ناموس ننگ کو
ہر عیب نور چشم و کمال و ہنر ہوا

انگریز کے باغی کو نہ زمین پناہ دینے کو تیار تھی نہ آسمان۔ ایک روز لوگوں نے ہفتہ وار کوہ نور پڑھا تو اس خبر پر آنکھیں جم گئیں۔

''سید محمد اسماعیل معروف بہ منشی منیر ملازم نواب باندہ، بجرم بغاوت معرفت کوتوال فرخ آباد گرفتار ہو کر صاحب مجسٹریٹ کی خدمت میں روانہ ہوا۔ باندہ میں تحقیقات جرم ہو کر حکم مناسب صادر ہوگا۔''

اسے فرخ آباد سے لے جا کر باندہ کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس نے زندگی بھر دوستوں پر جان چھڑکی تھی دوستوں کے کام آیا تھا اس لیے بجا طور پر توقع کر رہا تھا لیکن اس وقت اسے سخت اذیت ہوئی جب باندہ کے زنداں میں اس سے کوئی ملنے تک نہ آیا۔ لوگ اس سے اپنی دوستی یارشتے داری جتاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ان پر بھی کوئی الزام نہ آجائے۔ اس پر جیل کے ملازمین کی بدسلوکیوں کا نشانہ الگ بننا پڑتا تھا۔

راہ میں صورت نقش کف پا رہتا ہوں
ہر گھڑی بننے بگڑنے کو پڑا رہتا ہوں
عمر رفتہ نہ کبھی آئی منانے کے لیے
مدتیں گزریں کہ جینے سے خفا رہتا ہوں

......

قید میں مثل خوشی صبر کیا غم کو بھی
عید کیا چیز ہے رو بیٹھے محرم کو بھی

مقدمہ چلتا رہا۔ مقدمہ کیا تھا یک طرفہ کارروائی تھی۔ انگریز حکام مجسٹریٹ کے سامنے شواہد پیش کر رہے تھے۔ وہ ہر جرم سے انکار کر رہا تھا لیکن کوئی اس کی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے باوجود آٹھ نو ماہ گزر گئے اور بالآخر سات سال قید بہ عبور دریائے شور سنادی گئی۔ اس سزا کو کالا پانی کی سزا بھی کہا جاتا تھا۔ خلیج بنگال میں واقع جزیرہ انڈمان کو سزائے قید کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں کی آب وہوا نہایت مرطوب تھی۔ بارشیں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ یہاں قیدی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اکثر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ فرار کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے مجرموں کو اکثر یہیں بھیجا جاتا تھا۔ اب وہ ملزم نہیں مجرم تھا۔ اسے پہلے الہ آباد بھیجا گیا اور پھر ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر پاپیادہ کلکتہ پہنچا دیا گیا جہاں سے اسے انڈمان جانا تھا۔ یہ صاحب علم و فضل رسوائیوں کے سائے میں، دھوپ میں جلتا ہوا زنجیروں میں جکڑا ہوا انڈمان پہنچ گیا۔

پھر الہ آباد بھجوا دیا
ظلم سے تلبیس سے تزویر سے
ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش
نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے
جو الہ آباد میں گزرے ستم
ہیں فزوں تصویر سے تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
بے حواس و بے لباس و بے دیار
دل گرفتہ جور چرخ پیر سے
ہزاروں طرح کی جفائیں اٹھا کر
چلا قید ہو کر میں زنداں کی جانب
پیادہ روی اور بعد مسافت
ستم گار تلواریں کھینچے مراتب

وہ ان مصائب کو جھیلتا ہوا کلکتہ پہنچا تو زنجیریں کاٹ دی گئیں۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور قطعہ تاریخ نظم کیا

کالے پانی میں جو پہنچے یک بہ یک
کٹ گئی قید ستم تقدیر سے
یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر
صاف نکلے خانۂ زنجیر سے

قاعدے کے مطابق اس کی تصویر کھنچوائی گئی۔ تصویر دیکھی تو اپنی صورت خود نہ پہچان سکا۔ راستے کی صعوبتوں نے شکل ہی بدل کر رکھ دی تھی۔

رات ہوئی تو وہ بستر ڈھونڈنے لگا۔ بستر کیسا یہ جو ٹھنڈا چبوترا ہے اسی پر بغیر بستر کے سو جاؤ۔ وہ بہت دیر تک اس ننگے فرش پر بیٹھا سوچتا رہا، کوئی اس پر سو بھی سکتا ہے؟ آنکھوں میں بھری نیند نے قہقہہ مارا۔ کیوں نہیں سو سکتا۔ لے ابھی دیکھ۔ تھکن سے ہڈیاں پناہ مانگ رہی تھیں۔ لیٹا تو سو گیا لیکن رات میں کسی وقت آنکھ کھل گئی۔ عہد عیش کی یادوں نے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا۔ کیسے کیسے نوابوں نے ناز اٹھائے تھے اور اب نیند بھی ناز اٹھانے کو تیار نہیں تھی۔ ماضی کے مربی یاد آرہے تھے۔ شاگردوں کی یاد آرہی تھی۔ احباب اقربا کے بارے میں سوچتا رہا، بیوی کے بارے میں سوچتا رہا جسے وہ اس کے میکے میں چھوڑ آیا تھا کیا خبر دوبارہ شکل دیکھنے کو ملے نہ ملے۔ ان ہی خیالوں میں شب بسر ہو گئی۔

دوسروں کے بارے میں سوچتے سوچتے سحر ہو گئی تھی۔ اپنے بارے میں سوچا تو دیکھا جسم پر جو لباس ہے خستہ وخراب ہو چکا ہے۔ حکام سے شکایت کی تو پہننے کے لیے وہ کپڑے دیے گئے جو وہاں کے عام قیدیوں کو ملتے تھے۔ پاجامے کے پائنچے اس قدر تنگ اور چھوٹے تھے کہ اس کے پہننے سے جسمانی اذیت کے ساتھ ساتھ کوفت بھی ہو رہی تھی۔

یہاں جو لوگ آتے تھے ان کے کوائف کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کی صلاحیت کے مطابق ان سے کام لیا جاتا تھا۔ بعض مزدوری کرتے تھے تو بعض کلرکی۔

دراصل اس جزیرے کو روایتی قید خانہ نہ سمجھا جائے۔ یہ مجرمان کا ایک شہر سا آباد ہو گیا تھا جہاں ''رہائی'' کے سوا

سب کچھ تھا۔ لوگ کام کرتے تھے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ منیر کے کوائف سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پڑھے لکھے ہیں اس لیے اسے کمشنر کے دفتر میں ہیڈ محرر مقرر کرکے دس روپے تنخواہ مقرر کردی گئی۔ یہ تنخواہ اکیلے آدمی کے لیے کم نہیں تھی لیکن چونکہ اس نے زندگی امراء نوابین کے درمیان گزاری تھی اور اعلیٰ ترین لوازم کے عادی تھے لہٰذا اس قلیل آمدنی میں گزارا کرنے کے لیے اسے بہت سی عادتیں ترک کرنی پڑیں۔ مثلاً افیون کھانا ترک۔ افیون چھوڑنے سے وہ بہت دن تک شعر گوئی کی طرف مائل نہ ہو سکا۔ پھر رفتہ رفتہ تمباکو نوشی ہی سے بہلنے لگا البتہ اب اس نے قیدیوں کا لباس اتار کر اپنے پیسوں سے نئے کپڑے بنوا لیے تھے۔

کمشنر کے دفتر میں قیدیوں کی وفات، ان کے جرائم کی نوعیت، قید کی مدت، رہائی کی تاریخ اور اسی قسم کی دوسری معلومات درج کرنا اس کا کام تھا۔ جائے عبرت یہ بھی کہ گھر کے تمام کام چولہا جلا کر کھانا پکانا وغیرہ اسی کو کرنا پڑ رہا تھا۔

پانی اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے اسی طرح زندگی ہر رنگ میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ یہاں کی آب و ہوا اور ماحول کا عادی ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں صبر آگیا۔

جزائر انڈمان میں جو دوسرے علما و فضلا قید و بند اور غریب الوطنی کے صدمات برداشت کررہے تھے ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے علاوہ منشی خوشی رام اور مولوی مظہر کریم بھی تھے۔ ان دوستوں سے مل جانے کے بعد تو گویا اس جزیرے کو بھی اس نے فرخ آباد بنا دیا۔ مرزا ولایت حسین سابق وزیر باندہ بھی مل گئے جو اسی کی طرح بغاوت کی سزا کاٹ رہے تھے۔

اس کا بیشتر وقت فضل حق خیر آبادی کے ساتھ گزرنے لگا۔

یہ تمام لوگ فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ خوشی رام نے جزائر انڈمان کی تاریخ، تاریخ انڈمن کے نام سے تالیف کی۔ منیر نے اس کتاب کی تصنیف پر متعدد قطعات تاریخ موزوں کیے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی نے اپنی یادگار تصنیف ''الثورۃ الہندیہ'' یہیں تصنیف کی۔ وہ شاعر تھا۔ شعر گوئی ترک نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ اپنے درد و غم کا اظہار کرسکتا تھا۔ غزلیں کہتا رہا جو بعد میں انڈمان کے حالات کی تاریخ بن گئیں۔

جزائر انڈمان میں خط و کتابت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اپنی غزلیں دوستوں کو روانہ کرتا رہا جو شائع بھی ہوتی رہیں۔

میجر جان ہائن جو جزائر انڈمان کے کمشنر تھے اس کے ادبی شغف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کی نیک چلنی اور علم دوستی کے قائل تھے اور اُمید ہو چلی تھی کہ اگر موقع ملا تو وہ اس کی سزا معاف کردیں گے۔

☆......☆

تاریخ اپنا دائرہ مکمل کررہی تھی۔ جہاں سے آغاز ہوا تھا وہیں اتصال ہونے کو تھا۔ وہی نواب یوسف علی خاں والی رام پور جنہوں نے زادِ راہ بھیج کر منیر کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا اور اس نے معذرت کرلی تھی، الٰہ آباد آئے ہوئے تھے۔ اس قیام کے دوران میں لکھنو کا ایک قوال نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک غزل چھیڑی۔ کچھ گویّے کی آواز کا جادو کچھ کلام کی خوبی۔ نواب صاحب ایک ایک شعر سے لطف اندوز ہو رہے تھے گویّے نے مقطع پڑھا

میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

اس مقطع نے تو جیسے نواب پر جادو کردیا۔ بے اختیار زبان سے نکلا

ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

محفل ختم ہوئی۔ گویّا اٹھ کر چلا گیا۔ یوسف علی خاں کو یاد آیا کہ انہوں نے کبھی منیر کو طلب کیا تھا جب وہ کانپور میں تھا اور اس نے معذرت کرلی تھی۔ تاریخ اپنا دائرہ مکمل کرنے کو تھی۔ یوسف علی خاں نے پھر چاہا کہ اسے اپنے دربار کی زینت بنائیں اور جن محرومیوں کی شکایت غزل میں کی ہے اسے دور کریں لیکن انہیں یہ تکلیف دہ اطلاع ملی کہ وہ جزائر انڈمان میں بغاوت کے جرم میں سزا کاٹ رہا ہے۔

1857ء کے ہنگامہ دار و گیر میں رام پور کی سرزمین ایک ایسی جائے امن تھی جہاں ہر شریف آدمی عزت و آبرو کے ساتھ چین سے رہ سکتا تھا۔ دلی لٹ چکی تھی۔ ہندوستان میں ہر طرف قتل و غارت گری کا دور دورہ تھا۔ ایسے پُرآشوب زمانے میں شرفائے دہلی و لکھنو رام پور کو جائے امن دیکھ کر وہاں جمع ہو گئے تھے۔ یہ ریاست انگریزوں کی دست برد سے محفوظ تھی لہٰذا امن ہی امن تھا۔

انگریزی حکومت میں نواب یوسف علی خاں کی اچھی خاصی رسائی تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ منیر جیسا فاضل شاعر کالا پانی کی سزا کاٹ رہا ہے انہوں نے اس کی رہائی کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ دولت انگلشیہ ان کی ممنون تھی لہٰذا بہت جلد منیر کو سزا میں دو سال کی کمی ہوگئی۔ انہیں سات سال کے لیے بھیجا گیا تھا۔ پانچ سال وہ پورے کرچکے تھے کہ پروانہ رہائی مل گیا۔

انہیں بعض دوستوں کی معرفت انڈمان ہی میں بذریعہ خط معلوم ہو چکا تھا کہ نواب یوسف علی خان ان کی رہائی کے لیے کوششیں کررہے ہیں لہٰذا جب رہائی ملی تو انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وطن پہنچتے ہی رام پور کا رخ کریں گے۔ اس اندھیرے میں وہی ایک روشنی تھی۔

انڈمان سے کلکتہ تک کا سفر بڑا خوش آیند تھا۔ رہائی کی خوشی، احباب اور عزیزوں سے ملنے کا اشتیاق اور یہ اُمید کہ جب وہ عزیز و اقارب سے ملنے کے بعد رام پور جائے گا تو قدر دانی کے پھول فرشِ راہ ہوں گے۔ وہ کلکتہ سے الٰہ آباد آیا جہاں اس کے شاگرد علی عباس نیساں اور دوست میر غلام عباس موجود تھے۔ سب نے اسے زندہ سلامت دیکھا تو آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے لیکن وہ خود زندہ زمین میں گڑ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے یہ اطلاع ملی کہ نواب یوسف علی خان کا انتقال ہو چکا۔ اک چراغ راہ میں جلا تھا وہ بھی بجھ گیا۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

آیا منیر قید سے جب چھوٹ کر یہاں
تھا قصد رام پور کو ہو جاؤں میں رواں
لیکن حضور ہو گئے راہی سوئے جناں
اب کس کے پاس جاؤں میں ہے کون قدرداں
نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے

وہ پھر بھی کہیں نہ کہیں چلا جاتا لیکن نواب کی وفات کا صدمہ تھا یا انڈمان کے مصائب کے اثرات کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ بیمار بھی ایسا کہ بچنے کی اُمید نہ رہی۔ علاج ہوتا رہا اور بالآخر کئی ماہ کے علاج معالجے کے بعد شفایاب ہوا۔ شفایاب ہوتے ہی وہ کانپور کی طرف نکل گیا۔ یہاں اس کے بہت سے دوست اور شاگرد موجود تھے۔ کانپور میں کچھ دن گزارنے کے بعد اس کا شوق اسے لکھنو لے آیا۔ لکھنو آتے ہوئے کیسے کیسے خواب اس کی آنکھوں میں سجے ہوئے تھے لیکن یہاں آکر دیکھا تو سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ عروس البلاد لکھنو کا نقشہ ہی بدلا ہوا دیکھا۔ شعر و ادب کی محفلوں کا وہ رنگ ہی نہیں تھا جو کبھی تھا۔ اردو زبان بھی کچھ سے کچھ ہوگئی تھی۔ وہ محاورے اور روزمرہ جو سخن کا معیار تھے اب نا اہلوں تک پہنچ کر اپنی قدر کھو چکے تھے۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

اردو زبان ہو گئی ہندوستان میں مسخ
وہ بات وہ محاورہ وہ گفتگو نہیں

وہ لکھنو میں خود کو اجنبی محسوس کررہا تھا۔

وہ آب جو ہوں جو صدف آبرو نہیں
وہ آبرو ہوں جو گہر آب جو نہیں
وہ آرزو ہوں جس کو کوئی دل نہیں نصیب
وہ دل ہوں میں کہ جس میں کوئی آرزو نہیں

پرانے مربیوں کا مٹ جانا اور ان کی جگہ مسند علم پر ایسے لوگوں کا آبیٹھنا جن کے دلوں میں شعر و سخن کی کوئی قدر نہ تھی اس کے لیے بڑا الم ناک واقعہ تھا۔ وہ ایک ایک کی شکل دیکھتا تھا۔ شکل کیا دیکھتا تھا منہ تکتا تھا۔ جن دیواروں کو بوسے دیا کرتا تھا، ان سے سر پھوڑتا تھا، وہ اس وحشت آباد سے گھبرا گیا۔ گریباں چاک بھاگا تو کان پور جا کر دم لیا۔ فرخ آباد جانا چاہتا تھا لیکن الٰہ آباد پہنچ گیا۔

الٰہ آباد میں وہ روسا اور نوابین سے روابط بحال کرنے کے لیے کوششیں کرتا رہا لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ دس سال تک وہ ادبی منظر نامے سے غائب رہا تھا۔ بے مروت زمانہ اسے بھول چکا تھا۔ اس کے قدیم مربی نواب علی بہادر زندہ تھے مگر اندور کے قلعہ میں نظر بندی کے دن گزار رہے تھے۔ اس نے نواب صاحب کو خط لکھا اور اپنے حالات سے آگاہ کیا لیکن ان کا حال یہ تھا کہ انگریز کے وظیفہ خوار تھے وہ منیر کی دستگیری کیا کرتے پھر بھی وضع داری نبھاتے رہے۔ گاہے گاہے تحائف بھیجتے رہے۔ منیر بھی وضع داری نبھاتا رہا۔ ان تحائف کا شکریہ قطعات تاریخ کی صورت میں ادا کرتا رہا۔

جنگ آزادی نے ان صاحب ثروت قدر دانوں کو ختم کردیا تھا جو منیر کی کفالت کرسکتے تھے۔ اس کے کچھ شاگرد تھے جو اس کی مدد کرسکتے تھے لیکن یہ رقم اونٹ کے منہ میں زیرا تھی۔ اس کی پریشانیاں اپنی جگہ رہیں۔ وہ کسی دامن دولت کی تلاش میں تھا۔ آوارہ خرامی اس کے مقدر کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

ان حالات میں اگر کہیں قدر دانی اور ملازمت کی توقع ہوسکتی تھی تو وہ دربار رام پور ہی ہوسکتا تھا لیکن اب

جغرافیہ

یونانی لفظ جیوگریفی کا معرب، زمین کی مساحت و پیائش زمین کے بیان کا علم۔ وہ علم جس کے پڑھنے سے دنیا کی موجودات قدرتی اور مصنوعی کا حال معلوم ہو۔ جغرافیہ کی اصطلاح سب سے پہلے رسائل اخوان الصفاء میں نقشہ عالم کے معنی میں استعمال ہوئی تھی۔ علم جغرافیہ میں کرۂ ارض کے خط و خال، زمین، پانی، آب و ہوا، نباتات، حیوانات اور انسان کے آپس کے تعلقات سے بحث ہوتی ہے اس علم کی خاص خاص شاخیں یہ ہیں۔ طبعی، نباتاتی، حیواناتی، اقتصادی، تاریخی، ریاضیاتی، طبقاتی اور سیاسی یا ملکی۔ المقدسی نے ''احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم'' جغرافیے کے بیشتر پہلوؤں سے بحث کی ہے اور وہ اس کی جامعیت کے تصور کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔ اسلام سے قبل عربوں کی جغرافیائی معلومات بعض روایات اور قدیم جغرافیائی تصورات یا جزیرۂ عرب کے مقامات اور آس پاس کے علاقوں کے مقامات کے ناموں تک محدود تھیں۔ یہ معلومات جن تین بنیادی ماخذوں میں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں۔ 1۔ قرآن مجید۔ 2۔ احادیث نبوی۔ 3۔ قدیم عربی شاعری۔ قدیم عربی شاعری میں جو جغرافیائی تصورات و معلومات موجود ہیں ان سے اسلام سے قبل کے عربوں کے ہاں جغرافیائی مظاہر کے مفہوم اور ان کے علم کی حدود کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جغرافیہ اور کائنات کے متعلق جو تصورات ملتے ہیں ان کے لیے صحابہ کرام سے منسوب ایسی روایات بھی موجود ہیں جن کا تعلق کائنات، جغرافیے اور دیگر متعلقہ مسائل سے ہے۔ یہ روایات بعض جغرافیہ دانوں نے اپنی کتابوں میں قابلِ اعتماد علمی ذخیرے کے طور پر پیش کیں۔ جب اسلام افریقا اور ایشیا میں پھیلا تو عربوں کو معلومات جمع کرنے اور ان مختلف ممالک کے بارے میں اپنے تجربات و مشاہدات کو قلم بند کرنے کے مواقع حاصل ہو گئے اور اس طرح مسلمانوں کے علم جغرافیہ نے ترقی کی۔ اس ترقی میں قرآن مجید، فن حدیث و رجال اور عام تحقیق و مشاہداتی ذوق نے بڑا حصہ لیا۔ مسلمانوں کے علم جغرافیہ میں زیادہ وسعت عباسی عہد کے آغاز اور بغداد کے دارالخلافہ بن جانے کے بعد ہی پیدا ہوئی۔ ایران، مصر اور سندھ کی فتوحات نے ایک طرف تو عربوں کو قدیم تمدن کے ان وارثوں کے علمی و ثقافتی سرمائے سے براہِ راست مستفید ہونے کا موقع دیا اور دوسری طرف ان علاقوں کے علمی مراکز تجربہ گاہیں اور رصدگاہیں ان کے قبضے یا علم میں آگئیں۔ اس دور میں مسلمانوں نے غیر ملکی زبانوں کے علمی ذخائر کو حاصل کر کے انہیں عربی زبان میں منتقل کیا، چنانچہ ہند کی جغرافیائی و فلکیاتی معلومات سنسکرت کی کتاب ''سوریہ سدعانت'' کے عربی میں ترجمہ ہونے کی وجہ سے عربوں تک پہنچیں۔ ان متعدد تصورات میں جن سے عرب علما متعارف ہوئے آریابھٹ کا نظریہ بھی شامل تھا۔ عربوں کے جغرافیائی ادب سے اس امر کی کافی شہادت ملتی ہے کہ عربی جغرافیہ و نقشہ نویسی پر ایران کے اثرات ہیں۔ ایران کے بہت سے جغرافیائی تصور اور روایات کو عربوں نے اپنایا۔ ایرانی روایات نے عربوں کی جہاز رانی اور اس سے متعلقہ ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ عرب نقشہ سازی پر بھی فارسی اثرات ظاہر ہیں۔ یونانیوں کا علم جغرافیہ اور علم ہیئت کس طرح عربوں میں منتقل ہوا اس کے متعلق ہمیں مقابلتاً زیادہ مواد دستیاب ہے۔ اس عہد میں جغرافیہ بطلیموس کا ترجمہ کئی بار ہوا۔ اگرچہ علاقائی اور بیانی جغرافیے نیز نقشہ سازی میں فارسی اثرات واضح تھے لیکن یونانی اثرات عملی طور پر عرب جغرافیے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو گئے۔ عرب جغرافیے کو یونانی بنیاد سب سے زیادہ ریاضیات، طبیعات اور انسانی و حیاتی جغرافیے کے میدان میں نمایاں رہی۔

مرسلہ: اصغر علی۔ کراچی

یوسف علی خاں دنیا میں نہیں رہے تھے۔ نواب کلب علی خاں کا دورِ حکومت تھا۔ وہ خود بھی نامور شاعر تھے۔ دربار رام پور میں دہلوی اور لکھنوی شعرا کا مجمع تھا۔ منیر نے نواب کی تہنیت جلوس کا قطعہ تاریخ لکھ کر روانہ کیا تھا لیکن وہاں پہنچنے کی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔

وہ آگرہ میں تھا کہ انہیں نواب کلب علی خاں کے فرزند کی شادی کا علم ہوا۔ اس نے متعدد قطعات تاریخ لکھ کر ایک عریضے کے ساتھ رام پور روانہ کیے۔ یہ عریضہ کسی نیک ساعت میں لکھا گیا تھا کہ صرف پندرہ دن بعد ہی نواب کا بلاوا بمعہ زادِ راہ اسے مل گیا۔ وہ نومبر 1870ء کو رام پور پہنچا۔ اس موقع پر اس نے اپنے پرانے مخمس کو ضرورت کے لحاظ سے تبدیل کر کے نواب کے حضور پیش کیا۔

نواب پاک کلب علی خاں نے اے منیر
بلوا کے رام پور میں کی بخشش کثیر
صد شکر آئے راہ پر اب طالع فقر
ہے قدرداں مرا یہ امیر فلک سر پر
اب سرخرو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے

منیر کی غزل کا ایک مصرعہ تیرہ سال برابر سفر میں رہا اور تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب اس پر مقدمہ چلا تو اس کے قصور میں یہ مصرعہ پیش کیا گیا۔

''گوروں کے پاؤں اکھڑے ہیں کالوں کے سامنے۔''

جب نواب یوسف علی خاں کے سامنے ایک گویے نے منیر کی غزل پیش کی تو اس کا مقطع اس طرح سامنے آیا۔

''شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے''

نواب صاحب نے اس پر یہ گرہ لگائی۔

ناظم منیر آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

جب انڈمان سے رہائی کے بعد منیر کو معلوم ہوا کہ نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو چکا تو یہ مصرعہ یہ شکل اختیار کر گیا

''نادم رہا میں اپنے کمالوں کے سامنے''

اور جب وہ کوشش بسیار کے بعد کامیاب ہوا اور نواب کلب علی خاں کے دور میں رام پور پہنچا تو اس مصرعہ کی گویا تکمیل ہو گئی۔

''اب سرخرو ہوں اپنے کمالوں کے سامنے''

یہ اس کی خوش قسمتی ہی تو تھی کہ آخری عمر میں اسے رام پور کا دربار نصیب ہوا۔ دربدری کا دور ختم ہوا۔ اس کے بعد منیر نے کسی اور دربار کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ باقی تمام عمر یہیں گزار دی۔

شعر و ادب کی ترقی کے لیے جس سرپرستی اور امن چین کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان دنوں رام پور میں عام تھا۔ تمام ہندوستان کے قابل لوگ، ہر شعبہ، فن سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں کھنچ کھنچ کر آرہے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی منیر کو ماضی کا لکھنو یاد آگیا۔ وہی محافل تھیں، وہی ادب آداب تھے۔ شاعروں کی وہی کیفیت تھی، بخشش و انعام کی وہی گرم بازاری تھی۔ دہلی اور لکھنو کے نمایاں شعرا یہاں جمع ہو گئے تھے۔ دونوں کے اتصال سے ایک نیا دبستان شعر جنم لے رہا تھا۔ منیر اس کا حصہ بنا ہوا تھا۔ اسے یہاں پہنچ کر اس نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کوئی کوشش نہیں کرنی پڑی۔ بعض وہی شناسا صورتیں یہاں موجود تھیں جن کو وہ لکھنو اور کانپور میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے اب اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پورے ہندوستان کے روشن ستارے ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ اس وقت اور ریاستیں بھی تھیں۔ ورثۂ ادب کی حفاظت کر رہی تھیں لیکن رام پور ان سب میں نمایاں تھا حتیٰ کہ حیدرآباد جیسی بڑی ریاست کے مقابلے میں بھی وہ نمایاں تر ریاست تھی۔

نواب کلب علی خاں کے عہد میں مشاہیر شعرا کے یک جا ہونے اور خود نواب موصوف کے شغف علمی کی بدولت رام پور میں شعر و سخن کا بازار گرم تھا۔ نواب کلب علی خاں صبح سویرے ریاست کا کام کیا کرتے۔ سہ پہر کا وقت علمی مشاغل کے لیے وقف تھا۔ شعرا مصاحب منزل میں جمع ہو جاتے یہاں علمی مباحث ہوتے ہر جمعہ کو محفل مشاعرہ برپا ہوتی جس میں قرب و جوار کے سب شاعر شریک ہوتے۔

علما، فضلا، شعرا اور دیگر باکمال اصحاب کا جس قدر مجمع یہاں جمع ہو گیا تھا اس کی مثال شاہان مغلیہ اور شاہان اودھ کے درباروں میں ہو تو ہو دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔

مشاعروں کے علاوہ میلے بھی لگتے تھے جن میں بے نظیر کا جشن بطور خاص قابلِ ذکر تھا۔ منیر بھی ان میلوں میں شریک ہوتا اور جب کوئی نئی تعمیر ہوتی منیر اس کی یادگار میں قطعہ تاریخ رقم کرتا

کیا کروں باغ بے نظیر کا وصف

جس سے ظاہر ہے قدرت باری

نواب کلب علی خاں کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا۔ منیر کو بھی اس فن میں کمال حاصل تھا لہٰذا وہ بھی ان مناظروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

ان علمی سرگرمیوں کا سب سے پُرلطف پہلو وہ تھا جس میں نواب صاحب اپنے درباری شعرا کی مہارت کو آزمانے کے لیے فرمائشیں کیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی مشکل قافیہ دے دیا، کبھی کوئی مشکل ردیف، تمام شعرا اس پر طبع آزمائی کرتے۔ ایک مرتبہ نواب موصوف نے ایک سنگلاخ زمین طبع آزمائی کے لیے دی یعنی قوافی حضور، نور، سرور وغیرہ اور ردیف ''گردوں''۔ منیر نے بھی غزل کہی اور سب سے بڑھ کر کہی۔

میں اس کی بزم میں حاضر ہوں فضل خالق سے
نہ آئے رعب سے جس کے حضور میں گردوں
منیر نے جو بہ حکم حضور گھیرا ہے
پھنسا ہے کوچۂ بین السطور میں گردوں

اسی طرح اور بھی متعدد فرمائشی غزلیں اس کے قلم سے سرزد ہوئیں جو اس کے کلیات میں شامل ہوئیں۔

وہ کئی ٹھوکریں کھانے کے بعد رام پور آیا تھا خصوصاً انڈمان کی تکلیف دہ زندگی اور رہائی کے بعد عرصہ دراز تک جن پریشانیوں سے وہ گزرا تھا انہیں ابھی بھولا نہیں تھا لہٰذا اب جو چھاؤں ملی تو فرصت نے پاؤں پھیلائے۔ اس فرصت سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ رام پور کے قیام میں اس کے تین دیوان مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ اگر یہ ٹھکانا اسے نہ ملا ہوتا تو ممکن ہے اس کا یہ کلام ضائع ہو جاتا اور پڑھنے والے محروم رہ جاتے۔

ریاست رام پور میں رہتے ہوئے مالی اعتبار سے وہ اتنا آسودہ حال نہ ہوا جو زندگی اس نے فرخ آباد اور باندہ میں گزاری تھی لیکن جو نعمتیں اسے یہاں میسر آئیں وہ کہیں اور نہیں مل سکتی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنی موت تک یہیں مقیم رہا کسی اور ریاست کا رخ نہیں کیا۔

دس برس کی اس مدت میں جو اس نے رام پور میں بسر کی وہ درباری شاعر کی حیثیت سے ہر موقع پر داد سخن دیتا رہا اس کی کلیات میں چودہ قصائد اور متعدد تاریخی قطعات ہیں جو اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس دور کی غزلوں میں بھی قطعہ بند شعروں کی صورت میں نواب کلب علی خاں کی تعریف و توصیف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رام پور میں ایک مطمئن زندگی گزارتا رہا۔ رام پور کی علمی سرگرمیوں نے لکھنؤ کا خیال تک دل سے نکال دیا۔

کیا لکھنؤ سے کام جناب منیر کو
زنا بند زلفِ بتِ رام پور ہیں

......

شانِ و شوکت ہی میں بے مثل سمجھنا نہ منیر
شاعری میں بھی کوئی ہم سرِ نواب نہیں

1880ء کا سال اس وقت کے رام پور کی تاریخ میں یادگار بن گیا۔ ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی جو کامل تین مہینے جولائی، اگست اور ستمبر تک رہی۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی آدمی اس وبا میں مبتلا ہو رہا تھا۔ کثرت سے اموات واقع ہو رہی تھیں۔ سرکار نے علاج معالجے کی بڑی سہولتیں مہیا کیں لیکن پھر بھی قابو پاتے پاتے تین مہینے لگ گئے۔

ان دنوں دربار کا ماحول بھی بجھا بجھا تھا علمی مباحث کی جگہ اس وبا کے بارے میں ہی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن منیر بھی اس وبا کا شکار ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔ نواب کو معلوم ہوا تو ہاتھی پہ سوار ہوئے اور منیر کو دیکھنے اس کے گھر کڑہ جلال الدین میں گئے۔ شاہی اطبا کو حکم ہوا کہ اس کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے لیکن اس کا وقت آ گیا تھا۔ دو تین دن میں چٹ پٹ ہو گیا۔

13 اگست 1880ء کو جمعہ کے دن رام پور میں اس کا انتقال ہوا اور محلہ سرائے دروازہ لاڈلی جان کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

اس کی موت کے بارے میں یہ بھی مشہور ہوا کہ اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔

کسی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اس نے کوئی عمل کیا تھا جو الٹا ہو گیا اور اس کی موت کا سبب بنا، کسی داخلی شہادت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عملیات وغیرہ میں کمال رکھتے تھے یا عملیات کرتے رہتے تھے البتہ اس وقت کے اخباروں سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں رام پور ہیضے کی لپیٹ میں تھا، منیر کا انتقال اسی سال ہوا اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس کی موت کا سبب ہیضے کی بیماری بنا۔

ماخذات

مجاہد شاعر، منیر شکوہ آبادی۔ ڈاکٹر توصیف تبسم، احوال ریاست رام پور۔ سید اصغر علی شادانی

ہم پلہ

شکیل ادریس

بالی ووڈ کے ستاروں میں ایسے بے شمار نام ہیں جنھوں نے فن کی بلندیوں کو چھو کر خود کو منوایا۔ وہ بھی ایک ایسا ہی فنکار تھا جسے لوگ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے مگر جب اس نے فن کا مظاہرہ کیا تو لوگ انگشتِ بدنداں رہ گئے......

ایک عالمی شہرت یافتہ فن کار کا مختصر سا زندگی نامہ

شون کونری جب اپنے عروج پر تھا اور جیمز بانڈ کی حیثیت سے اس کی فلموں نے ساری دنیا میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔ جیمز بانڈ کلب قائم ہو چکے تھے اور متعدد مصنوعات پر 007 لکھا ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک بڑی فلم کی کاسٹنگ ہو رہی تھی یعنی اداکاروں کا انتخاب کہ شون کونری بھی ہدایت کار کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اس بڑے کمرشل کو دیکھ کر منہ بنایا اور ناگواری سے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس ٹائپ کے اداکار ہو؟ تمہیں عمدہ سوٹ پہننے، عورتوں

سے عشق لڑانے اور ہاتھ میں ریوالور تھامنے کے علاوہ کیا آتا ہے؟ میاں اداکاری بہت دشوار فن ہے اور اسے سیکھنے کے لیے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ جاؤ کوئی اور کام سیکھو۔ اسی میں بہتری ہے۔"

شون کونری نے اسے بتایا کہ وہ بہت بھاری معاوضہ لیتا ہے اور اس کے کریز میں امریکی قوم پاگل ہو چکی ہے۔ صدر امریکا جان ایف کینیڈی کا پسندیدہ ناول 'فرام رشیا ود لو' ہے۔ اس فلم کے بارے میں تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ یہ فلم لوگوں کے لیے اس طرح سے ضروری ہے جیسے شام کی چائے کی پیالی۔

ہدایت کار نے جواب دیا کہ وہ ان سب چیزوں کو تسلیم کرتا ہے، لیکن جب جیمز بانڈ کے 14 ناول فلم بند ہو جائیں گے تب وہ کیا کرے گا؟

شون کونری وہاں سے دل برداشتہ چلا آیا لیکن بات اس کے دل میں کچوکے لگانے لگی کہ جیمز بانڈ جیسے کتابی کردار کو حقیقت میں جیتا جاگتا بنا دیا تھا مگر بذاتِ خود وہ اداکاری کی کسی سطح پر نہیں پہنچ سکا ہے۔ یعنی وہ اداکار نہیں ہے اور صرف لپاڈگی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اب اسے جیمز بانڈ نہیں بننا چاہیے۔ اس نے ایک پریس کانفرنس بلا کر اس کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا کہ اب وہ فلموں میں جیمز بانڈ کا کردار ادا نہیں کرے گا۔ وہ حقیقی اداکار بننا چاہتا ہے۔

اس کے اس اعلان سے دنیائے فلم میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اسے بہت سمجھایا گیا کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لے مگر شون کونری پر اداکار بننے کا جنون طاری ہو چکا تھا اس لیے وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا اور اس نے بانڈ کی حیثیت سے کوئی اور فلم سائن نہیں کی۔

جیمز بانڈ کے خالق آئن فلیمنگ نے اس کردار پر کل 14 ناول لکھے تھے۔ جن میں صرف چھ کو اسکرین پر پیش کیا جا سکا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جیمز بانڈ کون بنے؟ کیونکہ اس کی فلمیں کاروباری لحاظ سے دھوم مچا چکی تھیں اور اب بھی توقع تھی کہ باقی فلمیں کروڑوں ڈالر کا بزنس کریں گی۔ اس سیریز کو ایسے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے رائٹر آئن فلیمنگ سے ایک فلم ساز نے سارے ناولوں کو فلم بند کرنے کے حقوق خرید لیے تھے۔

شون کونری نے سخت محنت کر کے اپنا جسم بنایا تھا۔ سوٹ پہننے اور ریوالور ہاتھ میں تھامنے کے بعد وہ ہلاکت خیز جاسوس نظر آتا تھا۔ اپنی پھرتی اور قدرتی اداکاری سے اس نے کردار میں جان ڈال دی تھی۔ ہالی ووڈ کے تمام اداکاروں کا بائیو ڈیٹا دیکھا گیا اور ان کی تصاویر کو سامنے رکھا گیا تو اندازہ ہوا کہ راجر مور، جو اس وقت سینٹ (سائمن ٹمپلر) کا کردار ادا کرنے کے بعد شہرت کی کافی سیڑھیاں طے کر چکا تھا اور 1973ء سے لے کر 1985ء تک لوگوں کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا، اس کردار پر بالکل فٹ آتا ہے، لہٰذا اسے پیشکش کی گئی کہ وہ اس کردار کو ادا کرے۔ اس نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ دوسرے ہی دن سے خبروں میں آ گیا اور کیمرے کے بلب جھپاک جھپاک سے اس کی تصویریں کھینچنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے ثابت کر دکھایا کہ وہ شون کونری سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے اور اسے کونری کا ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

راجر مور 14 اکتوبر 1927ء کو لندن بروگ آف لیمبتھ میں پیدا ہوا۔ وہ جارج الفرڈ مور کا اکلوتا بیٹا تھا، جو پولیس مین تھا۔ راجر مور کو اس کے باپ نے ابتدائی تعلیم کے لیے بیٹریا گرامر اسکول میں داخل کرایا۔ ان دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک بار سارا خاندان پکنک کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا مگر اس کی ماں نے جب اسے کرسی پر کھڑا کر کے اس کے گلسوے (ٹانسلز) کا جائزہ لیا اور فیصلہ سنایا کہ وہ پکنک پر نہیں جا سکتا۔

راجر مور ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"تھوڑی دیر بعد انکل جیک آ گئے۔ ان کی موجودگی میں انسان اپنے غم بالائے طاق رکھ دیتا تھا۔ وہ فوج میں سپاہی تھے لیکن جب بھی لندن آتے تھے، ہمارے گھر ضرور آتے تھے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جب وہ آئیں تو گھر سے کبھی نہ جائیں۔ مجھے ان کی وردی اتنی پسند تھی کہ میں اس پر دیر تک ہاتھ پھیرا کرتا اور اسے سونگھا بھی کرتا تھا، اس لیے کہ وہ جن جن ممالک میں جاتے تھے، ان ممالک کی بو مجھے ان کی وردی سے آتی تھی۔ وہ ممی کے بڑے بھائی تھے۔ اس لیے ہم پر بہت شفقت کرتے تھے۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی، اس لیے ہمیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے دلاسا دیا کہ وہ بعد میں مجھے پکنک پر لے جائیں گے اور خوب سیر کرائیں گے۔ مجھے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری صبح ممی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں تو اس نے بتایا کہ مجھے ڈبل نمونیہ ہو گیا ہے۔ اس نے میرے سینے

پر برانڈی ملی اور پھر ایک چمچ میں تھوڑی سی گھول کر پلا بھی دی۔ گویا میں اس کے مزے سے چھوٹی سی عمر ہی سے واقف ہو گیا تھا۔ کافی دنوں تک علاج ہوتا رہا اور معلوم نہیں میں کب صحت مند ہو گیا۔ اس اثنا میں خاندان کے لوگ پکنک منا کر آ گئے۔

میری ابتدائی زندگی حادثات سے پُر ہے۔ اس لیے کہ میں جب بھی پڑھائی جاری رکھنا چاہتا تھا کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ ہوا یوں کہ جب میں ایک بار خربوزہ توڑنے کے لیے انکل جیک کے ساتھ کوئلے کی کوٹھری کے قریب پہنچا تو انکل نے مجھ سے کہا کہ میں چھت پر چڑھ کر خربوزے توڑ لاؤں۔ میں کافی دشواری سے چھت پر تو چڑھ گیا، لیکن دھڑام سے کوٹھری کے اندر جا پڑا اور سر سے پاؤں تک کالا ہو گیا۔ اس لیے کہ کوٹھری کی چھت زنگ آلود ہو کر شکستہ ہو چکی تھی جس کے بارے میں کسی کو گمان ہی نہیں تھا۔ میری ایک ٹانگ میں زبردست چوٹ آئی اور ٹانکے لگانا پڑے۔ میں ایک بار پھر اسکول جانے سے رہ گیا۔

آپ پوچھیں گے کہ میرے بچپن کی سب سے حسین یادیں کہاں سے وابستہ ہیں تو میں کہوں گا کہ جب ہم اپنا یہ فلیٹ چھوڑ کر دوسرے فلیٹ میں گئے۔ وہاں ایک پارک تھا جہاں سے خوشبودار پودوں کی رومان پرور بو آتی رہتی تھی۔ نزدیک ہی ایک لکڑی کاٹنے والی فیکٹری بھی تھی جہاں قسم قسم کی لکڑیاں کٹتی تھیں تو ان کی خوشبو سے بھی دماغ معطر رہتا تھا۔ سب سے ناگوار اور دل پر بوجھ بن جانے والی یادیں بھی اسی پارک سے وابستہ ہیں۔

جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو فوج کے سپاہی آئے اور انہوں نے پارک کے گرد لگی ہوئی فولادی ریلنگ اکھاڑ کر نکال لی۔ ممی نے بتایا کہ اس سے اسلحہ بنایا جائے گا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ گویا جس ریلنگ سے میں ٹیک لگا کر کھیل تماشے کرتا تھا اور جس پر چڑھ کر چھلانگیں لگایا کرتا تھا اس سے بم اور گولیاں بنائی جائیں گی اور لوگوں کو ہلاک کیا جائے گا۔

میرے دوست جنگ کا کھیل کھیلا کرتے اور ایک دوسرے پر فائرنگ کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہاں سے وہ ٹین کے پستول لے آئے تھے۔ اس سے مصنوعی گولیاں برساتے تھے۔ مگر میں ان سب چیزوں سے دور رہا کرتا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے جنگ اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں کسی کو اپنا "دشمن" نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔ جب میں بالغ ہو گیا تو قدرت نے موقع دیا اور میں نے کافی ملکوں کی سیر کی۔ مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کیں جو نافہم زبانیں بولتے تھے، لیکن میں نے کبھی کسی کو دشمن نہیں سمجھا۔ دوسروں کو "دشمن" سمجھنا تو انسانیت سوز عمل ہے۔

بچپن کی یادوں میں اسکیٹس (پہیوں والے جوتے) باندھ کر میں ممی کے ساتھ تولس ہلز جایا کرتا تھا اور وہاں سے سڑک پر دوڑتا ہوا اپنے پارک تک آ جایا کرتا تھا۔ ممی نے وعدہ کیا تھا کہ جب میرا پاؤں بڑا ہو جائے گا تو وہ مجھے اپنے اسکیٹس دے دیں گی۔ میں ان دنوں اپنے پاؤں روزانہ ناپا کرتا تھا کہ شاید کسی روز وہ اچانک بڑے ہو جائیں اور اسکیٹس مجھے مل جائیں۔ پھر میں انہیں پہن کر سڑکوں پر دوڑا کروں گا۔"

☆☆☆

وہ اسکول میں زیادہ دن پڑھائی جاری نہیں رکھ سکا اس لیے کہ جب اس کی عمر دس برس ہوئی تو اسے ایک خانہ بدوش نے اغوا کر لیا اور سرکس والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اپنی زندگی کے آئندہ پانچ برسوں تک وہ ہاتھیوں کو پانی پلاتا اور گھوڑوں کے اصطبل کو صاف کرتا رہا۔ جب وہ سرکس پیرس پہنچا تو راجر کو کسی طرح سے موقع مل گیا اور وہ سرکس سے فرار ہو کر لوور کے میوزیم میں چلا گیا۔ لوور کا تصویری میوزیم ساری دنیا میں اپنی نادر اور کمیاب پینٹنگز کے سبب مشہور ہے۔ وہاں اس نے مائیکل انجیلو، پکاسو اور لیونارڈو کی پینٹنگز دیکھیں اور دیکھتا رہ گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ایک روز ایسی ہی پینٹنگز بنائے گا۔ پہلے روز وہ میوزیم کے ٹوائلٹ روم میں چھپ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بہت سی جگہیں تلاش کر لیں جہاں خود کو پہرے والوں کی نگاہ سے چھپایا جا سکتا تھا۔ اس دوران اس نے دربان کو اپنا دوست بنا لیا۔ وہ اسے میوزیم اسٹاف کا بچا کھچا کھانا کھلا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑوں کا مسئلہ ایسے حل ہوا کہ انہی لوگوں کے اترے ہوئے کپڑے کاٹ چھانٹ کر اپنے ناپ کے بناتا اور پہن لیتا۔

یہ سلسلہ سات برس تک چلتا رہا۔ اس اثنا میں اس نے ایک کیمرا خرید لیا اور اس میوزیم میں لگی بیشتر پینٹنگز کی تصویریں کھینچ لیں۔ جب اس نے باہر جا کر وہ تصویریں فروخت کیں تو اچھے داموں سے بک گئیں۔ اس نے یہ کام جاری رکھا اور کچھ رقم پس انداز کر کے گھر بھیجنا شروع کر دی۔ اس کے بعد اس نے جب کافی رقم جمع کر لی تو وہ پیرس

سے ٹرین میں بیٹھ کر لندن چلا آیا۔

تعلیم بہر حال ضروری تھی۔ اس کے باپ نے دوبارہ اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول کا علاقہ متاثرہ جگہ پر تھا۔ اس کے باپ نے اسے چانسلرز گرامر اسکول میں داخل کرا دیا، جو امرشیم بکنگھم شائر میں واقع تھا۔ ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد راجر مور نے ڈیوراہام یونی ورسٹی میں پڑھائی جاری رکھی۔ مگر گریجویشن نہ کر سکا۔ بیس برس کی عمر میں جب کہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی وہ فوج میں بھرتی ہو گیا اور اسے کیپٹن کا عہدہ دیا گیا۔

راجر مور نے رائل آرمی سروس کی اور اسے مغربی جرمنی میں پوسٹ کر دیا گیا۔ فوج میں رہ کر اس ۔ . . رزش کی تو اس کا جسم سڈول اور متناسب ہو گیا ورنہ وہ اس سے پیشتر فربہ اور بھدا تھا۔ اسکول کے لڑکے اسے بلغ کہہ کر مذاق اڑاتے تھے۔

کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد اس کو انٹرٹینمنٹ برانچ میں منتقل کر دیا گیا۔ جب اس نے فوج کو چھوڑ دیا تو اپنے اس جذبے کی تشکیل کی کہ اگر وہ پینٹر نہیں بن سکا ہے تو اسے فلم میں کام کرنا چاہیے۔ اسی اثنا میں راجر مور نے رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ میں داخلہ لے لیا، تاکہ اداکاری کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کر سکے۔ رائل اکیڈمی کی فیس ادا کرنے اور پیٹ پالنے کے لیے اس نے ایک کارٹون اسٹوڈیو میں کام شروع کر دیا۔ اسٹوڈیو سوہو پر تھا اور راجر کو وہاں ساڑھے تین پونڈ فی ہفتہ ملا کرتے تھے۔

ہدایت کار برین ڈسمنڈ ہرسٹ کو اس میں اداکاری کے جوہر نظر آئے تو اس نے راجر کو ایک فلم میں ایکسٹرا اداکار کی حیثیت سے ایک کردار دے دیا۔ فلم بندی کے دوران وہ راجر کی فیس ادا کرتا رہا۔ ایک کے بعد دوسری فلم مل گئی اور وہ بدستور ایکسٹرا اداکار کے طور پر اداکاری کے جوہر دکھاتا رہا۔ فلم 'سیزر اور قلوپطرا' جو 1945ء میں بنی اس میں راجر کو ایک مناسب کردار دیا گیا۔ فلم میں اس نے اپنی فنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔

اس کی حقیقی اداکارانہ زندگی کی ابتدا 1950ء سے ہوئی جب اسے ماڈل کی حیثیت سے مختلف اشتہارات میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ اشتہارات اون سے سوئیٹر بُننے کے تھے جس میں وہ نت نئے سوئیٹر پہن کر اشتہارات میں آتا تھا۔ دیکھا دیکھی ٹوتھ پیسٹ کی ایک کمپنی نے بھی اسے اپنی اشتہاری فلموں میں لینا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ٹیلی وژن کے ایک چینل کے ہدایت کار کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اس نے راجر کو مئی 1950ء میں ایک کام دے دیا۔ اسے اس نے ڈرائنگ روم کا سراغ رساں بنایا تھا۔ اسی دوران میں ایم جی ایم جیسے بڑے ادارے نے اسے ایک فلم میں کام دیا۔ لیکن فلم کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی، اس لیے راجر کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا گیا۔ یعنی کہ وہ تھا یا نہیں یہ کسی کو پتا نہ چل سکا۔

حقیقت میں فلم سے زیادہ ٹیلی وژن نے راجر کو سہارا دیا اور اس کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ وہ ناظرین کی نظروں میں بستا چلا گیا۔ اس کی دو سیریزوں نے اسے ایکسٹرا سے اداکار بنا دیا۔

لیسلی چارٹرس نے دی سینٹ کا کردار تخلیق کیا تھا جو مجرم کردار تھا، مگر لوگوں کو پسند آ گیا۔ اردو ناولوں کے شہرۂ آفاق مصنف ابن صفی کا کہنا تھا کہ انہیں سینٹ کا کردار بالکل پسند نہیں تھا، اس لیے ہر مصنف کو قارئین کو قانون کا احترام سکھانا چاہیے، نا کہ مجرموں کو ہیرو بنا کر پیش کرنا چاہیے؟ (سینٹ کے کردار سے متاثر ہو کر ظفر عمر حیات نے "بہرام سیریز" لکھی تھی جو 1950ء کے لگ بھگ شائع ہوتی تھی اور لوگ اس کے کارنامے پسند کرتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں کو پتا ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ پڑھ کیا رہے ہیں۔ بس جو مل گیا وہ پڑھ ڈالا)۔ لیسلی چارٹرس کا کردار سائمن ٹمپلر (دی سینٹ) انگریزی میں مقبول ہوا اور اس پر فلمیں اور ٹیلی وژن سیریز پیش کی گئیں۔ ہدایت کار لیو گریڈ نے راجر مور کی اسمارٹنس دیکھ کر اسے 1963ء میں سینٹ کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کی، جو راجر مور نے منظور کر لی۔

ٹیلی وژن سیریز برطانیہ میں بنائی جا رہی تھی، لیکن یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ امریکا اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی پسند کی جائے۔ وہ کام کرتا رہا۔ 1963ء سے 1967ء تک یعنی چار برس میں راجر مور ایک بین الاقوامی اداکار کی حیثیت سے مشہور ہو گیا اور اس کا شمار ٹاپ اسٹارز میں ہونے لگا۔ یہ سیریز اب تک بلیک اینڈ وہائٹ میں بن رہی تھی مگر 1967ء سے رنگین بننے لگی۔ اس لیے کہ فلم ساز اسے دنیا کے سارے ممالک میں فروخت کرنا چاہتا تھا۔

1962ء سے سینٹ کی چھ سیریز بنیں اور اس میں 118 اقساط پیش کی گئیں۔ طویل ترین اقساط میں صرف ایک ٹیلی وژن سیریز "دی ایونجرز" ہی اس کا مقابلہ کر سکی۔ اس کی طوالت سے راجر مور اکتاہٹ کا شکار ہو گیا۔

سیریز ختم ہوتے ہی اس نے مزید دو فلموں میں کام کیا۔ 'اسپائی کیپر' اور 'دی مین ہو ہائنڈ ہم سیلف' آخرالذکر فلم 1970ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ فلموں نے زیادہ بزنس نہیں کیا تھا، مگر راجر نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک ورسٹائل اداکار ہے۔ آخری فلم میں اس کا کردار لوگوں نے پسند کیا اور نقادوں نے بھی اس کی تعریف کی۔

اس زمانے میں اسے تولیا چوری کرنے کا دل چسپ شوق تھا۔ جس طرح لوگ ڈاک کے ٹکٹ، سکے اور ماچس کے لیبل جمع کرتے ہیں اسی طرح راجر کو ہوٹل کے تولیے جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ جس ہوٹل میں بھی ٹھہرتا تھا وہاں سے تولیا اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لیتا تھا۔ جب ایک اخبار نے اس کے بارے میں ایک کہانی اس عنوان کے تحت شائع کی "راجر مور تولیا چور ہے۔" راجر نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تولیا چوری کرنا چھوڑ دیے لیکن اپنے ایک اخباری بیان میں اس کا اعتراف کرنے کے بعد انکشاف کیا کہ اس کے سوئٹزرلینڈ والے مکان میں تولیوں کا کلکشن رکھا ہے۔

ٹیلی وژن کے پروڈیوسر اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو چکے تھے، اس لیے انہوں نے اس کے لیے ایک اور سیریز تیار کی جس میں اس کے ساتھ ٹونی کرٹس کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ سیریز کا نام "دی پرسوئڈرز" تھا۔ یہ دو پلے بوائز کی کہانی تھی جو سارے یورپ میں گھومتے پھرتے ہیں اور نت نئی اور دل چسپ حرکتیں کرتے پھرتے ہیں۔ اس سیریز کے لیے راجر کا معاوضہ دس لاکھ پونڈ تھا۔ یہ ایک ریکارڈ معاوضہ تھا، اس لیے کہ اس سے پیشتر کسی اداکار کو ساری دنیا میں اتنا معاوضہ نہیں ملا تھا۔ سیریز زیادہ عرصے تک نہیں چل سکی اس لیے کہ ٹونی کرٹس سیٹ پر تاخیر سے پہنچتا تھا جب کہ راجر مور اوور ٹائم کرنے پر بھی آمادہ رہتا تھا۔ اس سیریز کی 24 اقساط تھیں۔ دل چسپ بات یہ کہ امریکا میں یہ سیریز فلاپ ہو گئی جب کہ آسٹریلیا اور یورپ کے بہت سے ممالک میں اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ برطانیہ میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ جرمنی میں اسے ہٹ قرار دیا گیا۔ فرانس میں جب یہ لوگوں کی پسندیدہ بن گئی تو DVD پر پیش کی گئی اور اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔

1966ء میں جب شون کونری نے اعلان کر دیا کہ اب وہ جیمز بانڈ کا کردار ادا نہیں کرے گا تو راجر مور کو توقع تھی کہ یہ کردار اسے پیش کیا جائے گا، لیکن ہدایت کار کو جارج لیزن بے میں نہ جانے کیا خصوصیت دکھائی دی کہ اس نے اسے یہ پیشکش کی۔ مگر فلم کی ناکامی کے بعد جب "کسی اور" جیمز بانڈ کی تلاش ہونے لگی تو راجر مور کا انتخاب کر لیا گیا۔ اعلان کیا گیا کہ اس کی جیمز بانڈ کی حیثیت سے پہلی فلم "لیو اینڈ لٹ ڈائی" ہوگی۔

راجر مور نے اعتراف کیا: "بانڈ کی حیثیت سے اسکرین پر آنا ناکوں چنے چبانے کے مترادف تھا، اس لیے کہ مجھے ایسی اداکاری کرنا تھی کہ لوگ یہ تبصرہ کریں کہ ہاں یہ واقعی جیمز بانڈ لگ رہا ہے، دوسرے یہ کہ لوگ اس قسم کا تبصرہ نہ کریں کہ یہ تو شون کونری کی نقل کر رہا ہے۔ گویا یہ کردار ادا کرنا تھا اور اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھنا تھی۔ میں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور کامیاب رہا۔ پہلی فلم کی ریلیز کے بعد کسی نے یہ تبصرہ نہیں کیا کہ میں نے شون کونری کی نقل کی ہے۔ شوٹنگ کے دوران میں نے اپنے بیٹے سے پوچھا کہ تمہیں شون کونری پسند ہے یا میں؟ اب تو میں جیمز بانڈ ہوں؟ اس نے جواب دیا کہ اگر اصلی جیمز بانڈ (شون کونری) آ جائے تو تمہارے منہ پر مُکا مار کر سارے دانت توڑ سکتا ہے۔ تمہیں ایسی فائٹنگ کہاں آتی ہے؟

فلم کی ہیروئن بھی بھرپور عورت تھی، بالکل پٹاخا۔ اس لیے میری بیوی ہر شوٹنگ میں موجود رہا کرتی تھی کہ میں اس سے زیادہ فری نہ ہو جاؤں۔ اسے میری مردانہ وجاہت سے ہر لحظہ خوف اور اندیشہ رہتا ہے۔ یسوع مسیح کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں بھی کامیاب رہا اور میں نے فلم کی ہیروئن کو منہ نہ لگایا (محاورتاً نہیں حقیقتاً)۔

"لیو اینڈ لٹ ڈائی" کی باقاعدہ فلم بندی لوزیانہ میں شروع ہوئی۔ اس وقت راجر کے گردوں میں درد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ اس کے گردے میں پتھری ہے، لہٰذا فلم کے دوسرے مناظر فلم بند کیے گئے اور باقی اداکاروں سے کام لیا جاتا رہا۔ دسمبر 1972ء میں پائن ووڈ اسٹوڈیو اور پھر ہرلم میں شوٹنگ ہوئی۔ فلم کے ایک منظر میں جیمز بانڈ مگرمچھوں کے تالاب میں پھنس جاتا ہے اور ان کے سروں پر پاؤں رکھ کر دوڑتا ہے اور تالاب سے نکل آتا ہے۔ اس منظر کو ہانگ کانگ میں فلم بند کیا گیا اور ایک ڈپلی کیٹ روز کانانگا کی مدد سے پانچ بار میں فلم بند ہو سکا۔ آخری بار میں ایک مگرمچھ نے اس اداکار کی ایڑی پر اپنے دانت آزمائے تھے لیکن وہ پھرتی سے اپنی جان بچا کر تالاب سے نکل آیا اور مگرمچھ صرف اس کی ایڑی کے قریب

پتلون کا پائنچہ ہی چبا سکا۔ اس کی گردن بچ گئی۔ ورنہ مگرمچھ اس کی بوٹیاں اڑا کر شاندار ڈنر کرتے۔

فلم میں چند مناظر سانپوں کے ساتھ بھی ہیں۔ مارتھا نامی ایک مصنفہ نے اس کا منظرنامہ لکھا تھا، اس نے سانپوں کے خوف سے سیٹ پر جانے سے انکار کر دیا۔ ایک اداکار سیٹ پر ان کے خوف سے بے ہوش بھی ہو گیا۔ بہرحال جیوفرے ہولڈر نامی ایک اداکار قطعی نہیں ڈرا اور منظر فلم بند کرانے پر رضامند ہو گیا (اس لیے کہ اس روز شہزادی الیگزینڈرا اسٹوڈیو میں فلم کی شوٹنگ دیکھنے آ رہی تھیں)

فلم میں بوٹ کے تعاقب کے مناظر بھی ہیں۔ جیمز بانڈ فرار ہو رہا ہے اور مجرم اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ایک کمپنی نے اس کے لیے ہدایت کار کی ہدایت پر 26 بوٹس تیار کیں جن میں سے 17 بوٹس شوٹنگ کے دوران تباہ و برباد ہو گئیں۔

فلم کے ایک منظر میں جیمز بانڈ مجرموں کا تعاقب ڈبل ڈیکر بس میں کر رہا ہوتا ہے کہ مجرم ایک پل کے نیچے سے گزر کر فرار ہونا چاہتے ہیں، لیکن بانڈ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور ڈبل ڈیکر کو پل کے نیچے سے گزار دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی بس کی اوپری منزل کٹ کر دور جا پڑتی ہے۔

ہدایت کار نے ڈبل ڈیکر کی دو منزلیں بنوائیں۔ اوپری منزل کے نچلے حصے میں بال بیرنگ لگائے گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ حصہ پل کے نچلے حصے سے ٹکراتا ہے تو پھسلتا ہوا ایک طرف جا پڑتا ہے۔ باقی سنگل ڈیکر بس نیچے سے گزر جاتی ہے۔ (اور تماشائیوں کا سانس رک جاتا ہے کہ بانڈ نے کتنا خوف ناک کارنامہ انجام دے دیا)

☆☆☆

جیمز بانڈ کی حیثیت سے راجر کی دوسری فلم ''دی مین ودھ دی گولڈن گن'' تھی۔ جس کی شوٹنگ اپریل 1974ء سے تھائی لینڈ میں شروع کی گئی۔ شوٹنگ بینکاک میں بھی کی جاتی تھی۔

دل چسپ بات یہ کہ جب بینکاک کے ایک جزیرے پر شوٹنگ ہو چکی تو اسے جیمز بانڈ آئی لینڈ کہا جانے لگا (اب یہ نام سیاحوں کی کتاب میں بھی لکھا جانے لگا ہے) فلم کے ایک منظر میں باکسنگ بھی دکھائی گئی ہے، جو ایک اصلی باکسنگ اسٹیڈیم میں فلم بند کی گئی۔

فلم میں مجرم سونے کا پستول استعمال کرتا ہے۔ یہ ایک مشہور کمپنی نے تیار کیا تھا اور اس کا وزن 23 قیراط تھا۔ اس کی قیمت اندازاً 80 ہزار پونڈ تھی۔ شوٹنگ کے بعد وہ پستول کھو گیا۔ چنانچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چوری ہو گیا۔ کوئی کارکن اسے لے اڑا۔

یہ فلم 70 لاکھ ڈالر کے بجٹ سے تیار کی گئی تھی۔ جب کہ اس نے ساری دنیا میں باکس آفس پر 9 کروڑ 70 لاکھ ڈالر کا بزنس کیا۔ صرف امریکا میں اس کا بزنس 21 لاکھ ڈالر کا تھا۔ بزنس کے اعتبار سے یہ فلم ساری بانڈ فلموں میں چوتھے نمبر پر رہی۔

ٹائم میگزین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ راجر مور اس فلم میں شون کونری کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے۔ شاید یہ بانڈ کی سب سے بکواس فلم ہے۔ تاہم تبصرہ نگار کو مجرم اسکارا مانگا اور بانڈ کے وہ مناظر اچھے لگے جو فن ہاؤس میں فلم بند کیے گئے تھے۔ لیکن وہ فلم کے اختتام سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے لکھا کہ اسکارا مانگا کا کردار جس اداکار نے ادا کیا ہے اسے بانڈ کی فلموں کے مجرموں میں پانچویں نمبر پر رکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ ہیروئن کو اس نے تیسرے نمبر پر رکھا ہے۔ جو فیشن ایبل کپڑے زیبِ تن کرتی ہے اور موقع ملنے پر انہیں اتار کر اپنے جسم کی نمائش بھی کرتی ہے۔

☆☆☆

راجر کی تیسری بانڈ فلم ''دی اسپائی ہو لوڈ می'' کی شوٹنگ کا افتتاح وزیرِ اعظم ہیرالڈ ولسن نے کیا تھا۔ اس کے ایک منظر میں جیمز بانڈ ٹوٹے ہوئے پل پر سے کار اڑاتا ہوا دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اسے ایک ڈپلی کیٹ نے پچاس ہزار ڈالر لینے کے بعد فلم بند کرایا۔ فلم میں وہ منظر تیز ٹیمپو میں تھا، مگر ہدایت کار نے منظر کو سلو موشن میں دکھایا۔ مصر میں اہراموں پر شوٹنگ کرنے کے دوران کافی دقت پیش آ رہی تھی اس لیے اہراموں کے قدِ آدم ماڈل بنا کر شوٹنگ کی گئی اور اسے اصل اہراموں کے مناظر سے جوڑ دیا گیا۔

☆☆☆

''مون ریکر'' میں راجر مور چوتھی بار جیمز بانڈ بنا۔ یہ فلم یونائیٹڈ آرٹسٹ اور ایم جی ایم نے مل کر ریلیز کی تھی۔ ان دنوں چونکہ برطانیہ میں ٹیکس بڑھا ہوا تھا، اس لیے ایک دو مناظر کے علاوہ فلم کے بڑے حصے کی شوٹنگ پیرس کے تین بڑے اسٹوڈیوز میں کی گئی۔ جس سیٹ پر کلائمکس کا منظر فلم بند کیا جانا تھا اس میں 100 ٹن مختلف دھاتوں کے ٹکڑے، دو ٹن کیلیں اور دس ہزار فٹ لکڑی استعمال کی گئی۔ فلم کا یہ سیٹ تین منزلہ تھا۔

جب کہ بانڈ کی مجرم کے ساتھ اٹھا پٹخ کو دوسری جنگِ عظیم میں استعمال ہونے والی ایک ائیر کرافٹ فیکٹری میں فلم بند کیا گیا۔ فلم بندی کے دوران سیٹ پر سب سے زیادہ شیشہ توڑا گیا۔ فلم کی شوٹنگ پیرس کے علاوہ وینس، کیلی فورنیا، فلوریڈا، ریو ڈی جنریو اور لندن کے مضافاتی علاقے میں کی گئی۔

فلم کے ابتدائی منظر میں مجرم کا ساتھی جاز (جس کے جبڑے فولاد کے ہوتے ہیں) بانڈ کو اٹھا کر طیارے سے باہر پھینک دیتا ہے اور بانڈ بغیر پیراشوٹ کے ہوا میں تیرتا ہوا ایک سرکس میں جا گرتا ہے۔ یہ منظر ایسے ڈپلی کیٹس کے ذریعے فلم بند کیا گیا تھا جو بغیر پیراشوٹ کے فضا میں چھلانگ لگانے کا تجربہ رکھتے تھے۔ یہ منظر 88 ڈپلی کیٹس کی مدد سے فلم بند ہوا۔ جب کہ اسٹوڈیو میں راجر مور اور جاز کے مناظر فلم بند ہوئے اور انہیں جوڑ دیا گیا۔

ناسا کا شٹل اسپیس پروگرام اس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آیا تھا اس لیے راکٹوں کے سیٹ بنانا پڑے۔ جہاں انہیں دھواں خارج کرنا تھا وہاں باریک نمک کا استعمال کیا گیا۔ راکٹ کے نچلے حصے سے نمک دھواں بن کر خارج ہوتا ہے۔

ساری دنیا میں اس فلم نے باکس آفس پر 21 کروڑ ڈالر کا بزنس کیا۔ نیویارک ٹائمز نے اس فلم کو گولڈ فنگر کے بعد سب سے اچھی بانڈ فلم قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ اس فلم کے ویژول افیکٹ بہترین ہیں اور راجر مور بالکل فریش لگتا ہے۔ اس فلم کو ایک رسالے نے بہترین سائنس فکشن فلم قرار دیا۔

☆☆☆

''فار یور آئیز اونلی'' راجر کی بانڈ کی حیثیت سے پانچویں فلم تھی۔ مزے دار اور دل چسپ۔ اس کی شوٹنگ اٹلی اور بہاماز میں ہوئی۔ فلم کے جو مناظر زیرِ آب فلم بند ہونا تھے، وہ ہدایت کار نے نہایت عمدگی سے پانی میں جائے بغیر فلم بند کر لیے۔ روشنی کا تاثر، بلبلے بنانے کا عمل اور پانی میں لہریں پیدا کرنے کے عمل نے فلم دیکھنے والوں کو یہ تاثر دیا کہ وہ بانڈ کو زیرِ آب دشمن سے مقابلہ کرتے دیکھ رہے ہیں۔

یونان میں ایک خانقاہ میں فلم بندی کے لیے فلم ساز نے ایک پادری کو بھاری رقم دے کر اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ مگر جب ہدایت کار نے فلم کی شوٹنگ کی ابتدا کرنا چاہی تو باقی پادریوں نے شور مچا دیا کہ یہ ان کی مقدس جگہ ہے، یہاں کسی کو لغویت پھیلانے کی اجازت نہیں ہے۔ مقدمہ یونان کی سپریم کورٹ میں گیا تو بڑی عدالت نے فیصلہ سنایا کہ خانقاہ کا اندرونی حصہ پادریوں کا ہے جب کہ بیرونی حصے میں شوٹنگ کی جا سکتی ہے۔ وہ حصہ حکومت کا ہے۔ چنانچہ شوٹنگ شروع کر دی گئی۔

شوٹنگ کے دوران پادری اندرونی حصے میں بند ہو کر بیٹھ تو گئے لیکن انہوں نے شوٹنگ کو سبوتاژ کرنے کی ساری کوششیں کر ڈالیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کھڑکیوں سے اپنے کپڑے نکال کر ہوا میں لہرانا شروع کر دیے۔ کھڑکیوں میں رنگین جھنڈے لگا دیے، اس کے علاوہ جگہ جگہ تیل کے ڈرم رکھ دیے تاکہ شوٹنگ کا عملہ وہاں ہیلی کاپٹر نہ اتار سکے اور اس کی جان مصیبت میں پڑ جائے۔

''ایسپرگلوسیس'' ان مختلف بیماریوں کا ایک گروپ ہے جس کا سبب Aspergillus نام کی ایک پھپھوند ہوتی ہے۔ یہ پھپھوند یا فنگس عموماً سانس لینے کے نظام کو اپنا نشانہ بناتی ہے جس میں سانس کی نالی، چہرے اور آنکھوں کے گرد ہڈیوں کے گڑھے یا جوف (Sinuses) اور پھیپھڑے شامل ہیں لیکن یہ مرض جسم میں کہیں بھی پھیل سکتا ہے۔ ''ایسپرگلوسیس'' کی علامتیں شدت کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ معتدل قسم کی شکایت میں سینے سے سیٹی جیسی آواز نکل سکتی ہے اور اگر مرض شدت اختیار کر لے تو مریض کو خون کی الٹیاں ہو سکتی ہیں۔ جن لوگوں کا جسمانی مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے وہ اس عارضے میں زیادہ مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یہ مرض اس وقت لاحق ہوتا ہے جب کوئی شخص اس پھپھوند کے بہت ہی چھوٹے ذرات کو سانس کے راستے جسم میں داخل کرتا ہے۔ جن لوگوں کا Immune System توانا ہوتا ہے وہ جسم میں داخل ہوتے ہی اس۔ پھپھوند کو پھیپھڑوں تک پہنچنے سے پہلے ہی الگ کر کے ختم کر دیتا ہے لیکن کمزور جسمانی دفاعی نظام اس سے شکست کھا جاتا ہے اور پھپھوند اس میں جگہ بنا لیتی ہے۔ ''ایسپرگلوسیس'' متعدی مرض نہیں ہے اور انسانوں سے دوسرے انسانوں یا جانوروں کو منتقل نہیں ہوتا۔

مرسلہ: نوشین عارف۔ کراچی

ہدایت کار نے اس کا حل یہ نکالا کہ اس خانقاہ کی تصاویر کھینچ لیں اور اسی ڈیزائن کی خانقاہ پائن ووڈ اسٹوڈیو میں بنا کر شوٹنگ کر ڈالی۔

اسکیز (برف پر پھسلنے کے لیے لمبے تختے) پاؤں میں باندھ کر برف پر پھسلنے اور مجرم کا تعاقب کرنے کے مناظر کی فلم بندی کرتے ہوئے 32 سالہ پالو ریگن اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ خود ایک اسکیز پر کھڑا تھا اور منظر کی شوٹنگ کر رہا تھا کہ اچانک توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پھسل کر گہرائی میں گر پڑا۔

شوٹنگ ختم ہوئی اور 24 جون 1981ء میں اس کا پریمیئر اوڈین سینما لندن میں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سارے برطانیہ، کینیڈا اور امریکا کے 1100 سینما گھروں میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے باکس آفس پر کوئی ریکارڈ تو نہیں توڑا مگر موجودہ دور کے لحاظ سے ایک کروڑ 95 لاکھ ڈالر کا ساری دنیا میں بزنس کیا۔ بزنس کے اعتبار سے یہ دوسری بڑی بانڈ فلم تھی۔

☆☆☆

راجر نے اپنی جس فلم میں چھٹی بار جیمز بانڈ کا کردار ادا کیا وہ ''آکٹوپسی'' تھی۔ اس فلم کی زیادہ تر فلم بندی انڈیا میں ہونا تھی۔ مگر راجر مور اور دوسرے اداکاروں کے لیے دوسرے درجے کی غذا ایک مسئلہ بن گئی (انڈین کے نزدیک تو وہ اول درجے کی تھی) اس لیے محلات کے مناظر ہی وہاں فلم بند کیے گئے اور باقی کی فلم بندی پائن ووڈ اسٹوڈیو میں کرنا پڑی۔

فلم کے ایک منظر میں بانڈ ایک طیارہ چوری کر کے ہینگر میں کھڑا کر دیتا ہے اور وہاں سے اڑاتے وقت ہینگر کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ایک طیارے کو جیگوار کار کی چھت پر ٹیلی فون کا کھمبا کھڑا کر کے طیارے کو اس پر لٹکایا گیا اور شوٹنگ کی گئی۔ پھر کمپیوٹر پر جا کر کھمبے کو مٹا دیا گیا۔ دیکھنے والوں کو ایسا لگا کہ طیارہ جیمز بانڈ نے اڑایا ہے، مگر یہ کام ایک ڈپلی کیٹ نے کیا تھا۔ رہا ہینگر کو تباہ کرنے کا منظر تو یہ اس کا ماڈل بنا کر فلم بند کیا گیا۔ ماڈل کے ٹکڑے ہوا میں اڑتے ہوئے دور جا پڑتے ہیں مگر حقیقت میں ان ٹکڑوں کی لمبائی چار انچ سے زیادہ نہیں تھی۔

آکٹوپسی کے پریمیئر پر شہزادہ چارلس اور ڈیانا نے شرکت کی۔ پریمیئر کے بعد یہ سولہ ممالک میں ریلیز کی گئی اور اس کا بزنس ایک کروڑ ستاسی لاکھ ڈالر تھا جس میں سے صرف امریکا میں اس کا بزنس 70 لاکھ ڈالر کے قریب تھا۔ فلم پر ملا جلا تبصرہ ہوا۔ بہت سے ناظرین نے جیمز بانڈ کے جنگل میں دوڑنے کے منظر پر تنقید کی اور کہا کہ اس منظر میں اس کا لباس درست نہیں تھا اور وہ ٹارزن یا گوریلا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اخباری تبصرہ نگار نے یہاں تک لکھ مارا کہ بانڈ سرکس کا جوکر معلوم ہوتا ہے۔ اکثریت نے اسے سراہا، اس لیے کہ اس میں حیرت انگیز چیزوں کے استعمال کے بجائے جیمز بانڈ نے ہاتھوں سے رُوبرو دشمن کا مقابلہ کیا ہے۔ اخبار انٹرٹینمنٹ ویکلی نے اس فلم کو جیمز بانڈ کی تیسری سب سے خراب اور بوگس فلم قرار دیا۔ حوصلہ شکن تبصروں کے باوجود فلم کا بزنس عمدہ تھا اور اسے جرمنی میں گولڈن اسکرین ایوارڈ دیا گیا۔

☆☆☆

جیمز بانڈ کے بلاخیز کردار میں راجر ساتویں اور آخری بار فلم ''اے ویو ٹو اے کل'' میں جلوہ گر ہوا۔ اس فلم کی شوٹنگ پائن ووڈ اسٹوڈیو لندن میں کی گئی اور اس کے بعد آئس لینڈ، سوئٹزر لینڈ، فرانس اور امریکا میں کی گئی۔ اس کے علاوہ اس فلم کو گولڈن گیٹ سان فرانسسکو پر بھی فلم بند کیا گیا۔ فلم کے کلائمکس میں استعمال ہونے والا جہاز اسکائی شپ 500 پہلے 1984ء کے اولمپکس میں استعمال ہو چکا تھا، اس لیے اس کا رنگ تبدیل کیا گیا۔ رنگ کرنے اور سوکھنے میں دو دن لگ گئے جب کہ یہ منظر پردۂ فلم پر صرف دو منٹ کے لیے آیا۔

بانڈ کی اس فلم کا پریمیئر لندن کے باہر سان فرانسسکو کے فائن آرٹس کے سینٹر میں کیا گیا۔ پوری دنیا میں اس فلم نے باکس آفس پر 15 کروڑ 20 لاکھ ڈالر کا بزنس کیا۔ جب کہ صرف امریکا میں اس کا بزنس 5 کروڑ ڈالر کا تھا۔

فلم کو ناقدین نے پسند نہیں کیا اور ایک رسالے نے اسے 36 فی صد نمبر دیے۔ یہ بانڈ کی کسی بھی فلم کو دیے جانے والے سب سے کم نمبر تھے۔ مشہور رسالے ''واشنگٹن پوسٹ'' نے لکھا کہ اب راجر مور کو بانڈ نہیں بننا چاہیے اس لیے کہ اس کی عمر اب 57 برس ہو چکی ہے۔ رسالے نے بہرحال اعتراف کیا کہ اے ویو ٹو اے کل بانڈ سیریز کی سب سے تیز رفتار فلم ہے، جس کی ابتدا سائبیریا کے یخ بستہ مناظر سے ہوتی ہے۔

اس موقع پر شون کونری نے بیان دیا: ''جیمز بانڈ کا کردار کسی 30 یا 35 برس کے اداکار کو ادا کرنا چاہیے۔ میں تو خیر بوڑھا ہو گیا ہوں، مگر مصیبت یہ ہے راجر بھی بوڑھا ہو گیا ہے، لہٰذا اسے بانڈ سیریز سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔''

راجر نے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب وہ بانڈ کا کردار ادا نہیں کرے گا۔ اے ویو ٹو اے کل کے آخری مناظر اسے بالکل پسند نہیں آئے۔ جس میں مجرم مشین گن سے سیکڑوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ اس نے ہدایت کار سے کہا۔ ''بانڈ کے کسی ناول میں ایسا نہیں ہے۔ اگر ہم لوگوں کے جسموں سے خون بہتا اور سڑکوں پر ان کے دماغ بکھرے ہوئے دکھائیں گے تو لوگوں کو ایسی فلموں سے نفرت ہو جائے گی۔ ایسا نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔''

☆☆☆

راجر مور واحد اداکار ہے جس نے بارہ برس تک بانڈ کا کردار ادا کیا اور سات فلموں میں نہایت خوبی سے اس کردار کو نبھایا۔ 1985ء میں جب اس نے بانڈ بننے سے انکار کر دیا اور ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا تو اس کی عمر 58 برس ہو چکی تھی۔ 1987ء میں اس نے 007 کی پچیسویں تقریب یعنی سلور جوبلی منائی۔ بانڈ نہ بننے کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ بانڈ بڑی حد تک پلے بوائے ہے اور لڑکیوں سے عشق جھاڑتا ہے۔ اگر میں فلموں میں بانڈ کا کردار ادا کرتا رہتا تو مجھے اپنی بیٹی کی عمر کے برابر لڑکیوں سے عشق لڑانا پڑتا، جو غیر حقیقی لگتا۔ لوگ کہتے بڑے میاں اپنی اور اس لڑکی کی عمر تو دیکھو۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔

ریٹائرمنٹ کا اعلان اس نے اچانک کیا تھا اس لیے کہ ایک ہدایت کار نے لیونگ ڈے لائٹ فلم کے لیے خاص طور پر اسے مدِنظر رکھتے ہوئے اسکرپٹ لکھوایا تھا، لیکن اس کے بعد اسکرپٹ میں تبدیلیاں کی گئیں اور بانڈ کا کردار ٹموتھی ڈالٹن نے ادا کیا۔

روس سے سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جیمز بانڈ کا کردار تبدیل کرنا پڑا۔ اس لیے کہ اس کے سارے ناول فلم بند ہو چکے تھے اور سرد جنگ بھی ختم ہو چکی تھی، اس لیے ہدایت کاروں کی سمجھ میں نہ آیا کہ امریکا کا حریف کسے دکھائیں؟ سرد جنگ کے بعد اور روس کے حصے بخرے ہونے کے بعد ساری دنیا میں امریکا ہی امریکا رہ گیا۔ اس کا حریف کہاں سے پیدا ہوتا؟

راجر نے جیمز بانڈ کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ حقیقت سے بعید ہے۔ جیمز بانڈ حالانکہ جاسوس ہے اور اسے چھپ چھپا کر کام کرنا چاہیے، لیکن ہر شخص جان لیتا ہے کہ یہ جاسوس صاحب ہیں۔ دنیا کا ہر بارٹینڈر اسے مارٹینی کا گلاس پیش کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ میری شخصیت دوسروں سے مختلف ہے، لہٰذا میں نے ایک سرد و سفاک قاتل کا کردار کرنے کے بجائے ہنسنے ہنسانے پر زور دیا اور بانڈ کے کردار کو دل چسپ بنایا۔

پہلی بانڈ فلم کا معاوضہ اسے دس لاکھ ڈالر دیا گیا جب کہ ساتویں فلم کا معاوضہ پچاس لاکھ ڈالر تھا اور فلم سے ہونے والی آمدنی میں سے 5 فی صد حصہ علیحدہ تھا۔

اکیڈمی ایوارڈز کی ایک تقریب میں لوگوں کے ووٹوں سے 2004ء میں اسے ''بہترین بانڈ'' کا خطاب دیا گیا اور اس نے 62 فی صد ووٹ حاصل کیے۔ جیمز بانڈ بننے کے دوران اس نے 13 دوسری فلموں میں بھی کام کیا۔

اس کے بعد وہ فلم سے وابستہ رہا اور اس نے متعدد فلموں میں کام کیا مگر اس میں چند ہی ایسی تھیں جنہیں قابلِ ذکر کہا جا سکتا ہے۔

سنڈے ٹیلی گراف میگزین کے اپریل 2009ء کے شمارے میں اس نے اداکاری سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان پکا نہیں تھا، اس لیے کہ 2012ء میں اس نے ایک اشتہاری فلم میں جو لندن اولمپکس کے لیے بنائی جا رہی تھی پھر جیمز بانڈ کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح سے اس نے پوسٹ آفس پر بننے والی ایک اشتہاری فلم میں 2009ء میں کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ یونی سیف کے لیے اب بھی شو کرتا ہے اور رفاہی اداروں کے لیے چندہ جمع کرتا ہے۔ اس میں غریبوں اور مسکینوں کے لیے کام کرنے کا جذبہ اس وقت پیدا ہوا جب وہ جیمز بانڈ کا کردار چھٹی بار فلم آکٹوپسی میں ادا کر رہا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ انڈیا میں کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی دوست آڈری ہیپبرن جو پہلے سے یونی سیف کے لیے کام کر رہی تھی۔ وہ اس کی خدمات سے بھی متاثر تھا۔ چنانچہ 1991ء میں اس نے باقاعدہ طور پر اس ادارے کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس نے یونی سیف کی ایک کارٹون فلم میں مفت کام کیا۔

☆☆☆

راجر مور نے اپنی پہلی بیوی ڈوم وان اسٹین کو سات برس کے بعد چھوڑ دیا۔ اس سے راجر کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے ڈوم سے 9 دسمبر 1946ء کو شادی کی تھی اور

یکم مارچ 1953ء کو اسے چھوڑ کر گلوکارہ ڈوروتھی اسکوائر سے شادی کرلی۔

ڈوروتھی اس سے عمر میں 13 برس بڑی مگر اس سے زیادہ شہرت یافتہ تھی۔ شادی کے بعد وہ ساؤتھ ویلز میں تھوڑے عرصے قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد جب وہ اٹلی میں ایک فلم کی شوٹنگ کررہا تھا تو ایک اخباری نمائندے کی حیثیت سے میتولی ٹیلی ویژن کے لیے اس کا انٹرویو لینے آئی۔ وہ راجر کو پہلی نظر میں بھا گئی۔ حالانکہ میتولی انگریزی نہیں جانتی تھی اور وہ اٹالین سے نابلد تھا (لیکن دونوں کا ٹانکا جڑ گیا) بہرحال اس نے میتولی کو فلموں میں کام دلوادیا اور اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا (جیسے کہ میاں بیوی رہتے ہیں) 1969ء میں ڈوروتھی نے طلاق کے لیے باقاعدہ درخواست دی جو عدالت نے منظور کرلی۔ اس دوران میتولی سے اس کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہوئے۔ پھر اس نے اپنے بچوں کی ماں سے باقاعدہ شادی کرلی۔ راجر کو اٹالین سیکھنے کا شوق تھا جو اس نے میتولی کو استاد بنا کر پورا کیا۔ 1993ء میں یہ شادی بھی اختتام کو پہنچی اور اس نے ڈنمارک کی ایک مال دار خاتون کرسٹینا سے چوتھی شادی کرلی۔ اس وقت تک راجر نہایت روانی سے اٹالین بولنے لگا تھا۔

چوراسی برس کی عمر میں اس نے ایک انٹرویو کے دوران انکشاف کیا کہ اس کی پہلی دونوں بیویاں اس کی پٹائی کیا کرتی تھیں۔ اسی لیے اس نے دونوں سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ اس نے بتایا کہ ڈوم نے ایک بار اسے ناخنوں سے نوچا تھا اور ایک بار چائے کی کیتلی مجھ پر کھینچ ماری تھی۔ جب میں نے کہا کہ میں گھر چھوڑ کر جارہا ہوں تو وہ غسل کرنے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔ آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ وہ کتنی عجیب عورت تھی! میں نے جا کر باتھ روم کے دروازے پر دستک دی تو اس نے جھنجلا کر پوچھا کہ اب کیا بات ہے؟ تم دفع کیوں نہیں ہوتے ہیں نے بتایا کہ میرے کپڑے باتھ روم میں ہیں تو اس نے میرے سارے کپڑے اٹھا کر باہر پھینک دیے اور کہا اب تم مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔

دوسری بیوی ڈوروتھی کا قصہ یہ تھا کہ وہ غصیلی بہت تھی۔ مجھے گٹار بجانا پسند ہے، لہٰذا میں اس کے جذبات کا خیال کیے بغیر گٹار بجایا کرتا تھا۔ ایک روز ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے کہ اس نے کچھ کہا۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ بس اس کے بعد میں نے سب کچھ سلوموشن انداز میں دیکھا۔ گٹار میرے ہاتھوں سے نکل گیا (معلوم نہیں کب اور کیسے؟) اور اس کے بعد وہ تیزی سے میری کھوپڑی کی طرف آیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا ایک زوردار آواز آئی "دھائیں" یہ آواز گٹار کے کھوپڑی سے ٹکرانے سے پیدا ہوئی تھی۔ خوشی ہے کہ گٹار نہیں ٹوٹا، البتہ میری کھوپڑی ضرور کئی جگہوں سے چٹخ گئی۔ آپ خود انصاف سے بتائیے کہ کیا کوئی شریف شوہر ایسے "حادثے" کے بعد گھر میں رہ سکتا ہے؟ اس لیے میں نے نہ صرف یہ کہ دوسرا گھر تلاش کرلیا بلکہ گھر والی بھی! ایک شریف شوہر اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے؟

راجر کی بیٹی۔۔۔ ڈیبورا نے دو فلموں میں کام کیا ہے جن کا مصنف جیک ہگنز تھا۔ اس کا بڑا بیٹا جیوفرے بھی اداکار ہے اور اس کے علاوہ لندن کے ایک ریستوران کا مالک بھی۔ جب کہ چھوٹا بیٹا کرسٹیان مور فلم پروڈیوسر ہے۔

جب راجر مور سینٹ کا کردار ادا کررہا تھا تو اس کی رہائش رائل ٹنبرج ویلز میں تھی، پھر وہ سرے میں رہنے لگا (آہ! محترمہ بے نظیر نے بھی وہاں مکان خریدا تھا) یہ اس کے ہالی ووڈ جانے سے پہلے کا قصہ ہے۔ 1960ء میں وہ گورڈن ایونیو میں رہنے لگا۔ پھر 1970ء میں اس نے بکنگھم شائر میں رہائش اختیار کرلی، جو پائن ووڈ اسٹوڈیو کے قریب تھی۔ دی اسپائی ہو لوڈ می کی شوٹنگ کے دوران اس کے ولن کرٹ نے راجر کو پیشکش کی کہ وہ اس کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چل کررہے، جہاں اس کا مکان ہے۔ راجر نے یہ پیشکش منظور کرلی۔ راجر کو وہاں اسکیٹنگ (پاؤں میں لمبی اور چپٹی لکڑیاں باندھ کر برف پر پھسلا جاتا ہے) کرنا پسند آئی۔ جب سے اس نے کرسٹینا سے شادی کی ہے وہ اپنی سردیاں سوئٹزرلینڈ میں گزارتا ہے جب کہ گرمیوں میں وہ منا کو میں رہتا ہے۔

1993ء میں اسے پروسٹیٹ گلینڈ کا سرطان ہوگیا۔ اس کا چھوٹا سا آپریشن تو ہوگیا تھا، لیکن بڑا ہونا باقی تھا۔ تاہم جب اس کی عمر 65 برس ہوگئی تو اس نے بڑا آپریشن بھی کرالیا اور اپنے ایک اداکار دوست مائیکل کین کے سمجھانے پر سگرٹ نوشی بالکل ترک کردی۔

2003ء میں جب وہ نیویارک کے ایک اسٹیج ڈرامے میں کام کررہا تھا تو اچانک گر پڑا۔ دس منٹ کے وقفے کے بعد ڈراما دوبارہ شروع کردیا گیا اور جب اختتام کو پہنچا تو اسے اٹھا کر اسپتال لے جایا گیا۔ معلوم ہوا کہ اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ اس نے عارضۂ قلب سے نجات پانے کے لیے پیس میکر لگوالیا ہے۔ اس کے علاوہ جب اس کی عمر تیس برس تھی تو اسے گردے کی پتھری نکلوانے کے لیے تین آپریشن کروانے پڑے۔

اپنے سیاسی خیالات و رجحانات کے اعتبار سے وہ کنزرویٹو پارٹی میں ہے۔ 2001ء کے انتخابات میں اس نے پارٹی کے لیے انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ 2011ء میں اس نے وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون سے ان کی پالیسیوں پر مکمل طور اتفاق کیا۔

راجر مور کے شاہی خاندان سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔ ڈنمارک کے پرنس جواشیم اور اس کی بیوی الیگزینڈریا سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ کاؤنٹس آف فریڈرک نے اسے اور اس کی بیوی کو اپنے بیٹے پرنس فیلکس کی سالگرہ پر مدعو کیا تھا۔ اس کی سوئیڈن کے بادشاہ کارل گستاف سے بھی دوستی ہے۔

☆☆☆

مشہور صحافی سر ڈیوڈ فراسٹ نے اس سے ایک انٹرویو کے دوران پوچھا کہ اس نے اپنی زندگی میں سب سے ہولناک منظر کیا دیکھا تو راجر مور نے جواب دیا۔ جب میں یونی سیف کی طرف سے زمبابوے گیا تھا تو میں نے ایک بچہ دیکھا جس کا ایک بازو بارودی سرنگ میں اڑ گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک معمر خاتون سے بھی ملا۔ خاتون نے کہا کہ ہم کبھی انسانوں کی طرح سے رہا کرتے تھے۔ لیکن اب تو ہماری حالت جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے تو ہم درخت کی جڑیں کھا کر گزارہ کررہے ہیں۔

افریقا میں ایڈز سے مرنے والوں کی تعداد کافی ہے۔ الم ناک بات یہ ہے کہ وہاں بوڑھے اور بچے تو نظر آئے لیکن نوجوان دکھائی نہیں دیے، اس لیے کہ وہ ایڈز کا شکار ہو چکے تھے۔

کتنی افسوس ناک بات ہے کہ ترقی پذیر معاشرے میں لوگوں کو یہ فکر تو ہوتی ہے کہ ڈنر میں انہیں کیا کھانا ہے، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ مفلسوں کی دنیا میں کیا کچھ ہورہا وہ ان کے لیے کچھ نہیں کرتے۔

☆☆☆

☆1999ء میں اسے برطانیہ کا اعزاز کمانڈر آف آرڈر ملا۔

☆1999ء میں رائرسن پولی ٹیکنک یونی ورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ ان دنوں وہ یونی سیف کے سفیر کی حیثیت سے مختلف ممالک میں بھیجا جاتا ہے اور وہ مفلس اور نادار بچوں کے لیے کام کررہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ غربت کی بھی ایک خوش بو ہوتی ہے۔ ہماری حسیات اتنی تیز ہونی چاہئیں کہ ہم اسے محسوس کرسکیں۔

☆ 14 جون 2003ء میں اسے نائٹ کمانڈر کے اعزاز سے نوازا گیا یعنی اسے 'سر راجر مور' کہا جانے لگا۔

☆2003ء میں یونی سیف نے نونہالوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے پر اسے جرمن سروس کراس سے نوازا۔ ان کے علاوہ سیکڑوں میگزینوں اور اداروں کی طرف سے اسے لائف اچیومنٹ ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ان ایوارڈز کی فہرست بہت لمبی ہے۔

11 اکتوبر 2007ء کو جب وہ 80 برس کا ہوچکا تھا تو اس کا نام ہالی ووڈ کے واک آف فیم پر لکھا گیا (ہالی ووڈ کے سارے بڑے اداکار جنہوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ اور عوام سے خراجِ تحسین وصول کیا ہوتا ہے، ان کے نام اسی واک آف فیم پر لکھے جاتے ہیں) راجر کا ستارہ 2350 واں ہے۔

2008ء میں اقوام متحدہ کی طرف سے داغ ہیمر شولڈ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

1973ء میں جب وہ لیو اینڈ لٹ ڈائی کی فلم بندی میں حصہ لے رہا تھا تو اس نے اپنے مخصوص انداز سے فلم کی شوٹنگ کا احوال کتابی صورت میں درج کیا تھا۔ جسے پین بکس نے شائع کیا۔ اس کتاب میں شون کونری کا قصہ بھی شامل ہے جسے وہ اپنا دوست بتاتا ہے۔ راجر مور کا کہنا ہے کہ شون کونری کے مشوروں کے بغیر وہ جیمز بانڈ بن ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی یہ سوانح عمری 2008ء میں شائع ہوئی تھی۔

☆ یکم جولائی 2011ء میں اس نے اور اس کی بیوی نے موناکو کے شہزادے البرٹ کی شادی میں بھی شرکت کی۔

☆2012 میں جب 007 کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی تھی تو اس نے تیسری کتاب لکھی جس میں اس کی فلموں کی تصاویر، اس کے خیال و افکار اور یادداشتیں شامل ہیں۔

☆☆☆

آکٹوپس

خالد قریشی

خوں آشامی کی وجہ سے یورپ بھر میں بدنام ترین تنظیم آکٹوپس جس کا نام سن کر لوگ خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔ اس گھر میں بھی اسی انداز کی ایک واردات ہوئی اور سب نے یہی سمجھ لیا کہ آکٹوپس گروپ نے اس علاقے کا رخ کرلیا ہے لیکن پولیس والے مخمصے میں تھے کیوں کہ معاملہ ایک بچے کا تھا۔

نادانستگی میں ہوجانے والی ایک حادثاتی موت کا ذکر

اولڈ ہنری نے دکان کی صفائی کے بعد شیشے کے دروازے پر موجود اوپن کی تختی کو سیدھا کیا پھر دروازے کے ساتھ موجود باسکٹ میں رکھے ہوئے چند خطوط، مختلف اخباروں کے پلندے وغیرہ سنبھالے اور کاؤنٹر کے پیچھے موجود کرسی پر آبیٹھا۔ خطوط مختلف کمپنیوں کے پروڈکٹ سے متعلق تھے۔ ان پر سرسری نگاہ دوڑانے کے بعد اولڈ ہنری نے اخبار کی سرخیوں پر نگاہ دوڑانی شروع کی۔ ایک مختصر سرخی پر اس کی نگاہ ٹھہر گئی۔ لکھا تھا۔ ''آکٹوپس گروپ کی

ساتویں واردات''۔

ہنری نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے چشمے کو اٹھایا اور آنکھوں پر لگا کر سرخی کی تفصیل پڑھنے لگا۔

تین ہزار ایک سو ساٹھ فالٹن ایریا میں گزشتہ دو ماہ کے دوران۔ کم و بیش پندرہ کے قریب آدمیوں کو پُراسرار طریقے سے قتل کیا گیا۔ قاتل کا سراغ نہ ملنے کے علاوہ رہائشیوں کے رشتے داروں کا پتا لگانا بھی ممکن نہ ہوسکا۔ حیرت انگیز طور پر ان ہلاکتوں کا مرکز فالٹن ایریا تک ہی محدود ہے۔ فالٹن ایریا شہر کے گنجان آباد علاقے سے منسلک ہونے کے باوجود بھی اس قسم کے چھوٹے بڑے جرائم سے کافی عرصے تک مستثنیٰ رہا لیکن اب حالات کے مد و جزر کو سامنے رکھتے ہوئے لوگوں نے سرشام اپنے گھروں سے باہر نکلنا مفقود کردیا ہے۔ خوف و ہراس کا یہ عالم ہے کہ کاروباری حضرات کے علاوہ اشیائے خورونوش سے متعلق دکانیں بھی سرشام بند ہونے لگی ہیں۔ پولیس تاحال تفتیش میں مصروف ہونے کے باوجود بھی کسی خاص پیش رفت کی جانب قدم بڑھاتی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ فالٹن ایریا کے رہائشیوں سے احتیاط کی گزارش کی جاتی ہے۔ اولڈ ہنری نے چشمہ اتار کر دوبارہ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ آکٹوپس گروپ کے وجود میں آنے کے سبب سے کاروباری حضرات کو کاروباری لحاظ سے نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد دکان کی سیل بتدریج کم ہونا شروع ہوتی اور پھر نوبت مکھیاں مارنے تک آجاتی۔ دو ماہ پہلے ہونے والے قتل کے بعد سے اب تک یہ ساتویں واردات تھی ہوتا یہ تھا کہ دو تین آدمیوں یا پھر عورتوں کو زہریلی گیس کے ذریعے ہلاک کیا جاتا تھا۔ ہلاک ہونے والے افراد کے گلے میں سیاہ رنگ کی پٹی آکٹوپس کی صورت میں لپٹی ہوئی دستیاب ہوتی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر ہلاک ہونے والے افراد کے رشتے داروں یا پھر ذریعہ معاش سے منسلک افراد کا پتا نہیں لگایا جاسکا۔ ہلاک ہونے والے افراد کہاں سے آئے تھے اور کیا کرنے آئے تھے۔ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں پولیس کا محکمہ بری طرح ناکام ثابت ہوا سوائے اس کے کہ ہلاک ہونے والے کچھ ہی عرصہ قبل فالٹن ایریا میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔

اسٹور کے دروازے کے اوپر لگی ہوئی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ کوئی شخص دروازہ کھول کر دکان میں داخل ہوا ہے۔ ہنری نے اخبار کو تہہ کیا اور ایک جانب رکھنے کے بعد دروازے کی جانب دیکھا۔ اس کا کم عمر نوکر جیری دکان میں داخل ہوکر کاؤنٹر کی جانب آرہا تھا۔

''گڈ مارننگ۔'' مسکراتے ہوئے وہ ہنری سے مخاطب ہوا۔ ہنری نے جواب دینے کی بجائے اسے مختلف کاموں کے متعلق آگاہ کیا۔ پھر کیش باکس کھول کر گزشتہ دن کی سیل چیک کرنے لگا۔ اس کا جنرل اسٹور اور اس کے ساتھ منسلک گھر دیدہ زیب اور نفاست سے مزین تھا۔ سوائے اس کے کہ کمروں کی چھتیں نیچی تھیں۔ اس کے باوجود بھی گزشتہ ماہ رہائش گاہ کے اوپر بنا ہوا فلیٹ کرائے پر چڑھ گیا تھا۔ فیملی مختصر تھی۔ میاں بیوی اور ان کا پانچ سال کا نہایت خوب صورت گول مٹول بچہ۔ ان تینوں کے علاوہ چوتھا کوئی نہیں تھا۔ اولڈ ہنری کو ایسے ہی مختصر کنبے کی تلاش تھی۔ وہ شور شرابے سے اجتناب کرتا تھا لیکن بچوں سے اسے بے تحاشا محبت تھی۔ شاید اسی محبت کی بدولت اس نے جون میری کے ساتھ شادی کرنے کی حماقت کی تھی۔ جون میری ہنری کی فطرت کا تضاد تھی۔ بے پروا ہونے کے علاوہ وہ فضول خرچ اور عیاش عورت تھی۔ ان دونوں کی شادی صرف چھ ماہ کے عرصے میں ہی ناکام ثابت ہوگئی اور ہنری نے جون میری کو طلاق دے کر فارغ کردیا۔ طلاق کے بعد ہنری نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز اولڈ ہنری اسٹور کو قرار دینے کے بعد دن رات کی محنت کی بدولت اسٹور کو چار چاند لگادیے۔ ان دنوں وہ اسٹور کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں رہائش پذیر تھا۔ بعد از محنت اس نے اپنی آمدنی میں سے بچت کرنے کے بعد دکان سے متصل مکان خرید کر اپنی رہائش گاہ وہاں منتقل کرنے کے بعد اسٹور کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں ردوبدل کرنے کے ساتھ دکان میں توسیع کردی۔ اب اوپر کا حصہ گارمنٹس اور جیولری وغیرہ سے مزین تھا۔ جیری کو اسٹور میں کام کرتے ہوئے صرف ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ جیری کے وجود کا مصرف صرف اتنا تھا کہ وہ ہنری کی غیر موجودگی میں اشیا خورونوش پر نگاہ رکھتا یا پھر زیادہ گاہکوں کی موجودگی کے دوران اولڈ ہنری کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

بہرحال موجودہ دن سال کا گرم ترین دن تھا۔ گرمی کا یہ عالم تھا کہ سڑک پر آدمیوں کی عدم موجودگی کے علاوہ جانور اور پرندوں کا نام و نشان بھی تھا۔ ستم بالائے ستم یہ نیا شوشا آکٹوپس کی موجودگی کی خبر نے ڈھا دیا تھا۔ دوپہر تک سیل نہ ہونے کے برابر رہی۔ دو بجے کے قریب ہنری نے جیری کو اسٹور سنبھالنے کی ہدایات دیں۔ پھر شیشے کا دروازہ کھول کر دکان سے متصل اپنی رہائش گاہ میں چلا آیا۔

ٹھنڈے شاور سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہنری نے پتلا اور کاٹن کے کپڑے سے مزین گاؤن پہنا پھر کاؤچ پر بیٹھ کر ٹھنڈی بیئر کی چسکیاں لینے لگا۔ چھت پر لگا ہوا پنکھا مکمل رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔ زمین سے پنکھے کی اونچائی اتنی کم تھی کہ اکثر اوقات ہنری فرش پر کھڑے ہو کر پنکھے کے پروں پر لگنے والے مٹی کے ذرات کو صاف کرلیا کرتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ دل میں پکا تہیہ کرتا تھا کہ آنے والے سال وہ رہائش گاہ کو گرا کر نئے سرے سے تعمیر کروائے گا لیکن وقت کی کمی کی بدولت وہ اپنے ارادوں کو کبھی بھی تکمیل نہیں دے پایا۔ ابھی وہ بیئر کا گلاس ختم نہیں کرنے پایا تھا کہ اچانک باہر کے دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہنری نے سوچا۔ اس وقت باہر کون ہوسکتا ہے۔ بھری دوپہر میں گھر سے باہر نکلنے کی ہمت کوئی مجبور انسان ہی کرسکتا ہے۔ اس نے بیئر کا گلاس کاؤچ کے ساتھ موجود تپائی پر رکھا اور اٹھ کر دروازے کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھولنے پر اس نے رہائش گاہ کے اوپر بنے ہوئے فلیٹ کے کرائے دار میاں بیوی اور ان کے پانچ سالہ بچے کو سامنے کھڑے پایا۔ شوہر کا نام ہائیڈ اور بیوی کا نام ویلری تھا۔ وہ بچے کے نام سے ناواقف تھا لیکن اکثر ہونے والی ملاقاتوں کے دوران میں اسے جونیئر ہائیڈ کے نام سے یاد کرتا تھا۔ ہیلو ہائے کرنے کے بعد ہائیڈ نے اپنے آنے کا مدعا کچھ اس طرح بیان کیا کہ وہ اور اس کی بیوی کسی نہایت ضروری کام کے لیے قریبی شہر تک جانا چاہتے ہیں۔ جونیئر ہائیڈ کو ہمراہ لے جانا ممکن نہیں اس لیے وہ اسے اولڈ ہنری کی معیت میں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔

ہنری نے پریشان لہجے میں ان دونوں کی واپسی کی نوعیت معلوم کی۔ تب ہائیڈ نے شرمسار لہجے میں اسے بتایا کہ واپسی غروب آفتاب تک ممکن ہے۔ کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ جلد واپس آنا ممکن نہیں۔ چند لمحے سوچ و بچار کرنے کے بعد ہنری نے بچے کو ہمراہ رکھنے کی ہامی بھرلی اور دونوں میاں بیوی جونیئر ہائیڈ کو اولڈ ہنری کے ہمراہ چھوڑ کر فلیٹ کے سامنے کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے باہر کی جانب چل دیے۔ ہنری نے مشفقانہ انداز میں جونیئر ہائیڈ کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ جونیئر ہائیڈ نے بے تکلفانہ انداز میں ہنری کے ہاتھ کو تھاما اور اندر گیا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ سنڈے کی چھٹی میں اولڈ ہنری کی معیت وقت گزار چکا تھا۔ اس لیے اسے جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ ہنری نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ایک جانب موجود فریج کا دروازہ کھولا اور جوس کا ڈبا باہر نکال کر جونیئر ہائیڈ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ جونیئر ہائیڈ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے جوس کے ڈبے کو کھولا اور آہستہ آہستہ اسے پینے لگا۔ ہنری نے جونیئر ہائیڈ کو صوفے پر بٹھایا اور کوئی بھی شرارت نہ کرنے کی نصیحت کرنے کے بعد دکان کی طرف چلا آیا۔ جیری پنکھے کے نیچے بیٹھا ریڈیو پر گانے سننے میں مگن دکھائی دیا۔ ہنری نے اسے بتایا کہ وہ شام کو دکان پر نہیں آپائے گا اس لیے وہ دکان پر آنے والے گاہکوں کو سنبھال لے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مشکل درپیش آئے تب وہ اسے رہائش گاہ سے بلا سکتا ہے۔ جیری نے استفہامیہ لہجے میں دکان پر نہ آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب ہنری نے ناگوار انداز میں اسے کام پر توجہ دینے کی نصیحت کی اور واپس رہائش گاہ کی جانب چلا آیا۔ جونیئر ہائیڈ جوس ختم کرنے کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اولڈ ہنری نے اسے کمر کے پاس سے تھاما اور مسکراتے ہوئے ہوا میں اچھال دیا۔ جونیئر ہائیڈ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اسے اولڈ ہنری کی یہ حرکت بالکل بھی پسند نہ آئی اس لیے منہ بسورتے ہوئے وہ ناراض ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اولڈ ہنری نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔

”ننھے بچے کیا مجھ سے ناراض ہو گئے ہو۔ میں تو مذاق کر رہا تھا اگر تمہیں اچھا نہیں لگا تب آیندہ ایسا نہیں کروں گا۔“ جونیئر ہائیڈ بدستور منہ بسورتے ہوئے بولا۔

”مجھے ایسا مذاق بالکل بھی پسند نہیں۔ آیندہ خیال رکھنا۔“ اولڈ ہنری نے دوبارہ قہقہہ لگایا۔ پھر اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے جھک کر بولا۔

”جو حکم میرے شہزادے۔ میں کوشش کروں گا کہ آیندہ ایسا نہ ہو پائے۔ اب اگر تمہارا موڈ کچھ بہتر ہو گیا ہو تب میرے فریج میں آئس کریم سے بنے ہوئے کیک بھی موجود ہیں اگر تم انہیں کھانا چاہو تو کھا سکتے ہو۔“

جونیئر ہائیڈ جواب دینے کی بجائے اٹھ کر فریج کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے کھول کر کیک باہر نکالنے کی کوششیں کی لیکن وہ اوپر کے جن خانوں میں موجود تھا جونیئر ہائیڈ کا ہاتھ وہاں تک پہنچ نہ پایا۔ اولڈ ہنری نے ہنستے ہوئے جونیئر ہائیڈ کو دوبارہ کمر کے پاس سے تھاما اور اوپر اٹھانے کے بعد کیک کو تھامنے کے لیے کہا۔ جونیئر ہائیڈ نے کیک کے ڈبے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ تب اولڈ ہنری نے فریج کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر مزاحیہ لہجے میں جونیئر ہائیڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”اب اگر شکریہ کے طور پر میں تمہیں ایک دفعہ پھر ہوا میں اچھال دوں۔ تب میرے خیال میں تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

جونیئر ہائیڈ نے جواب دینے کی بجائے کیک کے ڈبے کو جھٹکے کے ساتھ کھولا اور ایک ہاتھ آئس کریم کے ساتھ بھرنے کے بعد تمام آئس کریم اولڈ ہنری کے چہرے پر لگا دی۔ ہنری کو لڑکے سے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے کی بدولت سرخ ہونے لگا لیکن اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور ہونٹ چباتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے۔ ایسا ہے تو ایسا ہی صحیح۔ اب تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے پوری طاقت صرف کرتے ہوئے لڑکے کو چھت کی جانب اچھال دیا۔ کمرا اولڈ ہنری کے قہقہوں اور جونیئر ہائیڈ کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ ہنری نے لڑکے کے جسم کو تھامنے کی کوشش کی۔ تب وہ تڑپتے ہوئے وجود کو سنبھال نہیں پایا اور بچے کا وجود زمین پر گر کر کچھ دیر تڑپتے رہنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ مکمل رفتار سے چلتے ہوئے پنکھے کی بدولت لڑکے کی شہ رگ بری طرح کٹ گئی تھی۔ بچے کو ہوا میں اچھالتے ہوئے اولڈ ہنری اس بات کو نظر انداز کر گیا تھا کہ کمرے کی چھت نیچی ہے اور وہ دونوں تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے پنکھے کے عین نیچے کھڑے تھے۔

اسے اپنے ہوش و حواس درست کرنے میں چند لمحے دستیاب تھے۔ ہنری نے میز پر رکھی ہوئی بیئر کے ٹین کو ہاتھوں میں تھاما اور ایک ہی گھونٹ میں ٹین خالی کر دیا۔ اسے چنداں اطمینان محسوس نہیں ہوا۔ کمرے کی حالت جیسی پہلے تھی، ویسے ہی اب بھی تھی۔ دیواروں پر خون کے چھینٹے موجود تھے اور زمین پر لڑکے کی بے سدھ پڑی لاش دھری ہوئی تھی۔ وہ سکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ رات کو جب بچے کے ماں باپ واپس آئیں گے تب بھلا وہ ان سے کیا بہانا کر سکتا ہے۔ مختلف بہانے اس کے دماغ میں وقتاً فوقتاً نمودار ہونے لگے جنہیں وہ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد مسترد کرنے لگا۔ پہلا بہانہ جو اسے سوجھا۔ وہ یوں تھا کہ وہ ماں باپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا تھا کہ بچے کو ڈاکو اغواء کر کے لے گئے ہیں اور اغوا برائے تاوان مانگ رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ماں باپ پولیس میں رپورٹ لکھوانے کی ضد کر سکتے تھے اور پولیس کی تفتیش کا آغاز۔ یقیناً اولڈ ہنری

کے بوڑھے وجود سے ہوتا۔ ان سے بچنا ناممکن ثابت ہوتا۔ دوسرا بہانا جو اسے سوجھا وہ یہ تھا کہ وہ بچے کی لاش کو چھپا کر مکمل لاعلمی کا اظہار کردے۔ ایسی صورت میں بھی پولیس کے انتخاب کی نوبت ضرور آتی اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ تیسرا بہانا یہ تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر سے باہر فرار ہوجائے۔ یہ طریقہ کار کچھ نہ کچھ قابلِ قبول ضرور تھا لیکن ایسا کرنے کی بدولت اسے اپنی دکان رہائش گاہ سے دستبردار ہونا پڑتا اس کی صدیوں کی محنت ضبط ہوکر رہ جاتی اور اسے اپنے بڑھاپے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوبارہ شروع سے محنت کا آغاز کرنا پڑتا۔ وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چوتھا طریقہ کار جو اس کے محدود دماغ میں آیا وہ یہ تھا کہ بچے کے ماں باپ کو سب کچھ صاف صاف بتانے کے بعد ان سے معافی کی درخواست کرے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اولڈ ہنری کو معاف کردیں۔ یہی مناسب طریقہ کار تھا۔ ہنری نے اثبات میں سر ہلایا اور پانی کی بالٹی لینے کے لیے کچن کی جانب چل دیا تاکہ دیواروں پر موجود خون کے دھبوں کو صاف کیا جاسکے۔ وہ صورتِ حال کو اپنے حق میں موافق کرنے کے لیے دکھائی دینے والے تلخ مناظر کم کرنا چاہتا تھا۔

رات کے نو بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اولڈ ہنری کافی حد تک اپنے اوسان بحال کرچکا تھا۔ حالات کو اپنے حق میں بہتر کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار محسوس کررہا تھا۔ دروازہ کھولنے پر اس نے دونوں میاں بیوی کو اپنا منتظر پایا۔ ہیلو ہائے کے بعد ویلری اور مسٹر ہائیڈ نے معافی مانگتے ہوئے دیر سے آنے پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ تب اولڈ ہنری نے بمشکل اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے انہیں گھر کے اندر چلنے کی دعوت دی۔ دونوں میاں بیوی نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ پھر کوئی بھی بات چیت کیے بغیر اس کے ہمراہ چلتے ہوئے سٹنگ روم میں موجود صوفوں پر آبیٹھے۔ ہنری بچے کی لاش کو اپنی خواب گاہ میں منتقل کرچکا تھا۔ اب وہاں بدمزگی پیدا کرنے کے لیے کوئی بھی ایسی چیز موجود نہیں تھی جو حالات کے دھارے کو ہنری کے مخالف سمت بہنے پر مجبور کرسکے۔ صوفے پر بیٹھنے کے فوراً بعد مسٹر ہائیڈ نے پریشان نگاہوں کے ساتھ ہنری کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مسٹر ہنری آپ کی طبیعت مجھے کچھ ناساز دکھائی دے رہی ہے اور جونیئر ہائیڈ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ خیریت تو ہے ناں؟“

اولڈ ہنری نے منہ میں آئے ہوئے تھوک کو حلق میں نگلتے ہوئے پریشان لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا کہ میں آپ دونوں کو معاملے کے متعلق کیسے بتاؤں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ بعض اوقات نادانستگی میں وہ سب کچھ ہوجاتا ہے جن کے ہوجانے کے متعلق ہمارے وہم وگمان میں تصور نہیں پایا جاتا۔ اگر آپ دونوں مجھے معاف کردینے کا وعدہ کریں تب میں آپ کو شاید مزید کچھ بتا سکوں۔“

اولڈ ہنری ملتجانہ نگاہوں کے ساتھ دونوں میاں بیوی کی جانب دیکھنے لگا۔

اس دفعہ ویلری سرد لہجے میں بولی۔ ”جونیئر ہائیڈ کہاں ہے؟ مسٹر ہنری اگر اسے کچھ ہوگیا تب میں آپ کو کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔“

اولڈ ہنری نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے اچانک ہی کہہ دیا۔ ”وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ آپ یقین جانیے اس میں میرا قصور نہیں ہے۔“ اسے بات کرنے کا مزید موقع نہ مل سکا۔

ویلری نے اچانک ہی چیخنا چلّانا شروع کردیا۔ ہائیڈ بھی پریشان نگاہوں کے ساتھ اولڈ ہنری کی جانب دیکھنے لگا۔ اولڈ ہنری بھی چلّاتے ہوئے بولا۔ ”خدا کے واسطے خاموش ہوجایئے۔ میں نے اسے جان بوجھ کر چھت کی جانب نہیں اچھالا تھا۔ یقین جانیے ایسا صرف نادانستگی میں ہوا ہے اگر مجھے رتی بھر بھی اندازہ ہوتا کہ مجھے اپنے اس عمل کے بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا تب میں ایسا کبھی بھی نہیں کرتا۔“

ویلری نے اچانک ہی آگے بڑھ کر اولڈ ہنری کو گریبان کے پاس سے تھام لیا اور چلّاتے ہوئے بولی۔ ”وہ کہاں ہے؟ اگر وہ خیریت کے ساتھ نہیں ہوا تب میں تمہیں بھی جان سے ماردوں گی۔“

اولڈ ہنری نے بوکھلائے ہوئے انداز میں خواب گاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ وہ وہاں ہے۔ ویلری نے اچانک ہی ہنری کے گریبان کو چھوڑ دیا اور بھاگتی ہوئی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ ہائیڈ اس کے ہمراہ تھا کمرے کے درمیان میں لڑکے کی لاش زمین پر سفید چادر میں ملبوس پڑی تھی۔ ویلری چند لمحے لاش کو سکتے کے عالم میں دیکھتی رہی۔ پھر تیورا کر زمین پر گرتی چلی گئی۔ ہائیڈ بپھرے ہوئے شیر کی مانند اولڈ ہنری کی جانب جھپٹ پڑا۔ اس کا مکا پوری طاقت کے ساتھ ہنری کے چہرے پر پڑا۔ ہنری کو اپنے چاروں جانب پھلجڑیاں پھوٹتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔ ہائیڈ چلّاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”فون کہاں ہے؟ میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔ تم نے جان بوجھ کر جونیئر ہائیڈ کو قتل کیا ہے۔ اس کے گلے پر چھری کے نشان موجود ہیں۔ ہٹو ایک جانب میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔“

اس نے ہنری کو ایک جانب دھکیل دیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں موجود فون کی جانب چل دیا۔ ہنری نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ آپے سے باہر ہوتا چلا جارہا تھا۔ اولڈ ہنری کا دماغ بھی سن ہونے لگا۔ ایک دفعہ پولیس گھر میں داخل ہوجاتی پھر ہنری کو اس بڑھاپے میں سلاخوں کے پیچھے جانے سے کوئی بھی بچا نہیں پاتا۔ ہنری ایسا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے ایک سائیڈ پر بنی ہوئی الماری میں رکھے ہوئے پیپر ویٹ کو اٹھایا اور ہائیڈ کے سر کے پچھلے حصے پر دے مارا۔ ہائیڈ تیورا کر زمین پر گر گیا۔ کچھ دیر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے رہنے کے بعد وہ بے سدھ ہوگیا۔ ہنری نے اس کے سر کا معائنہ کیا۔ پچھلے حصے میں گومڑ ابھرنے لگا تھا لیکن خون نہیں نکل پایا تھا۔ ہنری نے مطمئن انداز میں ہائیڈ کو گھسیٹا اور اوپر موجود فلیٹ میں لے آیا۔ ہائیڈ کے بے ہوش وجود کو فلیٹ میں منتقل کرنے کے بعد اس نے ویلری کو بھی اوپر منتقل کیا۔ پھر ان دونوں کے ہاتھ پاؤں کو رسیوں کے ساتھ باندھنے کے بعد سوئی گیس کے چولہے کو مکمل طور پر کھولنے کے بعد کھڑکیوں اور دروازوں کو اچھی طرح بند کردیا اور خود نیچے موجود اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ حالات کو آکٹوپس والی واردات کے ساتھ منسلک کرنا چاہتا تھا۔ اگر ساتویں واردات کے بعد آٹھویں واردات اس کے گھر کے اوپر موجود فلیٹ میں ہوجاتی تب بھلا کیا مغالطہ ہوسکتا تھا۔ صرف واردات کو آکٹوپس کا روپ دینے کی ضرورت تھی اور وہ ایسا بخوبی کرسکتا تھا۔

تمام رات شراب نوشی کرتے ہوئے گزر گئی۔ صبح اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بچے کی لاش کو بھی فلیٹ میں منتقل کردیا۔ فلیٹ میں گیس مکمل طور پر بھری ہوئی تھی۔ اولڈ ہنری نے گیس کے چولہے کو بند کرنے کے بعد کھڑکیاں اور دروازے چوپٹ کھول دیے۔ گیس کا اخراج شروع ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اس نے میاں بیوی کی لاشوں کا معائنہ کیا۔ انہوں نے ہلنے جلنے یا پھر جدوجہد کرنے کی کوششیں نہیں کی تھیں۔ بے ہوشی کے عالم میں ہی عالم بالا کو سدھار گئے تھے۔ اولڈ ہنری نے ان کے ہاتھ پاؤں کو رسیوں سے آزاد کیا۔ گلے میں آکٹوپس والا سیاہ رومال باندھا جو اس کے اسٹور میں دستیاب تھا۔ چولہے پر سے اپنے ہاتھ کے نشانات کو اچھی طرح صاف کردیا۔ اردگرد کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کرنے سے پہلے ان پر سے بھی اپنے ہاتھوں کے نشانات کو رومال کے ساتھ صاف کردیا۔ باہر کے دروازے کو کنڈی لگائے بغیر ہنری نیچے موجود اپنی رہائش گاہ میں چلا آیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا اور انہیں حادثے کے متعلق بتانے کے فوراً بعد ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر فریج میں سے وہسکی نکال کر اس کے یکے بعد دیگرے دو جام اوپر نیچے حلق میں انڈیلنے کے بعد آرام کرسی پر بیٹھ کر آیندہ کا لائحہ عمل کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے زیادہ وقت انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پولیس اسٹیشن اولڈ ہنری کی رہائش گاہ سے زیادہ دور واقع نہیں تھا۔ پانچ منٹ کے بعد ہی گھنٹی بج اٹھی۔ اولڈ ہنری نے کمرے میں لگے ہوئے شیشے میں اپنے چہرے کا معائنہ کیا۔ ایک ہی رات کے دوران میں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہوگئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کسی کے گھر میں ہونے والے قتل کے بعد مالک مکان کی حالت اولڈ ہنری کی حالت سے مختلف نہیں ہوسکتی تھی۔ گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اولڈ ہنری نے اپنے قدموں میں لڑکھڑاہٹ کی کیفیت کو اجاگر کرتے ہوئے مکان کے دروازے کا رخ کیا اور جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولنے کے بعد خالی خالی نگاہوں کے ساتھ سامنے کھڑے پولیس کے اہلکاروں کی جانب دیکھنے لگا۔

”تمہارا نام ہنری ہے؟“ اہلکار نے پوچھا۔

ہنری نے اثبات میں سر ہلایا۔ اہلکار نے ہاتھوں میں موجود ہتھکڑی ہنری کو پہنادی۔ پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”آکٹوپس نے آٹھویں واردات کہاں کی ہے۔“

ہنری نے پریشان نگاہوں کے ساتھ ہتھکڑی کی جانب دیکھتے ہوئے رہائش گاہ کے اوپر بنے ہوئے فلیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ پھر پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے ہتھکڑی لگانے کا مقصد؟“

اہلکار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کے متعلق سارجنٹ تھامس تمہیں بہتر بتا سکتا ہے۔“ اہلکار نے بات مکمل کرنے سے پہلے اولڈ ہنری کو دروازے کے سامنے کھڑی پولیس کی جیپ کی جانب کھینچنا شروع کردیا۔ ہنری

نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی لیکن اہلکاروں کے آگے اس کی ایک بھی چل نہ پائی۔

شام کو وہ سارجنٹ تھامس کے سامنے کھڑا حیران و پریشان نگاہوں کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس مختصر عرصے کے دوران میں فلیٹ سے لاشوں کو پولیس اسٹیشن منتقل کیا گیا اور فنگر پرنٹ کی عدم دستیابی کے بعد مختصر تفتیش کی صورت میں نمایاں ہونے والے خیالات کو فائل کی صورت دی گئی تھی۔ فائل سارجنٹ تھامس کی میز پر موجود تھی اور اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ معاملہ ہنری کی سمجھ سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ پھر بھی اپنے دفاع کو مدنظر رکھتے ہوئے ہنری پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''جناب آکٹوپس گروپ کی آٹھویں واردات سے میرا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی کہ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس اسٹیشن کیوں لایا گیا ہے؟''

سارجنٹ تھامس بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیوں کہ آٹھویں واردات میں آکٹوپس گروپ کا رتی بھر بھی ہاتھ موجود نہیں۔ ہلاک شدہ افراد کو تم نے قتل کیا ہے اور اب اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے آکٹوپس گروپ کے نام کا سہارا لینے کی کوشش کررہے ہو۔''

اولڈ ہنری چلا اٹھا۔ ''آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کوئی مصمم ثبوت یا پھر کوئی عینی شاہد موجود نہیں ہے۔ کیا آپ کو کمرے سے میرے ہاتھوں کے نشانات ملیں ہیں۔ آکٹوپس گروپ سات وارداتیں فالٹن ایریا میں کر چکا ہے اگر آٹھویں واردات میرے گھر پر ہوئی ہے تو بھلا اس میں، میں کیوں ملوث ہونے لگا۔''

سارجنٹ تھامس یکدم سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارے چہرے پر مکے کا نشان موجود ہے۔ میرے خیال میں گزشتہ رات تمہارے اور مقتول فیملی کے درمیان کچھ تلخیاں پیدا ہوئیں۔ جن کے ہونے کے بعد معاملہ ہاتھا پائی کی صورت اختیار کر گیا۔ تم نے مشتعل ہوتے ہوئے مسٹر ہائیڈ کے سر پر وار کیا۔ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ سوائے اس بات کے کہ تمہارے اور ہائیڈ فیملی کے درمیان تلخ حالات کیونکر پیدا ہوئے۔''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سارجنٹ تھامس دوبارہ بولنے لگا۔ ''جونیئر ہائیڈ کی شہ رگ پر گھاؤ کا نشان موجود ہے۔ گھاؤ کا یہ نشان چھری کا نہیں ہے کیوں کہ شہ رگ کے اردگرد کی چمڑی چھلی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ شاید ایسا مکمل رفتار سے چلتے ہوئے پنکھے کی بدولت ہوا ہے۔ میں تمہاری غیر موجودگی میں حالات کا جائزہ بلکہ مکمل معائنہ کر کے آرہا ہوں۔ کمرے کی چھت زیادہ اونچی نہیں ہے اگر بچے کو اوپر اچھالا جائے تب حادثے کے سو فیصد چانسز پائے جاتے ہیں۔''

اولڈ ہنری کو اپنے پاؤں میں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سارجنٹ تھامس اسے حادثے کے متعلق ایسے بتا رہا تھا جیسے حادثے کے دوران میں وہ گھر میں موجود رہا ہو۔ آکٹوپس گروپ کے متعلق بات کرنا تو دور کی بات وہ حادثے کو قتل کی واردات سے متعلق گردانے پر کمربستہ تھا۔

اپنے دفاع کے لیے آخری قدم اٹھانے کے لیے اولڈ ہنری کمزور لہجے میں بولا۔ ''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ آکٹوپس گروپ کی واردات ہے اگر آپ اسے قتل کی صورت دینا چاہتے ہیں تب کسی مضبوط اور حتمی ثبوت کا ہونا ضروری ہے۔ کیا کوئی ایسا ثبوت آپ کے پاس موجود ہے۔''

سارجنٹ تھامس سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ثبوت کی ضرورت نہیں ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ آکٹوپس گروپ کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو بے جا نہیں ہوگا۔ ایک سر پھرا اس نام کو ڈمی کی صورت میں استعمال کر رہا تھا۔ کچھ ایسے دہشت گردوں کے خلاف جو ملک و قوم کی سلامتی کے لیے مستقل خطرہ بنتے چلے جارہے تھے اور جن کی پشت پناہی کے لیے ملک کے اہم اور سرکردہ افراد بھی کمربستہ تھے۔ ان دہشت گردوں کو دس دفعہ گرفتار کیا گیا لیکن پشت پناہی کرنے والے ہاتھوں کی بدولت انہیں دوبارہ رہا کر دیا گیا۔ ان باتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اس نے آکٹوپس گروپ کے وجود کو وقتی طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور گروپ کی واردات کی پشت پناہی پر تمام دہشت گردوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ کام مکمل ہونے کے بعد آکٹوپس گروپ کو منظر عام سے آؤٹ کر دیا گیا۔ اب اگر تم یہ کہو کہ آٹھویں واردات آکٹوپس گروپ کی معیت میں تمہارے فلیٹ پر رونما ہوئی تب بھلا ہم اس بات پر کیونکر یقین کر سکتے ہیں۔'' سارجنٹ تھامس خاموش ہوگیا۔ اولڈ ہنری اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر شل ہوتے ہوئے قدموں کے ساتھ سامنے رکھی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ اب اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے مزید کوئی بھی چارۂ کار باقی نہیں بچا تھا۔

کیسے کیسے لوگ

منظر امام

اس دنیائے رنگ و بو میں بے شمار افراد ایسے ملیں گے جو اپنی ذات میں ایک جہان ہیں۔ فطرت میں انوکھا پن رکھتے ہیں اور نت نئی کلیہ کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ایسے ہی سر پھرے افراد کا مختصر مختصر سا تذکرہ۔

یہ دنیا بہت زبردست ہے۔ بہت رنگا رنگ۔ ہمارے خدا نے انسان کو اس کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ خدا کی یہ مخلوق جہاں ایک طرف صابر ہے تو دوسری طرف بے صبر بھی۔ رحم دل بھی ہے اور بے رحم بھی۔ ہمت ہار دینے والی ہے تو ہمت بندھانے والی بھی۔

انسان گوناگوں خوبیوں کا مالک ہے اگر یہ اپنی انا اور اپنی قوت ارادی پر آجائے تو کوئی رکاوٹ اس کو آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

اس دنیا نے ایک سے ایک باہمت نامور لوگ پیدا کیے جن کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے تھا۔ انہوں نے بنی نوع انسان کو بہت کچھ دیا ہے۔

یہ جفاکش اور مضبوط ارادوں والے لوگ داستانیں بنا گئے۔ تاریخ میں اپنے نام چھوڑ گئے لیکن ان تمام لوگوں میں سب سے باہمت وہ لوگ ٹھہرے جو کسی نہ کسی جسمانی معذوری میں مبتلا تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی معذوری کو رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

جو سوچ رکھا تھا وہ کر گزرے اور پوری دنیا کے لیے یہ مثال قائم کر گئے کہ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔

آئیں ایسے چند لوگوں کو یاد کرتے ہیں جنہیں ہم سب جانتے ہیں۔ جن کے کارنامے ہمارے لیے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔

آئن اسٹائن

اس کو کون نہیں جانتا۔ دنیا کا مشہور ترین سائنس داں، ریاضی داں، کیمیا داں۔ جس نے اپنے آئیڈیاز اور

فلاسفی سے دنیا کی علمی تاریخ بدل کرر کھ دی۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ نے اس سے بڑا سائنس داں پیدا نہیں کیا۔ یہ مشہور و معروف انسان 3 سال تک بول نہیں پاتا تھا۔ دنیا کا مشہور ترین ریاضی داں ہونے کا اعزاز، لیکن ابتدا میں اپنے اسکول میں عام سا حساب کتاب نہیں کر پاتا تھا۔

وہ جب کچھ لکھنے کی کوشش کرتا تو اس کے ہاتھ بری طرح لرزنے لگتے۔ بہت مشکلوں سے لکھ پاتا۔ اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ابتدائی ناکامیوں نے اسے اور بھی مہمیز کر دیا اور اس نے ثابت کر دیا کہ بڑا انسان بڑا ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ لاکھ مجبور اور معذور ہو۔

الیگزینڈر گراہم بیل

یہ وہ شخص تھا جس نے دنیا کو ٹیلی فون کا تحفہ دیا۔

آپ گھر میں کسی بھی کام میں مصروف ہوں۔ ٹیلی فون کی آواز آپ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے، آپ دوڑتے ہوئے فون کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن کیا آپ کو یہ سن کر حیرت نہیں ہوگی کہ فون کو ایجاد کرنے والے کی خود قوتِ سماعت کم تھی۔ وہ بہت کم سن پاتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے فون ایجاد کر کے بتا دیا کہ معذوری رکاوٹ نہیں بنتی۔

کرسٹوفر ریو

حالیہ تاریخ کا وہ انسان جس نے اپنی مہارت اور اپنے علمی کارناموں سے پوری دنیا میں میڈیا کی بھرپور توجہ حاصل کر لی۔

کرسٹوفر بہت چست و چالاک قسم کا انسان تھا۔ اس کا شعبہ میڈیکل تھا۔ اس نے اس شعبے میں بہت کام کیا ہے۔

اس کا شوق گھڑ سواری تھا۔ وہ بہت اچھا رائڈر تھا۔ اگر اس کے ساتھ معذوری نہ ہو گئی ہوتی تو شاید وہ اولمپک میں بھی حصہ لے لیتا۔ اس کی زندگی بہت متحرک تھی۔ کام کام اور صرف کام۔ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ گھڑ سواری کرتے ہوئے بری طرح گر گیا۔ وہ بہت دور تک گھسیٹتا ہوا چلا گیا تھا اور اس حادثے نے اسے مفلوج کر دیا۔ صحت یاب تو ہو گیا لیکن بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اب کچھ نہیں کر پائے گا۔ اس کا کیریئر ختم ہو چکا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ صحت یابی کے بعد اس نے دوبارہ اپنا کام شروع کیا اور میڈیکل ریسرچ کے شعبے میں کئی اہم انکشافات کیے۔ گرچہ وہ اس دوران میں مفلوج ہی تھا۔

ڈیوڈ بلانکٹ

اس شخص کو رول ماڈل کے طور پر لیا جاتا ہے۔

معذور ہونے کے باوجود اس نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے جو تندرست حضرات کے لیے بھی مشکل ہیں۔ برطانیہ کے رہنے والے اس شخص نے ثابت کر دیا کہ جینے کی امنگ ہو تو قدرت بھی کھل کر ساتھ دیتی ہے۔

صرف سولہ برس کی عمر میں اس نے لیبر پارٹی جوائن کر لی تھی۔ 22 برس کی عمر میں کونسل لیڈر منتخب ہو گیا۔ وہ اس اہم عہدے پر 1980ء سے 1987ء تک رہا تھا۔

پھر وہ ایم پی مقرر ہوا۔ اس کی شخصیت میں بہت جاذبیت تھی۔ اس کی گفتگو شاندار ہوا کرتی۔ وہ بہت جلد دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ اس نے اپنی معذوری کے باوجود رہنمائی کرنے والے کتوں کو ٹریننگ دینے کا کام کیا اور وہ بھی اس طرح کہ پورے برطانیہ میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اس کے سدھائے ہوئے تین کتے ہر وقت اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان اگر اپنی مدد کرنے پر آئے تو قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔

ایڈیسن

یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی ایجادات کے ذریعے ہماری آپ کی زندگی آسان بنا دی۔ اسے بھی سب سے بڑا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس شخص نے ایک ہزار کے قریب اپنی ایجادات روشناس کروائیں اور اس کی ہر ایجاد نے انقلاب برپا کیا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اس کی کمپنی اس کی بنائی ہوئی چیزیں فروخت کیا کرتی۔

اس نے فونوگراف بنا کر دنیا کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ پھر بلب بنا کر دنیا کو روشنی کا تحفہ دے دیا۔ اس نے ٹیلی گراف سسٹم متعارف کروایا۔

اس نے زندگی کو آسان بنانے کے لیے بہت کچھ کیا اور یہ بھی سن لیں کہ وہ بہت عرصے تک سن بھی نہیں سکتا تھا۔ اور جو کچھ اسے بتایا جاتا وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا (دماغ کی ایک بیماری کی وجہ سے) اس کے باوجود اس نے ثابت کر دیا وہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا موجد ہے۔

فرینکلین ڈی روز ویلٹ

جی ہاں یہ صاحب امریکا کے صدر رہے ہیں اور وہ بھی ایک بار نہیں کئی بار۔ اس سے پہلے وہ نیویارک کا گورنر بھی تھے۔

آپ اندازہ لگالیں کہ اتنے بڑے عہدے تک آنے والا کوئی عام انسان نہیں ہوتا۔ اس میں غیر معمولی صلاحیت اور ذہانت ہوتی ہے۔ اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ روز ویلٹ پولیو زدہ تھے۔ جی ہاں! وہ پولیو کے مریض تھے اور خود اندازہ لگالیں کہ جس کو پولیو کا مرض ہوگا اس کی کیا کیفیت ہوگی۔ اس کے باوجود امریکا کے صدر تھے۔

ہمتِ مرداں مددِ خدا اس کو کہتے ہیں۔

جارج واشنگٹن

بظاہر تو کوئی جسمانی معذوری نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا تھا۔ وہ کچھ سیکھ نہیں پاتا تھا۔ لکھ نہیں پاتا تھا اور اگر لکھنے بیٹھتا تو گرامر کی بے تحاشا غلطیاں ہوتیں۔ اس کے باوجود انتظامی صلاحیتیں بہت زیادہ تھیں۔ ان ہی صلاحیتوں نے اسے امریکا کا مشہور ترین صدر بنا دیا۔

فرانسکو ڈی گویا

اسپین کا بے مثالی صدر

اس کا زمانہ 1748ء سے 1828ء تک کا ہے۔

گویا انہیں پوری دنیا کے مصوروں میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں اپنی مثال آپ ہیں۔

وہ 46 برس کی عمر میں مکمل بہرا ہو گیا تھا۔ اس جسمانی معذوری نے اسے بہت پریشان رکھا۔ بہت دنوں تک اس نے اپنے کام کی طرف ہی دھیان نہیں دیا۔ اس کے بعد خود کو سنبھال کر پھر کام کی طرف متوجہ ہو گیا اور ماسٹر پیس تخلیقات کیے۔

ہیلن کیلر

اس مشہور زمانہ سماجی کارکن کو کون نہیں جانتا۔

اس خاتون نے دنیا بھر کے معذوروں کی بھلائی کے لیے ایسے ایسے کام کیے کہ آج بھی لوگ اس کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ ہیلن کیلر بہری، گونگی اور نابینا تھیں۔ عزم و ہمت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

جان ملٹن

بہت پہلے کراچی کی ایک مشہور سڑک کی ایک دکان کے سامنے ایک بورڈ لگا ہوا دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کراچی کے بہت سے لوگوں کو وہ بورڈ آج بھی یاد ہو۔ (یا ہو سکتا ہے کہ وہ بورڈ آج بھی ہو)۔

اس پر لکھا ہوتا تھا۔ ''ملٹن کیوں اندھا ہو گیا تھا'' اور اس کے نیچے لکھا ہوتا کہ اس زمانے میں چشمہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔

جی ہاں وہ دکان چشمے کی تھی اور دکاندار نے جس شخص کا ذکر کیا تھا وہ جان ملٹن تھا۔ انگریزی زبان کا بے مثال شاعر اور ادیب۔ 43 برس کی عمر میں وہ مکمل نابینا ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی خداداد صلاحیتیں جاگ رہی تھیں۔

نابینا ہونے کے بعد بھی اس نے لازوال ایپک ''پیرا ڈائز لاسٹ'' لکھا تھا۔

لارڈ بائرن

اس کی سحر انگیز تحریروں نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور آج بھی بائرن کو اس کی رومانوی اور فطری تحریروں کی وجہ سے بے انتہا پسند کیا جاتا ہے۔ یہ باکمال شاعر چل نہیں سکتا تھا۔

لارڈ نیلسن

برطانیہ کا مشہور بحری کمانڈر اس نے برطانوی بحریہ کے لیے بہت سے کارنامے کیے۔ اس کے مشہور کارناموں میں 1798ء میں دریائے نیل کا معرکہ اور 1805ء میں ٹرا فالگر کا معرکہ شامل ہیں۔

یہ مشہور کمانڈر اپنے عزم اور ہمت کی وجہ سے بحریہ کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے یہاں ناممکن نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور یہ برطانوی کمانڈر ایک آنکھ سے نابینا تھا لیکن اس نے کبھی اپنی اس کمزوری کی پروا نہیں کی اور اپنے کام میں لگا رہا۔

اس کی موت 1805ء ہی میں ہوئی تھی۔

بیتھوون

موسیقی سے دل چسپی رکھنے والے سنجیدہ حضرات کے لیے اس عظیم موسیقار کا نام ہمیشہ قابلِ احترام رہے گا۔ بیتھوون کا تعلق جرمن سے تھا۔

بیتھوون ویانا میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ یہ 28 سال کی عمر سے بہرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ بھی کمال کی بات ہے کہ موسیقی کے شعبے کا تعلق تو قوتِ سماعت ہی سے ہوتا ہے لیکن اس کی قوتِ سماعت خراب تھی۔ اس کے باوجود اس نے ایک سے ایک دھنیں تخلیق کیں اور اپنی اس معذوری کو اس نے رکاوٹ نہیں بننے دیا۔

ماریا یارن

کمال کی ایتھلیٹ۔ 1500 میٹر اور 2000 میٹر کی اولمپک چیمپئن۔ وہ ایسی باہمت خاتون تھی کہ اس کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس نے دنیا کے کئی ملکوں میں جا کر دوڑ میں حصہ لیا اور انعامات حاصل کیے۔ ماریا کو بچپن ہی سے دوڑ کا جنون تھا۔ وہ دوڑتی اور سب سے آگے نکل جاتی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ 2002ء میں ہونے والے سڈنی اولمپک میں بھی حصہ لے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس کے باوجود اسے دنیا کی چند بہترین خاتون ایتھلیٹ میں شمار کیا جاتا ہے اور معلوم ہے اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا؟ وہ نابینا تھی۔ جی ہاں! مکمل نابینا۔

مارلی مٹلین

قدرت نے اس کو بے شمار صلاحیتیں دی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ ایسی باتیں کیا کرتی کہ لوگ ہنس پڑتے۔ اس کی باتوں میں بلا کا مزاح اور شگفتگی ہوا کرتی۔

برطانیہ سے تعلق رکھنے والی اس خاتون کو اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

اس کو یہ ایوارڈ Children of lesser God نامی فلم میں ملا تھا۔ وہ اسٹیج پر جب نمودار ہوتی تو پورے ہال میں قہقہے بکھر جاتے۔

وہ اکیلی کھڑی ہو کر کامیڈی کیا کرتی اور ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیتی اور اس اداکارہ کی معذوری یہ تھی کہ وہ مکمل بہری تھی۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ جو شخص اپنی کسی معذوری کو اپنے ذہن پر مسلط کر لے وہ پھر کسی کام کا نہیں رہتا اور جو اس سے لڑنے کی قوت پیدا کر لے وہ کسی نہ کسی شعبے میں کوئی مثال حاصل کر ہی لیتا ہے۔

سارہ برن ہارٹ

فرانس کی عظیم ترین اداکارہ

اس نے فلم اور تھیٹر میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ 1914ء میں کسی عارضے کی وجہ سے اس کی ٹانگ خراب ہو گئی تھی اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنا کام کرتی رہی اور فرانس کی اعلیٰ ترین اداکارہ ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

اسٹیفن ہاکنز (سائنس داں)

اب ذکر ہے اس شخص کا جسے انسانی تاریخ کا عجوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ نے آئن اسٹائن کے بعد یہ دوسرا سائنسداں پیدا کیا ہے۔ اس کی بے مثال کتاب ''اے بریف ہسٹری آف ٹائم'' ہے جس نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اپنے وقت کا یہ بے مثال سائنس داں مفلوج ہے۔ بالکل مفلوج۔ اس کے اشاروں کو اس کا کمپیوٹر سمجھ کر اس کی تشریح کرتا رہتا ہے۔ ہاکنز نے دنیا کو اپنی ہمت اور لگن سے حیران کر کے رکھ دیا ہے۔

سودھا چندرن

ہندوستان کی بے مثال کلاسیکی رقص کی ماہر۔ اس نے اپنے رقص کی صلاحیتوں سے پورے ہندوستان کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ بظاہر یہ ناممکن سی بات لگتی ہے کہ رقص کرنے والی اور ایک ٹانگ سے معذور؟ لیکن وہ ہے۔ اس نے ایک فلم ''ناچے میوری'' میں بھی کام کیا۔ اور آج بھی وہ ہندوستان کے کئی ٹی وی پروگرامز کی میزبانی کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ٹام کروز

ہالی ووڈ کا مشہور اداکار جو ایسے مرض میں مبتلا ہے جس کو Dyslexic کہتے ہیں۔ اس مرض کا مریض کچھ سیکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود ایک کامیاب ترین اداکار ہے۔

آپ..... والٹ ڈزنی کو لے لیں وہ ایک ہیرا انسان تھا۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ دنیا کیسے باہمت لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی معذوریوں اور کمزوریوں سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ لڑتے رہے، لڑتے رہے اور آج بھی جنگ کر رہے ہیں۔

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے. اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا. کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے توشہ خاص

اس وقت سعودیہ کے پاس B-707 کے علاوہ دو جہاز B-720 کے بھی تھے۔ B-720 کو B-707 کا جڑواں بھائی سمجھیں۔ صرف دو جہاز ہونے کی وجہ سے ان کا انتظام سنبھالنا سعودیہ کو بھاری پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اب چونکہ سعودیہ کے آرڈر کیے ہوئے تینوں L1011 ڈیلیور ہو چکے تھے۔ B-720 کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ ان کا سودا ایک امریکی کمپنی کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ اس کے بیع کا عقد میرے ذمہ تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب ابھی
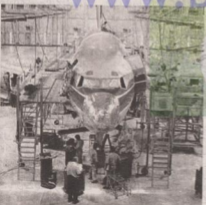
نئے اور موجودہ جہازوں پر کام کرنے والے انجینئروں کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔

جہاز کی ڈلیوری جدہ کی بجائے امریکا میں ہونی تھی اس کی وجہ امریکی کسٹم کے قوانین وغیرہ تھے جن کی ذمہ داری خریدار پر تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سعودیہ کا عملہ جہاز کو امریکا تک سعودیہ کے رجسٹریشن کے تحت اڑا کر لے جائے گا جہاں پر یہ جہاز امریکا کے قوانین کے تحت رجسٹر ہو گا۔ سعودیہ کا رجسٹریشن، ریڈیو لائسنس وغیرہ اتار لیے جائیں گے اور ڈلیوری کے کاغذ وغیرہ پر سعودیہ کا مندوب دستخط کرے گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سعودیہ انجینئرنگ کا ایک نمائندہ جہاز کے ساتھ امریکا جا کر یہ ساری کارروائی مکمل کر لے۔ پہلے جہاز کی ان ساری کارروائیوں کی تکمیل میرے ذمہ کی گئی۔

B-720 میں اتنا ایندھن نہیں ہوتا کہ وہ بغیر رکے جدہ سے کیلی فورنیا جا سکتا۔ پہلے ہم کو آئس لینڈ کے شہر کیفلیوک جانا تھا جہاں سے ایندھن ڈلوا کر ہم آگے بڑھتے۔ حالانکہ سردیوں کے دن نہ تھے مگر کیفلیوک کے ائرپورٹ پر برف پڑی ہوئی تھی جہاز میں ایندھن بھرا جانے لگا ہم لوگ ڈیوٹی فری شاپ کی طرف بڑھ گئے۔ شاید یہ دنیا کی سستی ترین ڈیوٹی فری شاپ تھی۔ اس میں کرسٹل کا سامان بھرا ہوا تھا جو آدھی قیمت سے بھی کم پر مل رہا تھا۔ میرے لیے ہاتھ روکنا مشکل تھا میں نے ایک گول مرتبان اور ایک ٹرے خرید لیا۔ جوڑے میں نے وہاں خریدی وہ بازار میں ڈھائی گنا قیمت میں بک رہی تھی۔

ہم کو امریکا کی ریاست مین کے شہر بینگر میں جہاز کا کسٹم کروانا تھا۔ میں کاک پٹ کی جمپ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جہاز اتر چکا تھا۔ رن وے پر آہستہ رفتار سے دوڑ رہا تھا کہ کیپٹن سوفتہ نے یکلخت بریک لگا کر جہاز روک لیا۔ سامنے ایک ہرن رن وے پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کو جہاز کی کوئی پروا نہ تھی وہ اس آہنی پرندے کے شور شرابے کا عادی ہو چکا تھا۔ جب اس نے اطمینان سے اپنی چہل قدمی ختم کی تو ہم لوگ گیٹ کی طرف بڑھ سکے۔

خریدار کمپنی کا ایک نمائندہ ہمارے ساتھ تھا۔ امریکا پہنچ کر ہم اس کے مہمان بن چکے تھے۔ بینگر چھوٹا سا شہر تھا۔ ائرپورٹ اس سے بھی چھوٹا۔ ہوٹل سامنے تھا۔ جیسے ہی ہم ہوٹل میں داخل ہوئے جانسن نے کہا۔ ”کمرے میں جانے سے پہلے اپنے اپنے حصے کا لابسٹر چن لو۔ بینگر کے لابسٹر مشہور ہیں۔ جب تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر واپس آؤ گے تو یہ لابسٹر تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

ہم لوگوں نے لابسٹر چن لیے۔ میں نے لابسٹر پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ ”پہلی دفعہ والے“ کھاتے میں ایک کا اضافہ اور ہو گیا۔

نہا دھو کر تازہ دم ہو کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو لابسٹر اپنے اپنے مہمان کے منتظر تھے۔ شکایت کرنے لگے۔ ”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔“ لابسٹر دیکھنے میں انتہائی خوفناک مگر کھانے میں لذیذ ہوتے ہیں۔ جھینگے کی طرح مگر اس سے دس پندرہ گنا بڑے اور پردہ نشین۔ ان کی کھال آپ کو خود اتارنی پڑتی ہے۔ پہلے سر اور اس سے لگی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں کو الگ کریں۔ پھر اس کی ٹانگیں توڑیں اور اس کے بعد کمر۔ کمر ٹوٹنے کے بعد یہ پوری طرح آپ کے قابو میں ہوتا ہے۔ اس کی زرہ بکتر اتاریں اور مزے لے لے کر کھائیں۔ لابسٹر کی ٹانگوں کے اندر بھی گوشت ہوتا ہے۔ اس کو نکالنے کے لیے خاص کیل کانٹے سے لیس ہونا لازمی ہے۔ جس طرح سے اخروٹ توڑے جاتے ہیں اسی طرح کے سروتہ نما اوزار سے لابسٹر کی ٹانگ توڑی جاتی ہے۔ پھر دو ٹانگ کے چھوٹے کانٹے سے لابسٹر کی ٹانگ کا گوشت کھرچ کھرچ کے نکالنا پڑتا ہے۔ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ اتنے ذرا سے گوشت کے لیے اتنی مشقت۔ تھوڑی دیر گپ بازی اس کے بعد سونا۔ کل صبح باقی کارروائی مکمل ہو گی۔ جس کے لیے ہم کو خریدار کمپنی کے دفتر ”وین نویس“ کیلی فورنیا جانا تھا جو لاس اینجلز کے قریب تھا۔ امریکا کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بے شمار ائرپورٹ ہیں۔

وین نویس کے ائرپورٹ پر اتر کر آدھا رن وے ختم کیا ہو گا کہ نمبر 2 انجن کے آئل کی خطرہ کی لائٹ نے جلنا بجھنا شروع کر دیا۔ انجن کا تیل لیک کر گیا تھا۔ انجن کو بند کرنا پڑا۔ جہاز کو خریدار کمپنی کے ہینگر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ دفتر جا کر کمپنی کے پریزیڈنٹ سے ملے۔ تمام کاغذی کارروائی مکمل کی۔ اٹھنے لگے تو پریزیڈنٹ صاحب نے ایک لفافہ میرے حوالے کیا۔ کھولا تو اس کے اندر چار لفافے تھے۔ ایک پر میرا نام باقی تین پر عملے کے تینوں افراد کے فرداً فرداً نام۔ یہ ہماری محنت کا صلہ تھا۔ جائز طے شدہ طیارے کے عقد بیع میں یہ شق شامل تھی کہ کمپنی ہوٹل اور کھانے کا خرچا طیارے کے ساتھ جانے والے افراد کو نقد ادا کرے گی۔ یہ لوگ ایک قدم آگے نکل گئے تھے۔ انہوں

نے نہ صرف نقد خرچا دیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام ہوٹلوں اور کھانے کے بل بھی ادا کر دیے تھے۔ کپتان کو دی جانے والی رقم باقی لوگوں کو دی جانے والی رقم سے زیادہ تھی۔ یہ رقم اس رقم کے علاوہ تھی جو سعودیہ نے ہم لوگوں کو یومیہ خرچے کے طور پر دی تھی۔ سب مل ملا کر مجھے ایک فالتو رقم صرف ایک جہاز میں بیٹھ کر کیلی فورنیا جانے اور جدہ واپس آنے اور دو دن فائیو اسٹار ہوٹل میں گزارنے کی صعوبت کے عوض ادا کی گئی تھی۔ افسوس کہ دوسرے جہاز کے ساتھ کسی اور کو بھیج دیا گیا۔ میری گرانقدر خدمات نظر انداز کی جا چکی تھیں۔

پیسے جیب میں ڈال کر میں ابھی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ کمپنی کے پریزیڈنٹ کی سیکریٹری ہانپتی کانپتی دل پر ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی آئی۔ ڈیوڈ تم کو بلا رہے ہیں۔ ڈیوڈ کمپنی کا پریزیڈنٹ تھا۔ مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ یہ رقم اس نے غلطی سے مجھے دے دی تھی۔ اب یقین ہوتا جا رہا تھا میں نے جانے سے پہلے رقم کا لفافہ احتیاطاً کیپٹن سوفتہ کو تھما دیا لیکن معاملہ کچھ اور تھا۔

”میں نے تمہارے دوست کا پتا معلوم کر لیا ہے۔“ ڈیوڈ نے خوش خبری سنائی۔ پھر ایک پرچی میری طرف بڑھائی۔ ”یہ ہے اس کا ٹیلی فون نمبر۔“ ڈیوڈ کے ہاتھ سے پرچی لیتے وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لوں کہ اس نے مجھ سے اپنے دیے ہوئے پیسے واپس نہیں مانگے تھے لیکن علامہ اقبال کی خودی میرے آڑے آ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”خودی سے مرد خود آگاہ کا جلال و جمال۔“ میں اسی نوع کے ایک واقعے سے برمنگھم میں گزر چکا تھا۔ جب پروفیسر ہولبر نے مجھے کلاس میں میری کارکردگی کا سرٹیفکیٹ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا وہ اپنا سرٹیفکیٹ مجھ سے واپس مانگ لیں گے۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سرٹیفکیٹ کو جیب میں چھپا کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ میں ڈیوڈ کے دفتر سے فوراً نو دو گیارہ ہو گیا کہ مبادا وہ اپنی دی ہوئی رقم مجھ سے واپس مانگ لے۔

میں نے ڈیوڈ کی دی ہوئی پرچی پڑھی۔ اس پر میرے PIA کے ساتھی اعجاز کا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اعجاز ان دنوں لاس اینجلس کے مضافات میں لگونا ہل میں رہتا تھا مگر میرے پاس اس کا پتا نہیں تھا۔ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ ڈگلس ائرکرافٹ کمپنی میں کام کرتا ہے۔

مغربی ممالک اور ان میں بسنے والے جس منظم طریقے سے اپنی زندگی گزارتے ہیں اس کی داد دینی پڑتی ہے۔ جدہ میں گپیں ہانکنے کے دوران میں، میں نے جانسن سے تذکرہ کر دیا تھا کہ میرا ساتھی اعجاز علی تاج بھی جنوبی کیلی فورنیا میں رہتا ہے۔ ڈگلس میں کام کرتا ہے۔ اس نے شاید یہ اطلاع ڈیوڈ کو دی ہو گی جس نے میری فرمائش کے بغیر اور محض اس بنیادی معلومات کی بنیاد پر اعجاز کا ٹیلی فون نمبر ڈھونڈ نکالا تھا۔ میں نے اعجاز کو فون کیا تو کوئی جواب نہ آیا شاید گھر پر نہیں تھے۔

رات میں اور فضائی عملہ لاس اینجلس کے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ صبح میں ناشتا کرنے کے بعد کیپٹن سوفتہ کے کمرے میں چلا گیا۔ انہوں نے ابھی ناشتا نہ کیا تھا۔ روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ تھوڑی دیر میں ناشتا آ گیا۔ میرا ان ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا پہلا اتفاق تھا۔ کیپٹن سوفتہ عادی تھے۔ انہوں نے اپنے حساب سے ناشتے کا آرڈر دیا تھا۔ میرے ناشتے میں چار توس، دو انڈے اور ایک پیالی چائے شامل تھی مگر اس طرف ”حال ہی دوسرا تھا“ ویٹر نے ایک ایک کر کے لوازمات میز پر سجانے شروع کیے۔ مختلف جوس، کارن فلیکس، پھل، توس، بن، رول، چائے دانی الگ کافی کی الگ۔ مکھن جیم وغیرہ ایک بڑی پلیٹ جس کے اوپر گنبد نما ڈھکن۔ یہ سب کافی نہ تھا اس نے جھک کر اپنی ٹرالی کے نچلے حصے کو کھولا اس کے اندر ایک چھوٹی سی اوون تھی جس میں تازہ تیار کی ہوئی اسٹیک تھی۔ ایک آدمی کتنا کھا سکتا تھا۔ زیادہ تر واپس ہو گیا۔

یہ ہوتا ہے اکسپنس اکاؤنٹ کا کمال۔
کمپنی پیسے دے گی۔
میری جیب سے کیا جا رہا ہے۔

مجھے اپنے پہلے اکسپنس اکاؤنٹ کا تجربہ یاد آ گیا۔ حیدرآباد کے پاور پلانٹ میں کچھ کام کرنا تھا۔ سارے اخراجات میری کمپنی AEI کے ذمہ تھے۔ کام سے واپس آ کر میں نے روزمرہ کی طرح کا کھانا یعنی ایک سالن سبزی اور روٹی آرڈر کیا۔ ویٹر مجھ سے پوچھتا رہا۔ سوپ، سلاد، میٹھا میرا جواب ایک ہی تھا ”جی نہیں شکریہ“۔ اس سے برداشت نہ ہوا۔ پوچھنے لگا۔ ”آپ پہلی دفعہ کمپنی کے خرچے پر آئے ہیں۔“ میں نے اقرار کیا تو بڑبڑایا۔ ”تب ہی“۔

کمرے میں واپس آ کر اعجاز کے دفتر ٹیلی فون کیا۔ اعجاز نے فون اٹھایا میں نے کہا۔ ”کاکا میں حسن بات کر رہا

ہوں۔'' جواب آیا۔ ''مجھے معلوم ہے آپ کون ہیں۔ مجھے وین نائس سے فون آچکا ہے کہاں ہو۔'' اعجاز کو سرپرائز دینے کا سارا ابال بیٹھ چکا تھا۔

''فلاں ہوٹل میں۔''

میں گھر جاتے ہوئے تم کو ساتھ لے جاؤں گا۔ چیک آؤٹ کر کے تیار رہنا۔

شام اعجاز کے گھر پہنچے۔ آٹھ نو سال بعد ہی ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ میں نے اعجاز کو سعودیہ ائر میں شامل ہونے کے امکانات پر غور کرنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہاں پر کبھی کبھی انہونے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ وہاں پر وہ ماحول نہیں مل سکتا جو امریکا میں ہے۔ کبھی کبھی لوگ اپنے ناکردہ گناہوں کے عوض جیل بھی پہنچا دیے جاتے ہیں اور پھر ڈی پورٹ بھی کر دیے جاتے ہیں۔ ان کو مثال دے کر بھی بتا دیا۔

ایک دفعہ ایک صاحب سعودیہ سٹی میں اپنے گھر کے باہر اپنی گاڑی دھونے گئے۔ جب دو گھنٹے بعد واپس نہ لوٹے تو بیوی کو تشویش ہوئی باہر گئیں تو گاڑی دھونے کا سامان تو رکھا تھا مگر میاں غائب۔ سعودیہ سٹی کی سیکیورٹی سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ موصوف گولہ بارود غیر قانونی طور پر سعودی عرب اسمگل کرنے کے الزام میں جیل میں آرام فرما رہے ہیں۔ تفتیش جاری ہے۔ مزید تفتیش پر پتا چلا کہ ایک ٹیلی گرام جوان کے نام پر آیا تھا وہ پکڑا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ گولہ بارود یا اسلحہ اسمگل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ٹیلی گرام میں واضح طور پر لکھا تھا کہ ''زریبہ آرہا ہے۔'' لفظ زریبہ عربی میں اسلحے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دراصل ان کی کوئی رشتے دار خاتون جدہ آرہی تھیں جس کا نام ''زرینہ'' تھا۔ جو تار والے کی غلطی سے ''ن'' کی جگہ ''ب'' ٹائپ دینے کی وجہ سے زرینہ سے زریبہ بن گیا تھا۔ جب زرینہ کے میاں کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے فاتحانہ انداز میں سب کو بتایا کہ یہ تار والے کا قصور نہیں۔ زرینہ ہے ہی توپ کا گولہ۔

دو دن اعجاز کے ساتھ گزارے۔ عید کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ جدہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

☆......☆

B-747 کے مواصفات کی چند الجھی گرہیں سلجھانے مجھے سیاٹل جانا تھا۔ اب سیاٹل میں سعودیہ کا اپنا دفتر تھا۔ ڈیموس اور لائیل فرائی اس دفتر کو سنبھال رہے تھے۔ ان کے استعمال کے لیے ایک گاڑی تھی۔ یہ گاڑی ہینگر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ بوئنگ کا یہ ہینگر دنیا میں اپنی طرز کا سب سے بڑا ہینگر ہے جو تقریباً 176 ایکڑ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ہینگر میں B-747 جیسے دیوہیکل بیک وقت کئی کئی کی تعداد میں اسمبل کیے جاتے ہیں۔

یہ میرا B-747 کی اسمبلی لائن پر جانے کا پہلا اتفاق تھا۔ B-747 دنیا کا سب سے بڑا ہوائی جہاز تھا... سوائے روس کے مال بردار جہاز AN12 کے جس کے چھ انجن تھے۔ B-747 کی لمبائی تقریباً 232 فٹ تھی اور اس کے پر دو سو فٹ سے زیادہ چوڑے تھے۔ جہاز کا وزن سوا آٹھ لاکھ پاؤنڈ۔

عام خیال یہ ہوگا کہ اس قدر بڑے جہاز کے بنانے کے لیے بیک وقت سینکڑوں آدمی کام کرتے ہوں گے۔ ایسا نہیں تھا۔ ہینگر میں اس وقت صرف پچیس سے تیس آدمی کام کر رہے تھے۔ جہاز کے مختلف حصوں پر لوگ اپنی اپنی مخصوص مہارت کے ساتھ اس طرح کام کر رہے تھے کہ ہر ٹیم میں صرف پانچ یا چھ آدمی تھے۔ جہاز بنانے کا کام انتہائی منظم طریقے سے کیا جاتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اس طرح سے پلان کیا جاتا ہے کہ اس کام کے کرنے میں وقت، افرادی قوت، مشین اور مال کا مناسب ترین استعمال ہو سکے۔ زیادہ تر چیزیں ایک کٹ کی شکل میں ہوتی ہیں جن میں پارٹس کے ساتھ ساتھ کام کی تفصیل اور ڈرائنگ وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ کام کے شروع کرنے کا اور ختم کرنے کا وقت متعین ہوتا ہے۔ جہاز پر کیا جانے والا ہر کام ایک سلسلے سیکونس (Sequence) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ تاکہ پورا جہاز بنانے کا کام ایک خاص روانی کے ساتھ چلتا رہے۔ اگر کوئی ایسا کام آجائے کہ جس کا تعین پہلے سے نہیں کیا گیا ہو تو اس کام کے کرنے کا اثر جہاز کی تکمیل کے وقت اور جہاز کی قیمت پر پڑ سکتا ہے۔ اگر اس کام کی فرمائش ائرلائن کی طرف سے کی گئی ہو۔ ایسا کام آؤٹ آف سیکونس پروڈکشن'' کہلاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے کام کم سے کم تعداد میں ہوں لیکن کبھی کبھی ایسے کام ناگزیر ہو جاتے ہیں۔

ہینگر کا چکر لگا کر واپس آیا تو بوئنگ کے لوگ ڈیموس کے دفتر میں موجود تھے۔ میٹنگ شروع ہوگئی اور دو گھنٹے بعد ختم ہوگئی۔ ایک بڑا مسئلہ رہ گیا تھا۔ APU کی بیٹری کی

وارننگ لائٹ کا۔ اس پر کل بات ہوگی۔

APU ایک چھوٹا سا انجن ہوتا ہے جو چھوٹے جہازوں...... جیسے سیسنا وغیرہ کو اڑانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر B-747 جیسے بڑے جہازوں میں یہی انجن بجلی اور کمپرسڈ ائر (سخت دباؤ والی ہوا) پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہوا جہاز کے ائرکنڈیشن کو چلاتی ہے اور جہاز کے انجن اسٹارٹ کرتے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ایک دفعہ جہاز کے انجن اسٹارٹ ہو جائیں تو APU کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اس کو بند کر دیا جاتا ہے۔ APU B-747 کی دم میں فٹ کیا جاتا ہے۔ APU کو اسٹارٹ کرنے کے لیے ایک بیٹری کی ضرورت پڑتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح آپ کو اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے بیٹری درکار ہوتی ہے۔

ڈیموس مجھے میرے ہوٹل چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ آج کا کام ختم ہو چکا تھا۔ میں نے بوئنگ کے ہینگر کا تفصیلی دورہ بھی کر لیا تھا لیکن شہر سیاٹل میں داخل ہونے کے لیے امریکا کے امیگریشن والوں نے جو میری درگت بنائی تھی وہ یاد آگئی۔

سیاٹل ائرپورٹ دنیا کے دوسرے ائرپورٹوں سے تھوڑا سا مختلف ہے۔ امیگریشن کے بعد سامان کا کسٹم چیک ہوتا ہے پھر سامان ایک بیلٹ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ جس کے بعد اس کو ایک دوسری عمارت میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ مسافر اس عمارت میں پہنچنے کے لیے جو ائرپورٹ کی لوکل ٹرین استعمال کرتے ہیں وہ دو تین ڈبوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

میں نے اپنے سامان کی شناخت کرنے کے بعد اس کو بیلٹ پر رکھوایا۔ اس کے بعد میں جیسے ہی پیچھے مڑا ایک آدمی نے مجھے اپنا امریکی کسٹم یا امیگریشن کا کارڈ دکھایا اور مجھے برابر والے کمرے کے اندر دھکیل دیا۔ وہاں دو آدمی پہلے سے موجود تھے انہوں نے میرا تفصیلی جائزہ لیا بے شمار سوال پوچھے میرا کینیڈین پاسپورٹ دیکھا۔ ان کی تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد میری جیبوں سے ساری چیزیں نکلوائیں اور میرے پاس سے ملنے والے نقد ڈالر اور ٹریولر چیک گنے گئے۔ اس زمانے میں اگر کسی مسافر کے پاس دو ہزار ڈالر سے زائد کرنسی ہو تو اس کو کسٹم کو مطلع کرنا ہوتا تھا۔ اب یہ حد شاید دس ہزار ڈالر ہے۔ میری خوش نصیبی کہ میرے پاس صرف چند سو ڈالر تھے۔ اس تمام کارروائی میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ میرا قصور کیا تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ امریکا میں پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ اس زمانے میں، میں کینیڈا میں رہتا تھا۔ میرے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھا۔ میں گرے ہاؤنڈ کمپنی کی بس کے ذریعے نیویارک سے ٹورنٹو جا رہا تھا۔ میں جیسے ہی بس کے پاس گیا ایک آدمی نے وہی حرکت کی جو سیاٹل والوں نے کی تھی۔ اپنا کارڈ دکھایا اور مجھے میرے سامان سمیت ایک کمرے میں لے آیا۔ وہاں اس کا ایک بڑا بھائی بھی موجود تھا۔ دونوں بھائیوں نے ڈیڑھ گھنٹا میری سیوا کرنے کے بعد جب مجھے کاندھوں پر اٹھا کر رخصت کیا تو ٹورنٹو کی بس جا چکی تھی۔ مجھے اپنی اس عزت افزائی کی وجہ بھی آج تک معلوم نہ ہو سکی۔

میری عزت و توقیر کا ایک واقعہ پاکستان کا بھی ہے۔ ان دنوں میں برمنگھم میں پڑھائی کر رہا تھا۔ میرے ماں باپ حج سے لوٹ کر کراچی میں میرے خالو کے گھر قیام پذیر تھے۔ میرے خالو وکیل تھے۔ میں نے برمنگھم میں شغل کے طور پر داڑھی رکھ لی تھی۔ اس داڑھی کو زندہ جاوید بنانے کے لیے اس کے ساتھ اپنی تصویریں بھی کھنچوالی تھیں۔ ایک تصویر میں نے اپنے ماں باپ کو بھیج دی کہ یہ آپ کے اعمال کی سزا مجھے مل رہی ہے کیوں کہ جب سے آپ نے حج کیا ہے میری داڑھی نکل آئی ہے۔ ان کو یقین نہ آیا کہ ان کا حج اتنا موثر ہو سکتا ہے۔ وہ تصویر میرے خالو کی گاڑی میں رہ گئی تھی۔ ان کا ڈرائیور یہ تصویر ان کو دینے آیا، خالو نے پوچھا۔ ''جانتے ہو۔ کس کی تصویر ہے۔'' اس کا جواب نفی میں پا کر میرے خالو نے کہا۔ ''یہ حسن صاحب کی تصویر ہے۔'' ڈرائیور نے اپنی حیرت کا اظہار ایک ''اچھا'' سے کیا پھر تفصیل بتائی کہنے لگا۔ ''آپ وکیل ہیں آپ کے پاس ہر طرح کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ میں سمجھا کسی ڈاکو کی تصویر ہے۔'' مجھے میری والدہ کا حکم نامہ ملا۔ ''فوراً داڑھی منڈوا دو۔'' حکم کی تعمیل میرا فرض تھا۔ سارا قصور میرے چہرے کا تھا۔ حیدرآباد دکن کے ایک شاعر نے اپنی منظور نظر کی تعریف کچھ یوں کی تھی۔

چوڑا جبڑا تیرا، صورت تیری پیاری پیاری

میں نے اپنے جبڑے اور صورت کو بغور آئینے میں دیکھا۔ نہ جبڑا چوڑا تھا نہ صورت پیاری پیاری، میرا ہوٹل آچکا تھا۔ اگلے روز APU کی وارننگ لائٹ کا مسئلہ حل کرنا تھا۔

وارننگ لائٹ ہے تو چیز چھوٹی سی مگر اس نے مسائل کھڑے کیے بڑے بڑے۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ جب APU کی بیٹری کے وولٹیج کم ہوں تو کاک پٹ میں ایک ننھی سی وارننگ لائٹ جل اٹھے۔ اس کے لیے ایک سینسر، ایک لائٹ اور دو تاروں کی ضرورت تھی۔ بوئنگ نے اس کی قیمت کئی ہزار ڈالر فی جہاز مقرر کی (شاید یہ قیمت ایک لاکھ ڈالر فی جہاز کے قریب تھی) چھوٹے سے کام کے لیے یہ قیمت کسی طرح جائز نہ تھی۔ بوئنگ کا نکتہ نظر تھا کہ سعودیہ اس کو صرف ایک لائٹ ایک سنسر کا معاملہ سمجھتی ہے جو مناسب نہیں ہے APU جہاز کی دم میں ہوتا ہے اور لائٹ کاک پٹ میں جو تار دم سے کاک پٹ تک جائیں گے وہ جہاز کی سیکڑوں ڈرائنگ میں تبدیلی کا باعث بنیں گے دم سے لے کر ناک تک ہر ڈرائنگ میں یہ تبدیلی دکھائی جائے گی جس کا خرچا لاکھوں ڈالر ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ جہاز کی ڈیلیوری کے بعد سعودیہ یہ کام خود کرے تو اس کو صرف ایک EO لکھنا پڑے گا جس کا خرچا فی جہاز دو ڈھائی ہزار ڈالر سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

B-747 کی ڈیلیوری کے بعد بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ جب آپ بوئنگ 747 میں داخل ہوں تو سامنے گیلی اور اپر ڈیک (UD) جانے والی سیڑھیاں پڑتی ہیں۔ الٹے ہاتھ پر فرسٹ کلاس اور سیدھے ہاتھ پر اکنامی۔ سعودیہ چاہتی تھی کہ جہاں فرسٹ کلاس شروع ہوتی ہے وہاں ایک پردہ لگا دیا جائے تاکہ فرسٹ کلاس کے مسافر ڈسٹرب نہ ہوں۔ میں نے بوئنگ کے کسٹمر انجینئر باب لیف کو CR بھیج دیا۔ ان کا جواب آیا چھبیس ہزار ڈالر فی جہاز اس کے ساتھ ہی اس کی توضیح بھی لکھا تھا۔ اگر آپ اپنے گھر میں پردہ لگانا چاہیں تو آپ بازار سے ایک ریلنگ اور کیلیں خرید لائیں گے دیوار میں سوراخ کر کے ریلنگ لگائیں گے اس کے بعد اس میں ہک پروئیں گے۔ بیوی کی پسند کا پردے کا کپڑا خرید کر اس کو بیوی سے سلوائیں گے یا درزی سے سلوائیں گے اور تیار پردہ ریلنگ پر ٹانگ دیں گے۔ آپ کو بیوی کے علاوہ کسی اور کی منظوری کی ضرورت نہ پڑے گی۔ پھر اپنی مشکلات بیان کیں افسوس بوئنگ کی کوئی بیوی نہیں۔ ہم کو ہر چیز FAA کے حکم کے مطابق خریدنی پڑتی ہے۔ پردے کا کپڑا خاص طور سے بنتا ہے جو آگ نہ پکڑے۔ ہر کام کے لیے ڈرائنگ بنوانی پڑتی ہے کوئی انجینئر مفت ڈرائنگ نہیں بناتا۔ جب سارا کام مکمل ہو جائے تو FAA کو منظوری کی درخواست دینی پڑتی ہے۔ ان کی منظوری کے بعد آپ کے لیے سروس بلیٹن (SB) تیار کرنی پڑتی ہے۔'' پھر افسوس کا اظہار تھا۔ ''انتہائی افسوس ہے کہ اس ساری کارروائی پر پیسا خرچ ہوتا ہے۔'' آخر میں مخلصانہ مشورہ ''میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ سعودیہ اگر خود یہ کام (EO) کے ذریعے کرے تو ہم دونوں کا خوش گوار رشتہ بدستور برقرار رہے گا۔'' اس دفعہ بھی کوئی چارہ نہ تھا۔

میں سیاٹل میں گھر خریدنا چاہ رہا تھا۔ اس کا ذکر نکلا تو لائل نے کہا۔ ''میری بیوی اسٹیٹ ایجنٹ کا کام کرتی ہے، تم کو گھر بھی دلا دے گی اور اس کی دیکھ بھال بھی کرے گی اگر تم چاہو تو کام ختم ہونے پر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنی بیوی اوکی سے ملوایا۔ اوکی کوریا میں پیدا ہوئی تھی بعد میں امریکا آگئی تھی۔ طے ہوا کہ کل وہ مجھے گھر دکھا دے گی۔

اگلا دن میٹنگ کا آخری دن تھا۔ بارہ بجے میٹنگ ختم ہوگئی۔ ڈیموس مجھے اور لائل کو لے کر لنچ کے لیے شہر کی طرف نکل گیا۔ اوکی ہم سے لنچ پر ملنے والی تھی۔ کھانے کے بعد میں اوکی کی گاڑی پر لائل اور اوکی کے ساتھ گھر دیکھنے نکل گیا۔ اوکی مجھے بیل ویو لے گئی جو سیاٹل کا اعلیٰ درجے کا رہائشی علاقہ ہے۔ وہاں ہم نے ایک ٹاؤن ہاؤس کا پروجیکٹ دیکھا۔ دو دو کمروں کے ٹاؤن ہاؤسز تھے ایک قطار میں چار چار ٹاؤن ہاؤسز بیچ کی ایک ایک دیوار آپس میں جڑی ہوئی۔ جب ٹاؤن ہاؤسز کا پیچھے کا دروازہ کھول کر ہم ڈیک پر گئے تو میری آنکھیں اس منظر پر جم گئیں۔ گھر کا پچھلا حصہ بیل ویو گولف کورس میں کھلتا تھا۔ سبزہ درخت پھول پتیاں میری کمزوری ہیں۔ اتنا شاندار پچھواڑہ مجھے اور کہیں نہ ملتا۔ دوسرا گھر دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں خوش تھا کہ اتنی اچھی جگہ مل گئی خاص طور پر آج کے دن کہ سیاٹل میں گھروں کی قیمتیں پچھلے تین برسوں میں بیس فیصد ہر سال کے حساب سے بڑھ رہی تھیں۔ سرمایہ کاری کا بہترین موقع تھا۔ اوکی گھر کی دیکھ بھال بھی کرے گی اور کیا چاہیے۔

آٹھ مہینے بعد اوکی کا فون آیا۔ کرایہ دار گھر چھوڑ گئے ہیں۔ اس سال سیاٹل میں گھروں کی قیمتیں نیچے آگئی ہیں۔ کرائے دار بھی نہیں مل رہے ہیں۔ گھر کی ماہانہ اقساط دینی ہیں۔ دو ہزار ڈالر بھیج دو۔ یہ میری سرمایہ کاری کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ پھر تو ایسی کامیابیوں کا تانتا بندھ گیا اور آج تک بندھا ہوا ہے۔ تنگ دلی خباثت ہے۔ میں اس خباثت سے بچنا چاہتا تھا۔ میں نے کھلے دل سے دنیا کے ہر بڑے ملک کو ایسے سرمایہ سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ہر ملک کی معیشت کو سہارا دیا۔ حتیٰ کہ فراڈ کمپنیوں کو بھی میرا سرمایہ ہر ایک کے کام آیا سوائے میرے۔

میرے والد بھی کامیاب سرمایہ کار تھے مگر زمینداری میں الجھ کر ان کو سرمایہ کاری سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ میری والدہ بہت غمگین ہوگئیں۔ کہنے لگیں۔ ''اب آپ سولہ سو کے ہزار کیسے کیا کریں گے۔'' میرے والد نے میری طرف فخر سے دیکھا اور میری والدہ سے کہا۔ ''اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند''۔ مجھے ان کے اعتماد کا بھرم رکھنا تھا۔ میں نے اوکی کو دو ہزار ڈالر بھجوا دیے۔ سرمایہ کاری کی اس پہلی کامیابی کے بعد میں نے ایسی لاتعداد کامیابیاں حاصل کیں۔

عثمان میرے اور اعجاز کے مشترکہ دوست اور NED کے ساتھی ہیں۔ ان کے میمن ہونے میں عثمان کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ گوری رنگت، بھلی سی شکل پر پلاسٹک کے فریم والی عینک کا بگھار، لانبا قد، قد سے زیادہ لمبی ناک۔ آج تک اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی ہے کہ عثمان کا قد زیادہ لمبا ہے یا ناک زیادہ لمبی ہے۔ ناک کی لمبائی تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس کے بغیر ان کی عینک کا بوجھ کون سنبھالتا۔ عثمان میں دو بہت بڑی خوبیاں تھیں پہلی خوبی تو یہ تھی کہ وہ کسی کی بات کا برا نہیں مانتے تھے۔ خاص طور سے میری کسی بھی بات کا۔ دوسرے وہ مجھ سے بہت انسیت رکھتے تھے۔ ''پیارے بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ویسے تو وہ باقی ہر ایک کو بھی ''پیارے بھائی'' ہی کہہ کر پکارتے تھے مگر جب وہ مجھے مخاطب کرتے تھے تو یہ ''پیارے بھائی'' محبت کی چاشنی سے بھرا ہوتا تھا۔ ہم باقی دوستوں کی طرح عثمان بھی امریکا سدھارے۔

عثمان کے امریکا پہنچنے کی اطلاع جب امریکا کے سابق صدر رچرڈ نکسن کو ملی تو انہوں نے عثمان کو مقابلے کے لیے چیلنج کر دیا۔ مقابلہ ناک کا تھا۔ عثمان ڈھائی تین انچ کی لمبائی سے جیت گئے۔ اس جیت کے بعد عثمان اپنی ناک پر خاص توجہ دینے لگے۔ ویک اینڈ کے دوران میں وہ اپنی ناک میں کھاد ڈال کر ڈھاٹا باندھ لیتے۔ منہ سے سانس لیتے۔ ناک پر خالص سرسوں اور خالص تل کا تیل برابر کی مقدار میں ملا کر اس کی مالش کرتے۔ نہاتے وقت شیمپو بالوں کی بجائے ناک پر استعمال کرتے۔ عثمان کا ایمان تھا کہ انسان کا قد تو اٹھارہ بیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد مزید بڑھنا بند ہو جاتا ہے لیکن ناک کی لمبائی ساٹھ سال کی عمر تک بڑھ سکتی ہے۔ کہتے تھے ''اگر میں یہ سب محنت مشقت نہ کروں تو کہیں اس کمبخت نکسن کی ناک میری ناک سے زیادہ لمبی نہ ہو جائے۔'' عثمان کے خدشات بجا تھے۔

عثمان کی ناک کی لمبائی کا قائم رہنا اور مزید بڑھتے رہنا پوری پاکستانی قوم کے وقار کا مسئلہ تھا۔ یہ وقار عثمان کی ناک پر ٹکا ہوا تھا۔ اس وقار کو اونچا رکھنے کی خاطر عثمان آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چلتے تھے۔ زمین کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔ ناک اونچی ہے تو پاکستان کا وقار اونچا ہے۔

اس فلک نوردی سے عثمان کو کبھی کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ اس لیے کہ امریکا کی سڑکیں پاکستانی سڑکوں کی طرح نہیں ہیں۔ امریکا کی ہر سڑک پر ہر گٹر کے اوپر ڈھکن صحیح سلامت تھے۔ نشئی لوگوں کے مرہونِ منت نہیں تھے۔

امریکا میں عثمان نے پہلے تو اپنے حصے کے دھکے کھائے پھر اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا۔ حالانکہ ایک میمن بچے کو کاروبار کے آداب کیا معلوم۔ مگر عثمان نے ایک عقلمندی یہ کی کہ پاکستان چھوڑنے کے بعد کبھی مجھے ملاقات کا موقع نہ دیا۔ جب کبھی میں ان کو لاس اینجلز میں فون کرتا تو بڑے تپاک سے فون اٹھا کر پہلے کہتے۔ ''ایک منٹ ٹھہرو میں فون کے سننے والے حصے پر موٹا کپڑا چڑھا لوں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سرمایہ کاری کے جراثیم برقی لہروں کے سہارے میرے فون میں داخل ہو جائیں۔'' ٹیلی فون کو اس طرح مفسدانہ خیالات سے بچانے کے بعد کہتے۔ ''یار ملے ہوئے برسوں ہو گئے، دل چاہتا ہے تم سے پانچ چھ گھنٹے کے لیے ملوں مگر یہ کمبخت کام کہاں پیچھا چھوڑتا ہے۔'' پھر ٹھنڈی سانس بھرتے اور کہتے۔ ''چلو خیر اگلی دفعہ سہی تم تو امریکا آتے رہتے ہو۔'' اس کے بعد مزید گفتگو کو غیر ضروری جانتے ہوئے فون بند کر دیتے۔

مجھے بعد میں پتا چلا کہ ہر دفعہ مجھ سے بات کرنے کے بعد عثمان اپنا پرانا ٹیلی فون نمبر کٹوا کر نیا نمبر لے لیتے تھے اور جس فون پر مجھ سے گفتگو کرتے تھے اس کو پلاسٹک کے تھیلے میں بند کر کے کمپنی کے گودام میں سب سے دور والی الماری میں بند کروا دیتے۔ کرسمس کے موقع پر وہ اس ٹیلی فون کو منگواتے اور اپنی سیکریٹری کو بطور کرسمس کے تحفہ کے دے دیتے۔ کم خرچ بالا نشین میرے سرمایہ کاری کے جراثیم سے بھی نجات۔ سیکریٹری بھی خوش۔

ان تمام احتیاطی تدابیر کا نتیجہ یہ نکلا کہ عثمان آج ایک

بہت بڑی کمپنی کے مالک ہیں جو ہر سال کئی سو ملین ڈالر کا کاروبار کرتی ہے۔ عثمان کے کاروباری دیو کی جان میرے ہاتھوں کی چڑیا میں ہے۔ عثمان کو چاہیے کہ اس دن سے ڈریں جب میں ان کی کمپنی میں سرمایہ کاری کر بیٹھوں۔

دنیا میں اور بھی لوگ ہیں جو سرمایہ کاری کے معاملے میں مجھ سے احتیاط برتتے ہیں۔ کئی سال بعد جب میں Gamco میں نوکری کی غرض سے ابوظہبی میں قیام پذیر تھا تو دنیا کے بیشتر ملکوں میں لاٹری کے ٹکٹ خریدنے اور انعام نہ جیتنے کا میرا تیرہ سالہ محکم تجربہ تھا۔ میں لاٹری کے ٹکٹوں میں کئی ہزار ڈالر کی سرمایہ کاری کا اعزاز رکھتا تھا۔ میرا تجربہ بین الاقوامی سطح پر تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیویارک، فلوریڈا، جرمنی، اسپین، تھائی لینڈ، انگلستان وغیرہ وغیرہ۔

ان دنوں ابوظہبی ائرپورٹ پر ایک لاٹری چلا کرتی تھی جس کے ٹکٹ کی قیمت پانچ سو درہم تھی۔ انعام پانچ یا دس لاکھ درہم۔ Gamco کے آٹھ دس لوگ اس لاٹری میں حصہ ڈالا کرتے تھے۔ میں چونکہ تقریباً ہر ہفتے سفر کیا کرتا تھا۔ اس لیے یہ میری ذمہ داری بنی کہ میں اس لاٹری کے ٹکٹ کو خریدا کروں۔ کیوں کہ یہ ٹکٹ صرف مسافر ہی خرید سکتے تھے اس کے لیے جہاز کا ٹکٹ دکھانا پڑتا تھا۔ سال بھر گزر گیا لیکن کوئی انعام نہ نکلا باوجود اس کے کہ ہم لوگ چالیس سے زیادہ ٹکٹ خرید چکے تھے۔ پھر اچانک لوگوں کو میرے تیرہ سالہ لاٹری کے ٹکٹ خریدنے اور انعام نہ نکلنے کے تجربے کا پتا چل گیا۔

جمعرات کا دن تھا۔ دفتر کے اوقات تین بجے تک تھے۔ مجھے پونے چار بجے کی فلائٹ سے کراچی کا سفر کرنا تھا۔ دو بجے کے قریب کیرو بل نے میرے کمرے میں جھانکا۔ کیرو Gamco میں بطور مارکیٹنگ مینیجر کام کررہے تھے۔ میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ کیرو مجھے لاٹری کے ٹکٹ کے پیسے دینے آئے تھے۔ عام طور سے اس ٹکٹ میں میرا ایک سو درہم کا حصہ ہوتا تھا باقی چار سو درہم دوسرے لوگوں کے ہوتے تھے۔ جس کا حساب کتاب کیرو رکھا کرتے تھے۔ آج کیرو نے مجھے معمول کے چار سو درہم کی بجائے چھ سو درہم دیے، میں نے حیرت کا اظہار کیا تو بولے۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری لاٹری کی خوش نصیبیاں اپنا سایہ بھی ہم پر کریں۔ اس لیے یہ ٹکٹ تم صرف ہم لوگوں کے لیے خریدنا اپنا سایہ بھی اس ٹکٹ پر مت پڑنے دینا۔ تم کو اپنے آپ کو اس ٹکٹ سے دور رکھنے کے عوض ہم تم کو ایک سو درہم فالتو دے رہے ہیں۔ مجبوری ہے کہ کوئی اور مسافر نہیں ہے ورنہ ہم تم کو اس ٹکٹ کی بھنک بھی نہ پڑنے دیتے۔

ان لوگوں کی محبت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان لوگوں نے مجھے ٹکٹ سے دور تو کردیا تھا مگر وہ اس بات کو فراموش کر بیٹھے تھے کہ ٹکٹ کے اوپر مسافر کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ میرا نام اپنا اثر دکھا کر رہا۔

اس واقعے کو بیس سال سے اوپر گزر چکے ہیں لیکن میرے اندر کا جذبہ خدمتِ خلق اتنا راسخ ہے کہ اب میں اس جذبے کے تحت صرف ایک لاٹری خریدتا ہوں جو آسٹریلیا کی بوئز ٹاؤن لاٹری کہلاتی ہے۔ ہر پانچ ہفتے بعد اس کا انعام نکلتا ہے۔ ہر ٹکٹ کی قیمت پندرہ ڈالر ہوتی ہے۔ مجھے انعام کی قطعاً پروا نہیں ہے۔ یہ لاٹری تو میں محض انسانیت کی خدمت کی خاطر خریدتا ہوں۔ اس کے ٹکٹ پر میرے یومیہ تینتالیس سینٹ خرچ ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس خطیر رقم سے آسٹریلیا کے سینکڑوں بے سہارا لڑکے مستفید ہوتے ہیں۔ شیطان انسان کو ہمیشہ اس کے برے اعمال خوشنما کر کے دکھاتا ہے۔

بیسویں صدی میں جو ترقی ساری دنیا نے دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جتنی اہم ایجادات اس صدی میں ہوئیں پہلے نہ ہوئی تھیں۔ ان ایجادات کے نتیجے میں وقت کے ساتھ ساتھ نئی نئی اشیاء صرف بازاروں میں آرہی تھیں۔ لوگ ان کو استعمال میں لا رہے تھے اور ان کا طرزِ زندگی بتدریج بدلتا جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بلکہ زیادہ تیزی سے جاری ہے۔ اگر کوئی نئی چیز ایجاد نہیں بھی ہورہی ہے تو کم از کم ان چیزوں کے استعمال کے نئے نئے طریقے ایجاد ہورہے ہیں یا پھر پرانی چیزوں میں ہی بہتری یا تبدیلی لائی جارہی ہے۔ یہی سلسلہ ہوائی جہازوں کے بنانے اور ان کے استعمال کرنے میں بھی جاری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جہاز میں جو مختلف تیکنیکی نظام استعمال ہوتے ہیں ان میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مسافروں کے استعمال اور آرام کی چیزیں اور جہاز کی اندرونی زیبائش بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں۔

جہاز میں استعمال کے لیے اگر کوئی چیز پہلی بار بنائی جائے تو بنانے والی کمپنی اس کو معائنے اور توثیق کے لیے جہاز ساز کمپنی یا ائرلائن یا دونوں کو پیش کرتی ہے۔ تاکہ وہ اپنا اطمینان کرلیں کہ جو چیز بنائی گئی ہے وہ ان کے منشا کے

مطابق ہے اگر کوئی تبدیلی کرنی ہو تو وہ اسی مرحلے میں کرلی جاتی ہے اس کے بعد اس کا مزید پروڈکشن شروع کیا جاتا ہے۔ یہ معائنہ فرسٹ آرٹیکل انسپکشن کہلاتا ہے۔ (FAI)

سعودیہ کے B-747 جہاز اب بننا شروع ہوچکے تھے بہت سا کام مکمل ہوچکا تھا۔ بعض چیزوں کے FAI کا وقت آچکا تھا۔ جس وقت سعودیہ نے B-747 کا پہلا آرڈر دیا تھا اس وقت تک مسافروں کو جو فلمیں وغیرہ دکھائی جاتی تھیں وہ مووی پروجیکٹر کے ذریعے دکھائی جاتی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک امریکی کمپنی نے جاپان کی سونی کمپنی کے اشتراک سے جہاز میں استعمال کے لیے ویڈیو سسٹم بنایا تھا۔ یہ سسٹم سعودیہ نے اپنے B-747 جہازوں کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس ویڈیو سسٹم کا پہلا نگ بن چکا تھا۔ اس کے فرسٹ آرٹیکل انسپکشن کے لیے مجھے ٹرانسکام Transcom کے دفاتر جانا تھا جو لاس اینجلز کے مضافات میں واقع تھے۔ مسافروں کی دیکھ بھال اور خاطر مدارات مارکیٹنگ کے شعبے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ویڈیو، سیٹوں، جہاز کی اندرونی آرائش میں ان کا دخل زیادہ ہوتا۔ انجینئرنگ صرف ٹیکنیکل معاملات کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ویڈیو کے FAI کے لیے میرے ساتھ مارکیٹنگ کے انچارج جارج بھی شامل تھے۔ ٹھہرنے کا انتظام ٹرانسکام کے ذمہ تھا۔

جنوبی کیلی فورنیا میں سمندر کے ساتھ ساتھ ایک سڑک چلتی ہے۔ جس کا نام ہے۔ پیسفک کوسٹ ہائی وے۔ اس کا شمار امریکا کی حسین شاہراہوں میں کیا جاتا ہے۔ ہائی وے کے دونوں طرف کے مناظر دلفریب ہیں۔ اسی ہائی وے کے قرب میں ایک بوٹ کلب ہے جس کا نام ہے ہیلیو ابوٹ کلب، ہمارے ٹھہرنے کا انتظام اسی کلب میں تھا۔ یہاں ٹرانسکام نے چند سویٹ لے رکھے تھے جس میں وہ اپنے مہمانوں کو ٹھہراتے تھے۔

سویٹ شاندار تھے۔ ان میں خواب گاہ کے علاوہ بیٹھک کا کمرا بھی شامل تھا۔ بیٹھک کا اندرونی دروازہ پانی میں کھلتا تھا جہاں کشتی کے پارک کرنے کا بندوبست تھا۔ یہاں پر جو لوگ ٹھہرتے ہیں ان کے پاس ذاتی کشتیاں ہوتی ہیں جن کو وہ اپنے سویٹ کے ساتھ پارک کرسکتے ہیں۔ میرے پاس ذاتی کشتی نہ تھی جس کو میں پارک کرتا۔ اپنی ٹھنڈی آہ، وہاں پارک کر کے میں خواب گاہ میں واپس آگیا۔

میرے مارکیٹنگ کے ساتھی جارج کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ میں نے اپنے تجربے کی بنا پر برطانوی شہریوں کو دو اقسام میں تقسیم کررکھا ہے۔ پہلی قسم ہے جنٹلمین۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں برطانوی تہذیب کی اعلیٰ اقدار موجود ہیں۔ شائستہ، مہذب، نرم مزاج دوسروں کا خیال کرنے والے میری نظر میں اس کی بہترین مثال برطانوی اداکار ڈیوڈ نیون (مرحوم) ہیں۔ دوسری قسم کو میں معاف کیجیے گا خبیث کا خطاب دیتا ہوں۔ ان میں خباثت کا عنصر اگر نہ بھی ہو تو کم از کم بدذات ضرور ہوتے ہیں۔

جارج جنٹلمین تھا۔

جارج میں ایک اور خوبی تھی جو اکثر برطانوی لوگوں میں پائی جاتی ہے ”کنجوسی“۔

ٹرانسکام کے ساتھ ہماری میٹنگ دو دن کی تھی۔ اس لیے کہ اگر FAI کے دوران میں اگر یونٹ میں کوئی ردوبدل کرنا ہوتو اس ردوبدل کے مکمل کرنے کے بعد وہ دوسرے دن دوبارہ معائنے کے لیے پیش کیے جاتے۔

ٹرانسکام بوٹ کلب میں ہمارے قیام کے ذمہ دار تھے لیکن طعام کے نہیں۔ ناشتا ہمارے ذمہ تھا۔ پہلے دن ناشتے کا بل جارج نے ادا کردیا۔ دوسرے دن مجھے آنے میں چند منٹ کی دیر ہوگئی۔ جارج نے بیرے کو ناشتے کا آرڈر دے دیا تھا۔ جب میں سیٹ پر بیٹھ گیا تو رازداری سے بولے۔ ”میں نے بل پر تمہارے کمرے کا نمبر لکھ کر دستخط کردیے ہیں۔“ ان کو گوارہ نہ تھا کہ وہ مزید ایک دن کے ناشتے کے پیسوں کا بوجھ برداشت کرسکیں۔ جیب تو برداشت کرسکتی تھی مگر طبیعت نہیں۔

ناشتا ختم کر کے ہم لوگ ٹرانسکام کے دفتر روانہ ہوگئے۔ ویڈیو سسٹم عمومی طور پر ٹھیک تھا لیکن تصویر دھندلی تھی۔ کل پھر آنا پڑے گا۔ اگلے روز دوبارہ ویڈیو سسٹم چیک کرنے گئے۔ خرابی دور ہوچکی تھی۔ ایک گھنٹے بعد واپس بوٹ کلب آگئے۔ جارج کو جدہ واپس جانا تھا۔ میرا پروگرام اعجاز کے ساتھ دو دن گزارنے کا تھا۔ اعجاز اپنے کام سے واپسی پر مجھے بوٹ کلب سے اپنے ساتھ لے جانے والے تھے۔ سہ پہر میں میرے کچھ دوست بھی مجھ سے ملنے آنے والے تھے۔

ڈھائی بجے جب میں کھانا کھا کر واپس آیا تو ٹرانسکام کا فون آیا کہ مجھے اپنا سویٹ تین بجے تک خالی کرنا ہوگا۔ تین بجے ان کے دوسرے مہمان آرہے تھے۔ مجھ سے

ان کا مطلب پورا ہو چکا تھا۔ میری اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ اب ان کو آنے والے خریدار کو خوش کرنا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں میں ان کے پیسے روک سکتا ہوں۔

میں نے اعجاز کو فون کیا ان کو اپنا کام چھوڑ کر مجھے لینے کے لیے آنا پڑا۔ ہم کو دو FAI اور کرنے تھے۔ ایک سیٹوں کا اور دوسرا گیلی (باورچی خانہ) کا۔ جارج کو دونوں جگہ جانا ہوگا میں صرف سیٹوں کے لیے جاؤں گا۔ سیٹوں کے FAI کے لیے چار پانچ ہفتے بعد واپس امریکا آنا ہوگا۔

کرسی جس کو ہم سیٹ کہتے ہیں چین کی ایجاد ہے۔ اس میں پائے نہیں ہوتے تھے۔ ایک چوکھٹا اس کے اوپر کشن اور پیٹھ ٹیکنے کے لیے پشت۔ انتہائی سادہ۔ پھر سیٹ میں پیچیدگیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں یہاں تک کہ جب یہ کرسیاں ہوائی جہاز میں پہنچیں تو ان کو بنانے کے لیے باقاعدہ مواصفات لکھے گئے جن میں سیٹ کے بارے میں ہر تفصیل شامل ہوتی ہے۔ یہ مواصفات سو ڈیڑھ سو صفحات تک ہو سکتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں ہے اس کی دو خاص وجوہات ہیں آرام اور حفاظت۔

جہاں تک آرام کا تعلق ہے تو اس کا اہتمام ہر سیٹ میں ہونا چاہیے چاہے وہ باورچی خانے میں ہی کیوں نہ استعمال ہوتی ہو۔

جب دنیا میں صنعتی انقلاب آیا ہے تو آدمی سے زیادہ مشین اہم تھی۔ پہلے مشین بنائی جاتی تھی پھر ایسے آدمی ڈھونڈھنے پڑتے تھے جو اس پر کام کر سکیں یا اس کو چلا سکیں۔ آہستہ آہستہ یہ احساس پیدا ہوا کہ انسان مشین کے لیے نہیں بنا ہے بلکہ مشین انسان کی خدمت کے لیے بنائی جاتی ہے لہٰذا مشین کو اس انداز پر بنایا جائے کہ وہ انسانی صلاحیتوں اور حدود کے اندر ہو۔ ایک عام آدمی اس کو آسانی سے چلا سکے۔ پہلوان کی ضرورت نہ ہو نہ ہی سپر مین کی۔ اس کے لیے ایک باقاعدہ سائنس وجود میں آئی جو یورپ اور برطانیہ میں ارگونومکس اور امریکا میں ہیومن فیکٹر انجینئرنگ کہلائی۔ ایک پہلو گو کہ وہ بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔ فیکٹری اور دفاتر میں کام کرنے والوں کے بیٹھنے کی اشیاء کا تھا۔ کام کرنے والا اس پر اپنا سارا دن گزارتا ہے اگر یہ چیز آرام دہ نہ ہو تو اس کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ کام کرنے والے کو جو ذاتی جسمانی بے آرامی پہنچتی ہے وہ اس کے علاوہ۔

برمنگھم یونیورسٹی میں جو ہمارے ارگونومکس کے استاد تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ”جب آپ لوگ یہاں سے پاس ہو کر اپنے اپنے محل نما دفتروں میں جلوہ افروز ہوں گے تو آپ اپنے دفتر میں آنے والوں کو بیٹھانے کے لیے دو مختلف اور متضاد قسم کی کرسیاں بنوائیے گا۔“ پھر انہوں نے اس کی وجہ بتائی۔ ”آپ کے پاس آنے والے بعض ایسے لوگ ہوں گے جن سے آپ جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں گے۔“ اب کرسی کی وہ صفات بتائی گئیں جو اس چھٹکارے کے حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ پہلی صفت کرسی اونچی ہونی چاہیے اتنی اونچی کہ پیر زمین پر ٹکنے کے لیے محنت کرنی پڑے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بیٹھنے والے کی رانوں کے پٹھوں کو بھی دبائے۔ لیکن یہ ایک صفت شاید کارگر نہ ہو۔ اب دوسری صفت کی تفصیل۔ اس کا بیٹھنے کا چوکھٹا آگے کو جھکا ہونا چاہیے تاکہ اس پر بیٹھنے والا اس پر سے مستقل پھسلتا رہے۔ پھر یہ ضمانت دی۔ ”خدا نے چاہا تو وہ بدبخت بہت جلد نہ صرف آپ کی آنکھوں سے بلکہ آپ کی زندگی سے بھی دور ہو جائے گا۔“

آرام دہ سیٹ اس کا تضاد ہوگی۔

جہاز کی سیٹ آرام کے علاوہ محفوظ بھی ہونی چاہیے۔

اگر ابھی تک آپ اس باب کو پڑھ رہے ہیں اور اس کو ترک کر کے اگلے باب تک نہیں پہنچے ہیں تو اگر میں نے ”محفوظ“ کی ساری صفات کی تفصیل بیان کر دیں تو یقیناً آپ دوسرے باب پر ہوں گے بشرطیکہ آپ نے کتاب کو ردی کی ٹوکری کی طرف نہ اچھال دیا ہو۔ لہٰذا صرف ایک دو باتیں۔

پہلی بات جہاز کی ہر چیز اس طرح بنائی جاتی ہے کہ حادثے کی صورت میں کم سے کم جانی نقصان یا انسانی تکلیف ہو۔ لہٰذا ایک خیال یہ رکھا جاتا ہے کہ اگر حادثہ اتنا شدید ہو کہ سیٹ کے ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو سیٹ کے اوپر بیٹھنے والے چوکھٹے کا سامنے والا ڈنڈا سب سے پہلے ٹوٹے۔ اس لیے کہ اگر پچھلا ڈنڈا پہلے ٹوٹ گیا تو مسافر سیٹ میں دھنس جائے گا۔ سیٹ سے اٹھ کر باہر جانے کے قابل نہ رہے گا۔

دوسری بات، سیٹ کا فوم ایسا استعمال کیا جاتا ہے جو دیر میں پگھلے تاکہ مسافر اس سے نہ جلیں مزید یہ کہ فوم بہت کم دھواں دینے والا ہو اور آگ دیر سے پکڑے۔

تیسری بات، سیٹ کا کپڑا خاص طرح سے بنایا جاتا ہے کہ یہ آگ نہ پکڑے اور اگر پکڑے بھی تو بہت آہستہ جلے اور دھواں کم سے کم چھوڑے۔

اگر آپ نے اوپر والی تفصیل واقعی پڑھی ہے تو آپ کے جگر دار ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ ساری محنت صرف آپ کی حفاظت کے لیے ہے۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سیٹ کے مواصفات سو ڈیڑھ سو صفحے کے کیوں ہوتے ہیں۔

سیٹ کے FAI کے لیے میں اور جارج ایک دفعہ پھر ساتھ تھے۔ اس دفعہ ہم کو امریکا کی ریاست نارتھ کیرولاینا کے شہر ونسٹن سیلم جانا تھا۔ امریکا کا یہ خطہ اپنی تمام تر کوششوں اور کاوشوں سے دنیا بھر میں کینسر پھیلانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہاں سگریٹ بنتے ہیں۔ سگریٹ کے برانڈ ونسٹن اور سیلم دونوں کا صحت مند دھواں اسی جگہ سے شروع ہو کر لوگوں کے پھیپھڑوں میں سکون کی نیند سوتا ہے۔ اکیلا نہیں سوتا سگریٹ نوشوں کو بھی اپنے ساتھ سکون کی نیند سلاتا ہے۔

یہاں کے ہوٹل کا بندوبست جارج کو بہت پسند آیا۔ کمرے اور کھانے کے تمام اخراجات فیر چائیلڈ برنس کے ذمے تھے۔ یہ خطرہ ٹل چکا تھا کہ کہیں جارج کو میرے ناشتے کے پیسے نہ دینے پڑیں۔

فیر چائیلڈ برنس سعودیہ کے دوسرے جہازوں کی بھی سیٹیں بناتے تھے۔ ان کو سعودیہ کی ضروریات کا پورا طرح اندازہ تھا۔ سیٹیں سعودیہ کی مرضی کے مطابق بنی تھیں۔ سیٹوں کے FAI کے ساتھ تمام مطلوبہ فرسٹ آرٹیکل انسپکشن پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ اب یہ تمام چیزیں بوئنگ کو روانہ کی جا سکتی تھیں۔ بوئنگ کمپنی ان اشیاء کو جہازوں میں نصب کر دے گی۔

بوئنگ کے ہینگر میں سعودیہ کو ڈیلیور کیے جانے والے جہاز ایک کے بعد ایک پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے تھے۔ پہلے جہاز کی ڈیلیوری تین مہینے بعد تھی۔ B-747 کے تعلق سے اب میرے لیے صرف ایک کام باقی رہ گیا تھا۔ B-747 کے ٹریننگ کورس میں شرکت۔

ٹریننگ جہاز رانی کا جز لازم ہے۔ پائلٹ، انجینئر اور مکینک کا ٹریننگ سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ جب بھی ان کی ائر لائن کوئی نیا جہاز خریدے گی ان لوگوں کو اس جہاز کے ٹریننگ کورس مکمل کرنا پڑیں گے۔ مکینکس کو جو ٹریننگ دی جاتی ہے وہ باریک بین اور تفصیلی ہوتی ہے اور ان کی ٹریڈ کی مناسبت سے دی جاتی ہے یعنی انجن، ایویانکس، سسٹم یا ائر فریم، ان کے کورس کا دورانیہ چار سے آٹھ ہفتے تک کا ہو سکتا ہے۔

مجھے جس کورس میں شرکت کرنا تھی وہ ایک تعارفی کورس تھا جو ٹیکنیکل مینجمنٹ کے ارکان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ بذاتِ خود تو جہاز پر کام نہیں کرتے ہیں لیکن انجینئرنگ کے ادارہ کو چلانے کے لیے ان کو اپنی ائر لائن میں اڑائے جانے والے ہر جہاز کے بارے میں بنیادی تکنیکی معلومات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کورس میں ہر ٹریڈ سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

ٹریننگ کی تفصیل غیر ضروری ہے صرف اتنا بتاتا ہے کہ ہمارے انسٹرکٹر نے اس ٹریننگ کو اپنی شخصیت اور اپنے حسِ مزاح سے خوش گوار بنا دیا تھا۔ نام ان کا جوزف تھا۔ ان کے ریٹائر ہونے میں صرف چند ماہ رہ گئے تھے۔ انہوں نے اس ریٹائرمنٹ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا تعارف کروانے کے بعد تمام شرکا ٹریننگ کو یہ اہم معلومات بہم پہنچائی کہ ان کے اور بوئنگ کے پریزیڈنٹ کے درمیان دو باتیں مشترک ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ دونوں سیاٹل کے ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ خیر یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی کیوں کہ بوئنگ کے اور بھی بہت سے ملازم اس محلے میں رہتے تھے لیکن جوزف میں اور بوئنگ کے پریزیڈنٹ میں اہم ترین اشتراک یہ تھا کہ اب دونوں کے لیے بوئنگ میں مزید آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں بچا تھا۔

جوزف کو اچھی خبر۔ بری خبر، کے لاتعداد لطیفے یاد تھے جو وہ موقع موقع سے سنایا کرتے تھے۔ سعودیہ نے اپنے B-747 کے ٹوائیلٹ میں چھوٹے بچوں کی پچالیاں بدلنے کے لیے ٹوائیلٹ میں دیوار کے ساتھ فولڈنگ میزیں لگوائی تھیں تاکہ ماؤں کو اس کام میں آسانی ہو۔ جب ان میزوں کا ذکر آیا تو جوزف کو فی الفور اپنے اچھی خبر بری خبر کے خزانے سے ایک واقعہ یاد آگیا۔ کہنے لگے۔ ”اچھی خبر یہ ہے کہ میرا بیٹا پوٹی ٹرین ہو گیا۔ بری خبر یہ کہ اس کی عمر اکیس سال ہے۔“

کورس ختم ہو چکا تھا۔

جدہ میرا انتظار کر رہا تھا۔

میرے جدہ پہنچنے کے چھ ہفتے بعد سعودیہ کے پہلے B-747 کی ڈیلیوری ہونی تھی۔ امانڈو کو سیاٹل جانا تھا تاکہ وہ ڈیلیوری پرواز کے دوران میں پرفارمنس سے متعلق ریڈنگ نوٹ کر سکے۔ یہ معلومات پرفارمنس گارنٹی کے لیے استعمال کی جائیں گی۔

جہاز کی ڈیلیوری سے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ڈیلیوری امریکا کی بجائے کینیڈا کی فضائی حدود میں کی

جاتی تھی۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ ڈیلیوری سے چند دن پہلے ائرلائن ایک ایسکرو Escrow اکاؤنٹ کھولتی ہے جس میں جہاز کی خریداری کی رقم جمع کروادی جاتی ہے۔ پھر جس وقت جہاز کی ڈیلیوری عمل میں آتی ہے تو بوئنگ اور ائرلائن کے متعلقہ ارکان جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں اور جہاز کو اڑا کر کینیڈا کی فضائی حدود میں لے جایا جاتا ہے۔ جب ائرلائن کا مندوب مطمئن ہو جاتا ہے کہ جہاز قابل قبول ہے تو وہ اپنی ائرلائن کو مطلع کر دیتا ہے۔ اس اطلاع کے بعد ائرلائن بینک کو ہدایت جاری کرتی ہے ایسکرو Escrow اکاؤنٹ سے پیسے بوئنگ کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیے جائیں۔ ادھر پیسے منتقل ہوئے ا...ادھر جہاز کے اندر موجود بوئنگ کا عملہ ائرلائن کو سیلز سرٹیفکیٹ تھما دیتا ہے کہ جہاز اب آپ کا ہوا اور جہاز شکوہ کرتا ہے

کا ہے کو بیاہی بدیس

اس سارے گھماؤ پھراؤ میں وہی اندازِ فکر کارفرما ہے جو ہماری پارلیمنٹ کے 70 فیصد ارکان کا انداز فکر ہے۔ ٹیکس سے بچت۔ جہاز اگر امریکا سے باہر ڈیلیور کیا جائے تو اس پر سیلز ٹیکس لاگو نہیں ہوتا۔ بوئنگ بھی اس طرح اپنے ملک سے وفاداری دکھاتا ہے جیسے ہمارے 70 فیصد ارکان پارلیمنٹ دکھاتے ہیں۔

ٹیکس کے حوالے سے ایک بات مجھے بوئنگ کے کسٹمر انجینئر نے بتائی جو نہ معلوم کس حد تک سچ ہے۔ بوئنگ کمپنی کوئی انکم ٹیکس ادا نہیں کرتی تھی لیکن یہ سب امریکا کے ٹیکس قوانین کے تحت ہوتا ہے اس میں کسی قسم کی کوئی ہیرا پھیری نہیں ہوتی ہے۔ آج اگر بوئنگ ایک B-747 بیچ دے تو امریکی حکومت کو دو سو ملین (بیس کروڑ) ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب

اس سارے کھیل میں ایک اور چیز بھی قابل ذکر ہے۔ جہاز کے سیلز سرٹیفکیٹ پر اس کی اصل قیمت نہیں لکھی ہوتی ہے۔ لکھا ہوتا ہے یہ جہاز بعوض ایک امریکی ڈالر اور دوسرے قیمتی ملحوظات کے فروخت کیا گیا۔ ان ملحوظات کی کوئی تفصیل درج نہیں ہوتی ہے۔

سعودیہ کا پہلا B-747-100 جہاز رجسٹریشن نمبر HZ-AIA آج پہلی دفعہ جدہ ائرپورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔ انجینئرنگ کا اسٹاف ہینگر کے باہر رن وے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ یہ ان کی ڈیڑھ سال کی محنت کا ثمر تھا۔

☆......☆

B-747 کی خریداری کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو کام کیا جانا تھا اس میں سے زیادہ تر کام ختم ہو چکا تھا۔ اب دوسرے خریدے جانے والے جہاز پر کام شروع کیا جاسکتا تھا۔ اس دوسرے جہاز کے مطلوبہ بنیادی کوائف یہ تھے کہ یہ جہاز بھی وائیڈ باڈی ہو۔ اس میں مسافروں کی تعداد B-747 کے مسافروں کی تعداد سے کافی کم یعنی دو سو کے لگ بھگ ہو اور یہ سعودی عرب سے مغرب میں یورپ تک اور مشرق میں جنوبی ایشیا سے آگے تک کا سفر کر سکتا ہو اور نئی ٹیکنالوجی کے تحت بنایا گیا ہو۔

B-747 اور L-1011 کا ڈیزائن پرانا تھا۔ B-747 کا تو بہت ہی پرانا تھا۔ اس دوران میں ٹیکنالوجی بہت آگے بڑھ چکی تھی خاص طور سے ایویانکس ٹیکنالوجی اینالاگ ایویانکس کی جگہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے لے لی تھی۔ ایویانکس کی دنیا میں انقلاب آچکا تھا۔ اس انقلاب کو سمجھنے کے لیے شاید کلائی پر باندھنے والی گھڑی کی مثال سب سے زیادہ مناسب ہوگی۔ اینالاگ کی مثال پرانی گھڑی کی طرح سے ہے جو گراریوں کی مدد سے گھڑی کی گھنٹا اور منٹ والے ہاتھوں کو حرکت میں لاتی ہے جس سے وقت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ڈیجیٹل ایویانکس کی مثال ڈیجیٹل گھڑی کی طرح سے ہے کہ جس میں گراریوں اور گھنٹا منٹ ہاتھوں کی جگہ وقت گھڑی کے ڈائیل پر یا تو نمبروں کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے یا پھر اس پر گھڑی کے ہاتھوں کا متحرک عکس بنایا جاسکتا ہے۔ یہ سارا کام الیکٹرانک سرکٹ کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ میکینکل پرزے استعمال نہیں کیے جاتے ہیں۔

جہاز کے بنیادی کوائف کا تعین فلیٹ پلاننگ کے شعبے نے کیا تھا لیکن دستیاب جہازوں کا فنی موازنہ اور انتخاب شعبہ مطالبات و مواصفات طائرات کے ذمہ تھا۔ ڈاکٹر اینڈی پاول اس شعبے کے مدیر تھے میں ان کے ماتحت کام کررہا تھا۔ اس شعبے میں ایویانکس میں میرے ساتھ گریم پیرس کام کررہے تھے۔

فلیٹ پلاننگ کے دیے گئے کوائف پر دو جہاز پورے اترتے تھے۔ بوئنگ کمپنی کا بنایا ہوا جہاز B-767 اور ائربس انڈسٹری کا بنایا ہوا A-300-600۔ B-767 بننا شروع ہو چکا تھا اور کئی ائرلائنز کے زیر استعمال تھا۔ A-300-600 ابھی صرف ڈرائنگ بورڈ تک محدود تھا۔ اس سے پہلے جو A-300 جہاز بنائے جا چکے تھے ان میں

اینالاگ ایویانکس کا استعمال ہوا تھا اور ان کے ماڈل نمبر A-300-B2 اور A-300-B4 تھے۔ A-300-600 میں ڈیجیٹل ایویانکس کا استعمال کیا گیا تھا۔

ان دونوں جہازوں کے تکنیکی موازنہ کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ سیاسی دباؤ، امریکا کی خواہش تھی کہ سعودیہ B-767 خریدے جب کہ فرانس کا اور دوسرے یورپی ممالک کا دباؤ تھا کہ A-300-600 خریدا جائے۔ اس سیاسی دباؤ کی وجہ یہ تھی کہ سعودیہ کی اس خریداری کے اثرات بہت دوررس تھے سعودیہ علاقے کی سب سے بڑی ائرلائن تھی۔ جو جہاز سعودیہ خریدے گی اس جہاز کو علاقے کی دوسری ائرلائنز کے ہاتھ بیچنا آسان ہو جائے گا۔

جب تکنیکی موازنہ شروع کیا گیا تو کچھ کچھ جھکاؤ B-767 کی طرف تھا لیکن اس میں ایک اہم مسئلہ آڑے آگیا۔ کارگو کنٹینرز کا مسئلہ۔ کارگو کنٹینرز مختلف سائز میں آتے ہیں ان میں سے زیادہ استعمال کیا جانے والا LD-3 کنٹینر ہے لیکن جب بوئنگ نے B-767 ڈیزائن کیا تو انہوں نے اس میں LD-3 کی بجائے LD-2 کنٹینر استعمال کیے۔ یہ سعودیہ کے لیے مسئلہ تھا۔ اس لیے کہ سعودیہ اپنے تمام جہازوں پر LD-3 کنٹینرز استعمال کررہی تھی۔ اس میں آسانی یہ تھی کہ فرض کریں اگر ایک جہاز لندن سے جدہ آیا ہے اور اس میں چند کنٹینرز ایسے ہیں کہ جن کو آگے ریاض جانا ہے تو ان کنٹینرز کو ایک جہاز سے نکال کر دوسرے جہاز میں باآسانی منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن اگر دوسرے والے جہاز میں LD-3 کنٹینرز نہیں آسکتے ہیں تو سامان پہلے ایک کنٹینرز میں سے نکال کر دوسرے کنٹینرز میں منتقل کیا جائے گا جس کے بعد یہ نیا کنٹینرز دوسرے جہاز میں لادا جائے گا۔ اس منتقلی میں وقت اور افرادی قوت دونوں کا زیاں ہے۔

اس کنٹینرز کے مسئلے کی وجہ سے اور چند دوسری وجوہات کی بنا پر A-300-600 خریدنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ صرف پہلا قدم تھا۔ اصل کام اس کے بعد شروع ہو گا۔ A-300-600 کے مواصفات کا تفصیلی مطالعہ اور اس میں مطلوبہ تبدیلیاں۔ لیکن مواصفات پر کام شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ A-300 کی خریداری کے کنٹریکٹ پر دستخط ہو جائیں۔ کنٹریکٹ کے دستخط کے ضمن میں میرا بوجھ کچھ ہلکا ہو چکا تھا۔ سعودیہ نے باقاعدہ ایک کنٹریکٹ منیجر، مدیر عقود فنی کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔

جیری امریکی باشندہ تھا۔ اس نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کا تجربہ ٹیکنیکل کنٹریکٹ میں نہیں تھا جس کی وجہ سے جیری صرف خالص قانونی نکات پر عبور رکھتا تھا۔ فنی نکات میرے ذمہ تھے۔ ہوائی جہاز کے عقد میں قانونی نکات بہت زیادہ نہیں ہوتے ہیں مگر جو ہوتے ہیں وہ انتہائی اہم ہوتے ہیں۔

A-300 کا خریداری کا کنٹریکٹ مکمل ہو چکا تھا۔ اب مواصفات پر کام شروع کیا جاسکتا تھا۔ بنیادی کام تو B-767 اور A-300 کے موازنہ کے دوران میں ہو چکا تھا۔ اب بال کی کھال نکالنے کا وقت تھا۔ مواصفات کی کتابوں میں غوطہ زنی۔

سعودیہ پہلی ائرلائن تھی جس نے A-300-600 کا آرڈر دیا تھا۔ اس کے فائدے بھی تھے اور نقصانات بھی۔ فائدہ یہ تھا کہ یہ جہاز ابھی بننا شروع نہیں ہوئے تھے۔ سعودیہ ان کے بنائے جانے میں اپنے نکتہ نظر سے کچھ جائز مداخلت کر سکتی تھی۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ان جہازوں نے مکمل کر کے سعودیہ کو ڈیلیور کرنے میں ابھی تین سال کا عرصہ باقی تھا۔ اس عرصے میں ہم لوگ اطمینان کے ساتھ مواصفات پر بھی کام کر سکتے تھے اور وینڈرز کے انتخاب پر بھی۔ وینڈر وہ کمپنیاں ہوتی ہیں جو جہاز پر نصب کیے جانے والے مختلف سسٹم اور کمپیوٹر وغیرہ فراہم کرتی ہیں۔ پہلی خریدار ائرلائن ہونے کا نقصان وہی تھا جو ہر نئی بننے والی چیز کے بننے میں ہوتا ہے۔ اَن دیکھے مسائل کا ابھرنا اور یہ اندیشہ کہ چیز وقت پر تیار ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ ائرلائن کے لیے جہاز کا وقت پر تیار ہو کر ملنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ وقت کی اہمیت اس لیے ہوتی ہے کہ ائرلائن جہاز کی متوقع تیاری کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے آنے والے دنوں کے لیے پروازوں کا ٹائم ٹیبل مرتب کرتی ہے جہاز کے ملنے میں اگر تاخیر ہو جائے تو ائرلائن کا بنایا ہوا ٹائم ٹیبل نظام اوقات متاثر ہوتا ہے۔ اس کی پروازوں میں تاخیر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

مواصفات کے کام کی تقسیم اس طرح سے ہوئی تھی کہ سسٹم کی ذمہ داری اینڈی کی تھی جو شعبہ مواصفات کے منیجر کا کام بھی کررہے تھے گریم اور میں ایویانکس سنبھال رہے تھے اور اماندو اور پرویز رشید انجن اور باقی ماندہ کام دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک ایک تبدیلی آگئی۔ کرٹ نے ڈاکٹر اینڈی پاول کو سسٹم انجینئرنگ میں واپس بھیج کر مواصفات

کے مینیجر کی ذمہ داری مجھے سونپ دی جس کی وجہ سے میرا کام بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جہاز کی اندرونی آرائش، انٹیریئر پر کام کرنے کے لیے کوئی انجینئر نہیں موجود تھا جس کی وجہ سے سیٹوں، گیلی وغیرہ کا کام تعطل کا شکار ہو رہا تھا۔ ان تمام کاموں کو بخوبی سرانجام دینے کے لیے مجھے مزید انجینئر درکار تھے گو کہ انٹیریئر کا کچھ کام پرویز رشید نے سنبھال رکھا تھا۔ پرویز بھی امانڈو کی طرح ہرفن مولا تھے۔ انتہائی قابل انجینئر، پرویز کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ میرے بعد یہ دوسرے پاکستانی تھے جو امریکن کنٹریکٹ پر رکھے گئے تھے لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ ان کو پاسپورٹ کی کمائی کھانے کے طعنے نہیں سہنے پڑے۔ وہ سب پہلے ہی میرے حصے میں آچکے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ PIA سے اگر یہ انجینئر مل جائیں تو ان کو رکھ لیا جائے۔ کرٹ اس کے خلاف تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایک عمر خان کے علاوہ وہ کسی پاکستانی انجینئر کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب کرٹ نے پوچھا کہ تم ذاتی طور پر کسی PIA کے انجینئر کو جانتے ہو جس کا مواصفات کا تجربہ ہو تو میرا جواب نفی میں تھا اس لیے کہ میرے جتنے بھی جاننے والے تھے وہ سب ہینگر میں کام کرتے تھے مواصفات کا تجربہ کسی کو نہ تھا۔

تجربہ کار انجینئروں کی تلاش میں مجھے فلپائن جانا پڑا۔ امانڈو نے فلپین ائرلائن کے تین تجربہ کار انجینئروں کے نام دیے تھے ان کا انٹرویو لینے میں منیلا آیا تھا۔ منیلا ائرپورٹ پر جیسے ہی میں جہاز کے دروازے سے باہر آیا تو لگتا تھا کہ کسی نے میرے کپڑے پانی میں ڈبو دیے ہیں۔ اس درجہ کی ہوا میں نمی میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

فلپائن کے لوگ عام طور سے منکسر المزاج اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ امیگریشن کاؤنٹر پر میرا ایسے استقبال ہوا کہ لگتا تھا کہ میں نے فلپائن آ کر ان لوگوں کی عزت افزائی کی ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے امیگریشن افسران کا جو روکھا پن ہوتا ہے وہ ان لوگوں میں نہ تھا۔

ہوٹل کی بکنگ امانڈو نے پہلے ہی کروا دی تھی میں ہوٹل چلا گیا۔ چار گھنٹے آرام پھر انٹرویو وقت کی کمی کے باعث مجھے کل ہی جدہ واپس جانا تھا۔

انٹرویو جلد ختم ہوگئے۔ تینوں انجینئر قابل اور تجربہ کار تھے میں نے ان تینوں کو نوکری کی آفر دے دی۔ اس کے بعد کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر ایسا گرا کہ رات دس بجے آنکھ کھلی۔ روم سروس والوں کو کھانے کا آرڈر دے کر نہانے چلا گیا۔ نہا کر آیا تو کھانا آچکا تھا میں نے کھانا کھایا اور کافی پینے کے لیے کافی شاپ کا رخ کیا۔ کافی شاپ تو نہ گیا سامنے ڈسکو تھا اس میں گھس گیا۔

ویٹرس آرڈر لینے آئی۔ میں نے کوکا کولا کا آرڈر دے دیا۔ میں کوک پی رہا تھا کہ ایک صاحبزادی سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

''میرے ساتھ ڈانس کرو گے۔''

''مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔

''تعجب ہے۔'' ان کا تعجب بجا تھا۔ اگر میں ڈانس کرنے کی کوشش بھی کروں تو سوائے بے ہنگم ہاتھ پاؤں ہلانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ڈانس اس معاشرے کا حصہ نہیں تھا جس میں، میں پلا بڑھا تھا۔ پھر اظہارِ تعجب کے بعد فرمائش ہوئی۔ ''اچھا تو مجھے ایک ڈرنک منگوا دو۔''

اس فرمائش پر میں پوری طرح چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جب برمنگھم کے زمانے میں، میں اور میرا ایک دوست مائیکل لندن گھومنے گئے تھے۔ شام کا وقت تھا ہم لندن کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ مائیکل کو بیئر کی پیاس لگی۔ سامنے ایک بورڈ لگا تھا۔ ''ڈانس اینڈ ڈرنک''۔ ہم اس جگہ چلے گئے۔ میں نے اپنی پسندیدہ کوک منگوائی۔ مائیکل نے اپنی پسندیدہ بیئر۔ بیئر آنے کے بعد ایک لڑکی مائیکل کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا تم ایک پیاسی غریب لڑکی کے لیے ایک ڈرنک نہیں منگوا سکتے۔'' مائیکل کی جواں مردی جوش میں آگئی۔ اس نے فوراً ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔ لڑکی ڈرنک خود لے کر آئی ساتھ میں ڈرنک کا بل بھی تھا۔ صرف بیس پاؤنڈ۔ اس لوٹ کھسوٹ پر مائیکل نے احتجاج کرنا چاہا تو دو لمبے تڑنگے آدمی اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر آ کھڑے ہوئے۔ مائیکل نے اپنے گستاخانہ رویے کی معافی مانگی اور بیس پاؤنڈ ان کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ میرے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آسکتا تھا۔

میں نے اس لڑکی کے لیے ڈرنک منگوانے سے انکار کر دیا۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ ''تم ڈانس نہیں کرتے۔ خود صرف کوک پیتے ہو۔ دوسروں کے لیے ڈرنک نہیں منگوا سکتے تو پھر ڈسکو میں کیا کرنے آئے ہو۔''

''وقت گزارنے۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔

''میں بھی وقت گزارنے آئی ہوں۔ اگر ہم دونوں

ساتھ وقت گزاریں تو کتنا اچھا ہو۔'' میں نے صاف صاف بتا دیا کہ مجھے ساتھ وقت گزارنے میں کوئی اچھائی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ وہ ناراض ہو کر دوسری میز پر چلی گئی۔

''کیا تم میرے ساتھ ڈانس کرو گے؟'' اس نے وہاں بیٹھے آدمی سے پوچھا۔ وہ دونوں ڈانس کرتے چلے گئے اور میں کمرے میں واپس آگیا۔

کل جدہ واپسی تھی۔ پہلے بینکاک پھر جدہ پھر گھر۔ گھر میں آرام دہ بستر مجھے اس وقت صرف ایک چیز کی طلب تھی بستر۔ وہ میرے سامنے موجود تھا۔

منیلا سے میں نے جن انجینئروں کا انتخاب کیا تھا وہ تینوں انجینئر جدہ آچکے تھے۔ مواصفات کا کام زور شور سے چل رہا تھا لیکن اس درمیان مواصفات کے چند ایسے نکات نے سر اٹھایا جن کو حل کرنے کے لیے میرا تولوس جانا ضروری ہوگیا ائربس کے دفاتر تولوس کے شہر میں واقع تھے۔ تولوس بذاتِ خود جنوبی فرانس میں ہے۔ ایک چھوٹا سا شہر۔ پیرس ائرپورٹ پر امیگریشن سے فارغ ہو کر سامان کا کسٹم کروایا اور ائرانٹیر کی تلاش میں چل پڑا۔ فرانس میں یہ لوگ جس طرح سائن بورڈ لگاتے ہیں وہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئے۔ میں ائرپورٹ کی عمارت میں گول گول چکر کاٹتا رہا۔ حکومت فرانس نے میرے ہی جیسے مسافروں کی خاطر پیرس ائرپورٹ کی عمارت سیدھی یا ایل (L) کی طرح یا یو (U) کی طرح بنانے کی بجائے گول بنائی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسافر بھٹک کر عمارت سے باہر نکل جائیں اور پیرس کی سڑکوں پر بھٹکتے پھریں۔ کئی چکر کھانے کے بعد مجھے ائرانٹیر کا کاؤنٹر دکھائی دیا۔ وہاں سے اپنا بورڈنگ کارڈ لیا اور کاؤنٹر کے ایجنٹ سے یہ اچھی طرح معلوم کرلیا کہ جہاز تک کیسے پہنچا جائے۔

جہاز فضا میں بلند ہوا تو ہوسٹس مشروبات کی گاڑی لے آئی۔

''کیا چاہیے؟'' اس نے پوچھا۔

میں کہا ''کوکا کولا''۔

''پانچ فرینک'' اس نے کہا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ ائرانٹیر مشروبات کے ساتھ پانچ فرینک بھی دیتی ہے میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہہ دیا کہ مجھے پانچ فرینک نہیں چاہئیں۔ اس نے کہا۔ ''میں تم کو پانچ فرینک دے نہیں رہی ہوں تم سے مانگ رہی ہوں۔''

''کس لیے؟'' میرا سوال تھا۔ جواب ملا اس لیے کہ ''یہ کوکا کولا کی قیمت ہے ہم مفت مشروبات نہیں بانٹتے۔'' یہ میں نے پہلی دفعہ سنا تھا کہ کوئی ائرلائن کوکا کولا کے بھی پیسے لیتی ہے پہلی بار والے کھاتے میں ایک اور کا اضافہ۔

''دنیا کی کوئی بھی ائرلائن مشروبات کے پیسے نہیں لیتی۔ ہاں شراب کی اور بات ہے وہ قیمت ادا کر کے ملتی ہے۔'' میں نے اس کو اطلاع دی۔ جواب میں اس نے مجھے مطلع کیا کہ ائرانٹیر دنیا کی اور دوسری ائرلائنوں کی طرح نہیں ہے۔ ہمارا مقابلہ ائرفرانس سے نہیں ہے ان کو تو ہم تین دن میں چت کردیں۔ ان کی یونین بھی ہمارا ساتھ دے گی۔ ائرفرانس میں ہر پندرہ دن بعد کسی نہ کسی یونین کی طرف سے ہڑتال ہوجاتی ہے۔ ائرفرانس تو ویسے بھی ڈوب جاتی اگر حکومت اس کے نخرے نہ اٹھاتی۔ وہ حکومت کے پیسے پر پلتی ہے خود کچھ نہیں کماتی۔''

مجھے یقین تھا کہ اس کو ائرفرانس نے کبھی نوکری سے نکال دیا ہوگا اور اب اس کو اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا تھا لیکن فرانس میں آنے جانے سے معلوم ہوا کہ اس کی باتیں کافی حد تک سچی تھیں۔

''تو پھر تمہارا مقابلہ کس سے ہے جو تم مجھ سے کوکا کولا کے پانچ فرینک مانگ رہی ہو۔''

''ہمارا مقابلہ''۔ اس نے فخریہ کہا۔ ''ہمارا مقابلہ فرانس کی ریل گاڑی سے ہے جو دنیا کی تیز رفتار ترین ریل گاڑی ہے۔ اس کے کرائے ہم سے کم ہیں لوگوں کو ائرپورٹ بھی نہیں جانا پڑتا اگر ہم مفت مشروبات بیچنے لگیں تو ہمارے کرائے بڑھ جائیں اور اگر کرایہ بڑھے تو......'' میں نے اس کو آگے بولنے سے روک دیا۔

''میرے پاس تمہارے درد کی آسان ترین دوا ہے۔''

''سچ۔'' اس نے اچھلتے ہوئے کہا۔

''جلدی سے بتاؤ۔''

میں نے اس کو دوا بتائی۔ ''اپنی ریل گاڑی کے تمام افسرانِ اعلیٰ کو نوکری سے نکال کر پاکستان ریلوے کے افسران کو بھرتی کروا دو۔ تمہاری ریل گاڑی بہت جلد بیٹھ جائے گی۔ ائرانٹیر اوپر آجائے گی اور میرے پانچ فرینک بھی بچ جائیں گے۔''

میرا مشورہ مفت نہ تھا۔ میں نے اس سے تقاضا کیا۔ ''اب تم مجھے پانچ فرینک دو۔ دس فرینک میرے مشورے

کے۔ اس میں سے کوک کے پانچ فرینک نکال کر تمہاری طرف میرے پانچ فرینک بچتے ہیں۔" ائرانٹیر کو تباہی کے دہانے سے بچانے کے عوض یہ سودا اس کو برا نہ لگا۔

اب مجھے پاکستان جا کر پاکستان ریلوے کو یہ بتانا باقی رہ گیا تھا کہ میں نے ان کے مستقبل کا بندوبست کر دیا ہے۔ ان کو چاہیے کہ اب پاکستان ریلوے کو بخش دیں۔ فرانس کی ریل گاڑیاں ان کے ہاتھ کی صفائی کی بے چینی سے منتظر ہیں۔ میں پاکستان ریلوے کی فکر میں تھا وہ ائرانٹیر کی فکر میں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ جلد از جلد اپنے ڈائریکٹر جنرل کو جا کر یہ خوش خبری سنائے۔ اس نے اڑتے جہاز سے چھلانگ لگا دی۔ اس کی چھلانگ نے میرے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا میں خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے کانوں میں آواز آئی۔ "پانچ فرینک۔"

تولوس ائرپورٹ کی عمارت سے نکل کر میں ٹیکسی والے کی طرف بڑھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے فرانسیسی زبان میں استقبال کیا۔ مجھے فرنچ اتنی ہی اچھی طرح آتی تھی جتنی اچھی اس کی اردو تھی۔ ہوٹلوں میں جانے کا مسئلہ عام طور سے مسئلہ نہیں ہوتا۔ آپ ہوٹل کا نام بتا دیں تو ٹیکسی والا بغیر کسی دقت کے وہاں پہنچا دیتا ہے بشرطیکہ وہ صرف تین کمروں والا ہوٹل نہ ہو۔ میں نے یہی ترکیب آزمائی اور کہا۔ "نو وٹیل"۔ اس نے خوش دلی سے کچھ کہا مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ "اوئی موسیو"۔ موسیو تو میں سمجھتا تھا کہ فرنچ میں مسٹر کا ہم معنی ہے۔ یہ لفظ "اوئی" کیا بلا تھی۔ میں نے اردو فلموں میں دیکھا تھا کہ جب ہیرو ہیروئن سے کوئی خاص بات کہتا تھا تو ہیروئن شرما کر "نوج" یا "اوئی اللہ" کہتی تھی۔ یہ نوج یا اوئی نہیں کے معنی میں ہیرو کے ساتھ گھر کا زیور لے کر بھاگ جانے کے پروگرام کو نیم انکاری ہوتی تھی۔ ایک دم سے ہاں کہہ دینے میں خدشہ تھا کہ ہیروئن کی عزت وقعت ہیرو کے دل میں گھٹ جائے۔ اس نیم انکاری کا مطلب وہی تھا کہ...... ہونٹوں پر تو نہ تھی مگر دل میں ہاں تھی۔" مگر اس اوئی والی انکاری کا ایک اہم جزیہ بھی ہوتا تھا کہ ہیروئن دوپٹے کا آدھا پلو کا گھونگھٹ نکال کر سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت ناک پر ضرور رکھتی تھی۔ انگشت شہادت شاید اس لیے کہ فرشتے بھی اس کے منصوبہ کے گواہ رہیں۔

ٹیکسی والے نے اوئی موسیو کہتے ہوئے انگشت شہادت استعمال نہ کی تھی اس لیے حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مجھے بھگا لے جانے کا منصوبہ بنا کر آیا ہے۔ میں اپنی عزت ہتھیلی پر رکھ کر سعودیہ کے A-300 کے مواصفات کی پوٹلی اپنی بغل میں دبا کر اور انگشت شہادت پر ناک ٹیک کر ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ فرنچ oui تھا اردو کا اوئی نہ تھا۔ فرانسیسی اس کو اوئی وی اور ووئی کے اشتراک سے کچھ عجیب سے تلفظ کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ oui کے معنی ہاں یا جی ہاں کے ہوتے ہیں۔

ٹیکسی ائرپورٹ سے نکل کر شہر کی سڑکوں پر پہنچی تو جملہ تمام لوازمات کے ساتھ مجھے آیت الکرسی کا ورد بھی شروع کرنا پڑا۔ وہ جس خطرناک طریقے سے ٹیکسی چلا رہا تھا اس کا توڑ صرف آیت الکرسی تھی۔ میری سمجھ کے مطابق (ڈاکٹر مسعود کے مطابق نہیں) اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں یا تو وہ ریس کی گاڑیوں کا ڈرائیور تھا جو اپنی حرکتوں کی وجہ سے وہاں سے نکال دیا گیا تھا اور اب ٹیکسی چلا کر گزارا کر رہا تھا یا پھر واقعی مجھے بھگا لے جانا چاہتا تھا۔ پہلا تجزیہ صحیح نکلا اس لیے کہ چند منٹ بعد میں نو وٹیل کے کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔

تولوس جنوبی فرانس میں ایک سوتا جاگتا چھوٹا سا شہر ہے جس کی شاید دنیا میں صرف یہی اہمیت ہو کہ یہاں پر ائربس انڈسٹریز کا بہت بڑا ہینگر ہے جہاں پر دنیا کے مختلف ملکوں سے جہاز کے مختلف حصے لائے جاتے ہیں پھر ان سب کو جوڑ کر مکمل جہاز تیار کیا جاتا ہے۔ ائربس کا ہیڈ آفس سیلز اور کسٹمر سپورٹ کے دفاتر بھی یہیں پر ہیں یا اس وقت تھے۔ اب ائربس انڈسٹریز کا ڈھانچا بدل چکا ہے۔ اب یہ EADS کے تحت ہے جس کے متعلق میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

سامان ہوٹل میں چھوڑ کر میں تولوس شہر کی سڑکوں پر نکل آیا کوئی قابل ذکر چیز نہ دکھائی دی۔ ہر دوسرے شہر کی طرح تھا۔ میری میٹنگ کل ہونی تھی۔

دوسری صبح میں ناشتا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹیلی فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی "موسیو" میں نے کہا "جی" تو اطلاع دی کہ ائربس کی گاڑی آپ کی منتظر ہے۔

پندرہ بیس منٹ میں ہم بلاناک پہنچ چکے تھے جہاں ائربس کے ہینگر اور دفاتر کا مجموعہ تھا۔ دفتر میں داخل ہو کر گاڑی صدر دروازہ پر روک کر ڈرائیور نے اپنی ٹوپی پہنی۔

گاڑی سے اتر کر اپنی وردی ٹھیک کی اور مودبانہ انداز میں میرا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا کہ میں شان کے ساتھ گاڑی سے برآمد ہو سکوں۔ مجھے اپنی اصلی اوقات یاد آ گئی۔ کراچی میں بس میں سفر کرنے والے مسافروں کو بعض خاص قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان ہی میں ایک ہے "چلتی بس پر سے اترنے" کا آرٹ۔ اگر ذرا سی بھی سستی ہو جائے تو کنڈیکٹر پیچھے سے مسافر کی کمر پر اپنے گھٹنے کا ٹھونگا لگا کر کہتا ہے۔ "ارے اترو ڑے پنا گیڑ کا بچہ۔ کیا گاڑی تمارا واسطہ ایک گھنٹا کھڑا رہے گا۔" حالانکہ گاڑی پوری طرح رکی بھی نہ ہوتی تھی۔ اس وقت پنا گیڑ کا بچہ کے لیے مودبانہ دروازہ کھولا جا رہا تھا۔ اتنی عزت افزائی اور توقیر کی توقع نہ تھی۔ رومال کی ضرورت محسوس ہوئی۔

صدر دروازے پر بھی یہی عالم تھا۔ ایک لڑکا دروازہ کھول کر کھڑا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے مودبانہ اپنا سر اوپر نیچے ہلایا اور انتہائی تمیز کے ساتھ ریسپشن کی طرف اشارہ کیا۔

ریسپشنسٹ چاہے ہوٹل کی ہو، دفتر کی ہو، اسپتال کی ہو یا جیل خانے کی اس کا کام مسکراہٹیں بکھیرنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہر طرف مسکراہٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ مسکراہٹوں سے زیادہ یوڈی کولون میں بسی ہوئی خوشبو کی لپٹیں تھیں۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ "موسیو رضا کی" میں نے ہاں کہنے کے انداز میں سر ہلایا۔ انہوں نے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ پاکستان، سعودی عرب، کینیڈا کی دوستی فرانس سے پکی ہو چکی تھی۔

اگلے مرحلے میں ریسپشنسٹ کو بتایا تمام ائربس کے ملازمین کو دو خوشخبریاں سنانی تھیں۔ پہلی یہ کہ موسیو رضا کی بلاناک پہنچ چکے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ "موسیو رضا کی" سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔

پہلی خوش خبری نے میرے نام کی ٹانگ توڑ کے رکھ دی۔ جس کو انہوں نے فون پر میرے آنے کی اطلاع دی تھی۔ اس کی سمجھ میں میرا نام نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا میرے نام کے ہجے فرانسیسی صوتی اثرات کے ساتھ گئے۔ "آر آ دوزی آ کا ای"۔

اس کو یوں پڑھا جا سکتا ہے۔

"I K A Z Z A R"

اب اس کو الٹا پڑھیے۔ RA ZZ A K I

فرنچ میں دو کو DOU کہتے ہیں اور زیڈ کو زی۔ دو زی یعنی ڈبل زیڈ۔ پہلے اس نے قط کہا پھر بت کہا پھر دین کہا۔ اس طرح ظالم نے قطب الدین کے ٹکڑے کر دیے۔ اگر جرمنوں کو اس طرح کوڈ میں بات کرنی آتی تو وہ دوسری جنگ عظیم کبھی نہ ہارتے۔ اپنے نام کے یہ صوتی اثرات میں نے اگلے چار سال میں درجنوں دفعہ سنے لیکن اب میں اس صوتی قتل کا عادی ہو چکا تھا۔ لخت لخت اپنے نام کو دوبارہ جمع کر لیتا۔

میری پہلی ملاقات رنجیت جایارتام سے ہونی تھی جو ائربس کے شعبہ سیلز کے سربراہ تھے۔ ہندوستانی، دراز قد، دبتا رنگ، وجاہت سے بھرپور شخصیت، انتہائی اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کے مالک، ورنہ ایک جنوبی ایشیا کے باشندے کا گوروں کے تالاب میں ایسا اہم اور اعلیٰ عہدہ حاصل کرنا ناممکن تھا۔ رنجیت عمر میں بھی زیادہ نہ تھے۔ میرے ہم عمر ہوں گے۔

رنجیت نے مجھے باقی لوگوں سے ملوایا۔ اب ہماری اصل میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ میٹنگ کا پہلا مرحلہ یعنی ابتدائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ رنجیت کی موجودگی میں ہی گزر چکا تھا۔ اب میٹنگ کا اہم ترین مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ جس کے بعد ہم کام کی باتیں بھی کر سکتے تھے۔ اس مرحلے کے لیے ائربس والے ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس تھے۔ چائے، کافی، دودھ، جوس بسکٹ، کیک اور نا معلوم کیا کیا۔ دوسرا مرحلہ فرنچ معاشرت میں سب سے طویل مرحلہ ہو سکتا ہے اگر ان کو یہ یاد نہ دلایا جائے کہ اس کے بعد تھوڑا سا وقت کام کاج کے لیے بھی بچا لینا چاہیے۔ تولوس کی یہ میٹنگ فرانسیسیوں سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ جب تک میں زور بازو سے اس مرحلے کو نہ روکوں یہ شام تک بھی چل سکتا ہے۔ رنجیت گھاگ آدمی تھا اس کو فرانسیسی معاشرے اور میری اس ماحول میں تن تنہا پہلی میٹنگ کا خوب اندازہ تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد اس کا سر دروازے میں نمودار ہوا۔ تم لوگوں کا کام کیسا چل رہا ہے۔ اب ائربس والوں کو خیال آیا کہ چلو طوعاً و کرہاً تھوڑا سا کام بھی نمٹا لیا جائے۔

میری اس میٹنگ کا مقصد A-300 جہاز کی چند مواصفاتی تبدیلیوں کو جن کا تعلق ایویانکس سے تھا سمجھنا اور سمجھانا تھا۔ سعودیہ نے ان تبدیلیوں کے لیے CR جاری

کیے تھے جن کے جواب میں ائربس سے SCN اور ٹیکنیکل نوٹ جاری کیے تھے۔ SCN ان تبدیلیوں کے لیے جاری کیے جاتے ہیں جو ائربس کو قابلِ قبول ہوں۔ اس میں تبدیلی کی تفصیل۔ اس تبدیلی کے باعث جہاز کے کسی نظام پر اثرات۔ اس تبدیلی کی قیمت اور اس کی وجہ سے جہاز کی ڈیلیوری میں تاخیر کا امکان وغیرہ شامل ہوتے۔ ٹیکنیکل نوٹ (TN) ان تبدیلیوں کے لیے ہوتا جو کسی وجہ سے نہیں کی جاسکتی ہیں۔ ان وجوہات کی مکمل تفصیل درج ہوتی ہے ورنہ جہاز خریدنے والی ائرلائن ان کے گلے پڑ جاتی ہے۔ ٹیکنیکی بخشم بحث کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی مرحلے ہیں جن پر سارے خیر سگالی کے جذبات ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ اصل جذبات سارے میک اپ اتار کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے سہاگ رات کی صبح کی دلہن۔ آج کل کے بیوٹی پارلر کیموفلاج کے ماہر ہو چکے ہیں۔ سنورنے بجنے کے بعد چڑیل جیسی شکل بھی دنیا کی حسین ترین شکل اس طرح سے بن جاتی ہے کہ دولہا وارا ہو جاتا ہے لیکن جب وہی دلہن صبح اٹھ کر اپنا میک اپ اتارتی ہے تو اکثر دولہا دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ ہائے یہ جوانی یہ موت۔ دولہا صرف مرتے ہی نہیں مرنے مارنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک صبح ایسے ہی ایک حادثے کے بعد دولہا الٹے ہاتھ سے دل کو تھامے سیدھے ہاتھ میں پستول اور آنکھوں میں خون اتارے اس بیوٹی پارلر پہنچ گیا جہاں دلہن کو سجایا گیا تھا۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی دلہن کا سنگھار کس منحوس نے کیا تھا۔ وہ اس سے بھجنے کے لیے تیار تھا منحوس پارلر کے پچھلے دروازے سے سٹک چکی تھی۔ اس دن کے بعد وہ اس پارلر میں نہ دیکھی گئی منحوس نے دوسرے پارلر میں نوکری کر لی تھی۔

لیکن میری میٹنگ میں ابھی خنجر پستول وغیرہ نہ نکلے تھے۔ آدھے گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد میرے فرانسیسی بھائی نڈھال ہو چکے تھے۔ اس تھکن کا دافع انہوں نے اس طرح نکالا کہ اس بحث میں پڑ گئے کہ لنچ کے لیے مجھے کس ہوٹل میں لے جانا چاہیے۔ کام تو ہوتا رہتا ہے۔ یہ بحث آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہی آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ ان کو اس بحث میں نہ پڑنا چاہیے کہ لنچ کے لیے وہ سب اور میں رنجیت کے مہمان ہیں۔ ہوٹل کا انتخاب رنجیت کا دردِ سر ہے ان کا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد [illegible] نکل اٹھے۔

رنجیت نے سر دروازے میں داخل کر کے پوچھا۔ ”دوستو ہوٹل پر دھاوا بولنے کے لیے تیار ہو۔“ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

فرانس کے لوگ کھانا پکاتے بہت محنت سے ہیں اور کھاتے اس سے بھی زیادہ محنت اور اطمینان سے ہیں۔ خاص طور سے رات کے کھانے میں دو دو تین تین گھنٹے لگا دیتے ہیں۔ فرانس کے تمام بڑے شہروں میں خاص طور سے پیرس میں اگر آپ رات نو بجے کھانے کے لیے جائیں تو عین ممکن ہے کہ آپ کو ریسٹورنٹ والے انتہائی معذرت کے ساتھ اندر آنے سے منع کر دیں۔ عموماً لوگ ساڑھے آٹھ بجے تک ریسٹورانٹ پہنچ جاتے ہیں۔ سب سے پہلے اپاریٹیف کا سلسلہ ہوتا ہے جو ہلکے قسم کے شراب یا جوس وغیرہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد باتیں پھر ویٹر مختلف اقسام کی ڈبل روٹیوں کے ٹکڑے، رول، بن وغیرہ لے آتا ہے اور اس کے ساتھ مینو۔ اب کھانے کے انتخاب کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ بھی خاصے اطمینان کے ساتھ طے کیا جاتا ہے۔ فرانس کے شیف اپنے پیشے سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں ہر کوئی اپنی اپنی خاص ترکیب سے کھانا بناتا ہے۔ اس کے لیے کھانے والے کے وقت کی نہیں اپنی مہارت اور انفرادیت کی اہمیت ہوتی ہے۔ جب تک کھانا آتا ہے سوپ اور سلاد کا دور چلتا ہے۔ پھر کھانا کھانے کے بعد مزید باتیں پھر فرانس کی خاص ڈش انواع و اقسام کی پنیر، فرانس میں ڈھائی سو سے زیادہ طرح کی پنیر بنتی ہے۔ جس میں سے پندرہ بیس مختلف اقسام، کھانے والوں کو پیش کی جاتی ہیں۔ چیز کے بعد میٹھا۔ میٹھے کے ساتھ کافی بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہ کافی عموماً تلخ ہوتی ہے اور تھوڑی مقدار میں پی جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر باتوں کی تہہ۔ کھانے کے دور کے ختم ہونے کی اُمید اس وقت بندھتی ہے جب میزبان ویٹر سے کونیک لانے کا آرڈر دے۔ جب کونیک کا دور ختم ہو جائے تو گھر جانے کا وقت ہو جاتا ہے جو ساڑھے گیارہ بجے رات سے لے کر ایک بجے رات تک ہو سکتا ہے دنیا میں اور کون سی قوم ہے جو اتنی محنت اور محبت سے کھانا کھائے گی۔ شکر ہے یہ دن کا کھانا تھا رات کا نہیں۔ رات کے کھانے کی آزمائش کے لیے ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔

جاری ہے

لی مان

امجد رئیس

ریس صدیوں پرانا کھیل ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شکل بدلی ہے۔ کتے، گھوڑے اور دیگر جانوروں کو دوڑانے کا کھیل تو دلچسپی کا مرقعہ ہے ہی' اب کاروں کی ریس بھی بہت زیادہ پسند کی جانے لگی ہے۔ ایسی ہی ایک ریس میں کئی سو افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

ایک رونگھٹے کھڑے کر دینے والی ریس کی داستان

لی مان اسپورٹس کی دنیا کا مقبول ترین، موٹر ریسنگ ایونٹ ہے۔ اس کی اپنی تاریخ ہے۔ چوبیس گھنٹے کا نان اسٹاپ ایونٹ ہے۔

☆☆☆

اس بار لی مان گراں پری نے عالمی سطح پر سنسنی پھیلائی ہوئی تھی جس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو ورلڈ چیمپئن ”فینگیو“ مقابلے میں حصہ لے رہا تھا۔ دوسرے نئی نئی کاریں، مقبول ترین ڈرائیورز کے ساتھ اسپیڈ کے نئے ریکارڈز قائم کرنے جا رہی تھیں۔ ایسی برق رفتاری کے دعوے کیے جا رہے تھے جو اس سے قبل دیکھے نہیں گئے تھے۔ ہر کمپنی اپنی اپنی کار کی اشتہار سازی میں مگن تھی۔ ان میں مغربی جرمنی کی مرسڈیز بینز، اٹلی کی فراری، گورڈین آف فرانس، برطانوی جیگوار اور ایسٹن مارٹن وغیرہ تھیں۔

ان دنوں فینگیو، کیسٹولیٹی اور مائیک ہاتھورن کی مقبولیت نے ہر گھر کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ جو لوگ اسپورٹس کے شائق نہیں تھے وہ بھی ان ناموں سے واقف تھے۔

مطلع صاف اور چمکیلا بلکہ کسی قدر گرم تھا۔ ریس سے متعلق ہر فرد کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ ریس کا آغاز سہ پہر کو ہوا تھا۔ ابتدا میں ہی اگلی کاروں کی رفتار 150 میل فی گھنٹا تک پہنچ چکی تھی۔

پھر فینگیو اور ہاتھورن نے لیپ ریکارڈ بنانے شروع کیے۔ اس دوران میں ان کی اوسط رفتار 120 میل فی گھنٹا تھی جو اس سے قبل ”گراں پری“ میں نہیں دیکھی گئی تھی۔ شروع کے

دو گھنٹے سخت ہیجان اور سنسنی خیز تھے۔

پھر دفعتاً دہشت کا دیوتا ایسے نمودار ہوا جیسے بجلی کڑکتی ہے۔ مرسڈیز کاروں میں سے ایک کار بے قابو ہو کر اچھلی اور قلابازی کھا کر تیر کی مانند فضا میں بلند ہو کر تماشائیوں کو چیرتی چلی گئی۔ جب وہ ساعت شکن دھماکے سے پھٹی تو 100 تماشائی فرشتۂ اجل کا شکار ہو چکے تھے۔ ان گنت زخمی تھے۔ اس بھیانک المیے کو جنم پذیر ہونے میں فقط 3 سیکنڈ لگے تھے۔ اکثر اموات اتنی سرعت سے ہوئیں کہ مرنے والوں کو ادراک ہی نہ ہو سکا کہ وہ خطرے میں ہیں یا زندگی کی سانسیں پوری کر چکے ہیں۔

یہ سب کیسے اور کیونکر ہوا؟ یہ سوال ایک نہ ختم ہونے والے تنازع میں بدل گیا۔

☆☆☆

ریس جاری تھی۔ کراؤڈ کی توجہ کا مرکز مائیک ہاتھورن تھا جو برطانوی ڈی ٹائپ جیگوار میں اڑا جا رہا تھا اور چیمپئن فینگیو کے لیے حقیقی خطرہ بنا ہوا تھا۔ چیمپئن سلور رنگت کی مرسڈیز بینز میں تھا۔ فرنچ مین پیری لیوی، مرسڈیز میں ان دونوں سے ایک لیپ (Lap) پیچھے تھا۔

اس وقت مائیک ہاتھورن نے بریک پر پیر رکھا۔ کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ وہ اپنی گاڑی کے لیے مخصوص جگہ پر سائیڈ پکڑ رہا تھا تاکہ اسٹیرنگ ساتھی ڈرائیور کے حوالے کر دے۔ ساتھی ڈرائیور کا نام لون ڈونر باب تھا۔ بعد کی تفتیش کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ اس نے سائیڈ پکڑتے وقت عقب میں آنے والوں کو ضوابط کے تحت ہاتھ سے اشارا دے دیا تھا۔ چند برس بعد ٹائم میں ایک خط چھپا جس میں مائیک کے بیان کی تصدیق کی گئی تھی۔

بہرحال جب اس کی گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو پیچھے یعنی تیسرے نمبر پر فرنچ مین پیری لیوی نمودار ہوا۔ وہ بھی مرسڈیز میں تھا اور گاڑی کی رفتار 180 میل فی گھنٹا تھی۔ مائیک کی گاڑی کے سائیڈ پکڑنے سے عقبی گاڑیوں کو ایڈجسٹمنٹ کرنی پڑی۔ اسی دوران میں برطانیہ کی آسٹن، ہیلے جو لانس میک لن بھگا رہا تھا وہ تیسرے نمبر پر آ گئی۔ پیری کی مرسڈیز نے آسٹن کے عقبی حصے کو چھوا۔ 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے مرسڈیز کی ہلکی سی ٹکر نے آسٹن کو بے قابو کر دیا اور وہ چک پھیریاں کھاتی ہوئی 100 گز تک پھسلتی چلی گئی۔ کوئی حادثہ نہیں ہوا اسی لیے کسی نے توجہ نہیں دی۔

تمام نگاہیں لیوی کی مرسڈیز پر تھیں۔ مرسڈیز آسٹن کو دور پھینکنے کے بعد خود بھی پھسلی اور چھ فٹ دبیز سیفٹی بینک سے ٹکرائی جو اس طرح ڈیزائن کیا گیا تھا کہ گاڑی کے لیے بیرونی بریک کا کام کرتا تھا اور ڈرائیور کو واپس ٹریک پر لے جانے میں مددگار ثابت ہوتا تھا تاہم اس بار ایسا نہیں ہوا۔

گاڑی کنارے سے ٹکرا کر ایک جھٹکے کے ساتھ بلند ہوئی اور فضا میں سم سالٹ لگا کر تماشائیوں کی جانب گئی۔ گرنے سے قبل گاڑی نے ایک اور انتہائی تیز قلابازی کھائی نیچے گر کر دوبارہ ہوا کے دوش پر آئی پھر دھماکے سے فضا میں ہی کسی بم کی مانند پھٹ گئی۔ گاڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ ڈرائیور کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد ازاں اس کی لاش سڑک پر ملی۔

اس منحوس دن کی انوکھی ریس کو اتنے زیادہ تماش بین دیکھ رہے تھے کہ حادثے کی نوعیت اور شدت کو بہت کم لوگوں نے محسوس کیا۔ ریسکیو آپریشن پوری پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ جاری تھا۔

شاید اسی یا کسی اور وجہ کے تحت ہائی لیول منتظم نے شو جاری رکھا۔ ریس، میوزک اور تفریح......!!

تاہم اس مرتبہ میڈیا نے ہلہ بول دیا۔ ان میں بین الاقوامی صحافی بھی شامل تھے۔ ریڈیو، ٹی وی اور پرنٹ میڈیا نے بڑی تیزی اور ہر زاویے سے رپورٹنگ کی۔ حتیٰ کہ فلم ایڈیٹر، پروڈیوسر اور انڈسٹری کا دیگر عملہ بھی پہنچ گیا جنہیں اس قسم کی چیزوں کی تلاش رہتی تھی تاہم لی مان فرنچ گراں پری میں جو ہولناک خونی المیہ جنم لے چکا تھا، وہ تاریخ کے بدترین اسپورٹس المیوں میں سے ایک تھا جس کی جزئیات اتنی بھیانک تھیں کہ سخت دل حضرات بھی آبدیدہ ہو گئے۔

ایک رپورٹر کے مطابق مرسڈیز کا انجن اور بیک ایکسل کسی بلیڈ کی مانند 100 گز تک گنجان تماشائیوں کو کاٹتا چلا گیا۔ منظر خونی میدانِ جنگ کی مانند لگ رہا تھا۔ مرد، عورت دیوانوں کی مانند لاشوں میں اپنے عزیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ جب کہ گاڑیوں کے طاقت ور انجن گرجتے ہوئے فراٹے بھر رہے تھے۔"

ایک کہنہ مشق کیمرا مین کا تبصرہ تھا۔ "میں نے نہ صرف جنگی مناظر کی عکس بندی کی ہے بلکہ ہر قسم کی ہولناک بربادیوں کو کیمرے کی مدد سے محفوظ کیا ہے لیکن جو کچھ میں نے یہاں دیکھا، وہ میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش اور دردناک منظر تھا۔ عام آدمی تو نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہاں بچے تھے جن کے سر دھڑ سے الگ ہو چکے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آئس کریم اس وقت بھی گرفت میں تھی جسے چند سیکنڈ پہلے وہ چکھ رہے تھے۔ وہاں ایک باپ تھا جو پاگل ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن نے بیٹے کی موت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اس کی لاش کو محفوظ جگہ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہر جانب لاشیں بکھری تھیں۔ کچھ اسپتال جاتے ہوئے راستے میں دم توڑ گئے تھے۔ کچھ لاشوں پر پھٹے ہوئے اشتہاری بینرز ڈال دیے گئے تھے۔ مرسڈیز کے پھٹنے اور اس کے فیول سے جو آگ لگی تھی اس نے لاشوں کو جھلسا دیا تھا۔

ریسکیو مشن میں وہ ڈاکٹر بھی شامل ہو گئے تھے جو خود ریس کا نظارا کرنے آئے تھے۔ رات کو بارش نے نیا بحران پیدا کر دیا۔ لی مان کے مقامی اسپتالوں میں انتقال خون کے 80 مریض پڑے تھے۔ بلڈ سپلائی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ خون کی شدید اور فوری ضرورت تھی۔

ٹریجڈی کے بعد پہلی مرتبہ موسیقی کی تانوں نے دم توڑا اور لاؤڈ اسپیکر سسٹم پر بلڈ ڈونیشن کی اپیل شروع ہو گئی جس کا فوری اور مثبت ردِعمل سامنے آیا۔ ڈونرز خون دے کر دوبارہ ریس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

ریس کے خاتمے کا اعلان ابھی تک نہیں کیا گیا تھا۔ گاڑیاں بارش میں بھی دوڑ رہی تھیں۔ اسٹالز بھی کھلے تھے۔

کیا یہ پاگل تھا؟ کیا کہا جا سکتا تھا؟ تاہم اس کا ایک مثبت پہلو بھی تھا کہ عوام افراتفری اور ہنگامہ آرائی کا شکار نہیں ہوئے تھے، ورنہ ریسکیو آپریشن جاری رکھنا ممکن نہ رہتا بلکہ ہلاکتوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی۔

تصور کیا جا سکتا ہے کہ ڈھائی لاکھ کے قریب تماشائی بیک وقت وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے تو کیسی ہڑبونگ مچتی۔

فلڈ لائٹ کی روشنی میں دمکتے ہوئے ٹریک پر گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ تاہم روح فرسا حقائق عیاں ہونے لگے تھے اور ڈرائیورز کی دلچسپی ریس میں ختم ہو چکی تھی۔ یہ ایک ایسی ریس میں تبدیل ہو گئی تھی جہاں کوئی حقیقی فاتح نہیں تھا تاہم اب بھی اسپانسرز کا ردِعمل منقسم تھا۔ مرسڈیز گروپ نے فیصلہ کر لیا تھا اور وہ ریس سے نکلنے کے لیے فرم کے ڈائریکٹر سے رابطے کے لیے بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن لائنیں جام ہو گئی تھیں۔ فوری رابطے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

آخر میں بون کی وفاقی حکومت (مغربی جرمنی) نے مداخلت کی۔ اگرچہ لی مان کے آرگنائزران کو اتوار کے روز 1.45AM تک ملوث رکھنا چاہتے تھے تاہم اسی اثنا میں جرمن ٹیم کے منیجر الفریڈ نیوبار کو اختیار مل گیا تھا کہ وہ اپنی باقی ماندہ دو گاڑیوں کے لیے جھنڈا لہرا دے۔ دونوں گاڑیاں پہلی اور تیسری پوزیشن پر تھیں۔ درمیان میں ہاتھورن تھا۔ ہیڈ آف جیگوار مسٹر ولیم لی آن ریس کے اختتام کی حمایت میں بول رہا تھا۔ کیونکہ اس کا اپنا بیٹا بھی مارا گیا تھا۔ "ریسنگ کا جواز ختم ہو گیا ہے۔ حادثے کی سنگینی عیاں ہے۔ ہم اس شدت کی ٹریجڈی پر کس حد تک دکھ کا اظہار کر سکتے ہیں۔ رنج و غم نے اسپورٹس پر تاریک سایہ ڈال دیا ہے!"

☆☆☆

1955ء کی لی مان فرنچ گراں پری ریس کا ونر ہاتھورن تھا ریس کے دوران اس کی اوسط رفتار 108 میل فی گھنٹا کے قریب رہی تھی۔ ایونٹ کے بعد اس نے تبصرہ کیا:

"میری جیت ایک مذاق ہے۔ اپنے کیریئر کے اس موقع پر میں ہار کر زیادہ مطمئن ہوتا۔"

ہاتھورن قدرتی طور پر تنقید کی زد میں آیا کیونکہ ریس کے دوران دوسرے حادثے کا ذمہ دار اسے سمجھا جا رہا تھا۔ پریس میں اس پر الزام تھا کہ گاڑی روکتے وقت اس نے مطلوبہ اشارہ نہیں دیا تھا۔ دوسرے وہ مقررہ جگہ سے 80 گز دور رکا تھا۔

میک لی اور فینگیو نے چند سال بعد کچھ ایسا ہی الزام لگایا۔ داستان بربادی کے بعد ہاتھورن کو آفیشل انکوائری میں بری الذمہ قرار دے دیا گیا۔ شاید حقیقت صرف اسی کو پتا تھی لیکن چند سال بعد (1959) وہ ایک عام روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔

لی مان کے المیے کے بعد فرانسیسی حکومت نے ایکشن لینے میں کسی تاخیر کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سب سے پہلے تمام موٹر کاروں کی ریس پر پابندی لگا دی گئی جب تک نئے سیفٹی رولز پر اتفاق رائے کے بعد اعلان نہیں ہو جاتا دوسرے نئے سیفٹی رولز کو انٹرنیشنل ایگریمنٹ کے لیے آگے بڑھانا تھا تاکہ انہیں ہر ملک میں یکساں طور پر لاگو کیا جا سکے۔

تمام کارروائی کے تین مرکزی نتائج برآمد ہوئے۔ اوّل تمام کار ایونٹس پر پابندی لگا دی گئی کہ لو اسپیڈ اور ہائی اسپیڈ کارز کو بیک وقت ایک ہی ریس میں شامل نہیں کیا جائے۔ (کیونکہ آسٹن۔ ہیلے کو ہٹ کرنے والی مرسڈیز اس کے مقابلے میں طاقت ور گاڑی تھی)۔

دوم تماشائیوں کا دائرہ ریس ٹریک سے مزید دور کر دیا گیا۔ سوم پٹ (Pits) (جہاں گاڑیاں فیول اور مینٹیننس کے لیے ٹھہرتی ہیں) کے لیے الگ سے سائیڈ ٹریک کی سفارش کی گئی جو پبلک اسٹینڈ سے کافی فاصلے پر کر دیا گیا۔

تینوں قوانین کو بین الاقوامی سطح پر منظور کروا کر فوری طور پر نافذ کر دیا گیا۔

اے رئیس

اس دن اخبار میں وہ اشتہار نہ چھپتا تو شاید اسے موت کا مزہ نہ چکھنا پڑتا، قتل کرنے والے نے اسے کس بات کی سزا دی' اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ یورپ کے اس واقعہ میں ہمارے لیے بھی سبق ہے۔

جرم کی ایک انوکھی داستان' یورپ سے

فون پر سنائی دینے والی آواز نرم، رواں اور پُراعتماد تھی جوزیفائن بیک شال فوراً ہی اس دوستانہ لیقی آواز کے نادیدہ جال میں الجھتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ کال کرنے والے کو واقعی اس کی ضرورت ہے۔ آخر وہ آواز اس کی مددگار تھی۔

100 پاؤنڈ (یومیہ) ایک معقول رقم تھی جو اس کے فیملی بجٹ میں نمایاں فرق پیدا کرسکتی تھی۔

درحقیقت جب اس نے اخبار میں اشتہار دیا تھا تو وہ مثبت ردِعمل کے لیے خاصی پُرامید نہیں تھی۔ اس کی عمر 39 برس تھی اور وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ مقامی چرچ میں مناجات گاتی تھی اور براؤنی ٹروپ کی لیڈر تھی۔

اشتہار کے جواب میں جس مرد نے اس سے رابطہ کیا تھا اس کی آواز میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اسے مشکوک لگتی۔ ویسے بھی وہ ایک سادہ لوح اور شریف خاتون کی شہرت رکھتی تھی۔ اس نے پارٹ ٹائم ماڈل کی ہامی بھرلی۔

ملاقات پر بھی اس نے اچھا تاثر لیا۔ جوزیفائن، مالڈن ایسکس برطانیہ کی ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے ٹرائل سیشن کی تصاویر، اس آدمی نے جوزیفائن ہی کے گھر کے فرنٹ لان میں اتاری تھیں۔ اس وقت بھی وہ پُرامید نہیں تھی مگر جب دوبارہ فون پر جوزیفائن کا اس سے رابطہ ہوا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی ملازمت حاصل کرچکی ہے۔ 100 پاؤنڈ یومیہ کا مطلب تھا کہ تیس دن میں کوئی وقفہ نہ آیا تو وہ مہینے میں 3000 پاؤنڈ کما لے گی۔

اسے اپنی مسرت کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

یہ ایک گلیمر سے عاری ارزاں کاسمیٹک فرم کی ماڈلنگ تھی جوزیفائن کو گلیمر سے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کالر کی آواز میں شائستگی کا نمایاں عنصر اس کی متاثر کن شرافت کا اظہار تھی۔ شام کی میٹنگ کے لیے اتفاق ہوگیا۔

اس نے شام کو خوش خبری شوہر کو دیتے ہوئے اس کا بوسا لیا اور گڈ بائی کہا اور سامنے کے دروازے سے خوش کن خیالات کے ہمراہ گزر گئی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ آخری بار اس دروازے سے باہر جارہی ہے۔

☆☆☆

جمعہ 12 بجے یکم نومبر 1974ء کو تین دن بعد اس کی لاش ملی جسے رسی کے ذریعے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ اس کی فیملی اور احباب کا گریہ دیکھنے والوں کو آبدیدہ کرنے کی پوری طاقت رکھتا تھا۔

فیملی نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا۔ جوزیفائن جیسی خاتون کا اندوہناک قتل، ناقابلِ یقین اور پُراسرار تھا جس نے بھی سنا سوگوار ہوگیا۔

اس کا بے جان جسم ایک تالاب میں پایا گیا۔ اس کی کلائیاں سامنے کی جانب رسی کے ساتھ جکڑی گئی تھیں۔ ویسی ہی رسی گردن سے لپٹی ہوئی تھی۔

ایک اچھی اور شریف خاتون کو سفاکی سے بلا جواز قتل کردیا گیا۔ وہ معصوم، شرافت کی ماری جس شخص کی تعریف اپنے شوہر سے کررہی تھی وہ ایک سفاک قاتل نکلا لیکن کیوں؟

جوزیفائن کا قصور یہ تھا کہ اس نے بلاتوقف اپنی شریفانہ فطرت کے تحت اس پر بھروسا کیا۔ اس اعتماد کی قیمت اسے اپنی زندگی دے کر چکانی پڑی۔

پولیس انتہائی سرگرمی کا مظاہرہ کررہی تھی۔ پولیس فورس نے ایک لاکھ گھنٹے خرچ کیے پھر بھی کوئی کلیو حاصل نہ کرسکی۔ قاتل کی پُراسرار آمد اور غیاب نے جوزیفائن کے کیس کو برطانوی تاریخ کا سب سے زیادہ حیران کن کیس بناڈالا۔ ایسا کیس جسے کبھی حل نہ کیا جاسکا۔ باوجود اس کے کہ پولیس نے غیر معمولی جدوجہد کی تھی۔

پہلے سال میں تفتیش کے لیے ایک دو نہیں پورے 40 سراغ رسانوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ اس وقت تک کی سب سے بڑی تفتیش تھی۔ اپنی نوعیت کی چکرا دینے والی تفتیش۔

19,000 ہزار سے زیادہ لوگوں کے انٹرویو کیے گئے۔ ان سب کے ناموں میں "پیٹ" یا "ڈپو" آتا تھا یا پھر ان کے خاندانی ناموں میں تھامسن یا جانسن آتا تھا۔

یہ ان ناموں کا کمبی نیشن تھا جو جوزیفائن نے اپنی فیملی اور دوستوں کو بتائے تھے۔ یہ اشارے اسے لان میں تصاویر بنواتے وقت ملے تھے۔ جب وہ آدمی اسے پارٹ ٹائم ماڈل بنانے جارہا تھا جب کہ بےچاری جوزیفائن اس بات سے بےخبر تھی کہ وہ ایک سفاک قاتل کے روبرو ہے۔

پولیس پریشان تھی کہ آخر قتل کا محرک کیا تھا؟ یہ ایک بنیادی اور بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

ہزاروں گاڑیوں کی نمبر پلیٹس چیک کی گئیں۔ یہ ایک محنت طلب کام تھا۔ حتیٰ کہ دوبارہ پلیٹوں کو جانچا گیا۔ امکانی طور پر یہ ایک نیلے رنگ کی فورڈ کار ہونی چاہیے جسے فاؤنٹین پبلک ہاؤس سے نکلتے دیکھا گیا تھا اور ممکنہ طور پر جوزیفائن کار میں قاتل کے ساتھ تھی۔

سراغ رسانوں کا خیال تھا کہ جوزیفائن کو قاتل پر اعتبار تھا۔ وہ جب گھر سے آخری بار نکلی تو ایک گھنٹے بعد قاتل ڈرنک کے لیے فاؤنٹین ہاؤس پر رکا۔ وہاں بیئر پی گئی۔ پھر ایک بزنس ڈنر کیا گیا جو چائنیز ریسٹورنٹ میں تھا۔ کار ڈنر کے بعد جائے واردات کی طرف گئی۔

سراغ رسانوں نے چائنیز ریسٹورنٹ کا اندازہ فارنسک ماہرین کی رپورٹ پر لگایا۔ کیوں کہ مقتولہ کے معدے میں چائنیز کھانا پایا گیا تھا۔

آخری گواہی ایک خاتون "جوآن" کی تھی جس نے ان دونوں کو فاؤنٹین سیلون بار کی میٹنگ میں دیکھا۔ یہ نہیں پتا

چلا کہ میٹنگ بار میں تھی یا ریسٹورنٹ میں یا پھر ڈنر کے بعد میٹنگ کے لیے جانا تھا۔

جوآن کا کہنا تھا کہ وہ قاتل پر ایک اچٹتی نظر ہی ڈال سکی تھی۔ وہ صرف یہی بتا سکی کہ وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔ سراغ رسانوں کے زور لگانے پر اس نے اپنا اندازہ ظاہر کیا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کو اتنے قریب نہیں دیکھنا چاہتا کہ کوئی اس کا چہرہ دیکھ سکے۔ وہ خود بھی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔ مبینہ قاتل کا سر بار کاؤنٹر پر بیرنگ پر جھکا ہوا تھا۔

مسز جونز (جوآن) کو فیملی ہولی ڈے کی تصاویر دکھائی گئی تھیں۔ اس نے فوراً جوزیفائن کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ دونوں بار کے کونے میں تھے اور جوزیفائن قطعی آرام دہ حالت میں تھی۔

مہینوں پولیس فاؤنٹین میٹنگ کے اسرار کی جزئیات جاننے کی کوشش کرتی رہی اور وہاں طویل مدت تک منڈلاتی رہی کہ شاید قاتل پھر وہاں آئے لیکن یہ ایک خام خیال تھا۔

چائنیز ریسٹورنٹس پر بھی کافی جھک ماری گئی۔

سراغرسانوں کے لیے دوسری اہم کڑی فرنچ کنکشن تھا۔ ایک تیز نگاہ پولیس وومین نے جوزیفائن کے کمرے میں کاسمیٹکس کا نمونہ دریافت کرلیا تھا۔

یہ غیر معروف برانڈ کا نمونہ تھا جسے فروخت کی مہم شروع کرنے سے قبل فرانس سے درآمد کیا گیا تھا۔

سراغرساں غور و فکر میں غلطاں تھے کہ کیا قاتل فرنچ پروڈکٹ کی تشہیری مہم کے لیے جوزیفائن کو استعمال کرنا چاہتا تھا؟

نئے سرے سے تفتیش شروع کی گئی۔ برطانیہ اور فرانس کے تقریباً ہر فوٹو اسٹوڈیو کی چھان بین شروع ہوئی کہ شاید قاتل کسی اسٹوڈیو سے جوزیفائن کے اشتہار کی جانب متوجہ ہوا ہو۔ جوزیفائن کا اشتہار کچھ اس طرح شائع ہوا تھا۔

”خاتون، عمر تقریباً 30 برس کو جز وقتی ملازمت کی ضرورت ہے۔ ٹرانسپورٹ اپنی ہے۔ کسی بھی پیشکش پر غور کے لیے تیار۔ سابقہ تجربہ، بینکنگ، ٹائپنگ کی صلاحیت۔“

مختصر اشتہار کے نیچے اس کے گھر کا فون نمبر موجود تھا۔ اشتہار کی نوعیت اس قسم کی تھی جسے قانون کے رکھوالے sex for sale کا ایک مخصوص طریقہ خیال کرتے تھے۔ کیس پر کام کرنے والے ایک سینئر آفیسر نے وضاحت کی کہ یہ اشتہار کنندہ کی نہ تجربہ کاری تھی کہ اس نے اشتہار میں ”کسی بھی پیشکش پر غور کے لیے تیار“ کے الفاظ شامل کرنے کی غلطی کی۔ اس نے مزید وضاحت کی کہ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ anything conidered کا مطلب کیا لیا جاتا ہے۔

یہ ایک المیہ تھا کہ شریف خاتون کی بے خبری نے اشتہار کا مفہوم بدل دیا اور وہ قاتل کے جال میں جا پھنسی۔ خیال غالب ہے کہ جب اسے حقیقتِ حال کا علم ہوا ہوگا تو اس نے اشتہار کے پوشیدہ معنی کے برخلاف ردِعمل کیا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

سینئر آفیسرز کا کہنا تھا کہ عام سا کیس ہمارے لیے مشکل ترین ثابت ہوا۔ یہ ایک مایوس کن صورتِ حال ہے اور ہمیں اس سے قبل بھی ایسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے مطابق:

جوزیفائن کے اشتہار کے چند روز بعد کسی مرد کی کال آئی اور ایک ہفتے بعد کی ملاقات طے ہوئی۔ جہاں ملاقات ہونی تھی وہ مقام مقتولہ کے گھر سے پندرہ میل دور ودام ایسکس میں تھا۔ تاہم مرد وہاں ظاہر نہیں ہوا۔ اگلے روز اس نے فون کیا اور نئے سرے سے ملاقات کا اہتمام کیا اور ایک بار پھر متعین کردہ مقام پر نہیں پہنچا۔

دو ہفتے بعد پھر کال آئی اور اس مرتبہ دونوں تیسرے مقام پر ملنے میں کامیاب ہو گئے۔ جوزیفائن خوش تھی۔ حالانکہ اسے محتاط ہو جانا چاہیے تھا۔ اسی کے گھر پہ فوٹو سیشن بھی ہوا۔

دو مرتبہ اس کی میٹنگ طے کر کے غائب ہونا بھی محض اتفاق نہیں سمجھا جاسکتا۔ ہمارے خیال میں وہ دونوں مرتبہ طے کردہ مقام پر پہنچا تھا لیکن سامنے نہیں آیا وہ حد درجہ محتاط اور چالاک معلوم ہوتا ہے لیکن یہ کوئی ناکامی کا جواز نہیں ہے۔ ہر مجرم ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس واردات نے ہمیں فرسٹریشن میں مبتلا کر دیا ہے۔

جوزیفائن نے شام چھ بجے گھر چھوڑا اور اپنی سرخ فورڈ کورٹینا میں ”ودام“ پہنچی۔ کورٹینا کا نمبر BVW374L تھا۔

سراغ رسانوں کے مطابق ساڑھے چھ سے نو بجے کے درمیان کار ”ودام“ کوئنگ ووڈ روڈ کی پارکنگ میں دیکھی گئی۔ ایک راہ گیر کے مطابق کورٹینا خراب معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔

بعد ازاں یہ بات یقینی ہے کہ کم از کم وہ قاتل کے ساتھ فاؤنٹین بار میں دیکھی گئی اور چائنیز ریسٹورنٹ میں ڈنر بھی ہوا۔

پھر تین دن کا وقفہ آیا۔ لاش دریافت کرنے والا ایک ٹیلی فون لائن ورکر تھا۔ جس نے ”ٹری گرین“ میں ایک کھائی نما تالاب میں باڈی دریافت کی۔ کاش وہ اشتہار دیتے وقت الفاظ کا صحیح استعمال کرلیتی تو شاید یہ سانحہ رونما نہ ہوتا۔

پُراسرار گمشدگی

ابن کبیر

وہ حکومت کے سب سے اعلیٰ عہدے تک پہنچ چکا تھا۔ پھر بھی اسے قرار نہ تھا اسی بے قراری میں وہ پُراسرار انداز میں غائب ہو گیا۔ کسی ملک کا سب سے بڑا عہدے دار غائب ہو جائے تو پورا ملک ہل کر رہ جاتا ہے۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے محکمہ خفیہ حرکت میں آکر بھی اسے ڈھونڈ نہ سکا۔

ایک وزیر اعظم کے غائب ہو جانے کا پراسرار واقعہ

”یہ ہنگامی صورتِ حال ہے۔ وزیر اعظم لاپتا ہو گئے ہیں۔“

وکٹوریا پولیس چیف کے اِن الفاظ نے پوائنٹ نیپن کے فوجی اڈے پر کھلبلی مچادی۔ فون ریسیو کرنے والا جونیئر افسر ہانپتا ہوا سینٹرل آفس میں داخل ہوا۔ اس کی بات سنتے ہی کرنل کے ہاتھ سے کافی کا مگ گر گیا۔

بحریہ کے حکام نے جلد حالات کی سنگینی کا اندازہ لگالیا۔ گہرے پانیوں میں کھڑے جہاز اور کشتیاں اس حصے کی سمت

دوڑ پڑیں جہاں اس پریشان کن خبر نے جنم لیا تھا۔ دارالحکومت کی اہم ترین عمارتوں میں، جن کی کھڑکیوں پر بارش دستک دے رہی تھی، فون تیزی سے بجنے لگے۔ کچھ دیر بعد فضائیہ کے ہیلی کاپٹرز بھی پہنچ گئے۔

دارالحکومت میں بادل گرجا اور ایک بھولی بسری یاد بوڑھی اینا کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ وہ لرزتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں کچھ بلاک دور واقع ایک پرانے مکان پر ٹکی تھیں جہاں ایک طوفانی رات، ٹپکتی ہوئی چھت تلے ایک خوبرو بچے نے جنم لیا تھا۔ بچہ، جو موت کو شکست دے کر دنیا میں آیا تھا، ورنہ نرس کی حیثیت سے تو اینا ہمت ہار بیٹھی تھی۔

عورت کی نظریں مکان کے بالائی کمرے کی کھڑکی پر ٹکی تھیں جہاں اندھیرے میں ہیرولڈ ہالٹ کی پہلی قلقاری گونجی تھی۔

ہیرولڈ ہالٹ... جواب لاپتا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اس کی قسمت پانی سے جڑی ہوئی تھی۔ جس روز وہ پیدا ہوا، آسٹریلوی شہر سڈنی غیر متوقع بارشوں کی لپیٹ میں تھا۔ سب سے زیادہ مضافاتی علاقہ اسٹین مور متاثر ہوا۔

اسکول ٹیچر تھامسن ہولٹ کے لیے ایک مشکل گھڑی تھی۔ اس کے چھوٹے سے گھر میں پانی داخل ہوگیا تھا اور اوپری منزل سے ہولناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

وہ 5 اگست 1908 کی رات تھی، جب بے بسی کا عفریت تھامسن کے خاندان پر حملہ آور ہوا۔ طوفانی ہواؤں کے باعث درخت گر گئے اور دریا میں طغیانی آگئی۔ راستے مسدود ہو چکے تھے۔ زچگی کے عمل سے گزرتی اس کی بیوی الیوا کو اسپتال لے جانا لگ بھگ ناممکن تھا۔ دائی کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

تھامسن لاچار تھا۔ وہ اپنی بیوی کی چیخیں سننے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ دائی کا ساتھ اینا نامی ایک نرس دے رہی تھی۔ وہ پڑوس میں رہتی تھی۔ تھامسن اسے بلا لایا۔ وہ ابھی ناتجربے کار تھی اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

یہ نرس ہی تھی، جس نے زینے سے چیخ کر تھامسن کو اطلاع دی کہ بالائی منزل کی چھت ٹپکنے لگی ہے۔

آدمی دوڑا دوڑا باورچی خانے گیا اور وہاں سے ایک بڑا سا پتیلا اٹھا لایا۔ جب وہ واپس زینے تک پہنچا، ہر سوں موت سی خاموشی تھی۔ نہ تو الیوا کی چیخیں تھیں، نہ ہی نومولود کی قلقاریاں۔ وہ اندیشوں سے دہکتا ہوا زینہ چڑھنے لگا۔

کمرے میں چھائی تاریکی سے ہم آہنگ ہونے میں اسے کچھ وقت لگا۔ جب بینائی بحال ہوئی، تو اس نے پسینے میں شرابور دائی کو دیکھا جس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تولیے میں لپٹا بچہ اس کی گود میں ٹانگیں چلا رہا تھا۔

عورت نے بچے کی پیٹ تھپکی۔ وہ کسمسایا۔ تاریکی میں اس کی پہلی چیخ سنائی دی۔ اس نے بچہ آدمی کی گود میں دے دیا۔ ”بیٹا ہوا ہے۔“

تھامسن نے اپنی بیوی کی سمت دیکھا، جس کے چہرے کی نقاہت پر خوشی غالب تھی۔ وہ ان کا پہلا بچہ تھا۔

آدمی نومولود کو لیے کھڑکی کی سمت گیا، تاکہ روشنی میں اسے دیکھ سکے۔ ابھی وہ اس کے چہرے میں اپنے خدوخال تلاش کر ہی رہا تھا کہ بچے کے ماتھے پر پانی کا ایک قطرہ آ کر گرا۔ اس نے جھرجھری لی۔

آدمی نے چھت کی سمت دیکھا۔ وہ تیزی سے ٹپک رہی تھی۔ چند اور قطرے بچے کے ماتھے پر گرائے... اور اسی لمحے اس کی قسمت پانی سے جڑ گئی۔

اس طوفانی رات، اس چھوٹے سے مکان میں پیدا ہونے والا بچہ مستقبل میں ملک کا وزیراعظم بننے والا تھا۔ تاہم یہ وہ حوالہ نہیں، جس کی وجہ سے تاریخ نے اسے یاد رکھا۔ اسے یاد رکھنے کی وجہ تو وہ معما ہے، جو کبھی حل نہ ہوسکا۔

☆☆☆

وہ مضبوط قد کاٹھ کا ایک خوبرو نوجوان تھا۔

اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت سانس لیتی۔ چال میں اعتماد تھا۔ وہ ویسلی کالج میلبورن کا چہیتا تھا۔ اساتذہ اس کی قابلیت کے قائل۔ لڑکیاں اس کی قربت کی متمنی۔

ہیرولڈ تیزی سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا مگر اس کی وجہ فقط ذہانت اور وجاہت نہیں تھی، اصل سبب اس کا دوست رابرٹ میزس تھا، جو مستقبل میں آسٹریلیا کے وزیر اعظم کا منصب سنبھالنے والا تھا۔ رابرٹ اس کا سینئر تھا۔ اس نے پاس آؤٹ ہونے کے بعد بھی کالج سے تعلق قائم رکھا۔ باقاعدگی سے سیمینار اور ورک شاپ میں شرکت کرتا۔ وہیں اس کی نظر ہیرولڈ پر پڑی۔ جلد دونوں میں دوستی ہوگئی۔ اسی شخص کی کامرانیوں نے مستقبل میں ہیرولڈ کو سیاست کی جانب مائل کیا۔

کالج کے مقبول ترین طالب علم کا مقام اس نے یونہی نہیں حاصل کرلیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک زمانے میں اسے کوئی

جانتا بھی نہیں تھا اور اس کا سبب وہ گہری اداسی تھی جس نے اس کے دل میں بسیرا کرلیا تھا۔

ہیرولڈ کے ماں باپ کے تعلقات ایک عرصے سے کشیدہ تھے۔ بڑھتے فاصلے بالآخر طلاق پر منتج ہوئے۔ ماں سے دوری بڑا صدمہ تھا جس نے نوجوان کو توڑ دیا۔ دوسری طرف اس کی ماں الیوا بھی تنہائی کے طوفان میں گھر گئی۔ اسی یاسیت نے کچھ برس بعد عورت کی جان لے لی۔

ہیرولڈ نے اپنی ماں کی تدفین میں شرکت نہیں کی۔ اس نے اپنے بھائی کلف کو لکھا۔ ”جب آخری بار میں نے ماں کو دیکھا تھا، وہ زندہ تھی، مسکرا رہی تھی۔ میں اسی یاد کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ انہیں تابوت میں لیٹا دیکھنا مجھے گوارا نہیں۔“

اس کا باپ تدریس چھوڑ کر تھیٹر انڈسٹری سے وابستہ ہوگیا۔ یعنی ہیرولڈ فقط ماں کی محبت سے نہیں، باپ کی شفقت سے بھی محروم ہوگیا۔ اس امر نے اسے خاموشی میں دھکیل دیا۔ وہ ہاسٹل کے سرد اور تاریک کمرے میں پڑا رہتا۔ یہ رابرٹ تھا، جو اس وجیہہ نوجوان کو اس کھائی سے نکال کر باہر لایا۔

ہوسٹل کے اسی سرد کمرے میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لیے دوست بن گئے۔ رابرٹ نے اس کی بپتا سننے کے بعد کہا۔ ”اگر تم محبت سے محروم ہو تو خود کو اس قابل بناؤ کہ لوگ تم سے محبت کریں۔“

وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”کامیابیوں کا تعاقب کرو۔ ان سے حاصل ہونے والی دولت اور شہرت ہر صدمے کو دھو ڈالے گی۔“

ہیرولڈ نے ایسا ہی کیا۔ وہ اپنا غم بھول کرنے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ آنے والے دن بھرپور تھے۔ اس کا شمار بہترین ایتھلیٹکس میں ہونے لگا۔ خدا نے آواز بھی اچھی دی تھی۔ جوشیلی تقریروں میں تو اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اصل شہرت اسے تیراکی کے مقابلوں سے ملی۔ وہ ایک ماہر تیراک تھا۔ پانی میں اترتے ہی مچھلی کی طرح تیرنے لگتا۔ اس کی مہارت دیکھ کر یار دوست اسے ”آبی مخلوق“ کہنے لگے۔ جوں جوں پرنسپل کے کمرے میں ٹرافیوں کی تعداد بڑھتی گئی، اس کے گرد لڑکیوں کا جمگھٹا بھی بڑھنے لگا۔ ہر کوئی اس کے ساتھ ایٹ پر جانا چاہتا۔

1926 میں کالج کی سالانہ تقریب ہیرولڈ کے نام رہی۔ اس نے اپنی آواز کا جادو جگا کر سب کے دل جیت لیے۔ سال کے بہترین طالبِ علم کا خطاب اس کے حصے میں آیا۔ اگرچہ اس یادگار رات ہیرولڈ کے اہل خانہ میں سے کوئی بھی تقریب میں موجود نہیں تھا، مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ سیکڑوں لوگوں کی محبت جیت چکا تھا۔

اور اس جیت جیسا ذائقہ اس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ کوئی شراب اس جیسی نشیلی نہیں تھی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ اور نئے تجربات اسے اپنی سمت پکار رہے تھے۔

یونیورسٹی آف میلبورن نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ اساتذہ جانتے تھے کہ قانون کے اِس طالب علم میں پورا خزانہ پوشیدہ ہے مگر یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی جلدی سب کی آنکھ کا تارا بن جائے گا۔

پہلے اس نے کرکٹ ٹیم تک رسائی حاصل کی۔ اس کے شاٹ کی قوت نے شائقین کو گرویدہ بنالیا۔ مگر وہ یہیں نہیں رکا۔ اگلے برس وہ یونیورسٹی کی فٹ بال ٹیم کا حصہ بھی بن گیا۔ تیراکی میں اس کی مہارت کے تو سب ہی قائل تھے۔ کھیلوں کے ساتھ ساتھ اس نے مضمون نگاری میں بھی اوّل انعام حاصل کیا۔ کئی مباحثوں کا فاتح ٹھہرا۔

لوگ کہا کرتے تھے، وہ انوکھی قابلیت لے کر پیدا ہوا ہے۔ جلد شہرت اور دولت اس کی داسی ہوگی۔ اور ہیرولڈ کا بیک وقت یونیوسٹی کے اسپورٹس اور سوشل کلب کا صدر منتخب ہونا اِس بات کا ثبوت تھا کہ ان کا اندازہ درست ہے۔

ایک وجیہ اور معروف طالب علم کے پہلو میں ایک اپسرا ہی ہونی چاہیے۔ وہ ویلا تھرنگ تھی۔ زلف سنہری۔ آواز شیریں۔ چال قیامت۔ اپنے وقت کے ممتاز فلم ڈائریکٹ ایف ایم تھرنگ کی بیٹی اور مشہور اداکار فرینک تھرنگ کی بہن۔

کچھ عرصے تو عشق زوروں پر رہا۔ میلبورن کی ہر چائے خانے میں اس جوڑے کا چرچا تھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا۔ یہ رشتہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

کوئی اور ہوتا تو ویلا کی جدائی سے ٹوٹ جاتا۔ مگر ہیرولڈ چند ہی روز میں اس صدمے سے ابھر آیا۔ وہ جانتا تھا، کسی کے جانے سے زندگی رکتی نہیں۔ کامیابی کا مرہم ہر زخم بھر دیتا ہے۔ اور پھر اس جیسے لڑکے کے لیے لڑکیوں کی کمی کہاں تھی۔

جونہی ویلا اور اس کا قصہ تمام ہوا، ایک اور دوشیزہ اس کی بغل میں نظر آنے لگی۔ یہ زارا کیٹ ڈکنز تھی۔ ایک انتہائی خوبرو اور تہذیب یافتہ لڑکی، جو ایک نواب کی بیٹی تھی۔ وہ یونیورسٹی کے وسیع وعریض باغ کی بینچ پر گھنٹوں ایک دوسرے کا

ہاتھ تھامے بیٹھے رہتے۔ درختوں پر نام لکھتے۔ ساتھ جینے مرنے کی باتیں کرتے۔

لگتا تھا کہ وہ جلد شادی کرلیں گے۔ لڑکی کے باپ کی بھی یہی خواہش تھی مگر ہیرولڈ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

”یہ وقت مناسب نہیں جناب۔ ابھی میں دوڑ رہا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب سے کہا۔ ”جب تھک جاؤں گا، تب سوچوں گا۔“

نواب صاحب کو یہ بات ناگوار گزری۔ ”صاحب زادے ابھی تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ میدان میں اترو گے، تو آٹے دال کا بھاؤ پتا چل جائے گا۔“

ہیرولڈ اس بات پر مسکرا دیا مگر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی حقیقت عیاں ہوگئی۔

بلاشبہ وہ ایک قابل نوجوان تھا مگر میلبورن شاطر وکیلوں اور رشوت خور ججوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس فرم میں اس نے انٹرشپ کی، اس نے چھ ماہ بعد اسے ملازمت دینے سے انکار کردیا۔ امریکا میں اسٹاک ایکسچینج کریش ہوتے ہی پوری دنیا مالیاتی بحران کے لپیٹ میں آگئی تھی۔ اسے کہیں ملازمت نہیں ملی اور وہ شہر کی ٹھنڈی سڑکوں پر چہل قدمی کرنے لگا۔

مایوسی کے ان دنوں میں برطانیہ میں مقیم اس کے باپ نے لکھا۔ ”لندن چلے آؤ لڑکے۔ یہاں کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لینا۔“

ہیرولڈ باپ کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد دونوں میں خاصے فاصلے پیدا ہوگئے تھے۔ اس نے پیش کش رد کردی۔ اس کا ایک سبب سیاست میں اس کی بڑھتی دلچسپی بھی تھی۔

وہ یونائیٹڈ آسٹریلیا پارٹی کا رکن بن چکا تھا۔ اس کے زور خطابت اور متاثر کن شخصیت نے جلد ہی پارٹی لیڈران کے دل جیت لیے۔ ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے چاپلوسی سے بھی کام لیا۔ 1934 میں آنکھوں میں خواب سجائے اس نے قومی انتخابات میں حصہ لیا مگر حقیقت کی دنیا ظالم تھی۔ سپنا چھن سے ٹوٹ گیا۔ اسے ناکامی کا تلخ ذائقہ چکھنا پڑا۔

اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک برس بعد وہ کلفٹن ہل سے لیبر سیٹ پر کھڑا ہوا۔ اس کی مہم شان دار تھی۔ اس نے کسانوں کے ساتھ کھیتوں میں ہل چلایا۔ مزدوروں کے ساتھ اینٹوں کے بھٹے پر کام کیا۔ بھینسوں کو چارا ڈالا۔ وہ ہر ایک کا چہیتا تھا۔ بوڑھی عورتیں اسے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتیں۔

اسے بھاری تعداد میں ووٹ پڑے، مگر آخر وقت میں پانسہ پلٹ گیا۔ ووٹوں کا معمولی فرق اس کی شکست کا باعث بن گیا۔

اس وقت تک نواب صاحب اپنی لڑکی برٹش فوج کے ایک افسر کپتان جیمس سے بیاہ چکے تھے جس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے اور وہ ہر وقت سگار پیا کرتا تھا۔

یہ ایک غلط فیصلہ تھا۔ گو شادی کے بعد زارا نے تین بچوں کو جنم دیا، مگر میاں بیوی میں کبھی نہیں نبھی۔ اس کا سبب کوئی اور نہیں، ہمارا ہیرولڈ ہولٹ ہی تھا۔ زارا کے لیے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ کپتان پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی وجہ سے اکثر شہر سے باہر رہتا۔ اور وہ راتیں زارا اپنے عاشق ہیرولڈ کے پہلو میں گزارتی۔ تینوں بچے بھی نیلی آنکھوں والے انکل سے مانوس تھے، جو ان کے لیے ڈھیر ساری چاکلیٹ اور ٹافیاں لایا کرتا۔

کپتان کو شک تو پہلے سے تھا، مگر معاشقے کی تصدیق ہونے کے بعد اس نے اس بے وفا عورت سے جان چھڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ 1939 میں اس نے زارا کو طلاق دے دیا۔

پانچ برس بعد ہیرولڈ نے، جو اب ایک جانا مانا سیاست داں تھا، نہ صرف اس سے شادی کرلی، بلکہ اس کے بچوں کو بھی اپنا لیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان بچوں کا حقیقی باپ بھی ہیرولڈ ہی ہے، مگر اب اس کی تصدیق کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ زارا اس کی قانونی بیوی تھی۔

گو آنے والے برس انہوں نے ساتھ گزارے اور جب کبھی میڈیا کے سامنے آئے، یہی تاثر دیا کہ وہ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی جی رہے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہیرولڈ کے لیے زارا کی اہمیت اب ختم ہوچکی تھی۔ وہ فقط ایک ٹرافی تھی، جس سے اسے سگار کی بو آتی تھی۔ فقط ایک اور کامیابی... جسے اس نے گھر کے شیلف میں سجا دیا تھا۔

شوہر کی لاتعلقی زارا کے اعصاب پر اثر کرنے لگی، جس کا نتیجہ ڈراؤنے خوابوں کی صورت سامنے آیا۔ ان خوابوں میں ایک خواب ایسا بھی تھا، جس میں اسے بپھرا ہوا غصیل سمندر نظر آتا اور چاند کو گرہن لگا ہوتا۔

☆☆☆

جن دنوں زارا اپنے برطانوی شوہر کے ساتھ تلخ زندگی گزار رہی تھی، ہیرولڈ ایک جست لگا کر ناکامیوں کے بھنور سے نکل آیا۔

1935 کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے وہ پارلیمنٹ میں پہنچ گیا۔ 27 سالہ ہیرولڈ یہ اعزاز پانے والا کم عمر ترین شخص تھا۔ لوگ کہتے تھے، اس کامیابی کے لیے لڑکے نے جادو ٹونے کا سہارا لیا ہے۔ بیوروکریٹس اسے رشوت کا طلسم قرار دیا کرتے۔

وجہ جو بھی رہی ہو، بس پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ خود کو کلی طور پر سیاست کے لیے وقف کردیا۔ وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ اکثر دفتر ہی میں نیند پوری ہوتی۔ فقط تیراکی ایک ایسی سرگرمی تھی، جس کے لیے وہ وقت نکال لیتا۔ ہاں، کبھی کبھار وہ اچانک منظر سے غائب ہو جاتا تھا۔ ایک دو روز تک اسے کوئی تلاش نہیں کرپاتا۔ یہ وہ دن ہوتے، جب کپتان جیمس دورے پر ہوتے اور ہیرولڈ اپنی محبوبہ کو بانہوں میں تھام رکھا ہوتا۔

واقعات تیزی سے رونما ہوئے۔ 1939 میں آسٹریلیا کی سیاست نے کروٹ لی۔ ہیرولڈ کے گرو رابرٹ میزس نے وزیراعظم کا منصب سنبھال لیا۔ اسے نوجوان ہیرولڈ پر اعتبار تھا۔

”لڑکے کو تجارت کی وزارت سونپ دو۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

اس فیصلے پر خاصی تنقید ہوئی۔ کہاں تجارت کا قلمدان اور کہاں یہ کل کا لونڈا۔ مگر اس کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔

ابھی وہ کامیابی کے زینے پھلانگ ہی رہا تھا کہ آسمان میں ایک دم دار ستارہ نمودار ہوا۔ میلبورن کے گرجا گھر میں آگ لگ گئی۔ اور بدشگونی کی ان علامات کے بعد دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا۔

آسٹریلیا اتحادی فوج کا ساتھ دے رہا تھا۔ حکومت نے اس جنگ کے لیے رضاکاروں کی ایک فوج تیار کی۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی کئی نامی گرامی ہستیاں اس فوج کا حصہ بن گئیں۔ ہیرولڈ بھی ان میں شامل تھا۔ وہ بہ طور توپچی رضاکاروں کی فوج میں شامل ہوا۔

اس خبر کا بہت چرچا ہوا۔ اخبارات میں ستائشی مضامین شائع ہوئے۔ اسے ابھرتے ہوئے ہیرو کا درجہ حاصل ہوگیا۔ گو اس نے اپنی رکنیت سے استعفیٰ نہیں دیا تھا، مگر جنگ کے زمانے میں ناقدین عنقا ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی فوج کے ساتھ جا کھڑا ہوا تھا۔ کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی کہ جناب ہیرولڈ ہالٹ بہ طور رکن اسمبلی برابر تنخواہ لے رہے ہیں۔ اور اگلے محاذوں پر لڑنے کی بجائے زیادہ تر بنکر میں آرام کرتے ہیں، جہاں شراب وافر مقدار میں ہوتی ہے۔

ابھی فوج میں بھرتی ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ کینبیرا کے مقام پر ہونے والے ایک فضائی حادثے میں حکومت کے چند اہم وزراء اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی حادثے نے ہیرولڈ کی واپسی کا سامان کیا۔

وزیراعظم نے بیان جاری کیا ”فوج میں اور بھی جانباز ہیں، مگر سیاسی میدان میں ہیرولڈ جیسے باصلاحیت لوگوں کی کمی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ فوراً لوٹ آئے اور وزیر تجارت کا منصب سنبھال لے۔“

جس روز وہ محاذ سے لوٹا، اس کا استقبال کسی سورما کی طرح کیا گیا۔ پورا میڈیا ایئرپورٹ پر امنڈ آیا۔ اس پر پھول نچھاور ہوئے۔

جب وہ وزیراعظم سے ملا، تو اس نے آنکھ ماری۔

حکومتی لاتعلقی

یہ عمل حیرت انگیز ہے کہ حکومت کی جانب سے وزیراعظم کی گمشدگی کی تحقیقات کے لیے کوئی کمیٹی نہیں بنائی گئی۔ عوامی مطالبات کے جواب میں کہا گیا کہ اس نوع کی کوششیں وقت اور پیسے کا ضیاع ثابت ہوں گی۔ وکٹوریا کے شہری قوانین کی شقوں کو بنیاد بناتے ہوئے ان مطالبات کو رد کردیا گیا۔ بس وکٹوریا پولیس ڈیپارٹمنٹ کی 108 صفحات پر مشتمل رپورٹ پیش کردی گئی، جو انتہائی ناقص اور خام تھی۔ زیادہ تر بیانات پر مشتمل۔

1985 میں کہیں جاکر وکٹوریا کے قوانین میں تبدیلی ہوئی۔ 2003 وکٹوریا پولیس کے مسنگ پرسن یونٹ نے 1985 سے پہلے اس علاقے میں لاپتا ہونے والے 161 افراد کی فہرست تیار کی، جن میں ہیرولڈ کا نام بھی شامل تھا۔ کیس کی دوبارہ تحقیقات شروع ہوئیں۔ عوام سے تعاون کی اپیل کی گئی، مگر کوئی نیا گواہ یا ثبوت سامنے نہیں آیا۔ 2005 میں یہ کہہ کر کیس بند کردیا گیا کہ مسٹر ہیرولڈ سمندر میں نہاتے ہوئے حادثاتی طور پر ڈوب کر ہلاک ہوگئے۔

وہ ریاستیں، جو اپنے ایک شہری کی حفاظت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہیں، ان کی جانب سے اپنے وزیراعظم کے کیس میں برتی جانے والی لاتعلقی حیرت انگیز تھی جو اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ دال میں کچھ تو کالا تھا۔

’’میاں تم تو مجھ سے بھی مقبول ہوگئے۔‘‘

دم وار ستارے کے بداثرات اب بھی باقی تھے۔ جنگ مالیاتی بحران ساتھ لائی۔ 1941 میں رابرٹ منزس کی حکومت ڈگمگانے لگی۔ اس کی اپنی جماعت اس کے خلاف ہوگئی۔ دباؤ میں آکر رابرٹ نے وزارت عظمٰی سے استعفیٰ دے دیا۔ آنے والے برس یونائیٹڈ آسٹریلیا پارٹی کے لیے کٹھن تھے۔ جماعت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔

1945 میں رابرٹ نے بڑی دھوم دھام سے ایک نئی جماعت لبرل پارٹی کی بنیاد رکھی۔ صنعت کار اس کی پشت پناہی کررہے تھے۔

ہیرولڈ ہالٹ اس جماعت کا حصہ بننے والا پہلا شخص تھا۔ میڈیا میں رابرٹ سے اپنی وابستگی کا اعلان کرنے کے بعد وہ ایک ہفتے کے لیے غائب ہوگیا۔

وہ دن اس نے ساحل پر دھوپ سینکتے گزارے۔ اگلے چند ماہ بہت مصروف ثابت ہونے والے تھے۔

☆☆☆☆

1949 کے انتخابات رجحان ساز ثابت ہوئے۔

لبرل پارٹی نے کامیابی حاصل کرکے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ ٹرن آؤٹ زبردست رہا۔ ٹھپے بھی خوب لگائے گئے۔ رابرٹ منزس نے پھر وزیراعظم کا منصب سنبھال لیا اور اگلے 18 برس تک جونک کی طرح اس عہدے سے چمٹا رہا۔

یہ کامیابی ہیرولڈ ہالٹ کی انتخابی مہم کے مرہونِ منت تھی، جس نے اپنے سیاسی استاد کو عوام کے سامنے ایک دیوتا بنا کر پیش کیا۔ اس خدمت کے عوض اسے ٹھیک ٹھاک نوازا گیا۔ اب اس کا شمار آسٹریلیا کے بااثر افراد میں ہونے لگا تھا۔ کئی اہم عہدے اس کے پاس رہے۔ اس نے چند بڑے فیصلے کیے اور میڈیا یہ کہنے لگا کہ رابرٹ منزس کے بعد یہی شخص ملک کی باگ دوڑ سنبھالے گا۔

اس زمانے میں کچھ پریشان کن خبریں بھی آئیں۔ پہلی تو اس کے معاشقوں سے متعلق تھی، مگر اس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ یہی کہا گیا کہ شہرت اسکینڈلز تو ساتھ لاتی ہی ہے۔ مگر دیگر الزامات گمبھیر تھے۔ یہ بازگشت سنی گئی کہ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کررہا ہے۔ پھر رشوت ستانی کی کہانی بھی مباحثوں کا موضوع بنی۔ تاہم ہیرولڈ کی شہرت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ آسٹریلیا کی معیشت میں واضح بہتری نظر آرہی تھی اور لیبر منسٹر کی حیثیت سے اس کا سہرا ہیرولڈ کے سر تھا، جو کئی غیر ملکی کمپنیوں کو آسٹریلیا کھینچ لایا تھا۔ نئی صنعتیں لگ رہی تھیں۔ بے روزگاری کی شرح کم ہوئی۔

ایسے میں کون اس بات پر توجہ دیتا ہے کہ ہیرولڈ رشوت لے رہا ہے۔ پھر وزیراعظم کے وہ بے حد قریب تھا، جس نے اس معاملے پر کبھی انکوائری کمیشن بننے ہی نہیں دیا۔ الٹا ہر محاذ پر اس کی وکالت کی۔

50 کی دہائی میں وہ اپنے کیریر کے عروج پر پہنچ گیا۔ خارجی امور میں بھی اس نے کلیدی حیثیت حاصل کرلی۔ جب امریکی اور برطانوی میڈیا بھی اس کے انداز تقریر اور خوش لباسی کو سراہنے لگا تو آسٹریلیا میں بیٹھے اس کے ناقدین نے خاموش رہنے میں عافیت جانی کہ رائے عامہ پوری طرح اس کے حق میں تھی۔

1956 میں اسے لبرل پارٹی کا نائب صدر منتخب کیا گیا، جس کے بعد لگ بھگ طے ہوگیا کہ جلد یہ شخص وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنے والا ہے۔

دھیرے دھیرے خارجہ پالیسی میں اس کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ اس کی امریکی صدر جون ایف کینیڈی سے گاڑھی چھنتی۔ اس قربت نے آسٹریلیا کی سیاست میں اس کی حیثیت کو مزید استحکام بخشا۔

اس کا کیریر عروج کی سمت جارہا تھا کہ 1960 کا ماہ نومبر نازل ہوا۔

طوفانی بارشیں ہوئیں۔ نشیبی علاقوں میں سیلاب آگیا۔ اور ان ہی پریشان کن دنوں میں وہ اپنے کیریر کی ہولناک غلطی کر بیٹھا۔

☆☆☆

صنعت کار سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ہیرولڈ کے پتلے جلائے گئے اور اسے برطرف کرنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔

اِس کا سبب وہ منی بجٹ تھا، جسے ہیرولڈ نے اس دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ اس سے ملکی معیشت مزید مستحکم ہوگی اور نمائشی اشیاء کی خریداری کے رجحان میں کمی آئے گی۔

دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ یہ بجٹ خامیوں کا پلندہ تھا۔ اس کے اطلاق نے آسٹریلوی معیشت پر کاری ضرب لگائی۔ تاجر آگ بگولا ہوگئے۔ ایک ہولناک بحران نے جنم لیا۔ حکومت خطرے میں پڑگئی تھی اور رابرٹ میزس پر دباؤ بڑھنے لگا۔ ہیرولڈ کو معافی مانگنی پڑی۔

میڈیا کے سامنے تو ہیرولڈ یہی کہتا رہا کہ اس سے بھیانک غلطی ہوئی ہے، مگر نجی محافل میں وہ کہا کرتا تھا۔ ’’انہوں نے مجھے دھوکا دیا۔‘‘

یہ دھوکا کس نے دیا؟ اس کا تذکرہ اس نے کبھی نہیں کیا۔ مگر کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ اس کا اشارہ ان بڑے صنعت کاروں کی جانب تھا جو دنیا کی ورلڈ اکانومی پر راج کرتے تھے۔

1961 کے انتخابات میں اس کی جماعت کی ہار یقینی تھی، تاہم آخری وقت میں چند اپوزیشن ارکان نے بھاری رشوت کے عوض اپنی وفاداریاں بدل لیں۔ انڈر ورلڈ نے اپنا کردار ادا کیا۔ اور یوں لبرل پارٹی کو اپنا اقتدار بچانے کا موقع مل گیا۔

رابرٹ نے حکومت سازی کے عمل سے ہیرولڈ کو دور رکھا۔ اس کی منفی شبیہ سے پارٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مایوس ہو کر وہ چھٹیوں پر چلا گیا اور زیادہ وقت ایک جزیرے کے ساحل پر گزارا، جہاں دوشیزاؤں کی کمی نہیں تھی۔ جب ایک سیٹ کے فرق سے اس کی پارٹی نے حکومت بنالی، تو وہ لوٹ آیا۔

اب وہ اپنی غلطی سدھارنے کو تیار تھا۔ آگے کا کھیل بہت سنبھل کر کھیلا گیا۔ اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے اس نے رشوت کا سہارا لیا۔ اخبارات میں اپنے حق میں مضامین لکھوائے۔ ریڈیو سے پروگرام نشر ہوئے۔ فلاحی کاموں میں حصہ لینے لگا۔

1966 میں اچانک رابرٹ میزس کی طبیعت بگڑ گئی۔ لوگوں کو شک تھا کہ اسے زہر دیا جارہا ہے۔ گرتی صحت کے باعث رابرٹ نے حکومتی اور پارٹی عہدوں سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ توقع کے عین مطابق ہیرولڈ کو پارٹی کا نیا صدر منتخب کرلیا گیا۔ چند روز بعد اس نے ملک کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا۔

رابرٹ میزس نے اپنی الوداعی تقریب میں کہا۔ ''جناب ہیرولڈ اس کے حق دار ہیں۔ انہوں نے اس عہدے تک پہنچنے کے لیے کڑی محنت کی۔ امید ہے کہ وہ آسٹریلیا کی امیدوں پر پورے اتریں گے۔''

ہیرولڈ آسٹریلیا کی امیدوں پر پورا اترا یا نہیں، مگر یہ طے ہے کہ اس نے رابرٹ کا خاصا خیال رکھا۔ مراعات تو دیں ہی، اہم کام یہ کیا کہ اس کے خلاف کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے تمام کیسز بند کروادیے۔

☆☆☆

وہ ایک ناکام وزیراعظم ثابت ہوا۔ اختیارات محدود تھے اور اسے قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا اور آسٹریلیا کو بین الاقوامی سطح پر شدید چیلنجز درپیش تھے۔ آسٹریلیا فطری طور پر برطانیہ کا حواری تھا مگر اب حالات بدلنے لگے۔ رشتے میں دراڑ پڑ گئی ... آسٹریلیا کا دشمن نمبر ایک جاپان تیزی سے برطانیہ کے قریب آرہا تھا۔

ویت نام جنگ میں آسٹریلیا کی شمولیت کو اندرونِ ملک شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ہیرولڈ پر الزام تھا کہ وہ امریکا کی خوشنودی کے لیے آسٹریلوی فوج کو آگ میں جھوک چکا ہے۔ قوم پرست اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کا ایک سبب اس کی روشن خیالی بھی تھی۔ ہاں ایک کام اس نے ڈھنگ کا کیا۔ اس نے تارکینِ وطن کی آبادکاری کے لیے جامع منصوبہ بندی کی۔

برطانیہ سے دوری کے بعد ہیرولڈ نے آسٹریلوی ڈالر کو مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے۔ ابتدا میں تو اسے شدید تنقید کا نشانہ بنا گیا، مگر بعد میں اس کے مثبت نتائج مرتب ہوئے۔

آسٹریلوی سیاست کو ایک گمبھیر مسئلہ درپیش تھا۔ رابرٹ میزس نے کسی بادشاہ کی طرح لبرل پارٹی پر راج کیا تھا۔ ہیرولڈ اس کے سائے میں پروان چڑھا۔ میزس کے بعد اس نے صدارت تو سنبھال لی مگر جلد یہ واضح ہو گیا کہ اس میں میزس والے گن نہیں۔ وہ فقط اس کا دست راست ہی کا کردار نبھا سکتا تھا، حقیقی قائد بننے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔

اس مسئلے کا ذمے دار کوئی اور نہیں، خود رابرٹ میزس تھا، جس نے نئی قیادت تیار کرنے کی بجائے خوشامدیوں کے ٹولے کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ہیرولڈ ان ہی میں سے ایک تھا۔ اس کی پراسرار گمشدگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور آسٹریلیا اپنی تاریخ کے بدترین بحران کی لپیٹ میں آگیا۔

☆☆☆

یہ خبر گردش میں تھی کہ وزیراعظم جلد چھٹیوں پر جانے والے ہیں۔

اِس کا آغاز برطانوی ذرائع ابلاغ کو دیے جانے والے ہیرولڈ کے اس انٹرویو سے ہوا جس میں اس نے اپنے تیراکی کے تجربات اور سمندر سے عشق پر کھل کر بات کی۔ اس نے یہ بھی کہا۔ ''کبھی کبھار مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پانی اور میرے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ جب لہریں ساحل سے ٹکراتی ہیں، تو لگتا ہے جیسے مجھے پکار رہی ہیں۔''

چٹ پٹی خبریں دینے والے میگزین نے نجومیوں کی پیش گوئیاں شائع کرنے کے لیے یہی وقت مناسب جانا، جنہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہیرولڈ کے اقتدار کا سورج جلد غروب ہونے والا ہے۔

عوام نے پیش گوئیوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یہ درست ہے کہ اس کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا تھا، مگر بظاہر اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ نہ تو اپوزیشن پارٹیاں دھرنے دینے کے موڈ میں تھیں، نہ ہی فوج بغاوت کا ارادہ رکھتی تھی۔

کرسمس قریب آرہی تھی۔ لوگ سنجیدہ معاملات کو بھول کر تفریح کے منصوبے بنانے لگے۔ ہیرولڈ نے بھی سامان باندھ لیا۔

دسمبر کی ایک خوشگوار صبح وہ اپنے تین دوستوں کرسٹوفر اینڈرسن، جین لی اور جورج ایلسن کے ساتھ میلبورن سے نکلا۔ باڈی گارڈ ساتھ تھے۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق وہ معروف جہاز راں ایلس روز سے ملاقات کے ارادے سے وہاں گئے تھے، جو اپنی کشتی ''لائیولی لیڈی'' میں دنیا کے گرد چکر لگانے کی مہم پر تھا۔ اس وقت جہاز راں جنوبی وکٹوریا کی کھاڑی پورٹ فلپ کے اس حصے میں تھا جو آسٹریلوی بحریہ کے زیرِ انتظام تھا۔

کچھ روز پہلے ہیرولڈ کا بیان بھی اخبارات کی زینت بنا، جس میں اس نے ایلس روز کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ سو جب وہ وکٹوریا کی سمت جارہا تھا، کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

کھاڑی کے مشرقی حصے میں پوائنٹ نیپن کے مقام پر شیویٹ نامی ساحل ہے۔ وہ تیراکی اور غوطہ خوری کے لیے شان دار مقام تھا اور 17 دسمبر کی دوپہر وزیراعظم اور اس کے دوستوں کی اس ساحل پر موجودگی حیران کن نہیں تھی۔

سال کے اس حصے میں سمندر عام طور پر شانت ہوا کرتا تھا مگر اس روز وہ کچھ غصیل تھا۔ لہریں توقع سے زیادہ بلند تھیں۔ اس کے دوست کرسٹوفر نے خطرے کی بو پالی۔

''اس وقت سمندر میں اترنا مناسب نہیں۔'' اس نے خیال ظاہر کیا۔ ''بہتر ہے، ساحل ہی پر لہروں سے لطف اندوز ہوا جائے۔''

ہیرولڈ نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ''بڑے میاں، تم تو فارغ آدمی ہو۔ ہمیں دیکھو، سر کھجانے کی فرصت نہیں۔ بھئی میں تو پانی میں جارہا ہوں۔''

کرسٹوفر نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''جناب وزیراعظم، آپ ہمارے رہنما، آپ کی اطاعت ہم پر فرض، مگر خاکسار کی درخواست ہے کہ اس وقت آپ پانی سے دور رہیں۔''

ہیرولڈ نے قہقہہ لگایا اور سمندر کی سمت بڑھنے لگا۔

کرسٹوفر یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ''ہیرولڈ، ایسا مت کرو۔ ذرا لہروں کو تو دیکھو۔''

''انہیں ہی تو دیکھنے جارہا ہوں۔ دیکھو، میری محبوبہ مجھے دیکھ کر کیسے مچل رہی ہے۔'' ہیرولڈ نے باآوازِ بلند کہا اور پانی میں داخل ہو گیا۔ پہلے اس کے پیر غائب ہوئے۔ پھر دھڑ۔ کچھ دیر بعد وہ تیرتا ہوا گہرے حصے کی سمت جارہا تھا۔

''بڑا ہی اڑیل ہے۔'' کرسٹوفر بڑبڑایا۔

جون نے اسے بے فکر رہنے کا مشورہ دیا۔ ''ابھی لوٹ آئے گا۔ ویسے بھی ماہر تیراک ہے۔ کیوں ناں ہم دھوپ سینک لیں۔''

وہ تینوں کپڑے اتار کر ریت پر لیٹ گئے۔ باڈی گارڈ

☆ خلا میں سب سے پہلا گانا ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' گایا گیا۔

☆ بی بی سی لندن نے اپنی غیر ملکی نشریات کا آغاز عربی زبان سے کیا۔

☆ پانچ ہزار سال قبل دنیا کی پہلی ہڑتال اہرام مصر تعمیر کرنے والوں نے کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ گندم کے ساتھ ساتھ لہسن بھی فراہم کیا جائے۔

☆ 1831ء میں برصغیر کی پہلی ہڑتال کہاروں نے انگریزوں کے خلاف کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انگریز پالکی میں مفت سفر کی بجائے کرایہ بھی ادا کریں۔

☆ 1338ء سے 1453ء تک (115 سال جاری رہنے والی) فرانس اور برطانیہ کے مابین طویل ترین جنگ ہوئی۔

☆ پاکستان اور افریقا کے کلچر پر بننے والی فلم کا نام ''افریقین اوڈیسی'' ہے۔

☆ 29 مئی 1453ء کو سلطان محمد خان ثانی نے قسطنطنیہ (استنبول) فتح کیا۔

☆ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ میں پورا ہفتہ بلوائیوں کے سردار غافقی بن حرب کی کی حکومت رہی۔

شیخوپورہ سے محمد شایان سعید کا مراسلہ

کچھ دور اسلحے لیے کھڑے تھے۔ دھوپ کی شدت کم ہونے لگی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، کرسٹوفر کی بے چینی بڑھنے لگی۔

اچانک باڈی گارڈ وائرلیس سیٹ لے آیا۔ ”خاتون اوّل جناب وزیراعظم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“

”ان سے کہہ دو وہ عیاشی کررہے ہیں۔“ جون نے اونچی آواز میں کہا۔

کرسٹوفر نے اسے گھورا۔ وہ جانتا تھا کہ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ عورت ہیرولڈ کے معاشقوں سے پریشان ہے۔

کرسٹوفر نے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ”زارا، میں کرسٹوفر ہوں۔ ہاں بھئی کیسے مزاج ہیں۔ صاحب تیراکی کے لیے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ کیا کہا لڑکی؟ نہیں بھئی کوئی لڑکی ہمارے ساتھ نہیں۔ ارے نہیں۔ بس ہم چاروں ہیں۔ بے فکر رہو۔ اچھا خدا حافظ۔“

اس نے فون رکھ کر سمندر کی سمت دیکھا۔ لہروں کی شدت بڑھ گئی تھی۔ جھاگ ساحل سے ٹکرا رہے تھے اور ہیرولڈ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔

دس منٹ بعد کرسٹوفر کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ پہلے وہ خود سمندر میں اترا، مگر لہروں کی شدت نے اسے واپس دھکیل دیا۔ تھک ہار کر اس نے وکٹوریا حکام کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا۔

شہری انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی۔ پہلے پولیس پہنچی، جس نے سمندر کا مزاج دیکھ کر آسٹریلوی بحریہ کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔

”ایمرجنسی ہے۔ وزیراعظم لاپتا ہوگئے ہیں۔“

پولیس چیف کے الفاظ نے پوائنٹ نیپن کے فوجی اڈے پر کھلبلی مچا دی... بحریہ کے حکام نے جلد حالات کی شدت کا اندازہ لگا لیا۔ دارالحکومت کی اہم ترین عمارتوں میں فون بجنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹرز بھی پہنچ گئے۔ اور تب ایک بھولی بسری یاد بوڑھی اینا کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔

ہیرولڈ ہالٹ... آسٹریلیا کا وزیراعظم... لاپتا ہوچکا تھا۔

☆☆☆

جب زارا کو ہیرولڈ کی گمشدگی کی اطلاع ملی، اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ پاجی اپنی محبوبہ کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔

رابرٹ میزس نے سوچا، ہیرولڈ نے اپنی گرتی ساکھ بحال کرنے کے لیے ایک چال چلی ہے۔ ”لڑکے، تم شہرت کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہو۔“

جب ٹیلی وژن کے ذریعے یہ خبر بوڑھی اینا تک پہنچی کہ سمندر میں نہاتے ہوئے وزیراعظم لاپتا ہوگئے ہیں، تو اس نے سرد آہ بھری۔ ”اس کی قسمت تو پیدائش سے پانی سے جڑی ہوئی تھی۔“

17 دسمبر کی سہ پہر شیویٹ کے ساحل پر ملکی تاریخ کا سب سے بڑا سرچ آپریشن شروع ہوا۔ اس سرچ آپریشن میں سیکڑوں افراد نے حصہ لیا۔ جدید آلات سے لیس ماہر غوطہ خور سمندر میں اترے۔ طاقتور انجنوں والی کشتیاں گہرے پانی کی سمت گئیں۔ ہیلی کاپٹر سمندر پر منڈلا رہے تھے۔ آبدوزیں سمندر کی تہہ کھنگال رہی تھیں۔

پورا سمندر چھان مارا گیا۔ تمام ساحلوں کا باریکی بینی سے جائزہ لیا گیا۔ جزیرے بھی چیک کیے گئے۔ مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ فوج اور شہری انتظامیہ کی ہر کوشش ناکام گئی۔ لگتا تھا کہ سمندر کی اتھاہ گہرائی نے ہیرولڈ ہالٹ کو نگل لیا تھا۔

اگلے روز بھی امدادی ٹیموں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کوئی حربہ کارگر نہیں ہوا۔ سمندر نے ایک راز اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا۔

واقعے کے دو روز بعد... 19 دسمبر کو حکومت نے سرچ آپریشن ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ ڈپٹی وزیراعظم نے اپنے بیان میں کہا۔ ”ہمیں اندیشہ ہے کہ اب تک مسٹر ہیرولڈ مرچکے ہوں گے۔“

عوام کی جانب سے اس فیصلے پر شدید تنقید کی گئی۔ وہ آپریشن جاری رکھنے کے حق میں تھے، مگر اسی شام پورٹ فلپ کا علاقہ شدید طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ بحریہ کو اپنی کشتیاں وہاں سے ہٹانی پڑیں۔ امدادی کوششیں ترک کردیں۔ اور یہ طے ہوگیا کہ ہیرولڈ کا قصہ تمام ہوچکا ہے۔

لبرل پارٹی تذبذب کا شکار تھی۔ ان کے پاس متبادل قیادت نہیں تھی، جس کے لیے وہ اس روز میزس کو کوس رہے تھے۔ دوسری جانب گورنر جنرل کی دعوت پر اپوزیشن جماعتوں کے اُمیدوار جون میکون نے وزارت عظمٰی سنبھال لی، جس نے تیزی سے معاملے کو نمٹانے کی کوشش کی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہیرولڈ کی ہر یاد عوام کے ذہن سے مٹا دینا چاہتا ہے۔

22 دسمبر کو میلبورن کے سینٹ پال کیتھڈرل میں ہیرولڈ کی تعزیتی سروس ہوئی، جس میں نہ صرف نمایاں ملکی شخصیات، بلکہ دنیا بھر کی ریاستوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ نیا وزیراعظم اور اس کی کابینہ بھی چہرے پر غم سجائے وہاں موجود تھی۔

ہاں، رابرٹ میزس وہاں نہیں پہنچا۔ البتہ اس نے گلدستہ بھجوایا تھا۔

☆☆☆

گمشدگی کا یہ پُراسرار واقعہ افواہوں کے دبیز سیاہ بادل ساتھ لایا۔

لوگ یقین کرنے کو تیار نہیں تھے کہ اس جیسا ماہر تیراک، جس کی صحت قابلِ رشک تھی، جو برسوں کے تجربے کا حامل تھا، سمندر کے ہاتھوں دھوکا کھاسکتا ہے۔

کافی ہاؤس میں مباحثے ہوتے۔ ایک کہتا۔ ”ٹھیک ہے دوستو، اس روز سمندر کچھ غصیل تھا، مگر ایسا بھی کیا۔ کوئی بڑا طوفان تو نہیں آیا تھا۔“

دوسرے کی آواز آتی۔ ”اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس جیسا مشاق شخص زیرِ آب بہاؤ کا اندازہ نہیں لگا پایا۔ وہ تو ان میں سے تھا، جو لہروں کے شور سے ان میں چھپے رازوں کو جان لیا کرتے تھے۔“

لوگوں کا پہلا خیال اس پُراسرار مرض کی سمت گیا، جس کی بابت حکومت نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ یہ ایک برس پہلے کا واقعہ تھا، جب ہیرولڈ پارلیمنٹ میں تقریر کرتے کرتے اچانک گر گیا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ یہ واقعہ جسم میں نمکیات کی کمی کی وجہ سے پیش آیا۔ البتہ عوام اس سے متفق نہیں تھے۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ شاید وزیراعظم دل کی بیماری میں مبتلا ہے، جسے چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

چند اخبارات نے اِسی واقعے کو ہیرولڈ کی گمشدگی کا اصل محرک قرار دیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ہیرولڈ کے لاپتا ہونے کا سبب ہارٹ اٹیک رہا ہوگا۔ بیچ سمندر میں حرکتِ قلب بند ہوگئی۔ جسم میں پانی بھر گیا اور وہ اتھاہ گہرائی میں گم ہوگیا۔

اِن ہی افواہوں کے دوران میں اس کے ذاتی معالج مارکوس دیلونی نے ایک انکشاف کیا۔

اس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ہیرولڈ گزشتہ چند ماہ سے کاندھے کے درد میں مبتلا تھا، جس کا سبب ایک پرانی انجری تھی۔ وہ دردکش گولیاں لے رہا تھا اور اسے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ ٹینس کھیلنے اور تیراکی سے اجتناب برتے۔

اِس اسٹوری کا تعاقب کرنے والے کرائم رپورٹر ٹام فریم کی ایک خبر نے بھی خاصی توجہ حاصل کی، جس نے دعویٰ کیا تھا کہ ہیرولڈ ہالٹ، جو ایک مشاق تیراک تھا، تیزی سے اِس فن کے رموز بھولتا جارہا تھا۔ وہ سمندر میں اترنے کے بعد کچھ ایسی غلطیاں کرنے لگا تھا، جو فقط اناڑی تیراک ہی کرتے ہیں۔

اس نے رواں برس کے اوائل کے ایک واقعے کا تذکرہ کیا، جب ٹھیک اِسی مقام پر غوطہ خوری کے دوران میں ہیرولڈ کی حالت بگڑ گئی تھی۔ دوستوں نے بمشکل اسے پانی سے باہر نکالا۔ حالت یہ تھی کہ وہ نیلا پڑ گیا تھا اور مسلسل الٹیاں کررہا تھا۔

ٹام فریم نے لکھا ”دو ہی امکانات ہیں، یہ تو شیویٹ کے پانیوں میں ایک عفریت چھپا بیٹھا ہے، جس نے ہیرولڈ کو نگل لیا یا یہ کہ وہ اب پہلے جیسا تیراک نہیں رہا تھا۔ اور میرے نزدیک دوسرا امکان زیادہ قوی ہے۔“

یہ تو وہ افواہیں تھیں، جن کا ماخذ ہیرولڈ کی گرتی صحت تھی۔ تاہم 1968 کے اوائل میں جن خبروں نے آسٹریلیا کے طول و عرض میں اپنا سفر شروع کیا، وہ زیادہ پریشان کن تھیں، کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست حساس ریاستی امور سے تھا۔

سب سے زیادہ توجہ کرپشن کے اِن الزامات نے حاصل کی، جو دائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے عائد کیے جارہے تھے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ تین برس قبل ہیرولڈ کے خلاف بننے والی تفتیشی کمیٹی نے حتمی رپورٹ تیار کرلی تھی، جس میں تارکین وطن کی آبادکاری کے دوران میں رشوت لینے کے الزامات کو درست قرار دیتے ہوئے اسے ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔

اِس رپورٹ کا حوالہ دینے والوں کا دعویٰ تھا کہ یا تو ہیرولڈ نے خودکشی کی ہے یا اس نے اپنی موت کا ڈھونگ رچایا ہے، تاکہ سزا سے بچ سکے۔

خودکشی کے الزامات تو جلد بھلا دیے گئے، مگر اپنی موت کا ڈھونگ رچنے والا معاملہ کافی عرصے خبروں کی زینت بنا رہا۔ ایک بڑا طبقہ اس پر یقین کرتا تھا اور اس کی وجہ بھی تھی۔ ایک بھرپور سرچ آپریشن کے باوجود آسٹریلوی حکام اس کی لاش تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ پھر کھاڑی کے جزیروں سے چند بے ربط اطلاعات آئی تھیں۔ کچھ ماہی گیروں نے اس سہ پہر ایک چھوٹی لانچ پر ہیرولڈ سے مشابہ شخص کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

☆☆☆

جلد اس معاملے نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی۔

1968 کے وسط میں اس وقت کھلبلی مچ گئی، جب میلبورن کے سب سے معتبر اخبار نے لبرل پارٹی کے ذرائع کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ مسٹر ہیرولڈ کو چینیوں نے اغوا کرلیا ہے۔ واضح رہے کہ انڈونیشیا میں ہونے والی سیاسی تبدیلیاں اور وہاں چین کی مداخلت ان دنوں مباحثوں کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ آسٹریلوی صنعت کاروں نے انڈونیشیا میں خاصی سرمایہ کاری کررکھی تھی، جس کے باعث ہیرولڈ اس معاملے میں براہِ راست شامل ہوگیا تھا۔

رپورٹ کے مطابق چینیوں کو ہیرولڈ کی پورٹ سپن آمد کا علم تھا۔ ممکن ہے، حکومت میں ان کے چند مخبر ہوں۔ 17 دسمبر کے روز شیویٹ ساحل سے کچھ میل دور ایک چینی آبدوز ماہر غوطہ خوروں کے ساتھ موجود تھی، جس نے موقع پاتے ہی ہیرولڈ پر قابو پالیا۔

اس خبر پر آسٹریلوی بحریہ کی جانب سے سخت ردِعمل آیا، کیونکہ ان کی قابلیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ جس علاقے سے ہیرولڈ لاپتا ہوا، اس کا بڑا حصہ بحریہ کے زیرِ تسلط تھا۔

اخبار کے خلاف نہ صرف مقدمہ درج ہوا، بلکہ رپورٹر پر غداری کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ آخرکار اخبار انتظامیہ کو معافی مانگنی پڑی۔

ڈیڑھ ماہ بعد اسی اخبار نے چین سے متعلق ایک اور خبر شایع کی۔ اس میں ایک آبدوز کا ذکر تھا، مگر اِس بار بحریہ کی جانب سے کوئی ردِعمل نہیں آیا۔ سبب واضح تھا کہ اس میں کسی اور کو نہیں، خود ہیرولڈ کو قصوروار ٹھہرایا گیا تھا۔

اس سنسنی خیز رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا کہ ہیرولڈ چین کی خفیہ ایجنسی کا جاسوس تھا۔ اس کے چینی حکام سے رابطوں اور ملاقاتوں کی تفصیل بھی شائع کی گئی۔ دعویٰ کیا گیا کہ وہ ماؤازم کی جانب جھکاؤ رکھتا تھا اور انڈونیشیا میں چینی مداخلت کا پُرزور حامی تھی۔

اخبار نے 17 دسمبر کے واقعات کی جونئی منظرکشی کی، وہ ایک مجرم کے فرار کی کہانی تھی۔ اس کہانی کے مطابق ہیرولڈ ابتدا ہی میں چینی خفیہ ایجنسی کا آلہ کار بن گیا تھا۔ امریکی صدر کینیڈی سے اس کے روابط کے پیچھے بھی چینی مقاصد تھے۔ اس دوپہر چینی آبدوز گہرے پانیوں میں موجود تھی۔ ہیرولڈ، جو ایک مشاق تیراک تھا، پہلے تیرتے ہوئے ایک قریبی جزیرے تک پہنچا، جہاں سے کشتی لے کر مقرر کردہ علاقے میں داخل ہوا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔

کئی برس بعد جب برطانوی صحافی انتھونی گرے نے اس کیس پر تحقیق کی، تو اسی نظریے کو سامنے رکھا۔ اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب میں ہیرولڈ کو پیپلز ری پبلک آف چائنا کا جاسوس قرار دیا۔ اس نے سوال اٹھایا کہ اگر ہیرولڈ ڈوب کر ہلاک ہوا، تو آخر اس کی لاش کہاں چلی گئی۔ آخر وہ ساحل کے نزدیک ہی تو غائب ہوا تھا۔

ایک جریدے نے تو یہ بچگانہ دعویٰ بھی کیا کہ ہیرولڈ کو خلائی مخلوق نے اغوا کرلیا ہے، تاکہ اس سے ملکی راز اگلوا کر آسٹریلیا پر حملہ کرسکیں۔ انہوں نے ثبوت کے طور پر قریبی جزیروں کے چند مکینوں کے بیانات پیش کیے، جنہوں نے اس سہ پہر آسمان میں سبز گولے دیکھے تھے۔ ساحلی ریڈیو اسٹیشن کی نشریات میں آنے والے ناقابلِ فہم تعطل کا ریکارڈ بھی موجود تھا۔

انہوں نے وہ تاریخ بھی دے دی، جب مریخ کے باسی آسٹریلیا پر حملہ کریں گے... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

☆☆☆

سائنس کے میدان میں حیران کن ترقی ہوئی، نئے نئے انکشافات سامنے آئے، مگر ہیرولڈ کی موت کا معما جوں کا توں رہا۔

بعد کے برسوں میں لکھی جانے والی بیش تر کتابوں کے مصنفین اس بات پر اصرار کرتے نظر آئے کہ ہیرولڈ نے خودکشی کی تھی۔ 2007 میں شایع ہونے والی رے مارٹن کی تصنیف "ہیرولڈ ہالٹ کا قاتل کون؟" میں خودکشی کو اِس چیستان کا اکلوتا حل قرار دیا گیا۔ معروف آسٹریلوی ہفت روزہ "دی بلیٹن" نے بھی اسی نظریے کی حمایت کی۔ اس میں ہیرولڈ کابینہ کے ایک وزیر ڈوگ انتھونی کے ایک بیان کو بنیاد بنایا گیا، جس کے مطابق اپنی موت سے کچھ ماہ قبل وہ شدید یاسیت میں گھر گیا تھا اور دوستوں کے مشورے کے باوجود کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنے سے اجتناب برتتا رہا۔

اس مضمون کی ہیرولڈ کے اہلِ خانہ کی جانب سے شدید مذمت کی گئی۔ مقدمے کی دھمکی دی۔ جواب میں ہفت روزہ نے ایک سطری وضاحت شایع کرکے جان چھڑالی۔

اکتوبر 2008 میں اے بی سی ٹی وی نے ہیرولڈ پر ایک ڈراما پیش کیا، جس میں اس کی موت کے اسباب کو گرتی صحت کا شاخسانہ قرار دیا۔

تحقیقات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وقتاً فوقتاً نئے انکشافات سامنے آتے رہتے ہیں، مگر سچ تو یہ ہے کہ پانچ عشرے گزر جانے کے باوجود ہیرولڈ ہالٹ کی گمشدگی ایک معما ہے۔

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی

قسط نمبر: 235

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزِاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درداستاں سرگزشت

حبیب جالب کی تعریف سب سے پہلے ہم نے معروف نغمہ نگار تنویر نقوی کی زبانی سنی تھی۔ حبیب جالب

ان دنوں کراچی میں قیام پذیر تھے۔ تنویر صاحب نے ان کا کلام اور پڑھنے کا انداز سنا تو بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ اس لڑکے کو لاہور بلانا چاہیے۔ یہ شاعری کے لیے اور فلم کے لیے بھی ایک مختلف انداز میں انقلاب برپا کردے گا۔ یہ غالباً 60 کا واقعہ ہے۔

حبیب جالب لاہور آئے تو اپنی شخصیت، کلام اور دیگر خوبیوں کی وجہ سے بہت جلد مقبول ہو گئے۔ جاوید ہاشمی کو تو غالباً پارٹیاں تبدیل کرنے کی وجہ سے باغی کہا جاتا ہے لیکن حبیب جالب حقیقتاً باغی تھے موجودہ نظام سے انہیں نفرت تھی۔ انہیں زیادہ شہرت صدر ایوب کے زمانے میں ملی

ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

ایسی نظم لکھنا بڑی جرأت کی بات تھی۔ ایک آمر کو اس طرح للکارنا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہ نظم کسی جگہ شائع تو نہیں ہوئی مگر سینہ بہ سینہ پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ یہ بھی سچ ہے کہ جالب ایک نڈر اور بے خوف شاعر تھا۔ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ بعد میں ان کی نظمیں فلموں میں بھی استعمال کی گئیں اور انہوں نے فلمی سچویشن کے مطابق بے حد خوب صورت گیت اور نغمے لکھے۔ ریاض شاہد کی فلم ''زرقا'' کے گانے اس کا ثبوت ہیں۔ جب نیلو قید میں زنجیروں میں بندھی ہوئی ہے اور اس کو رقص کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو حبیب جالب نے اس سچویشن کے لیے یہ معرکہ خیز گیت لکھا

عشق زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

بہت جلد انہوں نے فلمی اور ادبی حلقوں میں اپنا مقام بنا لیا۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز سننے والوں کے اندر ایک ہیجان اور جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔

جالب صاحب سے ہماری بہت اچھی دوستی رہی لیکن ایک بات پر عموماً ہمارا جھگڑا رہتا تھا۔ ہم کہتے کہ دنیا میں انقلاب لانے اور اسے بہتر بنانے سے پہلے اپنے گھر، خاندان خصوصاً بچوں کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ یہ کیسی زندگی ہے کہ صبح گھر سے نکلے اور رات گئے نشے میں دھت گھر پہنچ کر بے ہوشی کے عالم میں پڑ گئے۔ ان کے پاس کوئی معقول دلیل تو نہ تھی مگر وہ کہتے تھے کہ دنیا کو اور انسانوں کو

انقلاب سے آشنا کرنا بہت ضروری ہے ہمارے مابین اکثر رو ٹھنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مناتا کوئی نہ تھا بس کچھ دن بعد بات چیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان سے ہم نے ایک یادگار انٹرویو بھی لیا تھا۔ ان کی باتیں سنیے اور حبیب جالب کے پوشیدہ پہلوؤں سے بھی واقف ہو جائیے۔

حبیب جالب یوں تو ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے کچھ ہوشیاری نہیں سیکھی۔ ان کا عالم یہ ہے کہ ایک بار جسے اپنا کہہ دیا، بس اسی کے ہو کر رہ گئے۔ جس سے وابستہ ہوئے دوبارہ کسی اور کے دامن کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ یہ وفاداری، مستقل مزاجی اور پائیداری بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

انہوں نے شاعری کا آغاز تو ایک رومانی اور تخیل پرست شاعر کے طور پر کیا تھا لیکن بعد میں ان کی حساس اور زود رنج طبیعت، زمانہ اور ماحول سے اس بری طرح متاثر ہوئی کہ پھر انہوں نے اپنے آپ کو عوام کے لیے وقف کر دیا اور آج وہ پاکستان میں ایک حق گو اور شعلہ نوا شاعر کے طور پر مشہور ہیں۔

کچھ نقادوں اور شاعروں کا کہنا ہے کہ حبیب جالب کی شاعری وقتی اور جذباتی ہے۔ زمانے کی گرد اسے تہہ در تہہ اپنے نیچے دبا لے گی اور ایک وقت آئے گا جب کسی کو حبیب جالب کا نام بھی یاد نہیں رہے گا لیکن جالب کا نظریہ بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو شاعر، ادیب یا فن کار اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر نہیں ہوتا اور اپنے ہم وطنوں کے دکھوں کا ادراک نہیں کرتا اسے فن کار کہلانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جس شاعری کو نقاد وقتی اور حادثاتی شاعری قرار دیتے ہیں اس کو حبیب جالب حقیقت پسندی کا نام دیتے ہیں۔ واقعات اور حالات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور ارد گرد کی تبدیلیوں سے منہ موڑ لینا ان کے نزدیک بزدلی اور موقع پرستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبیب جالب نے ملک کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کو موضوع بنا کر ایسی ایسی نظمیں لکھیں جو سینہ بہ سینہ ہر گھر اور ہر گلی تک پہنچ گئیں اور وقت کے مرد آہن اور ڈکٹیٹر بھی ان کی مقبولیت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ جالب نے ہر حکمران کے دور میں اس پر نکتہ چینی کی اور نتیجتاً ہر حکمراں اور حکومت کے معتوب رہے۔ انہوں نے شہرت اور دولت کی خاطر اپنے ضمیر کو فروخت نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ زمانے کے معیار کے مطابق یہ آسائشیں اور مادی فائدے حاصل نہیں کر سکے۔ اسے شوق آوارگی کہہ لیجیے یا قلندری اور بے نیازی، وہ دولت کمانے کی دوڑ کے لیے مخصوص آج کے دور میں بھی سڑک سوار شخص ہیں جو اپنے خاندان کی کفالت کرنے کے لیے ذہنی محنت و مشقت کرنے پر مجبور ہے۔ انہیں ہر دنیاوی نقصان اور ہر مادی تکلیف گوارا ہے بشرطیکہ ان کی آواز کی گھن گرج کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

حبیب جالب سے ہماری شناسائی اور ملاقات بہت پرانی ہے۔ انہوں نے فلموں کے لیے نغمات بھی لکھے جن میں سے بعض بے حد مقبول ہوئے لیکن فلمی دنیا میں بھی ان کا صحیح معنوں میں گزارہ نہیں ہوا اور اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ جس شخص کا خداوند تعالیٰ کی تخلیق کردہ اتنی وسیع و عریض دنیا میں گزارہ نہ ہو وہ بھلا ایک گوشے میں واقع ایک مختصری دنیا میں کیونکر مطمئن رہ سکتا ہے؟ بقول غالب

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

آفاقی: جالب صاحب! آپ ہمارے بہت پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ ادب اور شاعری میں آپ کا ایک منفرد مقام ہے۔ پہلے تو آپ نے ادبی شاعری کی مگر بعد میں سیاسی موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں شامل کر لیا۔

ایک جالب تو وہ تھا جس کا یہ کہنا تھا کہ

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا، شوقِ آوارگی

غالباً آپ نے یہ گانا فلم اسٹار کمال کی فلم کے لیے لکھا تھا جسے آپ کا پہلا فلمی گیت بھی کہا جاسکتا ہے۔

حبیب جالب: ایک فلم بنی تھی ''بھروسا'' جس کی کہانی ریاض شاہد نے تحریر کی تھی۔ یاسمین اور علاؤ الدین نے اس فلم میں مرکزی رول ادا کیے تھے۔ جعفر شاہ بخاری اس فلم کے ڈائریکٹر تھے۔ میں نے اس پکچر کے لیے تین گیت لکھے تھے۔ اس سے پہلے 1956ء میں کراچی میں ایک فلم بنی تھی اس کے لیے بھی میں نے ایک غزل لکھی تھی۔

دراصل کراچی شہر سے ہی میں نے اپنی فلمی شاعری کا آغاز کیا تھا جب انور کمال پاشا صاحب نے فلم ''دو آنسو'' بنائی تھی ان دنوں مرتضیٰ جیلانی اور ایم ایچ آزاد کے ساتھ میں رائل پارک میں رہتا تھا۔ میں اس دور میں بطور شاعر اتنا تجربہ کار نہیں تھا۔ محض معمولی سی مشق کر رکھی تھی۔ ان دنوں ہدایت کار مرتضیٰ جیلانی نے مجھے ایک مصرعہ دیا تھا۔

اِک حال پر ہمیشہ رہتا نہیں زمانہ

جیلانی صاحب نے کہا کہ اس پر دوسرا مصرعہ لگاؤ۔ میں نے دوسرا مصرعہ یوں لگایا۔

کیوں ہنس رہی ہے دنیا سن کر میرا فسانہ
اِک حال پر ہمیشہ رہتا نہیں زمانہ

مرتضیٰ جیلانی نے اس مصرعے کے مجھے تھوڑے بہت پیسے تو دے دیے تھے مگر اس کے ساتھ میرا نام نہیں آیا تھا۔ پھر جب میں کراچی چلا گیا تو آزاد نے ''طوفان'' کے بعد ایک نئی فلم شروع کی۔ خلیل احمد اس کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ آزاد نے خلیل احمد سے پوچھا۔ ''تم باجا بجا لیتے ہو؟'' خلیل احمد نے کہا۔ ''ہاں! بجا لیتا ہوں۔'' اس پر آزاد بے ساختہ بولے۔ ''تو بس پھر آج سے تم میوزک ڈائریکٹر ہو۔'' خلیل احمد کی کمپوزیشن میں نذیر بیگم نے بھی دو گانے ریکارڈ کروائے مگر یہ فلم نہ بن سکی۔

اس زمانے میں علاؤ الدین اور ریاض شاہد کا کراچی آنا جانا رہتا تھا چنانچہ انہوں نے مجھے لاہور آنے کی دعوت دی۔ میں لاہور آ کر علاؤ الدین کے ہاں ٹھہر گیا۔ وہ بلاشبہ ایک ہمدرد اور مخلص دوست تھے۔ انہیں کسی میں اگر ذرا بھی خوبی نظر آتی تھی تو وہ اس شخص کی سرپرستی اور رہنمائی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ علاؤ الدین مجھے روزانہ پانچ روپے دیا کرتے تھے اور کہتے تھے ''گھومو پھرو، انشاء اللہ تمہیں گانے لکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔'' ایک روز میں میکلوڈ روڈ پر کھڑا پان کھا رہا تھا کہ ایک آدمی نے وہاں آ کر مجھے پیغام دیا کہ آپ کو جعفر شاہ بخاری بلا رہے ہیں۔ اس وقت میرا مزاج کچھ تیز تھا۔

آفاقی: وہ تو اب بھی ہے۔

حبیب جالب: میں نے کہا۔ ''میں نہیں جاسکتا کیوں کہ مجھے اس طرح بلانے کا انداز پسند نہیں ہے۔'' اتنے میں وہ خود آئے اور زبردستی مجھے اٹھا کر لے جانے لگے۔ جیسا کہ ان کی عادت ہے۔ علاؤ الدین بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''ایک گانا لکھنا ہے مگر آپ چل نہیں رہے۔'' چنانچہ ہم شاہ نور اسٹوڈیو میں آگئے یہاں پر میوزک ڈائریکٹر اے حمید بیٹھے تھے۔ یہاں جعفر شاہ بخاری نے میرے بارے میں یہ ہوا باندھی کہ یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہیں کراچی سے بلوایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اے حمید نے کہا کہ انہیں پرسوں بلوایے، میں نے کہا۔ ''بھائی میں تو تمہارے ساتھ بیٹھنا ہی نہیں چاہتا اور تم مجھے ڈیٹ دے رہے ہو مگر جعفر شاہ بخاری اس گفتگو کا رخ مزاح کی طرف لے گئے اور مجھے وہاں بٹھا دیا۔ میں نے کہا۔ ''بھائی میں تو موڈ میں آئے بغیر لکھتا نہیں ہوں۔'' اس وقت کوئی خاص پابندی بھی نہیں ہوتی تھی۔ جعفر بخاری نے کہا۔ ''لیکن میں تو یہ شوق نہیں کرتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تو پھر میں نہیں لکھ سکتا۔'' میری دراصل کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ان سے اپنا پیچھا چھڑاؤں مگر انہوں نے شوکت حسین رضوی صاحب سے جا کر کہا کہ کراچی سے ایک شاعر آیا ہے جو ترنگ کے بغیر نہیں لکھتا۔ شوکت حسین رضوی نے کہا۔ ''پھر تو وہ شاعر یقیناً بہت اچھا ہوگا۔ میں بھی آ کر اس سے ملتا ہوں۔'' چنانچہ اس طرح وہ بھی وہاں آگئے۔ اے حمید نے پہلے ہی طرز بنا رکھی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی تو اپنا غم بیان کر، تاکہ میں اندر سے تیرا قلب صاف کردوں۔ اے حمید نے جو طرز بنا رکھی تھی اس پر میں نے پہلے ہی مکھڑا لکھ لیا تھا۔

آفاقی: یعنی وہ پہلا گانا تھا جو آپ نے طرز پر لکھا۔

حبیب جالب: جی ہاں! تھوڑی دیر میں وہ گیت مکمل ہوگیا جو کچھ یوں تھا

روئے میرا دل
تو ہے کہاں
ڈستی ہیں تنہائیاں

ان دنوں ''تنہائیاں'' ایک نیا قافیہ تھا۔ چنانچہ شوکت حسین رضوی نے بھی وہ گانا پسند کیا۔ اس طرح میں نے تین دن میں تین گانے لکھے۔ میں نے علاؤ الدین سے پوچھا۔ ''بھئی یہ پیسے بھی دے گا؟'' علاؤ الدین نے کہا۔ ''ضرور دے گا۔'' جعفر شاہ بخاری نے کہا ''کتنے پیسے دوں۔''

اب مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ یہ اتنے پیسے دے بھی سکے گا لیکن میں نے کہا۔ ''پانچ سو لیا کرتا ہوں تم تین سو دے دو۔'' چنانچہ اس نے اسی وقت تین گانوں کے مجھے نو سو روپے دے دیے۔

آفاقی: اور آپ کی جان میں جان آگئی۔

حبیب جالب: اس وقت ایک گانے کے تین سو روپے بہت بڑی رقم تھی۔ اس زمانے میں میرے بچے جھنگ میں رہتے تھے۔ میں نے انہیں بھی لاہور بلوا لیا۔ میری کتاب ''برگِ آوارہ'' بھی چھپ چکی تھی۔ اسی زمانے میں یونیورسٹی ہال لاہور میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں لائل پور سے لاہور آیا۔ لاہور کے لیے جب مجھے بس نہ ملی تو میں نے ایک ٹرک والے سے درخواست کی جس نے مجھے لاہور پہنچایا۔ اس زمانے میں شاعروں کے بڑے بڑے بال ہوا کرتے تھے کیوں کہ انہیں شاعر بننے سے زیادہ شاعر لگنے اور شاعر نظر آنے کا زیادہ شوق ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں ایک شاعرہ ''زہرہ نگاہ'' کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ ترنم کے ساتھ اور بہت اچھا پڑھتی تھیں۔ انہیں تو ایک مشاعرے میں جگر صاحب بھی حیرت سے دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ میں جب مشاعرے میں آ کر بیٹھا تو شوکت تھانوی نے فوراً میرا نام لیا۔

آفاقی: ان کا خیال ہوگا کہ انہیں جلدی سے بھگتاؤ۔

حبیب جالب: جب میں کھڑا ہوا تو لوگوں نے مجھے ہوٹ کرنا شروع کردیا کہ یہ خبیث کہاں سے آگیا ہے۔ اسے باہر نکالو۔ میں ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اس دوران میں میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے سوچا کہیں دل میں یہ حسرت نہ رہ جائے کہ میں نے سنایا نہیں۔ لہٰذا اس جذبے کے تحت میں نے ان کے شور میں ہی اپنی مشہور غزل سنانا شروع کردی۔

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

کچھ صورتِ حال ایسی تھی کہ یہ غزل حسبِ حال بن گئی۔ لوگوں نے میرا شعر سنا تو انہیں خیال آیا کہ یہ تو ٹھیک ٹھاک قسم کا شاعر ہے۔ پھر میں نے دوسرا شعر پڑھا

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

اس پر تو مجھے بہت زیادہ داد ملی۔

آفاقی: یہ غزل آپ نے کتنے عرصے پہلے لکھی تھی؟

حبیب جالب: 1956ء میں تو میری کتاب چھپی تھی۔ یہ اس سے تین چار سال پہلے لکھی تھی۔ بہرطور جب میں نے یہ شعر پڑھا تو جگر صاحب نے بھی مجھے داد دی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ لوگ مجھے سنتے ہی نہیں تھے مگر اب میں مائیک چھوڑ کر جگر صاحب کی داد وصول کرنے گیا اور ان سے ہاتھ ملایا۔ اس سے پہلے جب جگر صاحب کراچی میں آیا کرتے تھے تو لوگ مجھے کہا کرتے تھے کہ جالب چلو جگر صاحب آئے ہوئے ہیں اور میں ان سے کہتا تھا۔ ''یار جگر صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' لوگ کہتے تھے دیکھو اس لونڈے کا دماغ خراب ہوگیا ہے کہتا ہے۔ ''جگر صاحب سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب کیسے ملاقات ہو جائے گی؟''

آفاقی: پھر ایک روز واقعی ان سے آپ کی ملاقات ہوگئی اور اس دلچسپ انداز میں ہوئی کہ آپ ان سے داد وصول کرنے گئے۔

حبیب جالب: بہرکیف جگر صاحب کی داد وصول کرنے کے بعد میں دوبارہ مائیک پر آیا اور اپنی غزل مکمل کی۔ اب لوگوں نے شور مچانا شروع کردیا کہ ایک اور......ایک اور......جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ اس پر شوکت تھانوی مائیک پر آگئے اور کہنے لگے کہ ابھی بہت سے شاعر باقی ہیں۔ جالب صاحب کو بھی دوبارہ وقت دیا جائے گا۔ میں نے مائیک پر کہا۔ ''حضرات! کیا آپ مجھے سننا چاہتے ہیں؟'' لوگوں نے کہا۔ ''جی ہاں ہم آپ کو سننا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر آپ شوکت صاحب سے کہیں کہ وہ مائیک سے ہٹ جائیں تاکہ میں آپ کو اور غزلیں سنا سکوں۔'' آفاقی صاحب! اس مشاعرے کے بارے میں بہت سے اخبارات نے لکھا۔ شاید انتظار حسین نے بھی اس سلسلے میں کچھ لکھا تھا۔ بہرطور یوں لوگوں میں میرا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد تو کافی ہاؤس میں بھی لوگ مجھ کو پہچاننے لگے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں کہ چراغ حسن حسرت بہت بڑے شاعر اور نقاد تھے۔ کسی کو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے اور اگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے تو واقعتاً انہیں

اس کا حق بھی تھا۔ ان سے گفتگو کرنے کے لیے کسی آدمی کا اہلِ علم اور دانشور ہونا بہت ضروری تھا۔ یقیناً وہ بہت بڑا ادبی دور تھا۔ جب چھوٹے بڑے کا خیال کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ میں کافی ہاؤس میں داخل ہوا تو وہاں بہت سے دوست احباب موجود تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کچھ سناؤ۔ میں نے بہانہ کردیا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں چراغ حسن حسرت بھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے آواز دی۔ ''مولانا اِدھر آیئے۔'' میں فوراً اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ انہوں نے میری ایک غزل کا پورا مطلع پڑھ کر کہا یہ غزل سناؤ۔

مطلع یہ تھا

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

میں تو بہت خوش ہوا کہ چراغ حسن حسرت ایسے عظیم نقاد اور شاعر کو میری غزل کا مطلع یاد ہے۔ حسرت صاحب کی فرمائش ٹالنا میرے لیے ناممکن تھا چنانچہ میں نے اپنا کلام سنایا۔ ان دنوں مشاعرے کرکٹ میچ کی طرح ہوتے تھے۔ ہندوستان سے بھی لوگ سننے آجایا کرتے تھے۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناؤں کہ چودھری عبدالحمید نے ہماری کتاب ''برگ آوارہ'' چھاپی تھی۔ ان سے لوگوں نے کہا۔ ''جالب تو اپنی غزلیں کسی اور سے لکھواتا ہے۔ اس کی تو بس آواز ہی آواز ہے۔'' اب یہ جو پبلشر تھا وہ خود بھی شاعر تھا۔ فیض، ناصر کاظمی اور سیف کا کلام بھی وہ شائع کرتا تھا۔ ایک دن جب میں ان کے پاس گیا تو وہ کہنے لگے۔ ''دیکھیے میں آپ کو ایک مصرعہ دے رہا ہوں۔ اس پر آپ چار پانچ شعر لکھ دیجیے۔'' میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند اشعار لکھ دیے۔ وہ بولے۔ ''لوگ آپ کے خلاف بہت پروپیگنڈہ کرتے تھے مگر میں تو بہت متاثر ہوا ہوں۔'' چنانچہ انہوں نے میرا کلام شائع کردیا۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہا اور میں مشاعرے بھی پڑھتا رہا۔

آفاقی: جالب صاحب! آپ نے بہت کم مشاعرے پڑھے۔ آپ جان بوجھ کر مشاعرے میں جانے سے کتراتے ہیں یا لوگ آپ کو بلانے سے ڈرتے ہیں؟

حبیب جالب: کبھی میں تو مشاعرے کا بڑا کامیاب شاعر تھا مگر جب سے میں نے ایک نظم ''دستور'' کہہ ڈالی اس کے بعد مجھ پر پابندیاں عائد ہونا شروع ہوگئیں۔ ڈی سی کہتے تھے کہ جالب یہ نظم نہ پڑھے مگر میں بھی ضد میں آگیا مگر جب میں نے ''دستور'' کے عنوان سے نظم لکھ لی تو اب اس کو پڑھنا بھی تھا۔ ایک جگہ مجھے یہ نظم پڑھنے کا موقع بھی مل گیا۔ کوہ مری میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں جسٹس منیر پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم اس مشاعرے میں غزل وغیرہ ہی پڑھنا چاہتے تھے۔ ''دستور'' پڑھنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

آفاقی: وہ نظم آپ نے ایوب خان کے دستور کے بارے میں لکھی تھی نا؟

حبیب جالب: جی ہاں! ان دنوں ضمیر جعفری، ظریف جبل پوری اور شوکت تھانوی جس مشاعرے میں بھی چلے جاتے تھے وہ مشاعرہ ان ہی کے ہاتھ میں رہتا تھا اور لوگ غزل گو شاعروں کو کم ہی سنتے تھے اور انہی کا طوطی بولتا تھا۔ چنانچہ جب شوکت تھانوی اپنا کلام پڑھ چکے اور غالب کی نظم کا تمسخر اڑا چکے۔ (میں جو بات کرنے والا ہوں اس میں عطا حسین کلیم کا حوالہ دینا ضروری ہے جو ایک شاعر ہیں یقیناً وہ میری بات سے اختلاف کریں گے مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں) تو میں نے جو اشارہ دیکھا وہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اب جالب کو کٹواؤں۔ میں ساری صورت حال کو بھانپ گیا۔ چنانچہ جب میں مائیک پر آیا تو میں نے حاضرین سے کہا۔ حضرات! میں آج خلافِ معمول نظم عرض کروں گا جس کا عنوان ہے ''دستور'' جب میں نے یہ کہا تو کرم حیدری نے میرا پاجامہ کھینچنا شروع کردیا اور کہنے لگا۔ ''بھئی کیا کررہے ہو ایسا مت کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''ہٹ پیچھے۔'' آفاقی صاحب پھر میں نے جو نظم پڑھی تو مشاعرہ بلیوں اچھلا۔

آفاقی: جالب صاحب! اس نظم کا کچھ حصہ دہرا دیجیے گا۔

حبیب جالب: میں عرض کیے دیتا ہوں

دیپ جس کا محلات میں ہی جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں مانتا

ان دنوں نیا نیا دستور جاری ہوا تھا۔ ویسے بھی ایوب خان کا لوگوں پر بڑا دبدبہ اور جلال تھا۔ جب میں نظم پڑھ رہا تھا تو سامنے والی قطار میں بیٹھے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر لوگ مجھے داد دے رہے تھے۔ ویسے بھی میں یہ نظم ترنم کے ساتھ پڑھ رہا تھا جس کا کچھ زیادہ ہی اثر ہوا۔ جب میں

آخری مصرعہ پڑھ کر بیٹھنے لگا تو سب لوگ اٹھ کر چلنے لگے۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں مجھے ایک بڑے شاعر نے کہا۔ ''اس کا موقع نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں موقع پرست نہیں ہوں۔''

اس کے بعد تو یہ ہوا کہ جہاں جہاں مجھے جانا ہوتا تھا میری یہ نظم مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جایا کرتی تھی۔ جب ہر شہر میں جا جا کر میں نے تمام جگہوں کو بھگتا لیا تو اس کے بعد قید و بند کی صعوبتیں شروع ہوگئیں۔

آفاقی: کیا مشاعرے کے منتظمین یہ شرط نہیں لگاتے تھے کہ آپ یہ نظم نہ پڑھیں؟

حبیب جالب: وہ تو شرط لگاتے تھے مگر لوگوں کا پُرزور مطالبہ ہوتا تھا کہ وہی نظم سناؤ۔ اس لیے یار دوستوں سے میں نے کہا کہ لوگوں کے جذبے پر میں پانچ سات سو روپے کا معاوضہ قربان کرتا ہوں۔ میں جہاں جاتا تھا لوگ میرے ساتھ ہوتے تھے مگر جو بڑے تھے وہ اوپر والوں کے سامنے وضاحتیں کرتے رہ جاتے تھے کہ صاحب ہم نے تو بہت روکا مگر لوگوں کے مطالبے کے سامنے ہماری ایک نہ چلی۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ دس سال تک مری میں میرا داخلہ بند رہا۔ پھر جب وہ وقت بدلا اور یحییٰ خان آگئے تو مری والے بدنصیبوں نے پھر مجھے بلا لیا۔ یہ مشاعرہ فیض احمد فیض کی صدارت میں ہورہا تھا۔ میں نے مائیک پر آکر کہا۔ حضرات میں بہت خوش ہوں کہ آج کسی بیوروکریٹ، کسی منسٹر یا کسی اسپیکر کی صدارت نہیں ہے بلکہ آج ایک عظیم المرتبت شاعر فیض احمد فیض کی صدارت ہے۔ آج ساری آزادیاں بحال رہیں گی۔

فیض صاحب! اکثر مجھے کہا کرتے ہیں۔ ''اوئے غزل پڑھ۔ اوئے غزل پڑھ۔ لہٰذا میں ان سے ڈرتے ہوئے غزل ہی لکھ لایا ہوں۔'' مشاعرے میں احسان دانش بھی تھے۔ میں نے کہا۔ ''آج کی تصویر'' سے خطاب کرتے ہوئے میں غزل عرض کرتا ہوں۔ تصویر سے میری مراد یحییٰ خان تھے جنہوں نے ایوب خان کے بعد اقتدار سنبھالا تھا۔ غزل یوں تھی

تم سے پہلے وہ جو اک شخص تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنہیں ناز بہت اپنے تئیں تھا
آج سوئے ہیں تہہ خاک نہ جانے یہاں کتنے
کوئی شعلہ، کوئی شبنم، کوئی مہتاب جبیں تھا
اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اِک زمانے میں مزاج ان کا سرِ عرش بریں تھا
چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالب نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے، کوئی زنداں تو نہیں تھا

جب میں نے یہ نظم پڑھی تو مشاعرہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ کسی اور شاعر کو انہوں نے سننا ہی گوارا نہیں کیا۔ یحییٰ خان کے بعد سے لے کر اب تک ہمیں کسی نے مری میں مشاعرے کے لیے نہیں بلوایا اب تو وہ مشاعرے ہی ختم ہوگئے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر کہتا ہے یا اسے بلالو یا مجھے بلالو۔ اب میں مشاعروں میں اس لیے بھی نہیں جاتا کہ جتنے بھی شعراء وہاں جاتے ہیں وہ سارے حلقہ بگوش ضیاء الحق ہیں۔ جب وہ ان کی اکیڈمی آف لیٹرز میں جاتے ہیں تو میں ان کے ساتھ بریکٹ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے نقصان تو ہوتا ہے مگر میں نہیں جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں بہت سا معاوضہ دیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ یہاں میں اپنے خرچ پر آکر کلام سنا جاؤں گا مگر میں ان شاعروں کے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ انہوں نے تو عوام کے جذبے اور ان کی آزادی کی بڑی توہین کی ہے۔ یہ لوگ وظیفہ خور اور درباری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے ساتھ کہیں جانا بھی پسند نہیں کرتا۔ اب آپ کہیں گے کہ گزر اوقات کیسے ہوتی ہے؟ تو میں نے بڑے کام لگا رکھے تھے۔ مشاعرے نہ ہوئے تو کیا ہوا، زندگی گزارنے کے لیے میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ پھر کافی عرصے کے بعد قریباً دو تین سال قبل مجھے پاسپورٹ ملا تو میں لندن چلا گیا۔ وہاں لوگ مجھے سننے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھتے تھے کہ یہ وہاں سے زندہ کیسے آگیا ہے؟ وہاں سے یہ کیسے نکل آیا ہے؟ پھر وہاں سے میں ناروے گیا۔ سوئیڈن کا دورہ کیا اور امریکا بھی گیا۔ وہاں میری بڑی پذیرائی ہوئی۔ اب ظاہر ہے جب وہ مجھے بلواتے تھے تو لفافے میں بند کر کے کچھ نہ کچھ دیتے بھی تھے مگر میں نہ تو ان کے سامنے لفافے کھولتا تھا اور نہ کبھی میں نے ان سے یہ طے کیا تھا کہ اتنی رقم لوں گا۔ اگر کسی نے بہت کم پیسے دے دیے تو میں نے کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ یوں لوگوں کی جانب سے مجھے بہت پذیرائی اور محبت ملی۔ جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے وہ ادارے ہی رہے ہیں۔ ایک عوام کا اور دوسرا دربار کا۔ (دربار سے مراد حکومت ہے) جن کا دربار نہیں ہوتا ان کے

ساتھ عوام ہوتے ہیں وہ وہی ان کی سرپرستی کرتے ہیں لہٰذا مجھے اپنی اس زندگی پر کبھی کوئی ندامت نہیں ہوتی بلکہ درباروں میں حاضری دینے والوں کی نسبت عوام سے رابطہ رکھنے والوں کی عزت زیادہ ہوتی ہے۔ کتب فروشی کی تاریخ میں یہ ایک مثال ہے کہ کسی شاعر کی کتاب کے ایک مہینے میں چار ایڈیشن شائع کیے گئے ہوں۔ میں ''سرِ مقتل'' کی بات کررہا ہوں جو عبدالحمید نے شائع کی تھی۔ ابھی لندن سے کچھ کتب فروش آئے تھے ان کا کہنا تھا کہ بیرونی ممالک میں فیض، فراز اور حبیب جالب کی کتابیں بہت زیادہ بکتی ہیں۔ وہ لوگ کم از کم سرپرستی تو کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اب میں لوگوں پر کیا الزام دھروں۔ ڈکٹیٹرز ان کے بارے میں عموماً کہتے ہیں کہ عام لوگ بے شعور ہوتے ہیں لیکن بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے عوام بے جا توقعات رکھ لیتے ہیں اور وعدوں کی جنت میں رہتے ہیں مگر وہ وعدے کرنے والوں کے طبقاتی کردار اور ان کی شکلوں کو نہیں دیکھتے۔

میں بہت کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً خاتون کے خان، خان آف قلات۔ ان سے روٹی مانگنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ وہ بھلا کہاں سے روٹی دے گا۔ نواب بہاولپور سے صادق قریشی سے روٹی، کپڑا، مکان کی توقعات کیسے پوری ہوسکتی ہیں۔ اس سسٹم میں اور اس بجٹ میں تو کوئی جی ہی نہیں سکتا۔ جن دنوں ولی خان قائد حزب اختلاف تھے انہوں نے بھٹو سے کہا۔ ''جناب آپ نے روٹی کپڑے کے نام پر الیکشن جیتا ہے لہٰذا آپ آئین میں لوگوں کو روٹی، کپڑے اور مکان کا تحفظ بھی دیں۔''

اس پر بھٹو نے کہا۔ ''ولی خان یہ تو نعرے ہوتے ہیں۔ بھلا کوئی کسی کو روٹی، کپڑا مکان دے سکتا ہے؟'' تو جہاں اس قسم کے نظریات رکھنے والے لوگ ہوں وہاں بھلا عوام کی حالت کس طرح سدھر سکتی ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھٹو کے ساتھ نہیں گیا۔ ان کی بیٹی بے نظیر میرے گھر آئیں۔ میں نے ان سے کہا۔ ''لوگ آپ سے پیار کرتے ہیں لہٰذا آپ ان کے مسائل سے پیار کریں مگر ان کے یہ مسائل واشنگٹن حل نہیں کرسکتا۔ واشنگٹن سے تو جنگ اور بھوک ونگ آتی ہے یا پھر مارشل لا آتے ہیں۔ اب تک جو مارشل لا آئے ہیں وہ سوویت یونین کی طرف سے تو نہیں آئے مگر امریکا میں تو کھمبیں پلتی ہیں۔ میں نے بفلو (امریکا) میں ایک کتبہ دیکھا جس میں نہ صرف ان جنرلوں بلکہ آگے ان کے پوتوں، پڑپوتوں، نواسوں، نواسیوں اور دوسرے تمام لوگوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔

تو بی بی صاحبہ سے بھی ہمیں یہی اختلاف تھا ورنہ ہم تو سو جان سے قربان ہوتے ہیں ان کے والد پر اگر ہمیں اعتبار ہوتو ہم خوشی سے ان کے لیے مرجاتے۔ ایسا کون آدمی ہے جو اتنی قربانی کرتا ہے کہ جس کو بھٹو نے کہا ہو کہ میں تمہارے جلسے پر پیسے لگاؤں گا۔ تقریر کروں گا مگر تم میرے ساتھ آجاؤ مگر میں نے کہا۔ ''صاحب میں آپ کے ساتھ متفق نہیں ہوں۔'' میاں محمود علی قصوری شیخ رفیق اور میری پارٹی کے دوسرے لوگ چلے گئے جن میں سے کوئی ایم پی اے ہوگیا کوئی اسپیکر ہوگیا اور کوئی وزیر ہوگیا مگر میں اصولوں پر ڈٹا رہا۔ ایک روز میری بیوی نے کہا۔ ''فلاں صاحب جو کبھی چھت پر کھڑے ہوکر تمہارا کرتہ سکھایا کرتے تھے وہ بہت بڑے عہدے پر ہوگئے ہیں مگر تم وہیں کے وہیں ہو۔''

میں نے بیوی سے کہا۔ ''تم فکر مت کرو۔ جو عزت مقام انہیں ملا ہے وہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔'' پھر آپ نے دیکھا کہ سب کی واپسی ہوگئی لیکن ہمارا مقام وہی ہے جو ہم سے کوئی چھین ہی نہیں سکتا۔

آفاقی: جالب صاحب! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

حبیب جالب: ضلع ہوشیار پور کے گاؤں پٹھاناں سے ہمارا تعلق ہے مگر وہاں مالکان دوسرے تھے۔ ہمارا شمار تو صرف رعایا میں ہوتا تھا۔ ہمارے ابا جوتے بنایا کرتے تھے۔ اب ہم پاکستان میں رہتے ہیں۔ خاص طور پر پنجاب سے ہمیں بڑی محبت ہے۔ شاید اسی لیے بھٹو کے زمانے میں ایک مرتبہ ہم پنجاب سے الیکشن میں کھڑے ہوگئے تھے۔ لوگ بھاری تعداد میں میرے جلسوں میں آیا کرتے تھے۔

آفاقی: مگر آپ کو ووٹ نہیں ملے تھے؟

حبیب جالب: کچھ لوگوں نے بھٹو سے کہا کہ جالب کے مقابلے میں کوئی بندہ کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ بھٹو نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ ہمارے ٹکٹ پر کھڑا ہوجائے تو ہم اس کے مدمقابل کو بٹھادیتے ہیں۔ مگر آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی غلط کام کے لیے سمجھوتا نہیں کیا۔ اس الیکشن میں مجھے ساڑھے سات سو ووٹ ملے تھے۔ جن میں احمد ندیم قاسمی اور محمد طفیل کا ووٹ بھی شامل تھا۔ اقبال احمد خان نے بھی کہا کہ میں تمہارا ووٹر ہوں۔ میں نے کہا تم بھی میرے ممبر بن جاؤ۔ میں نے اپنی ایک زبانی کلامی پارٹی بنادی تھی جس کی نہ پرچی تھی اور نہ کوئی چندہ تھا۔ چنانچہ وہ ممبر بن گئے

لیکن پھر میں نے فلیٹی ہوٹل میں انہیں معطل کردیا۔ میں نے ان سے کہا۔ بھئی اب تمہاری خطائیں بہت بڑھ گئی ہیں حکومت کے حق میں تمہارے بہت زیادہ بیان آنا شروع ہوگئے ہیں اس لیے میں نے تمہیں معطل کیا۔

آفاقی: جالب صاحب! ہم نے اپنی بات ''دستور'' سے شروع کی تھی۔ آپ نے اس سیاسی موضوع پر جو لکھا کیا اس کی پاداش میں آپ کو سزائیں بھی بھگتنا پڑیں؟

حبیب جالب: ایوب خان کے زمانے میں نواب کالا باغ گورنر تھے۔ انہوں نے ایس پی سے کہا۔ ''اگر تم آج جالب کو نہیں پکڑوگے تو میں تمہیں معطل کردوں گا۔ میں ان دنوں کراچی میں تھا اور مادرِ ملت کے جلسے میں، میں نے کچھ اشعار پڑھ دیے تھے۔

آفاقی صاحب! یہ آپس کی بات ہے شوکت حسین رضوی ہمارے بڑے اچھے دوست اور سرپرست تھے۔ ایس پی ان کے دوست تھے۔ انہوں نے شوکت حسین رضوی سے کہا جالب سے کہو کہ وہ کہیں کراچی میں ہی قیام کرلیں۔ شوکت حسین رضوی اس مقصد کے لیے مجھے ٹیلی فون کرتے رہے مگر ٹیلی فون نہیں ملا اور میں وہاں آگیا اور پھر واپس بھی چلا گیا۔

ایک روز میں کافی ہاؤس سے نکل رہا تھا تو چند افراد میرے پاس آئے ایک تو انسپکٹر تھا۔ اس کے ساتھ دو تین آدمی اور بھی تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ سے بات کرنا ہے۔ میں نے کہا آپ کے پاس کوئی وارنٹ یا سمن وغیرہ ہیں؟ کہنے لگے۔ نہیں ویسے ہی آپ کو ذرا تھانے لے جانا ہے۔ وہاں آپ کے پاسپورٹ وغیرہ کا مسئلہ ہوگیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ پاسپورٹ تو میرے پاس ہی ہے۔ اس پر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے کہ جی بس ایسے ہی ایک مسئلہ ہے۔ میں نے ان سے کہا پھر تو مجھے اپنے وکیل سے پوچھنا ہوگا۔ میرے وکیل محمود علی قصوری تھے۔ انسپکٹر نے کہا کہ ہم آپ کو وہیں لیے چلتے ہیں۔ میرے ساتھ چار پانچ آدمی اور بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے جیپ میں بٹھایا۔ ادھر ایک پولیس سرجن سے شراب نوشی کا سرٹیفکیٹ لیا اور مجھے تھانے لے گئے۔ اتنے میں متعلقہ تھانیدار آگیا۔ وہ میرا پاسپورٹ دیکھ کر کہنے لگا۔ ''پاسپورٹ تو ٹھیک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر درست ہے تو مجھے واپس لوٹا دیجیے اور مجھے گھر جانے کی اجازت دیجیے۔''

کہنے لگا۔ ''جناب اجازت کیسی۔'' دراصل پاسپورٹ سے انہوں نے میری ولدیت دیکھنا تھی جو کہ مقدمہ بنانے کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے۔ اس موقع پر وہاں موجود ایک اے ایس آئی نے کہہ ہی دیا۔ ''بھئی آپ تو ہماری وردیاں اتروانے لگے تھے۔ ہم نے تو آپ کو قطعی نہیں چھوڑنا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا پروگرام ہے؟''

کہنے لگے۔ ''اب تو آپ جیل جائیں گے۔ میں آپ کو سن چکا ہوں اور آپ کا مداح ہوں مگر ہم آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔ آپ آرام سے بیٹھے رہیں اور جو کھانا پینا ہے وہ ہمیں بتائیں۔''

ادھر یہ عالم تھا کہ لوگ مجھے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ سارا مسئلہ یہ تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مادرِ ملت کے جلسے میں شریک ہوکر وہاں نظم نہ پڑھ سکوں۔

ایک صاحب جو آج کل بہت بڑے افسر ہیں۔ اس وقت پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر تھے جو مجھے لائل پور سے ہی جانتے تھے۔ انہوں نے پولیس والوں سے کہا۔ ''ہاں ہاں میں جانتا ہوں اسے۔ بڑا قاتل ہے۔ ڈاکے مارنے والا ہے۔ اسے چھوڑ دو میرے پاس۔'' چنانچہ پولیس والے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر انہوں نے بھی میرا تمسخر اڑایا مگر انہوں نے کسی حد تک مجھ پر مہربانی کی اور سی کلاس میں بڑے بڑے امیر امراء جو قاتل لوگ تھے ان کے ساتھ ٹھہرا دیا۔

آفاقی: سی کلاس میں قاتلوں اور ڈاکوؤں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

حبیب جالب: وہ مجھے بڑا کھانا کھلاتے تھے مگر وہ مجھے سنتے رہتے تھے۔ یہ شکایت ایک پولیس افسر تک پہنچ گئی۔ انہوں نے مجھے بلوا کر کہا۔ بھئی کیا آپ میری پیٹی اتروانا چاہتے ہیں آپ سارا دن ان کو اپنا کلام سناتے رہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ بھئی اگر یہ لوگ کہیں گے پھر میں تو انہیں اپنا کلام ضرور سناؤں گا۔ اس دوران میں وہاں جیل کے افسر بھی آگئے اور طے یہ پایا کہ آپ رات کو نو بجے صرف ایک گھنٹے کے لیے اپنا کلام سنا لیا کریں مگر سارا دن نہ سنایا کریں۔

آفاقی: شاید آپ کو ڈر ہوگا کہ اگر آپ نے نظمیں وغیرہ سنانے سے انکار کردیا تو کہیں یہی ڈاکو قاتل آپ کو مارنا شروع نہ کردیں۔ جالب صاحب! ایوب خان کے زمانے میں آپ نے ''دستور'' پر ایک نظم لکھی تھی ''میں نہیں

مانتا''۔ پھر یحییٰ خان کے دور میں ان کی تصویر سے خطاب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی جو کچھ دیر پہلے آپ نے ہمیں سنائی۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کا دور آگیا۔ ان کی حکومت میں آپ نے کیا لکھا تھا؟

حبیب جالب: بھٹو صاحب کے دور میں تو میں نے پوری کتاب لکھ دی تھی جس کا نام تھا ''ضبط'' کیوں کہ اسے ضبط تو ہونا ہی تھا اسی میں یہ نظم تھی ''لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو''۔ ایک نظم اور تھی ''بلوچستان جلتا ہے''۔

آفاقی: جالب صاحب! یہ تو خیر حکمران تھے لیکن ایک نظم جو آپ نے مس بے نظیر کے متعلق لکھی اس پر بھی بڑا شور و غل ہوا۔

حبیب جالب: جی ہاں! بے نظیر پر پہلے تو میں نے اس وقت نظم لکھی تھی جب وہ بیرون ملک سے واپس آئی تھیں اور لوگوں نے ان کی بہت پذیرائی کی تھی۔ میں ان کے محبوس ہونے پر بھی نظمیں لکھتا رہا۔ دراصل جو بھی جمہوریت کے لیے لڑتا ہے میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ یہی میری روایت ہے۔ نظم کے چند اشعار میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔ میں نے لندن میں ہی لکھی تھی نظم کچھ یوں تھی۔

ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے
پھیلے ہیں ہمت کے اُجالے ایک نہتی لڑکی سے

یہ نظم بے نظیر کی جمہوری جدوجہد کے موضوع پر لکھی تھی۔ میں ان کو سلام کرتا ہوں۔ میں مادرِ ملت کو بھی ان کے بھائی سے کم نہیں سمجھتا کیوں کہ مادرِ ملت کی جمہوریت کی جدوجہد بھی بہت بھرپور تھی۔ چنانچہ میں نے اس خاتون (بے نظیر) کو بھی اپنی نظموں میں ابھارا۔ لندن میں قیام کے دوران میں، میں نے وہاں کوئی ایسی نظم نہیں پڑھی جو بھٹو کے خلاف ہو اگر وہاں میں بھٹو کے خلاف بولتا تو لوگ سمجھتے کہ شاید یہ حکومت کی طرف سے یہاں آیا ہوا ہے۔ بہر کیف یہ نظم بے نظیر نے بھی پسند کی۔ وہ خود میرے گھر آئیں۔ نظم میں یہی بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اگر لوگوں کے کچھ مسائل حل کرنے ہیں تو وہ واشنگٹن کی جانب سے حل نہیں ہو سکتے۔ دراصل امریکا کی طرف سے ہی افغانستان کی لڑائی جاری ہے۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں کیوں کہ اس لڑائی میں امریکی کوئی نہیں مرتا۔ اس جنگ میں تو صرف پٹھان مرتے ہیں۔

نظم کے حوالے سے ہی بات کروں گا کہ وہاں جام ساقی آگئے۔ یہاں قید یہ تھی کہ پنجابی میں ہی گفتگو ہوگی۔ یہ نشست فلیٹی ہوٹل میں ہوگی۔ اب میرے لیے بڑی مصیبت ہوگئی۔ میرے پاس کاغذ بھی نہیں تھا۔ وہاں ہوٹل کاؤنٹر سے ایک چٹ میں نے لے لی اور وہیں پندرہ منٹ میں بیٹھے بیٹھے ایک نظم لکھ دی۔

نہ جا امریکا نال کوے
اے گل نہ دیویں ٹال کڑے
اینے ایس دھرتی دا لہو پیتا
اینے قتل آزادی نوں کیتا
اینے کٹوایا بنگال کوے!
نہ جا امریکا نال کوے
اے روس دے نال لڑاندا اے
ایویں لوکاں نوں مرواندا اے
ساتوں تیرا بڑا خیال کوے
نہ جا امریکا نال کوے
گل ٹھیک ای کہندا ساقی وی
کدے چلا نہ جائے باقی وی
کر راکھی دیس سنبھال کوے
نہ جا امریکا نال کوے

اس نظم پر وہاں بڑا ہنگامہ ہوگیا۔ کچھ لوگ سامراج مردہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

آفاقی: اس نظم پر مس بے نظیر کا ردِعمل کیا تھا؟

حبیب جالب: انہوں نے تو یہی کہا تھا کہ حبیب جالب میرے بزرگ ہیں۔ میں ان کو اچھا شاعر مانتی ہوں۔ وہ جو بھی کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان میں اتنی جرأت ہونی چاہیے کہ وہ کسی کے سامنے آکر بات کہہ سکے۔ غیر موجودگی میں تو کبھی نعرے لگاتے ہیں۔ آزادی تو یہی ہونی چاہیے کہ اگر میں کسی کو برا بھلا کہتا ہوں تو دوسرا بھی مجھے برا بھلا کہہ سکتا ہے۔ میں یہی تو کہہ رہا ہوں کہ میری کتابیں ضبط ہو جاتی ہیں مگر دوسروں کی ضبط نہیں ہوتیں۔ یہ جو رائٹر ہیں یہ تو مجھے پولیس سے بھی بڑھ کر لگتے ہیں۔ انہوں نے کبھی میری کتاب کے ضبط ہونے پر احتجاج نہیں کیا بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ ایمانداری کی بات ہے کہ جتنا مجھے رائٹروں نے دکھ پہنچایا ہے اتنا پولیس والوں نے بھی نہیں پہنچایا۔ ایک جانب تو ان کا یہ عالم ہے کہ حبیب جالب سے بیٹھ کر ہاتھ ملاتے ہیں لیکن جب کوئی بیوروکریٹ آتا ہے تو یہ اپنی نشست سے اٹھ کر اس سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ ایسے فقیر و فقرا جو صوفی منش شاعر بنے پھرتے ہیں جنہوں نے تصوف کی چادریں اوڑھ رکھی ہیں ان سے مجھے سخت نفرت ہے۔

آفاقی: جی ہاں اگر مسئلہ انا کا ہے تو وہ ہر ایک کے ساتھ ہونی چاہیے؟

حبیب جالب: کم از کم مجھے تو کسی گورنر کے پاس پولیس ہی لے کر جائے گی میں تو نہیں جاتا۔

جب ایوب خان ریٹائرڈ ہوئے تو ایک مرتبہ انہوں نے مجھے یاد کیا۔ ہمارے ایک دوست ہیں چودھری جلیل جن کا تعلق گجرانوالہ سے ہے۔ وہ اکثر ایوب خان کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کہا۔ ''یار جالب ایوب خان کہتے ہیں کہ جالب کو میرے پاس لاؤ۔ میں ان سے وہ نظمیں سنوں گا جو انہوں نے میرے خلاف لکھی تھیں۔'' اب وہ ایسی نظمیں تو نہیں تھیں جو سنی نہ جاسکتی ہوں۔ ایوب خان نے چودھری جلیل سے کہا کہ میں حبیب جالب کی خدمت بھی کروں گا اور آنے جانے کا خرچ بھی برداشت کروں گا۔ میں نے جلیل صاحب سے کہا۔

''ٹھیک ہے ہم کسی روز چل کر ایوب خان کو نظم وغیرہ سنا دیں گے۔'' مگر بعد میں چودھری جلیل کو فرصت ہی نہ ملی اور ایوب خان کو موت نے گھیر لیا۔ شاید وہ مجھ سے یہی پوچھنا چاہتے ہوں گے کہ تم نے میرے خلاف نظمیں لکھیں اور مجھے اقتدار سے اتارا لیکن آفاقی صاحب آج میں آپ کے سامنے ایمانداری سے کہوں گا کہ نظمیں کسی کو اقتدار سے نہیں اتار سکتیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت ملکی بقا کے لیے بہت ضروری ہے۔ عدم جمہوریت کی وجہ سے مشرقی پاکستان بھی ہمارے ہاتھ سے چلا گیا۔

آفاقی: جالب صاحب! بات سے بات نکلتی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں قلم کی طاقت سے یا نظموں وغیرہ سے انقلاب لایا جاسکتا ہے یا حکومت بدلی جاسکتی ہے؟

حبیب جالب: اس سے تحریک ضرور ہوتی ہے۔ حوصلے برقرار رہتے ہیں۔ بیداری کی ایک لہر پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہاں صورت کچھ ایسی ہوئی کہ 1947ء کے ساتھ ہی مارشل لا کی ایک صورت بن گئی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا آدمی سہروردی تھا۔ اسے بھی برداشت نہیں کیا گیا تھا۔ وہ تو بدقسمتی کی ایک لمبی داستان تھی لیکن میں شاعروں اور ادیبوں کی بات کرتا ہوں۔ بھٹو کے زمانے میں جب بلوچستان میں ایک منتخب حکومت کو ختم کیا گیا تو ان ادیبوں اور شاعروں نے اس کی مذمت نہیں کی۔ بڑے سے بڑے شاعر بھٹو کے ہمنوا رہے ہیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑے شاعر ایوب خان کے مشیر رہے ہیں۔ انہوں نے اس زمانے میں بھی مشاورت فرمائی۔ پھر مشاورت اور ملازمت دونوں فرماتے چلے گئے۔

آفاقی: ایوب خان سے تو آپ کی ملاقات نہ ہوسکی مگر بھٹو صاحب سے آپ کی ملاقات ان کے اقتدار کے زمانے میں ہوئی یا نہیں؟

حبیب جالب: ان کے حکومت میں آنے سے پہلے ہوئی تھی۔ بھٹو صاحب نے میرا نام تو سن رکھا تھا اپوزیشن شاعر کی حیثیت سے وہ مجھے پہلے سے ہی جانتے تھے۔ اقتدار میں آنے سے پہلے بھی وہ مجھے سننا چاہتے تھے۔ انہوں نے عارف افتخار سے کہا۔ ''بھئی کیا ہم اپوزیشن شاعر کو نہیں سن سکتے؟''

آفاقی صاحب: جب بھٹو صاحب وزیر تھے کیا اس وقت آپ کی ان سے ملاقات ہوئی تھی؟

حبیب جالب: پہلے نہیں تھی لیکن جب وہ وزارت چھوڑ کر آئے تب ملاقات ہوئی تو اس موقع پر ہم نے ایک نظم لکھ دی۔

دستِ خزاں میں اپنا چمن چھوڑ کے نہ جا
آواز دے رہا ہے وطن چھوڑ کے نہ جا

آغا شورش کاشمیری

کچھ تیری ہمتوں پہ یہ الزام آئے گا
مانا کہ راستہ ہے کٹھن چھوڑ کے نہ جا
اے ذوالفقار تجھ کو قسم ہے حسینؓ کی
کر احترام رسم کہن، چھوڑ کے نہ جا

یہ نظم گیارہ بارہ اشعار پر مشتمل تھی جو نوائے وقت کے بیک پیج پر شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کی وجہ سے بھٹو کے دل میں میرے ساتھ ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے فلیٹی ہوٹل سے مجھے ٹیلی فون کیا کہ آپ میرے پاس آسکتے ہیں؟

میں نے کہا: ''جناب میں آپ کے پاس نہیں آسکتا اگر آپ کو بہت زیادہ شوق ہے تو آپ میرے پاس کافی

ماڈل ٹاؤن پارک

ہاؤس آجایئے۔"

بھٹو صاحب نے کہا۔ "اچھا میں خود آتا ہوں۔" میں نے کافی ہاؤس میں بیٹھے نوجوانوں سے کہا۔ "بھٹو صاحب آرہے ہیں اس لیے پروٹوکول کا خیال رکھنا اور دائرہ ادب میں رہتے ہوئے سوال کرنا۔ آپ کے جو جی میں آئے ان سے پوچھیں مگر آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔"

چنانچہ بھٹو صاحب آگئے۔ لوگوں نے ان سے بہت سے سوالات بھی کیے پھر وہ میری طرف آئے اور کہنے لگے۔ "مجھے دست خزاں والی نظم سنائیں۔" میں نے کہا وہ نظم تو ختم ہوگئی۔ اس کی افادیت تو چلی گئی کیوں کہ آپ حکومت سے چلے گئے۔ جب کالا باغ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر آپ سے کہا چلے جاؤ تو آپ چلے گئے لہٰذا اب میں وہ نظم سنانا خوشامد سمجھوں گا اور خوشامد مجھے پسند نہیں ہے۔

وہ کہنے لگے۔ "ملاقات تو ہوگئی اگر اب بلاؤں تو آؤ گے؟" میں نے کہا۔ "اب آپ بلائیں گے تو میں ضرور آؤں گا۔"

پھر کچھ عرصے بعد لاڑکانہ میں ایک مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے منتظمین میں سے دو شاعر بھٹو صاحب نے لے لیے ان میں ایک میں تھا اور دوسرے فیض صاحب تھے۔ وہاں معاہدہ تاشقند پر بھٹو سے تبادلۂ خیال بھی ہوا چونکہ میں ایوب خان کے زیرِ عتاب رہا تھا اس لیے میں غیر جانبدار ہو گیا۔ ہماری نیشنل عوامی پارٹی نے معاہدہ تاشقند کے حق میں قرارداد بھی پاس کی تھی۔ بھٹو صاحب مجھ سے پوچھتے تھے کہ آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔ ان کا خیال تھا چونکہ جالب ایوب خان کی مار کھا چکا ہے اس لیے یہ میرا ساتھ دے گا۔ میں نے کہا۔ "صاحب آپ دونوں (فیض، بھٹو) آپس میں بات کریں میں غیر جانبدار ہوں۔ صرف سننے پر ہی اکتفا کروں گا۔" یوں میں نے اپنی جان بچائی۔

پھر ایک دفعہ میں کراچی گیا اور جنگ کے ابراہیم جلیس سے ملا۔ وہیں سے میں نے ذوالفقار علی بھٹو کو فون کیا (ان دنوں وہ اقتدار میں تھے) بھٹو صاحب نے نوکروں سے کہا۔ "وہ اندر ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو وہ باہر تھے آتے ہی اندر ہو گئے۔ ان سے کہو حبیب جالب یاد کر رہے ہیں۔" اس وقت وہ غسل خانے میں تھے میرا پیغام سن کر تولیہ لپیٹ کر ہی باہر آگئے اور کہنے لگے کہو، میں نے کہا۔ "میں جنگ اخبار سے بول رہا ہوں" کہنے لگے آجاؤ میں نے کہا ابھی نہیں رات کو آؤں گا۔ آپ تیار رہیے گا۔ ابراہیم جلیس کہنے لگا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اسے بھی شوق تھا ملنے کا میں نے بھٹو سے کہا۔ "ابراہیم جلیس بھی ساتھ آئے گا۔" کہنے لگے۔ "اسے بھی لے آؤ۔"

مگر جب بھٹو صاحب کے پاس جانے لگے تو ابراہیم جلیس ڈر گیا اور جانے سے انکار کر گیا۔ پھر میں ایسٹرن اسٹوڈیو گیا تو وہاں مجھے طارق عزیز بھی ملے۔ انہوں نے کہا۔ "آج شام کو تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "بھئی آج تو میں بھٹو کا مہمان بن رہا ہوں۔" طارق عزیز کہنے لگے۔ "مجھے بھی ساتھ لے چلو بھٹو سے میرا تعارف ہی کروا دینا۔" میں نے اسے کہا۔ "واپس تمہیں

مجھے اسی لال کار میں لانا ہوگا۔ بھٹو سے ملنے کی یہ قیمت ادا کرنا ہوگی۔ چنانچہ میں نے طارق عزیز کو بھٹو صاحب سے ملوا دیا اور کہا کہ اب آپ سیاسی اور فلمی ہیرو آپس میں گفتگو کریں۔"

پھر بھٹو صاحب نے مجھے طالب مولیٰ سے ملوایا اور کہا کہ انہیں کچھ اشعار سناؤ میں نے اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق اشعار سنانا شروع کر دیے۔

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا!
لا الہ الا اللہ

میرے اشعار سن کر طالب مولیٰ چلے گئے۔ بھٹو یہ سن کر چیخ پڑے۔ "ارے یہ اشعار کس کو سنا دیے۔ وہ تو سندھ کا سب سے بڑا لینڈ لارڈ تھا۔"

میں نے کہا تو کیا ان کے سامنے یہ کہنا چاہیے تھا کہ......

کھیت وڈیروں کو دے دو؟

میں نے کہا۔ "بھٹو صاحب میں تو "لے لو" کا آدمی ہوں۔ "لے لو" ہی کہوں گا۔ وہ بات ٹالتے ہوئے کہنے لگے۔ "اچھا اچھا ٹھیک ہے۔"

یوں بھٹو صاحب سے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ بھٹو صاحب نے ابھی اپنی پارٹی نہیں بنائی تھی۔ ایک مرتبہ ہم فلیٹی ہوٹل سے میاں محمود علی قصوری کے گھر جا رہے تھے۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں نیشنل عوامی پارٹی کا سیکریٹری جنرل بنا دیا جائے میں نے کہا۔ "بھٹو صاحب! ایسا فی الحال تو نہیں ہو سکتا آپ سال دو سال اسی پارٹی کے ساتھ رہیں گے اور چھوٹے صوبوں سے اس قسم کے عہدوں کے لیے جو گنجائش نکلے گی تو اس معاملے پر غور کیا جائے گا مگر بھٹو صاحب جلدی میں تھے۔ وہاں محمود علی قصوری کے گھر میں پی آر او چائنا لوگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو گھاس بھی نہ ڈالی مگر میں انہیں مقصد پر لانا چاہتا تھا۔ میں نے بھٹو صاحب سے کہا۔ "جناب میرا سر دکھنے لگا ہے میں تو چلا۔" انہوں نے کہا۔ "نہیں جالب ابھی بیٹھو۔" محمود علی قصوری بھی میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے پھر راستے میں چلتے چلتے بھٹو نے کہا۔ "جالب صاحب! آپ کی پارٹی کے دو

دائیں سے بائیں گل خان سائیر، حبیب جالب، عبدالکریم ساروش، اور علی احمد کرد

حصے ہو گئے ہیں۔ ایک پی آر او چائنا اور دوسرا پی آر او ماسکو ہے۔ اب میں کیا کروں۔" میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ اب آپ اپنی ایک پارٹی بنائیں۔ خیر انہوں نے پارٹی بنا لی۔ ہماری نیشنل عوامی پارٹی پنجاب کے جو لوگ تھے انہوں نے یہ بات صیغہ راز میں رکھی کیوں کہ اس سے صرف دو دن پہلے ایک مرحوم بزرگ سیاستداں نے کہا تھا کہ ولی خان کو چھوڑنا اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف ہے مگر صرف دو دن بعد ہی وہ سیاستداں پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے پھر جب بھٹو لاہور آئے تو احمد رضا قصوری نے مجھے راستے میں با آواز بلند کہا۔ "ارے جالب! محمود علی قصوری تو پیپلز پارٹی میں آگئے ہیں تم کب آؤ گے؟" میں نے کہا۔ "کیا بکواس کرتے ہو۔ کیا کبھی سمندر بھی ندی میں گرے ہیں۔" محمود علی قصوری صاحب نے کہا۔ "بھئی چلاؤ مت ہم تو آگئے ہیں۔" پھر وہ مجھے کشاں کشاں بھٹو صاحب کے پاس لے گئے اور ان سے کہا جالب صاحب سینٹرل کمیٹی کے ممبر ہیں انہیں قومی اسمبلی کی نشست کے لیے ٹکٹ دینا ہے۔ بھٹو صاحب نے جواب دیا۔ "آپ اس کی سفارش کیوں کرتے ہیں؟ یہ میرا دوست ہے میں اس کے جلسے میں جاؤں گا۔ روپیا لگاؤں گا اور سب کچھ کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "صاحب میں آپ کی پارٹی میں نہیں آرہا" میرے یہ الفاظ سن کر بھٹو صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ بات بدلنے کے لیے کہنے لگے۔ "اچھا اچھا ٹھیک ہے۔" انہیں اس بات کا صدمہ ہوا کہ مجھے ایک شاعر سا آدمی جواب دے رہا ہے جب کہ بڑے بڑے لوگ ٹکٹوں کے لیے میرے پیچھے آرہے ہیں۔ بہر طور بات ختم ہوگئی۔

میں نے تو ان کی صاحبزادی سے بھی کہا تھا کہ میرا نظریہ صحیح ہو یا غلط میرا اپنا تو ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ روٹی،

کپڑا اور مکان کا مسئلہ اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ سسٹم تبدیل کر دیا جائے۔

آفاقی: جالب صاحب کیا بھٹو صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد بھی آپ کی ان کے ساتھ کوئی ملاقات ہوئی؟

حبیب جالب: ایک مرتبہ جب انہوں نے جنرل رحیم گل کو نکالا تو میں نور خان کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے نور خان سے کہا۔ ''آپ تو بھٹو صاحب سے ملیں گے مگر میں نہیں ملوں گا۔'' چنانچہ میں ذرا دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ غالباً یہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل پنڈی کی بات ہے۔ بھٹو صاحب نے نور خان سے کہا کہ میں نے گل حسن اور رحیم کو نکال دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کہیے کیا حال ہے؟ میں ولی خان سے ملنے جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''خوشی سے جائیے۔'' اسی طرح ایک مرتبہ وہ اسمبلی کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ بھٹو صاحب نے وہاں بھی آگے بڑھ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔

شورش کاشمیری کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک دفعہ ان سے میرا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ بہرکیف اس کے بعد تعلقات اچھے ہو گئے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ شورش بھٹو صاحب کو ٹیلی فون کر رہے تھے۔ بات کرتے کرتے ویسے ہی انہیں کچھ یاد آ گیا۔ انہوں نے ٹیلی فون پر ہی بھٹو صاحب سے کہا۔ ''سر آپ کا پرانا دوست حبیب جالب میرے سامنے بیٹھا ہے۔'' اس پر بھٹو نے کہا۔ ''وہ تو میرے خلاف نظمیں لکھتا ہے۔ مجھے گالیاں دیتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ شورش کاشمیری نے کہا۔ ''جناب وہ تو شاعر کی ایک ادا ہوتی ہے۔ فضا ہوتی ہے۔ نظام ہوتا ہے۔ پیام ہوتا ہے، سلام ہوتا ہے۔ چنانچہ کشمیری صاحب نے حسب عادت جب اچھی خاصی لفاظی کر دی تو بھٹو صاحب نے ان سے کہا۔ ''جالب کو میرا اسلام کہو۔''

میں نے کہا۔ ''وعلیکم السلام کہہ دو۔''

بھٹو صاحب نے شورش کاشمیری سے کہا۔ ''جالب کو بھی ساتھ لاؤ۔''

(بھٹو کو صیغہ واحد میں گفتگو کرنے کی عادت ہو گئی تھی وہ شورش کاشمیری کو بھی شورش کہتا تھا) شورش صاحب نے کہا۔ ''جناب میں جالب کو آپ کا پیغام دے دیتا ہوں کیوں کہ وہ نیپ سینٹرل کمیٹی کا ممبر ہے۔ رابطہ ہوا تو لے آؤں گا۔'' شورش کاشمیری نے جب ٹیلی فون بند کر دیا تو میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کو یہ نہیں کہنا تھا کہ میں لے آتا ہوں کیوں کہ میں نہیں جانا چاہتا۔'' شورش کہنے لگا۔ ''بھٹو نے مجھے دو مرتبہ کہا ہے کہ جالب میرے برے وقتوں کا دوست ہے۔ میں اسے کچھ دینا لینا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ انکار کر کے وہ میری توہین نہ کر دے۔'' میں نے کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ وہ ایسا سوچتے ہیں اور میں یہی کروں گا۔''

بات یہ ہے کہ ہر حکومت نے بڑے کارندے بھیجے مگر مجھے فخر ہے اور میں اس بات پر اپنی عزت محسوس کرتا ہوں کہ میں نے عوام کے خلاف کسی سازش میں حصہ نہیں لیا۔

آفاقی: بھٹو صاحب اور آغا شورش کے باہمی مراسم کیسے تھے؟ میری مراد نظریاتی اور ذاتی تعلقات سے ہے؟

حبیب جالب: ختم نبوت کے سلسلے میں شورش ان کے پاس جاتے رہتے تھے اور ان سے کچھ منوا بھی لیا تھا۔

آفاقی: آغا شورش کاشمیری کی ان کے بارے میں رائے کیا تھی؟

حبیب جالب: بھٹو صاحب کا ان کے پاس آنا جانا بھی رہتا تھا۔ ویسے آغا شورش کاشمیری کی بڑی خدمات ہیں۔ انہوں نے تقسیم سے پہلے بھی بڑی مار کھائی تھی۔ انہوں نے تنہا اپنا اخبار ''چٹان'' بھی کامیابی سے چلایا۔ نظم و نسق پر بھی انہیں بڑا قدرتی عبور تھا۔ مقرر، صحافی، ادیب، شاعر سبھی کچھ تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے بعد شورش کاشمیری اس قبیل کا آخری تھا۔ اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔

آفاقی: جالب صاحب! آپ کے پاس تو خیالات اور یادوں کا ایک دریا ہے۔ شروع میں، میں نے آپ کی ایک غزل کا حوالہ دیا تھا کہ

اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوق آوارگی

اس کے بعد آپ کی شاعری کا یہ انداز بھی تھا

زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

آپ کی غزل کا ایک اپنا مخصوص انداز تھا۔ پھر وہاں سے آپ آ گئے۔

میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

میں یہ جاننا چاہوں گا کہ یہ تبدیلی آپ کے اندر کیسے رونما ہوئی؟

حبیب جالب: ''برگ آوارہ'' کی شاعری دراصل شاخ سے ٹوٹے ہوئے ایک پتے کی شاعری ہے۔ ہم جب ریل سے پاکستان آئے تو ہمارے ذہن میں بڑے بڑے خواب تھے جو ہم نے دیکھ رکھے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وطن

جا کر یہ خواب پورے ہوں گے مگر یہاں آ کر ایک ایک خواب بکھر گیا۔ ''برگِ آوارہ'' میں اسی رویے کا ایک عکس موجود ہے۔ وہ بھی دھیمے لہجے کی شاعری ہے مگر ہے سیاسی۔ مثلاً

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں

یہ بھی ایک عدم جمہوریت کے بارے میں شعر ہے یا پھر

اپنوں نے وہ رنج دیے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں

مقصد یہ کہ شاعری کے میدان میں ماضی میں جو کچھ میں نے لکھا وہ میرے رومانی جذبات نہیں تھے کہ جس میں باقاعدہ کوئی خاتون انوالو ہو۔ ''آوارہ پتے'' کی شاعری بھی کچھ ایسی ہی تھی جو کراچی سے شروع ہوئی اور پھر ہم سارے پنجاب سے سر ٹکراتے رہے۔

سب سے پہلے میں نے روزنامہ ''آفاق'' میں پندرہ بیس دن تک پروف ریڈنگ کا کام کیا۔ جب میں نے تنخواہ پوچھی تو انہوں نے پچھتر روپے بتائی۔ پھر میں نے اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا جہاں انہوں نے میری فیس معاف کر دی لیکن رہنے کے لیے لاہور میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ سید اعزاز شاہ گیلانی جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لکھتے تھے ان کے ہاں میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ان کا گھر ہیرا منڈی میں ایسی جگہ پر واقع تھا کہ جہاں بائیاں وغیرہ بیٹھتی تھیں۔ ''آفاق'' میں کام کرنے کے بعد جب رات کو وہاں جاتا تھا تو پولیس بھی ہر روز مجھے پکڑ لیا کرتی تھی۔ میں ان سے کہتا تھا۔ ''بھائی میں تو یہاں رہتا ہوں''۔ مگر وہ میری بات کو جھوٹ سمجھتے تھے۔ پھر پولیس مجھے گھر چھوڑنے آیا کرتی تھی۔ بابا جاگ رہا ہوتا تھا اور وہ اس بات کی تصدیق کرتا تھا کہ یہ لڑکا یہیں رہتا ہے مگر جب پندرہ بیس دن یہی ہوتا رہا تو بابے نے ہاتھ باندھ دیے۔ بابا کے لڑکے سے میری یاری تھی۔ وہ جو آج کل سیکریٹری وغیرہ ہے۔ اس نے بھی سفارش کی مگر بابا نے کہا۔ ''بیٹا میں بیمار رہتا ہوں رات کو اٹھ نہیں سکتا لہٰذا تم کوئی اور انتظام کر لو۔'' اس وقت میری تنخواہ صرف پچھتر روپے تھی جس میں کرائے کا مکان لے کر رہنا بہت مشکل تھا۔ بہرکیف اس طرح میرا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا اور میں لاہور چھوڑ کر کراچی چلا گیا۔

اب کس پہ ستم تم نئے ایجاد کرو گی

لاہور کی گلیو! مجھے تم یاد کرو گی

اس طرح ماتم کرنے کے بعد میں کراچی چلا گیا۔ اس کے بعد میں دوبارہ کچھ عرصے بعد لاہور آیا تھا۔

تنویر نقوی

آفاقی: علاؤالدین اور تنویر نقوی آپ کی بڑی باتیں کیا کرتے تھے۔ دراصل ان کے ذریعے سے ہی آپ سے میرا غائبانہ تعارف ہوا تھا۔

حبیب جالب: تنویر نقوی ایسے انسان میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ وہ جتنا بڑا شاعر تھا اتنا بڑا انسان بھی تھا۔ اس کے کلام میں بڑا درد تھا۔ وہ سب سے پہلا شاعر تھا جس نے فلمی شاعری کو ادبی رنگ دیا۔ مثلاً

آ، رات جا رہی ہے

یوں جیسے چاندنی کی بارات جا رہی ہے

آفاقی: آپ کی شاعری میں جو عوامی، انقلابی اور سیاسی رنگ آیا۔ آپ اس ضمن میں کسی شاعر سے بھی متاثر ہوئے یا خود بخود یہ جذبہ رونما ہو گیا؟

حبیب جالب: اس زمانے میں جاں نثار اختر، مجروح، مجاز اور جگر صاحب تھے جن کا کلام مجھے اچھا لگتا تھا۔ پھر فیض صاحب تھے مگر جب میں نے نذیر اکبرآبادی کو پڑھا تو ان کے اندر چھپا ہوا ایک زبردست عوامی شاعر نظر آیا۔ مثلاً ان کی نظم

جب لاد چلے گا بنجارہ

آفاقی: یا پھر ''آدمی نامہ''، سو ہے وہ بھی آدمی۔

جالب صاحب بہت سے لوگ تو آپ کو شاعر ہی نہیں مانتے۔ آپ کی سیاسی شاعری کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ یہ تو ایک وقتی جذباتی اور نعرے بازی کی شاعری ہے۔ یہ نہ تو خالص شاعری ہے اور نہ ہی دیرپا ہے۔ یہ تو محض نعرے بازی ہے۔

حبیب جالب: مجھے ان لوگوں کے خیالات سے کوئی

پریشانی نہیں ہے کیوں کہ میں شاعری اپنے لیے اور اپنے خیالات ونظریات کو پھیلانے کے لیے کرتا ہوں۔ جو سامعین مجھے میسر آئے ہیں۔ اتنے کسی اور شاعر کو میسر نہیں آئے۔

آفاقی: جو کچھ آپ لکھ رہے ہیں کیا آپ اس کو شاعری سمجھتے ہیں؟

حبیب جالب: جی ہاں! میں تو اسے شاعری ہی سمجھتا ہوں۔ میں ان کو شاعر ہی نہیں سمجھتا کہ جن کی شاعری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سب لوگ اپنی شاعری پر خود ہی داد دیے چلے جاتے ہیں۔ مفہوم کا موتی اس میں ہوتا ہی نہیں ہے۔

آفاقی: محض الفاظ کی جادوگری ہوتی ہے؟

حبیب جالب: جادوگری بھی نہیں ہے۔ غالب سے زیادہ جادوگری کون کر سکتا ہے مگر اس میں کم از کم مفہوم تو تھا۔ شعر کی تہہ میں مفہوم تو ہونا چاہیے۔ البتہ یہ ہے کہ میں میراجی، مجید امجد اور فیض کو ان شعرا سے اچھا سمجھتا ہوں۔

یہ کون لوگ ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں، کیا یہ فراق صاحب سے بڑے لوگ ہیں؟ کیا یہ معترضین فراق سے بڑے ہیں؟ ہماری غزل سن کر فراق صاحب نے کہا تھا۔ اب ہم مر بھی جائیں گے تو ہمیں افسوس نہیں ہوگا۔ مجھے تو وہ اکثر سنتے ہی رہتے تھے۔ اسی طرح جگر مراد آبادی نے بھی اکثر مشاعروں میں میری تعریف کی۔ کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ چراغ حسن حسرت نے میرا پورا مطلع پڑھا تھا۔ کیا یہ معترضین ان سے بڑے ہیں؟ کیا خیال ہے آپ کا؟

آفاقی: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟

حبیب جالب: پھر دفع کیجیے ان کو۔

آفاقی: جالب صاحب جب آپ نئے نئے لاہور آئے تھے اور شاعری کا آغاز کیا تھا تو بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ جالب صاحب تو ترنم کے بل پر شہرت حاصل کر رہے ہیں؟

حبیب جالب: میں نے عرض کیا کہ میری ایک کتاب کے چار ایڈیشن صرف ایک مہینے میں بکے۔ کیا یہ سب ترنم کے بل پر تھا۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ پھر میری کتاب جو لندن میں چھپی اس کی تقریب رونمائی میں جس قدر لوگوں نے شرکت کی اس کی پہلے کوئی مثال ہی موجود نہ تھی۔ کسی ہندو یا انگلش شاعر کے لیے بھی کبھی اتنی پبلک نہیں آئی تھی۔

دراصل اس قسم کی باتیں کرنے والے چھوٹے لوگ ہیں۔ ان کی نظم کا عنوان لمبا مگر متن مختصر ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو خود ہی بڑا شاعر کہے جا رہے ہیں۔ میں نے فیض کے منہ سے کبھی خود اپنی تعریف نہیں سنی تھی۔ یہ لوگ کسی کی تعریف کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ غالب سے بڑے شاعر تو نہیں ہیں جو اپنے شاگردوں کو بھی کھل کر داد دیا کرتا تھا۔ یہ بڑے کمی اور خود غرض ہیں جو دوسرے شاعر کو سننا ہی نہیں چاہتے۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ ہے کہ میرے مخاطب میرا کلام خریدتے ہیں اور مجھے سنتے ہیں۔ اس لیے مجھے ان لوگوں کی کوئی پروا نہیں۔ میں نے ابھی جو چند اکابرین کے نام لیے ہیں۔ فیض، چراغ حسن حسرت اور جگر صاحب یہ لوگ ان سے تو بڑے نہیں ہیں۔

آفاقی: آپ کی شاعری۔ سیاسی ہے یا ادبی؟ ہم اسے بانٹ تو نہیں سکتے؟

حبیب جالب: آپ یہ بتائیں جس کو آپ میری سیاسی شاعری کہتے ہیں کیا اس میں زبان و بیان یا بحر کی غلطی ہے؟ کیا میری شاعری میں کوئی ایسا لفظ ہے جس نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سادہ ہونا تو کوئی عیب نہیں ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

یہ شعر کہنے والے کا بھی ایک مقام ہے۔ جس نے بچوں کے لیے ایسی ایسی نظمیں لکھیں۔ میرے پڑھنے والے 99 فیصد عوام کی زبان تو اسی قسم کی ہے۔

آفاقی: آپ کی زبان کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے میں تو اس کے موضوعات کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔

حبیب جالب: اصل قصہ یہ ہے کہ جب ان کو کوئی سنتا نہیں ہے تو پھر یہ اس قسم کی فضول تاویلیں کرتے ہیں جب انہیں کوئی نہیں پڑھتا تب یہ اس قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

آفاقی: جالب صاحب! ایک تو آپ کی تسلیم شدہ حیثیت یہ ہے کہ آپ شاعر ہیں اب کچھ عرصے سے آپ نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ آپ اسے اپنی شاعری کی Extention سمجھتے ہیں یا سیاست کو اپنا ایک الگ شعبہ سمجھتے ہیں؟

حبیب جالب: کوئی بھی بندہ سیاست سے الگ نہیں ہے جو زندگی گزار رہا ہے اس کا سیاست سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ فرانس کے شاعر سارتر کا کہنا ہے کہ اگر آپ کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تو پھر میرا ابھی آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا غالب کا سیاست سے تعلق نہیں تھا؟

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

یہ شاعر ایسے ہیں جن کی راحت میں جان ہوتی ہے۔

یہ کام کر نہیں سکتے۔ یہ لوگوں کو شاعری میں الجھائے رکھتے ہیں۔ یہ تو میرے ساتھ دو قدم بھی نہیں چل سکتے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ وہ عامی ہے۔ عوامی ہے۔ غیر مستند ہے۔ ان کی جو تنقید نظیر اکبر آبادی کے لیے تھی وہی میرے لیے ہے۔

آفاقی: آپ نے پاکستان میں بڑے سیاستدانوں سے ملاقاتیں بھی کی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ متاثر آپ کو کس نے کیا؟

حبیب جالب: میں جمہوریت کی وجہ سے تقریباً ہر سیاستداں کے ساتھ رہا ہوں۔ جمہوریت ایک ایسی لائن ہے جس میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب وہ حکمران تھے تب وہ جمہوریت کو قتل کرتے رہے مگر جب علیحدہ ہوتے ہیں تو ہم لوگوں کو یاد فرمانے لگتے ہیں۔ پاکستان میں اپوزیشن کی بنیاد ہی سہروردی صاحب نے رکھی تھی۔ پھر وہ حکمراں بن گئے۔ مولانا بھاشانی تو تھے ہی عوامی آدمی۔ ان کا اپنا اسٹائل تھا۔

آفاقی: جالب صاحب! آپ کو پاکستان کا سیاسی مستقبل کیسا نظر آرہا ہے؟

حبیب جالب: ہم نے اپنے آباؤ اجداد اور رشتے داروں کی جانوں کو قربان کر کے یہ ملک بنایا تھا مگر یہاں آکر ہمیں جمہوریت بھی نصیب نہ ہوئی۔ میں اس ملک میں پندرہ مرتبہ قید کیا گیا ہوں۔ میرے رزق کے سارے سرچشمے بند کر دیے گئے اگر یہ فلم والے مجھے کام نہ دیں تو میں کہاں سے کھاؤں۔ میں کہتا ہوں صرف وعدۂ جمہوریت پر کوئی مزدور یا کسان اپنے بچے کیوں مروا دے۔ اب یہ Amendment کا لفظ کسان کی سمجھ میں نہیں آتا اس کا یہ ترجمہ کرتے ہیں ”کہ ترامیم کی جاتی ہے“۔ قانون کی بالادستی۔ اس قسم کے الفاظ سن کر کسان دیکھنے لگتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کہیں سے روٹی کپڑا آتا ہی نہیں، کہیں مکان کی بات نہیں ہوتی۔ اب بھٹو کی صاحبزادی کہہ رہی ہیں کہ ہم Street`s Cermenies میں نہیں آئیں گے۔ وہ اس لیے نہیں آنا چاہتیں کہ اس طرح سے تو عوام سے رابطہ ہو جائے گا ان کے ساتھ Commit کرنا پڑے گا کہ کیا دو گے؟ اگر مزدور کو منافع میں شامل کرو گے تو وہ اپنا ایک لڑکا آپ کے لیے مروا دے گا۔ وہ صرف وعدۂ جمہوریت پر اپنا بچہ مروا دے ایسا تو نہیں ہو سکتا۔

آفاقی: جالب صاحب! اگر ہمارے ہاں غیر جانبداری سے الیکشن ہو جائیں اور اس میں کوئی مداخلت بھی نہ کرے تو کیا یہ ہمارے مسائل کا حل ہے جب کہ ہمارے ہاں جو فیوڈل سسٹم ہے، جاگیردار ہیں، وڈیرے ہیں؟

ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن

حبیب جالب: ہمارے ہاں تو جمہوریت بھی نہ ہوئی۔ اگر یہاں جمہوریت ہوتی، تعلیم ہوتی، لوگ اپنا پروگرام دیتے رہتے تو کچھ ممکن تھا۔ اب میں آپ سے عرض کروں کہ جمہوریت والوں کو بھی پروگرام دینا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو ہمارے ہاں فیڈرل پارلیمانی نظام ہونا چاہیے۔ اس صورت میں اگر ہمارے ہاں جماعتی طور پر الیکشن ہو جائیں اور اس میں مداخلت بالکل نہ ہو تو اس سے جمہوریت کا ایک عمل شروع ہو سکتا ہے۔ اب جنرل ضیا یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لوگ بڑے وحشی ہیں۔ یہ اسلام کو بھی بھول گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کو صرف مارشل لا ہی ٹھیک کر سکتا ہے لیکن اب ایک اور پریشان کن مسئلہ افغانستان کا ہے اور ہمارے مستقبل کا اس پر بہت دارومدار ہے۔ اس وقت تو بڑی عجیب و غریب فضا ہے دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ وہ افغانستان کو کس کے حوالے کرتے ہیں۔ دوسرے ہمارے ملک میں بے تحاشا اسلحہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ امریکا اسلحہ کی سپلائی بند کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ جب یہ ساری بات طے ہوں گی اس کے بعد ہی اصل مسئلہ حل ہو سکے گا۔

آفاقی: شاعری کے ساتھ ساتھ سوشل لائف اور تحریکوں میں بھی آپ کا حصہ ہے ایک حصہ آپ کا فلم بھی ہے اس کے بارے میں ابھی تک آپ نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ حالانکہ آپ کا کہنا یہ ہے کہ اگر فلم والے آپ کو سپورٹ نہ کرتے تو دوسرے اداروں نے آپ کو بھوکا ہی مار دیا ہوتا۔ ہمارا ایک موضوع یہ ہے کہ کیا فلم سے اس معاشرے کی

اصلاح ہو سکتی ہے۔

حبیب جالب: اب ایسی فلمیں بنانے والے لوگ نہیں رہے جن کی فلموں سے لوگوں کی اصلاح ہوتی تھی۔ مثلاً ریاض شاہد تھے جنہوں نے شہید جیسی مقصدی فلمیں بنائیں۔ امن اور زرقا بنائی۔ آج کل پنجابی فلموں کے حوالے سے یہ کوشش تو کی جاتی ہے کہ جاگیرداری ختم ہو۔ یہ ایک موضوع تو یقینی ہے لیکن حل وہ بھی نہیں بتا سکتے تاہم ایسی فلموں کا کچھ نہ کچھ مقصد ضرور ہوتا ہے۔

آفاقی: آپ کے خیال میں فلم کے ذریعے اس نظام میں اور معاشرے میں کوئی انقلاب آسکتا ہے؟

حبیب جالب: لوگوں کی اس حوالے سے تھوڑی بہت تربیت ضرور ہوتی ہے۔

آفاقی: اس سلسلے میں خاصے متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں نے راجکپور کا انٹرویو پڑھا وہ کہتا ہے کہ فلم اصلاح کا نہیں بلکہ تفریح کا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ اگر اس سے اصلاح ہو سکتی تو قیام پاکستان سے پہلے اصلاحی فلمیں بن رہی ہیں۔ اگر لوگ ان پر عمل کرتے تو آج وہ یکجا ہوتے۔ ان میں اتفاق ہوتا کوئی ایک دوسرے کا گلا نہ کاٹتا ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں بہت اتفاق ہوتا۔ بقول راج کپور کے فلم تو صرف تفریح کے لیے دیکھی جاتی ہے۔ جب کہ ایک طبقہ ایسا ہے جس کا کہنا ہے کہ فلم سے معاشرے کی اصلاح ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

حبیب جالب: میں، تنویر نقوی، علاؤ الدین وغیرہ سب دوست اسی لیے فلموں میں آئے تھے کہ معاشرے کی کچھ اصلاح ہو سکے۔

آفاقی: کیا استاد دامن سے آپ کی دوستی رہی؟ ان پر بھی شراب کا مقدمہ بنا تھا؟

حبیب جالب: ان پر تو بم رکھنے کا مقدمہ بھی بن گیا تھا جس پر انہوں نے نظم لکھ دی تھی۔

کی کری جانا ایں
کی کری جانا ایں

کچھ عرصہ پہلے ملک ذوالفقار علی فلم بنا رہے تھے وہاں پولیس والوں نے دامن کو پکڑ لیا تھا۔ میں بھی وہاں تھا پولیس آئی اور کہنے لگی آیے استاد! ہم آپ کو لے چلیں۔ پولیس والے مجھ سے بھی کہتے کچھ نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا جناب ہمیں حکم ہوا ہے کہ آپ کو لے چلیں لیکن اگر آپ جانا چاہیں تو چلے بھی جائیں۔ میں ان سے کہتا تھا یار اگر چلا گیا تو کوئی اور مقدمہ بنا دے گا لہٰذا تم مجھے لے ہی جاؤ کئی بار پولیس والوں نے مجھے کہا کہ اگر تم بھاگنا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ مگر میں سوچتا تھا کہ اگر بھاگا تو یہ کوئی اور چکر چلا دیں گے۔

آفاقی: کیا جیل جا کر آپ کو کوئی تحریک ہوتی تھی؟

حبیب جالب: دراصل وہاں سوچنے اور لکھنے کا وقت بہت ہوتا ہے۔

آفاقی: ہمارے ایک اور کامن دوست ہیں جو بہت اچھے اور بڑے شاعر بھی ہیں وہ ہیں منیر نیازی وہ جس قسم کی شاعری کرتے ہیں اس پر آپ کا تبصرہ کیا ہے؟

حبیب جالب: ان کی شاعری پر تو میرا جی اور مجید امجد کا عکس ہے اور جب اصل ہیں تو نقل کی کیا ضرورت ہے؟

☆......☆

ایک عزیز دوست اور بزرگ کی تدفین کے لیے شہر کی فیشن ایبل آبادی گلبرگ کے ایک قبرستان میں گئے ہوئے تھے۔ قبر کھودی جا چکی تھی ہر طرف مٹی بکھری ہوئی تھی۔ میت کو قبر میں اتارا جا چکا تھا اور اب رشتے دار اور دوست احباب مٹھی بھر بھر کر مٹی قبر پر ڈال رہے تھے۔ میں بھی آگے بڑھا اور ایک مٹی کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھائی۔ یکایک ساتھ والے ایک صاحب نے کہا۔ ”ذرا دیکھ کر۔ آپ ایک قبر پر کھڑے ہو گئے ہیں۔“

میں نے معذرت سے ان کی طرف دیکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا مگر کسی طرف بھی پیر دھرنے کو جگہ باقی نہیں تھی۔ ہر طرف قبریں تھیں اور قبروں کے اوپر دوسری بھی قبریں تھیں۔ ذرا سی خالی زمین بھی موجود نہیں تھی۔ دوسرے لوگ قبروں ہی پر سوار کھڑے تھے۔ کچھ حضرات پختہ قبروں پر بیٹھے تھکن اتار رہے تھے۔ جو نئی قبر کھودی گئی تھی اس کے لیے گورکنوں نے آس پاس کی قبروں سے بھی بہت سی مٹی نوچ لی تھی اور ان کی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ میں نے اپنے ناصح کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی مٹی کی ایک ڈھیری پر ہی کھڑے تھے مگر جسے وہ ڈھیری سمجھ رہے تھے وہ ایک معصوم بچے کی ننھی منی قبر تھی جس کی طرف ایک اور بچے نے توجہ دلائی اور کہا۔ ”ابو دیکھیے۔ کتنی چھوٹی سی قبر ہے۔“

وہ صاحب فوراً بچے کی قبر پر سے ہٹ گئے۔ مگر میری طرح انہیں بھی یقین تھا کہ وہ جس جگہ کھڑے ہیں وہ بھی یقیناً کوئی قبر ہے اور اس جگہ بھی چند فٹ مٹی کے نیچے کوئی جسد بے جان محو خواب ہے۔

مغرب کا وقت ہو گیا تھا اور آس پاس اندھیرا پھیلنے لگا

تھا۔ قبرستان یوں بھی آنکھوں کے لیے کوئی دلکش منظر پیش نہیں کرتا۔ مگر میرے اردگرد جو قبرستان دور تک پھیلا ہوا تھا وہ حقیقی معنوں میں قبرستان تھا۔ گور غریباں۔ جہاں چند پختہ چمکدار سفید قبروں کو چھوڑ کر چاروں طرف شکست و ریخت کا راج تھا۔ کئی قبریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ بعض قبریں کھوکھلی ہو گئی تھیں اور بیٹھ چکی تھیں۔ اتنی ویرانی اور کسمپرسی دیکھ کر بھی اگر انسان کو عبرت حاصل نہ ہو اور فنا کا یقین نہ ہو تو اسے آپ کیا کہیں گے؟

ٹینگو فلم کا پوسٹ

گلبرگ کا یہ قبرستان لاہور کے چند قبرستانوں میں سے ایک ہے لیکن گزشتہ چند برسوں میں انسانی آبادی جس تیزی سے بڑھی ہے اور قبرستانوں کی ضرورت میں جس تیز رفتاری سے اضافہ ہوا ہے اس کے پیش نظر یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختصر سے قبرستان اتنی بڑی آبادی کی ضروریات کے کفیل کیوں کر ہو سکتے ہیں اور ہر میت اس کے اندر کس طرح سما جاتی ہے؟ اس کا ایک جواب تو ہمارے ساتھی نے دیا کہ قبروں کے اوپر دوسری قبریں بنوانا اب رواج میں داخل ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ہم لوگ قبرستانوں کے سلسلے میں اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کس طرح پوری کر رہے ہیں؟

مثال کے طور پر لاہور ہی کو لیجیے۔ قیام پاکستان سے قبل میانی صاحب کا قبرستان لاہور کا سب سے بڑا قبرستان تھا۔ ان دنوں لاہور کی آبادی آج کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بعد میں آبادی بے انتہا بڑھ گئی اور قبرستان سمٹ کر چھوٹا ہو گیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے سمن آباد کو تعمیر ہوتے دیکھا ہے۔ میانی صاحب کے قبرستان کا ایک معقول حصہ نئی آبادی میں شامل ہو گیا۔ زندوں نے مردوں کی زمین پر قبضہ مخالفانہ کر لیا۔ وہ بچارے نہ احتجاج کر سکتے ہیں نہ جلسہ جلوس۔ آج بھی سمن آباد کی بعض آبادیوں کے عین عقب میں قبروں کی موجودگی اس دعوے کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ لاہور کی حد سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات میانی صاحب کا سمٹتا ہوا قبرستان کس طرح پوری کر رہا ہے؟ شہر کے دوسرے حصوں میں بھی قبرستان موجود ہیں مگر یہ علاقائی اور مختصر قبرستان ہیں، یہاں بھی وہی مسئلہ درپیش ہے۔ اتنے بہت سے مرنے والوں کا اتنے چھوٹے قبرستانوں میں سما جانا ایک معجزہ ہی کہلا سکتا ہے، لیکن اب یہ عالم ہے کہ قریب قریب تمام قبرستان ”لبریز“ ہو چکے ہیں اور ہم نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ آخر ہم خود اور بعد میں آنے والے مر کر کہاں جائیں گے۔ لاہور ہی کی طرح کے دوسرے شہروں میں بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔

قبرستانوں کا تذکرہ چھڑتے ہی ہمارے تصور میں گندے، بدبودار، تعفن سے بھرے ہوئے قبرستان آجاتے ہیں جہاں حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق صفائی تو ایک طرف باقاعدگی سے جھاڑو بھی نہیں دی جاتی۔ بیشتر قبرستانوں کے ساتھ جرائم کی داستانیں وابستہ ہیں۔ کتنی بار پولیس نے چرسیوں، شرابیوں اور دوسرے نشہ کرنے والوں کے اڈوں کا سراغ قبرستانوں میں لگایا ہے۔ چور، ڈاکو بھی اکثر شہر خموشاں کے مکینوں کے درمیان پناہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ خود لاہور کے قبرستان میانی صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اب بھی اس کے بعض حصے جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ اکثر قبرستانوں میں نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے مناسب جگہ موجود نہیں ہے جہاں اس کا بندوبست ہے تو وہ انتہائی ناقص ہے۔ وضو کرنے کے لیے صاف ستھری جگہ نہیں ہے۔ جھاڑ جھنکاڑ اور خودرو پودے قبروں کو اپنے دامن میں ڈھانپ لیتے ہیں۔ لاہور کے ماڈل ٹاؤن کا بڑا قبرستان ایسی گھاس سے ڈھکا رہتا ہے جو برسات کے بعد کئی کئی فٹ بلند ہو جاتا ہے اس سخت اور تیز دھار گھاس کو کاٹنا بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔ ہر سال برسات کے بعد

فاتحہ کے لیے آنے والوں کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اس گھاس سے قبروں کو کیوں کر نجات دلائی جائے۔

اس کے برعکس یورپ اور امریکا تو کیا خود اپنے ملک کے کرسچن حضرات کے قبرستانوں پر ایک نظر ڈالیں تو شرم سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ گوروں کے قبرستان میں قبریں ایک ترتیب اور نظم و ترتیب کے ساتھ بنائی جاتی ہیں۔ درمیان میں گزرنے کے لیے راہداریاں موجود ہیں۔ قبروں پر مناسب نشانات لگے ہوئے ہیں۔ آس پاس سبزہ اور پھلواری ہے۔ یہ ایک پُرسکون اور پاکیزہ علاقہ نظر آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاص صفائی، پاکیزگی اور پھولوں سے آراستہ ماحول میں مدفون روحیں بھی سکون سے ابدی نیند سو رہی ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنے قبرستانوں کو صاف ستھرا اور خوشنما نہیں بنا سکتے؟ پرانی آبادیوں میں واقع قبرستانوں کی بہتری اور تزئین ناممکن کام نہیں ہے اور جہاں تک نئی آبادیوں میں قائم ہونے والے قبرستانوں کا تعلق ہے ان کی منصوبہ بندی اور ترتیب تو انتہائی سہل ہے۔ ترتیب کے ساتھ ساتھ قطار در قطار قبروں کی جگہیں مقرر کی جاسکتی ہیں۔ ان کے درمیان گزرنے کے لیے راستے بنائے جاسکتے ہیں۔ آس پاس سبزہ اور پھول اگائے جاسکتے ہیں۔ ماحول کو خوشگوار اور پاکیزہ بنانے کے لیے صفائی کا مناسب انتظام کیا جاسکتا ہے۔ قبرستانوں کو محض پیشہ ور اور ان پڑھ گورکنوں کے سپرد کرنے کی بجائے مناسب اور معقول عملہ دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا جاسکتا ہے۔ قبرستانوں کو مجرموں کے تسلط سے نجات دلا کر روحانی پاکیزگی کا مرکز بنایا جاسکتا ہے۔

میں جب بھی کبھی قبرستان میں جاتا ہوں تو یہ احساس شدت کے ساتھ ستانے لگتا ہے کہ کیا ہماری بے حسی اور بے پروائی انتہا کو نہیں پہنچ گئی۔ کیا ہمارے مرنے والوں کا ہم پر کوئی حق نہیں ہے؟ ان کی بعد از مرگ دیکھ بھال ہماری ذمہ داری نہیں ہے؟ کیا ان کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ہم ان سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی روحوں کو ایصال ثواب پہنچانے کا اہتمام تو کیا ہم ان کی قبروں کے لیے بھی پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول فراہم نہیں کر سکتے؟ ہم نے ان جذبات کا اظہار اپنے ایک دوست کے ساتھ کیا تو وہ تلخی سے مسکرائے اور بولے۔ ''حضرت یہ تو بتایئے کہ آپ زندہ انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ کیا زندوں کی ذمہ داریاں پوری کر چکے ہیں جو مردوں کی حق تلفی پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں؟'' پھر وہ ہنسے اور کہنے لگے۔ ''آپ قبرستانوں کے نظم و نسق اور قطار بندی کی بات کرتے ہیں؟ کیا جیتے جاگتے شہروں میں آپ تربیت اور قطار بندی پر عمل کرتے ہیں جو گورستان پر یہ اصول لاگو کرنا چاہتے ہیں۔''

پڑوس میں ایک صاحب کے والد محترم کا انتقال ہوگیا۔ پتا چلا کہ جنازے کے لیے دو بجے دوپہر کا وقت مقرر تھا۔ ڈیڑھ بجے سے عزیز و اقارب، دوست اور علاقائی، ہمدرد اور پرسان حال جمع ہونے لگے مگر ڈھائی بج گئے اور جنازے کو رخصت کرنے کے آثار نظر نہ آئے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کچھ حضرات کھڑے تھے۔ ایک صاحب نے آہستگی سے خیال ظاہر کیا کہ شاید مرحوم کا کوئی قریبی اب تک نہیں پہنچا ہے مگر چند منٹ کے بعد جب ایک ایمبولینس گاڑی کوٹھی کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو اس تاخیر کا اصل سبب معلوم ہوگیا۔ لواحقین ایمبولینس کے منتظر تھے تاکہ جنازے کو قبرستان تک ایمبولینس کے ذریعہ پہنچایا جائے۔ مگر کچھ حضرات کی رائے تھی کہ جنازے کو کاندھا دے کر پیدل ہی قبرستان پہنچانا چاہیے۔ قبرستان کا فاصلہ قریباً ایک میل تھا۔ موسم نہ زیادہ گرم تھا نہ سرد۔ دلیل یہ تھی کہ مرنے والے کو عزیز اور احباب اپنے کاندھوں پر سوار کر کے آخری منزل تک پہنچائیں تو بات ہی اور ہوتی ہے۔ یہ مرنے والے کی طرف سے آخری زحمت ہوتی ہے جو اس کے ملنے والوں کو دی جاتی ہے۔ اس لیے میت کو جنازے کے جلوس کی صورت میں قبرستان تک لے جانا زیادہ احسن ہے۔ ایک بزرگ نے مذہبی اعتبار سے بھی اس خیال کی تصدیق کی اور فرمایا کہ جنازے کے ساتھ جانے والے اصحاب تمام راستے کلمہ شہادت کا ورد کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے مرنے والے کی آخری منزل کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ بزرگ نے یہ بھی فرمایا کہ جنازہ ہماری معاشرت اور تہذیب کا ایک حصہ ہے اور ہمیں اپنی مذہبی رسوم کو اس طرح مسخ نہیں کرنا چاہیے کہ غیر مسلموں اور مسلموں کی میتوں میں کوئی امتیاز ہی نہ رہے۔ اس مسئلے پر زیادہ دیر بحث نہ ہوسکی چونکہ مرنے والے کے لواحقین نے دوسرے تمام دلائل پر جذباتی دلیل کی اولیت دی اور کہا کہ ہم تو اپنی میت کو کاندھوں پر اٹھا کر قبرستان تک پہنچائیں گے۔

ایک دوست نے چپکے سے ہمیں بتایا کہ فیصلہ تو کرلیا گیا ہے مگر ارد گرد نظر ڈالیے تو پتا چلے گا کہ اکثریت متوسط عمر اور ضعیف العمر لوگوں پر مشتمل ہے۔ نوجوان اور قوی جسم کے لوگ بہت کم ہیں۔ اتنا فاصلہ کندھا دے کر کس طرح طے کیا جائے گا؟ مگر اتنی دیر میں جنازہ روانہ ہو چکا تھا اور

کلمہ شہادت کی صدا فضا میں گونجنے لگی تھیں۔ گھر سے روانہ ہونے کے فوراً بعد ہر شخص کی خواہش اور کوشش تھی کہ جنازے کو کاندھا دے مگر کچھ فاصلے پر پہنچ کر بڑی عمر کے لوگ پیچھے رہ گئے۔ اور محض نوجوان جنازے کو کاندھا دینے کے لیے رہ گئے۔ ان کی تعداد خاصی کم تھی۔ گویا جنازے کو کاندھا دینے کا فرض عملی طور پر محض دس پندرہ لوگوں نے سرانجام دیا۔ ان میں سے کتنے لوگ تھے جنہوں نے یہ بوجھ بخوشی برداشت کیا۔ اور کتنے ایسے تھے جن کے لیے یہ ایک بیگار اور زبردستی کا معاملہ تھا؟ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

مگر اس واقعے کے بعد یہ احساس شدت سے پیدا ہوگیا کہ بدلتے ہوئے معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں کے پیش نظر کیا ہمیں مذہبی رسوم کو بھی تبدیل کرنا ہوگا؟ دیکھا جائے تو بڑے شہروں میں یہ تبدیلی عمل میں بھی آچکی ہے۔ کراچی شہر کے رہنے والے کب سے اپنے مرنے والے کو کاندھوں پر اٹھانے کی بجائے ایمبولینس گاڑیوں کے ذریعے قبرستان تک پہنچا رہے ہیں۔ چند سالوں سے لاہور میں بھی یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں البتہ ابھی تک جنازے کو کاندھا دینے کا دستور رائج ہے مگر کب تک؟ انسانی مصروفیات وقت کی کمی، قبرستانوں کے بڑھتے ہوئے فاصلے اور موسموں کی شدت ایسی وجوہ ہیں جن کے پیش نظر اب نہیں تو چند سال بعد ان قصبوں اور شہروں میں بھی ایمبولینس کے ذریعہ میت کو قبرستان تک پہنچانے کا رواج قائم ہو جائے گا۔ چلیے یہاں تک تو گوارا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کہیں جدیدیت کے تقاضوں کے دباؤ میں آکر ہم جذباتی اور روحانی رشتوں اور ذمہ داریوں سے بالکل ہی بری الذمہ تو نہیں ہو جائیں گے؟ اس لیے کہ جس رفتار اور رغبت سے ہم مغربی طور طریقے اپنا رہے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت انہیں حق بجانب بھی قرار دے رہے ہیں۔ اگر یہ سفر اسی طرح رواں دواں رہا تو اگلی منزلیں کیا ہوں گی؟ مغرب میں مرنے والوں کی آخری رسم نہایت سلیقے کے ساتھ مگر انتہائی میکانکی انداز میں ادا کی جاتی ہے۔ مرنے والوں کے لواحقین اس ادارے سے رابطہ قائم کرتے ہیں جس کا کام ہی تجہیز و تکفین ہے۔ اب یہ لواحقین کی استطاعت پر منحصر ہے کہ وہ کتنا خرچ کر سکتے ہیں اس کے مطابق تابوت تیار ہوتا ہے۔ قبر فراہم کی جاتی ہے۔

قبرستان

پھول ڈالے جاتے ہیں۔ پادری صاحب کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اگر خوشحال ہیں اور زیادہ پیسے خرچ کر سکتے ہیں تو میوزیشن بھی غم زدہ ساز بجانے کے لیے فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا آپ کو محض یہ بتانے کی زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے کہ آپ کتنا خرچہ کرنا چاہتے ہیں اور کس قسم کی آخری رسومات پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد سارا کام تجہیز و تکفین والوں کا ہوتا ہے۔ اکثر تو مرنے والوں کے لواحقین کو آخری رسومات میں شرکت کرنے کے لیے قبرستان تک جانے کی توفیق بھی نہیں ہوتی مگر اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ مغرب والے تو زندگی میں بھی ایک دوسرے سے بے تعلق اور سرد مہر رہتے ہیں۔ رسمی ملاقاتوں اور گاہے گاہے ٹیلی فون یا خط کے ذریعے ایک دوسرے سے ربط قائم رکھنے کے قائل ہیں۔ جو سرد مہری زندگی میں اختیار کرتے ہیں وہی مرنے کے بعد بھی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہمارے گرمجوش معاشرے میں جہاں عموماً رشتے دار اور احباب ایک دوسرے سے قریبی رشتوں اور گہرے میل ملاپ کے ذریعہ مربوط ہوتے ہیں۔ یہ رسمی اور دنیاوی انداز کہاں تک اپنائے جاسکتے ہیں؟ آج ہم نے جنازوں کو کاندھوں سے ایمبولینس پر پہنچا دیا ہے۔ مگر آخرت کا یہ سفر اور کن مراحل اور منزلوں سے گزرے گا۔ اس کا فیصلہ خود ہمیں کرنا ہے اور جتنی جلدی کرلیں اتنا بہتر ہوگا۔

ان کڑوی کسیلی یادوں اور باتوں کے بعد ہمیں خیال آیا کہ الجھنوں، پریشانیوں اور بدترین دباؤ کے اس دور میں کم از کم ہمارے مضمون کا اختتام خوشگوار ہونا چاہیے۔ لوڈشیڈنگ اور حبس میں آنے والے تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے یاد دلایا ہمارا شہر باغوں کا شہر کہلاتا ہے جسے شہر کے وسط سے گزرنے والی نہر نے چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ لاہور کیا، سارے پاکستانی لاہور کے اس حسن بے مثال سے واقف ہیں۔ ہم

نے بس ایک ہی شہر کو اس میدان میں بازی لے جاتے دیکھا اور وہ ہے انگلستان کا قلب لندن۔

☆☆☆

لندن کو باغوں کا شہر کہتے ہیں۔ دنیا بھر میں یہ اپنے باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ مگر باغوں کے شہر کا تو اپنا حسن ہے۔ کسی زمانے میں لاہور میں بہت سے باغ تھے۔ ان کی نگہداشت بھی خوب ہوا کرتی تھی۔ مگر پھر امتداد زمانہ اور ایل ڈی اے نے مل جل کر ان گلستانوں کو صحراؤں میں تبدیل کردیا۔ کچھ باغات بے اعتنائی اور غفلت کے سبب گئے۔ کچھ کو سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لیے ختم کردیا گیا۔ اور تو اور ایل ڈی اے نے تو لاہور کو خوبصورت بنانے کی غرض سے بے شمار قدیم خوبصورت سایہ دار درخت بھی کاٹ کر پھینک دیئے۔ حالانکہ ہمارے ملک کا تو موسم بھی ایسا ہے کہ گھنے سایہ دار درخت ہماری ضرورت ہیں۔ سایہ دار درخت لگانے کی توفیق تو ہوئی نہیں، جو موجود تھے، انہیں بھی سڑکوں کی خوبصورتی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یہی حال سبزے کے تختوں کا بھی ہوا۔ اب یہ دیکھیے کہ یورپ میں بارشیں اتنی ہوتی ہیں کہ سبزہ زار خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر گرمی کی وہ شدت بھی نہیں کہ انسان اور حیوان سایہ دار جگہیں تلاش کرتے پھریں۔ اس کے باوجود یہاں درختوں کی کثرت ہے۔ سڑکوں پر، بازاروں میں، گلیوں میں ہر جگہ اونچے اونچے درخت سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ پھر لوگوں کو ان درختوں سے محبت بھی اتنی ہے جیسے اپنے گھر والوں سے ہوتی ہے۔ کبھی ایسے دن بھی آتے ہیں جب یہاں متواتر کئی ہفتے تیز دھوپ نکلتی ہے اور بارش نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں درختوں کو سیراب کرنے اور نہلانے کے لیے خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگر محکمے کی طرف سے غفلت ہو تو لوگ گردن ناپتے ہیں۔ ایسے ہی ایک گرم و خشک موسم میں ایک صاحب نے باغات اور درختوں کے محکمے کو فون کیا اور کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ دو دن سے میرے درخت کو نہلایا نہیں گیا۔ اس پر گرد و غبار جم رہا ہے۔ آخر آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

میرے درخت سے ان کی مراد وہ درخت تھا جو ان کے مکان کے سامنے تھا اور کھڑکی سے نظر آتا تھا۔ جہاں تک گرد و غبار کا تعلق ہے، یہاں گرد و غبار نہیں ہوتا۔ درخت تو کیا یہاں تو انسانوں کو ہفتوں نہانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مگر یہ واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور درختوں اور باغوں کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم درختوں کو کاٹ کر جلا لیتے ہیں۔ پتے بکریاں چر جاتی ہیں۔ شاخیں بچے لٹک لٹک کر توڑ دیتے ہیں۔ رہے نئے کاشت کیے جانے والے پودے ان بے چاروں کا تو نوزائیدگی کے عالم ہی میں انتقال ہو جاتا ہے۔

مگر ایک بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ پچھلے چند سالوں میں کم از کم لاہور میں پرانے باغوں کی دیکھ بھال اور نئے باغ لگانے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں نئے نئے، وسیع اور خوبصورت باغ لگائے جا رہے ہیں۔ پرانے باغوں پر بھی نظر کرم ہوئی ہے۔ دیکھیے یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا ہے۔ لیکن اب اتنا ضرور ہے کہ ہم دوبارہ لاہور کو باغوں کا شہر کہہ سکتے ہیں۔

میں لندن کے باغوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ یوں تو اس گنجان شہر میں جگہ جگہ سبزہ زار اور چھوٹے چھوٹے باغ موجود ہیں جن کی وجہ سے شہر کھلا کھلا اور تازہ دم لگتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ لندن اپنے باغات پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ مغرب کے لوگوں نے اپنا نظریۂ حیات بنا لیا۔ وہ ہر چیز کا تیکنیکل اور افادی پہلو ضرور مدِنظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر باغوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ لندن کے باغ محض نظروں ہی کو تازگی نہیں بخشتے، ان کی اپنی مخصوص افادیت بھی ہے۔ یعنی خوبصورتی بھی اور پرکاری بھی۔

لندن کا مشہور ترین اور غالباً حسین ترین باغ "کیو گارڈن" ہے۔ انگریزوں کو فخر ہے کہ ایسا باغ دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ یہ باغ 288 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یورپ، افریقا، ایشیا کا کوئی ایسا پودا اور درخت نہیں ہے جو اس باغ میں موجود نہ ہو۔ نظر فریب اور خوبصورت درختوں اور پھولوں کے علاوہ یہ باغ نباتات کا ایک بہت بڑا مرکز بھی ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں اقسام کے درخت اور پودوں کے علاوہ کئی لاکھ سوکھے ہوئے پودے اور جڑی بوٹیاں بھی موجود ہیں جن کو حفاظت سے رکھنے کے لیے ایئر کنڈیشنڈ شیشے کے گھر بنائے گئے ہیں۔ ان گھروں میں تمام سال درجۂ حرارت وہی رکھا جاتا ہے جو پودے کے لیے لازمی ہے۔ یہی نہیں، دنیا بھر سے ہر سال ہزاروں نت نئے درخت، پودے، پھول اور جڑی بوٹیاں بھی یہاں، لائی جاتی ہیں۔ دنیا میں نباتات کی جتنی بھی قسمیں موجود ہیں، ایک دعوے کے مطابق وہ لندن کے "کیو گارڈن" میں موجود ہیں۔ پھر یہاں نباتات کے بارے میں مضامین اور معلومات پر مشتمل ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں نادر اور قدیم کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔ کسی بھی موضوع کا نام لیجیے۔ آپ کو لائبریری میں کتاب دستیاب ہو جائے گی۔

اس باغ کا قیام ایک چھوٹے سے باغیچے کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ 1759ء میں جارج سوئم کی والدہ شہزادی آگسٹا نے اس مقام پر ایک چھوٹا سا باغ بنوایا تھا۔ مغل بادشاہوں کے برعکس، جو محض خوبصورتی اور تفریح کے لیے ہی باغات بنواتے تھے، آگسٹا نے اس کے عملی اور افادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ نباتات کی اقسام پر خاص طور پر توجہ دی گئی۔ اور پودوں کے بارے میں نت نئے تجربات بھی کیے گئے۔ بعد کی حکومتوں اور حکمرانوں نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔ انگلستان کے مقامی پودے، پھول اور درخت معدودے چند ہیں۔ لیکن انگریز سائنس دانوں اور محققین نے دنیا کے ہر گوشے سے نباتات کے نمونے لا کر یہاں لگائے اور ان پر مفید تجربات بھی کیے۔ اس اعتبار سے یہ باغ علم نباتات کے طالب علموں کے لیے ایک درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس باغ کی توسیع اور ترقی کے لیے خود باغ میں اگائے جانے والے پودوں کی آمدنی سے بھی حاصل کی گئی، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بلکہ آج تو "کیو گارڈن" نباتات کے کاروبار کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ پودوں کو بارشوں اور موسموں کے تغیرات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں نہایت اعلیٰ سائنسی انداز میں اہتمام کیا گیا ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیاں بے شمار جدید دوائیوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اور باغ کے منتظمین کو اس سے لاکھوں پاؤنڈز کی آمدنی ہوتی ہے۔

لندن میں آنے والے سیاح کے لیے اس باغ کو دیکھنا "لازمی ضرورت" ہے۔ اس طرح سیاحوں اور باغ میں آنے والے لوگوں کے داخلہ ٹکٹوں سے ہی اتنی آمدنی ہو جاتی ہے جو ضرورت کے لیے کافی ہے۔

کیو گارڈن کے علاوہ لندن کے مشہور اور خوبصورت باغوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہ باغ اپنی جھیلوں، پھولوں کے تختوں، سبزہ زاروں، درختوں اور سیاحوں اور لوگوں کی تفریح کے لوازمات کی وجہ سے قابلِ دید ہیں۔ ہر باغ میں صاف ستھرے پُرشکوہ ریسٹوران اور دوسری تفریح گاہیں بھی موجود ہیں۔ لندن کے بعض پارک جو پہلے شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھے، لیکن اب ہر خاص و عام کے لیے کھلے ہوئے ہیں، حسبِ ذیل ہیں

سینٹ جیمز پارک، ہائیڈ پارک، کینگٹن گارڈنز، کوئین میری گارڈن (یہ ریجنٹ پارک کے اندر 18 ایکڑ رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔) ان باغوں کی رعنائی اور دلفریبی کا کیا پوچھیے۔ یہ باغ تمام سال لوگوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ جھیلوں میں کشتی رانی کا بھی اہتمام ہے۔

جیلسی گارڈن: 1673ء میں قائم ہوا تھا۔ پھولوں کے علاوہ جڑی بوٹیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔

بیٹسی پارک: اس باغ میں دوسرے پودوں کے علاوہ دنیا بھر کی مختلف اقسام کے پتھروں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔

ہیمپٹن کورٹ گارڈن: اس باغ میں مخصوص چیز یہ ہے کہ یہاں چھ سو اقسام کے انگور کے درخت موجود ہیں۔

بشی پارک: دریائے ٹیمز کے کنارے پر ہے۔ ایک ہزار ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ سیکڑوں سال قدیم بلند و بالا اور خوبصورت قد آور درختوں کے لیے مشہور ہے۔

چس وک ہاؤس: جھیلوں کے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے ٹمپل بھی بنے ہوئے ہیں۔

سیون ہاؤس: درختوں اور پودوں کی بے شمار اقسام کے علاوہ سبزہ زاروں اور خوبصورتی میں بھی لاجواب ہے۔ بہت وسیع و عریض پارک ہے۔

آسٹرلی پارک: اس باغ میں تین حسین جھیلیں اور مصنوعی جزیرے بھی ہیں۔

کین وڈ ہاؤس: جھیلوں، درختوں اور پھولوں کے لیے مشہور ہے۔

گرین وچ پارک: نباتات کے ذخیرے کے لیے مشہور ہے۔ حسن و رعنائی میں بھی بے مثال ہے۔

مذکورہ بالا باغوں کے علاوہ لندن میں جگہ جگہ کھلے سبزہ زار... باغ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گنجان آبادی کے باوجود اس شہر میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ لوگوں کو تازہ ہوا اور آکسیجن کی بڑی مقدار بھی حاصل رہتی ہے۔ بچوں کو کھیلنے کے لیے میدان مل جاتے ہیں۔ اور بڑے..... یوں تو ہر موسم میں باغوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مگر موسم گرما میں اگر قسمت سے دھوپ نکل آئے تو یہاں کے لوگوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں عورتیں، مرد اور بچے اوندھے سیدھے لیٹے دھوپ سینکتے نظر آتے ہیں جو ان کے مکانوں اور فلیٹوں میں انہیں حاصل نہیں ہو سکتی۔

جاری ہے

آبِ حیات

شیراز خان

آبِ حیات کا تذکرہ تقریباً تمام مذاہب اور معاشرے میں ملتا ہے لیکن یہ خاص پانی کہاں پایا جاتا ہے اس بارے میں صرف اشارتاً بتایا گیا ہے۔ تاقیامت زندہ رکھنے والے اس خصوصی صفت والے پانی پر ایک مختصر سی مگر بھرپور تحریر......

موت کو شکست دے دینے والے معجزاتی پانی کا ذکر

"کیا کیا خضر نے سکندر سے۔ اب کسے رہنما کرے کوئی۔"

یہ غالب کا شعر ہے اور اس راستے کی طرف اشارہ ہے جب خضر اور سکندر آبِ حیات کی تلاش میں گئے تھے۔

لیکن اس روایت کو بیان کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ آبِ حیات کے بارے میں کچھ باتیں ہو جائیں۔ سوال یہ ہے کہ آبِ حیات ہے کیا؟

ایک عجیب بات ہے کہ صرف ہمارے یہاں نہیں بلکہ

اور بھی کئی مذاہب کی کتابوں اور کئی ملکوں کی روایات میں اس قسم کے پانی کا ذکر موجود ہے جس کو پی کر ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔

انگریزی میں اسے Elixir (الاکسیر) کہتے ہیں۔ الکسیر ایک عربی لفظ ہے۔ یہ انگریزی میں داخل ہو کر الاکسیر بن گیا۔ گو کہ طبی لحاظ سے الکسیر ایسی دوا ہوتی ہے جو کہ ہر بیماری کا علاج بھی ہوتی ہے اور جو اسے پی جائے اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔

روایت یہ ہے کہ ہمیشہ کی زندگی کے لیے اس کا صرف ایک ہی کپ کافی ہے۔ ایک گلاس پی لیں اور قیامت تک زندہ رہیں اور دوسروں کے سینوں پر مونگ دلتے رہیں۔

آئیں یہ دیکھتے ہیں کہ کس کس کلچر میں اس قسم کے پانی کا ذکر موجود ہے۔ قدیم مصر کی روایات میں بھی اس قسم کے پانی کا ذکر ملتا ہے۔

اس پانی کا چرچا روایت کے مطابق تُوتھ سے ہوا تھا۔ تُوتھ ایک قدیم مصری دیوتا تھا۔ ایک ایسی شخصیت جس کا پورا دھڑ انسان کا اور اوپر سے ایک بڑے پرندے کی چونچ کی طرح۔ تُوتھ کی سب سے بڑی عبادت گاہ خدمن میں تھی۔ (قدیم زمانے کا ایک مصری شہر) تُوتھ نے ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے آبِ حیات پی لیا تھا۔

آبِ حیات کی تلاش ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ انجوائے کرنا چاہتا ہے۔ آج کے دور میں میڈیکل سائنس ایسی دواؤں کی جو بھر مار کر رہی ہے وہ اسی خواہش کے علاوہ اور کیا ہے۔

قدیم چین میں بھی اس کی تلاش کا سلسلہ جاری تھا۔ بہت سے چینی بادشاہوں نے اس کی تلاش میں مہمات روانہ کی تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کین (Qin) بادشاہت کے دور میں اس کی تلاش ہوتی رہی ہے۔ قدیم چین کے عظیم بادشاہ کین شی ہوانگ نے بھی ایک زبردست مہم آبِ حیات کی تلاش میں روانہ کیا تھا۔

یہ مہم اس زمانے کے ایک ماہر ادویہ ساز زونو کی سربراہی میں روانہ کیا گیا تھا کہ اگر یہ کہیں مل جائے تو زونو اپنے طور پر اس کی جانچ پڑتال کرے۔

اس مہم میں پانچ سو مرد اور پانچ سو عورتیں تھیں۔ انہیں مشرقی سمندروں کی طرف روانہ کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ جس سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں آبِ حیات ملا یا نہیں۔

چین کی قدیم روایات کے مطابق یہ پانی پگھلے ہوئے سونے کے علاوہ دنیا کی تمام دھاتوں کو پگھلا کر بنایا گیا ہے۔ (یعنی اس میں ہر قسم کی معدنیات پائی جاتی ہیں)۔

چین کی طرح آبِ حیات کی روایت ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں اس پانی کو امرت کہا جاتا ہے۔

یہ امرت سمندر سے نکالا گیا تھا۔ اس سلسلے میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ یوں ہے کہ دیوتاؤں اور رکھششوں (بدی کی طاقت) نے مل کر سمندر سے امرت نکالنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے مندار پہاڑ کو متھنی بنایا اور سانپ کو رسی کی طرح استعمال کیا اور امرت نکال لیا۔

پھر یہ ہوا کہ کچھ بدی کی طاقتوں (یعنی برے رکھششوں) نے اپنے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنے کی خاطر اس پانی کو چوری کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح طاقت حاصل کر لینے کے بعد وہ دیوتاؤں کے برابر ہو سکیں گے اور دیوتا ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ کیوں کہ امرت ان کے بدن میں موجود ہے۔

یہ صورتِ حال چونکہ تشویش کے قابل تھی۔ اس پر کچھ دیوتاؤں نے اپنے طور پر ایک میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں آسمانوں کا دیوتا اِندر، ہواؤں کا دیوتا وایو اور آگ کا دیوتا اگن تھے۔ اس میٹنگ میں طے پایا کہ معاملہ چونکہ گھمبیر ہے اس لیے مرکزی دیوتاؤں سے مدد لی جائے۔ یہ مرکزی دیوتا وشنو (حفاظت کرنے والا) برہما (خالق) اور شیو (تباہ کرنے والا) تھے۔ یہ تینوں مرکزی دیوتا بھی سوچ میں پڑ گئے اور یہ طے پایا کہ اس پانی کو کسی گہرے سمندر کی تہہ میں چھپا دیا جائے۔

پھر ایک بہت بڑے کچھوے کے خول میں اس پانی کو چھپا کر اس کچھوے کے خول پر ایک بہت بڑا پہاڑ رکھ دیا گیا اور ایک بہت بڑے سانپ کو مقرر کیا گیا کہ وہ اس پہاڑ کے چاروں طرف کنڈلی مار کر بیٹھا رہے۔ گویا اس طرح اس پانی کی حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا۔

ہندوؤں کی مقدس کتاب وید کے مطابق امرت سونے اور پارے کا مرکب ہے۔

ہمارے یہاں بھی آبِ حیات کے حوالے سے ایک روایت بہت مشہور ہے۔ آپ بھی اس روایت سے ضرور واقف ہوں گے۔ وہ روایت کچھ یوں ہے۔

ذوالقرنین جب یاجوج ماجوج والی دیوار سے فارغ ہوا تو چند عالموں کو طلب کر کے ان سے دریافت کیا کہ تم نے

ابو محمد جنابی

مصطفی بن حسن بن سنان الحسینی الہاشمی اسیہ (امامیہ) کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کئی ایک شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کئی ایک شہروں میں معلمی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ کچھ عرصے کے لیے حلب میں قاضی کے عہدے پر بھی فائز رہا۔ اس کی شہرت ایک تاریخی کتاب کے لکھنے سے ہوئی جو اس نے دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں عربی زبان میں تاریخ کے موضوع پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا نام ''العلیم الزاخرفی احوال الاوائل و الاواخر'' یہ کتاب عام طور پر تاریخ الجنابی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کے بیاسی باب ہیں اور ہر باب میں ایک مسلمان حکمران خاندان کا بیان ہے۔ اس نے خود ہی اس کا عربی سے ترکی زبان میں ترجمہ اور خلاصہ تیار کیا تھا۔

کسی کتاب میں درازی عمر کی بھی دوا دیکھی ہے؟''

(بعض کتابوں میں ذوالقرنین کا نام سکندر لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس قصے میں ہم بھی سکندر ہی لکھ رہے ہیں)۔

تو جب سکندر نے درازی عمر کی دوا دریافت کی تو ان میں سے ایک نے بتایا کہ میں نے وصیت نامہ حضرت آدم علیہ السلام میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چشمہ کوہ قاف کے نیچے پیدا کیا ہے اور اس مقام پر نہایت اندھیرا ہے اور اس چشمے کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور برف سے زیادہ سرد اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور جو کوئی اس کا پانی پی لے اس کو اس وقت تک موت نہیں آسکتی جب تک وہ خود خواہش نہ کرے۔

سکندر نے کہا کہ تم لوگ میرے ہمراہ چلو۔

انہوں نے کہا کہ ہم زمین کے قطب ہیں، اگر یہاں سے حرکت کریں تو آفت برپا ہو جائے گی۔ سکندر نے کہا پھر بھی کچھ نہ کچھ لوگ میرے ہمراہ چلیں۔

چنانچہ عالم اور حکیم ساتھ ہوئے اور خضر علیہ السلام کو اس لشکر کا امیر مقرر کیا گیا اور ایسے جواہر دیے گئے جن سے اندھیروں میں روشنی ہو سکتی تھی اور سکندر نے تاج و تخت ایک صاحب تقویٰ کے سپرد کیا اور وصیت کی کہ بارہ برس تک اس کی راہ دیکھی جائے۔

یہ قافلہ جب کوہ قاف سے گزرا تو راستہ بدل گیا اور خضر جلد ظلمات میں جا پڑے، چونکہ روشنی دینے والے جواہر ان کے ہاتھ میں تھے۔ سو انہوں نے اس کی روشنی میں اس راہ کو طے کیا اور چشمہ حیات پایا۔

خواجہ خضر اس چشمے میں نہائے۔ پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے آگے روانہ ہوئے تو سکندر کا لشکر نظر آیا۔ پریشان حال۔ سب خواجہ خضر کے پاس پہنچ گئے اور اپنے اپنے احوال سنائے۔

بہر حال اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ آب حیات انہیں مل گیا۔ قافلے والوں کو شاید اسی لیے غالب نے کہا تھا

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

یورپ بھی آب حیات کے تصور سے خالی نہیں ہے۔ وہاں بھی داستانوں کہانیوں وغیرہ میں آب حیات کا موضوع دہرایا جاتا رہا ہے۔ بلکہ ایک سنت، سینٹ جرمائن کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس نے آب حیات کے چند قطرے پی لیے تھے اسی لیے وہ صدیوں تک زندہ رہا۔

ایل فرانک کے ناول ...... میں بھی آب حیات کا ذکر موجود ہے۔

سائنس فکشن میں ڈاکٹر ہُو اس کی مثال ہے۔ اس طرح 2013ء میں ایک فلم بنی ''ٹائٹ آف دی ڈاکٹر'' اس میں بھی آب حیات کا ذکر موجود ہے۔

جے کے رولنگ نے بھی اپنی ایک کتاب ہیری پوٹر اینڈ دی فلاسفر اسٹون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

ایک محقق کے مطابق آب حیات کے بے شمار نام ہیں جو مختلف کلچر اور مذاہب کے لحاظ سے ہیں۔ جیسے امرت رس، امرتا، آب حیات، آب حیواں، چشمہ کوثر، فلاسفر اسٹون، زندگی کا پانی۔ سیال سونا وغیرہ۔

وہیل مچھلی جب سانس لیتی ہے تو اس کے پھیپھڑوں میں ایک جیلی سی بن جاتی ہے۔ وہ جیلی سمندر کی ساری نمکیات اور معدنیات کا مرکب ہوا کرتی ہے اور وہی جیل آب حیات ہے اور وہ جیلی انتہائی قیمتی ہوتی ہے۔ اس جیلی سے کیک بنایا جاتا ہے اور کیک کا ایک ایک ٹکڑا ہزاروں پاؤنڈز قیمت کا ہوتا ہے۔

مان لیں کہ اگر ایسا ہے بھی تو یہ حضرت انسان زندہ رہ کر کیا کریں گے۔

درست فیصلہ

مریم کے خان

ملک و قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اسے دیانت دار رہبر ملے۔ بروقت صحیح فیصلہ کرنے کی دولت سے وہ مالا مال ہو۔ برّاعظم ایشیا میں ایسے کئی ممالک ہیں جن کے رہبروں نے درست فیصلے کیے اور اپنے ملک کو عروج پر پہنچا دیا۔

ٹوٹے بکھرے ممالک کو عروج پر پہنچانے کا مختصر سا بیان

سترھویں صدی تک جاپان ایک نامعلوم اور پُراسرار سا ملک تھا جس کے بارے میں بیرونی دنیا بہت کم جانتی تھی۔ جاپانی نہ اپنی زمین سے باہر آتے تھے اور نہ ہی کسی غیر ملکی کو جاپان آنے دیتے تھے۔ پہلی بار امریکا نے باضابطہ بہ حیثیت ملک جاپان سے رابطہ کیا اور یوں دنیا جاپان سے روشناس ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک امریکا اور جاپان کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اسی سے اچھے رہے باقی ایشیائی پڑوسیوں

سے جاپان کے تعلقات خراب تھے۔ روس، چین اور کوریا سے جاپان کی جنگیں ہو چکی تھیں۔ ان جنگوں میں جاپانی فتح یاب ہوئے کیونکہ امریکا سے انہوں نے جدید ٹیکنالوجی حاصل کرلی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم تک جاپان نہایت طاقتور ملک کے طور پر سامنے آیا تھا خاص طور سے اس کی بحری اور فضائی فوج کا مقابلہ خطے کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی تھی۔

جاپان نے دوسری جنگِ عظیم میں محوری طاقتوں کے ساتھ اتحاد کیا اور ایشیا میں جرمنی اور اٹلی کے ساتھ اتحاد کرلیا اس کے بعد جاپان نے ایشیائی ہمسایوں پر حملہ کیا۔ چین اور کوریا کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ اس حملے میں امریکا نے جاپان کی پوری حوصلہ افزائی کی۔ اسے عدم مداخلت کا یقین دلایا اس کے ساتھ امریکا کسی موقع کا منتظر رہا جب وہ ایشیا کی جنگ میں کود سکے۔ یورپ میں جرمنی نے روس پر حملے کی غلطی کی تھی تو اس کے ساتھی جاپان نے امریکا پر حملے کی غلطی کی۔ دونوں ممالک اپنی فوجی قوت اور وسائل کا بیشتر حصہ استعمال کر چکے تھے اور جنگ کے کمزور حصے میں تھے۔ وہ بڑے علاقوں پر قابض تھے اور قبضہ برقرار رکھنے کے لیے مزید طاقت اور وسائل کی ضرورت تھی۔ جس کا مہیا کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ گویا امریکا نے دشمن کے کمزور ہونے کا انتظار کیا اور پھر حملہ کیا۔

مشرق بعید کے بیشتر حصے پر قبضے کے بعد جاپان کو محسوس ہوا کہ امریکا پر حملہ کیے اور اسے زیر کیے بغیر اس کی فتح ادھوری رہے گی۔ 1942ء تک امریکا بحرالکاہل کی جنگ سے دور تھا۔ جزائر ہوائی میں پرل ہاربر کا امریکی اڈا دنیا کے چند بڑے بحری اڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے امریکا تقریباً پورے بحرالکاہل کو کنٹرول کرتا ہے۔ فلپائن، جاپان اور جنوبی کوریا میں اس کے بحری اڈے ذیلی شمار ہوتے ہیں گویا امریکا کی اصل طاقت پرل ہاربر میں ہوتی ہے۔ جیسے بحرہند میں ڈیگو گارشیا کا اڈا امریکا کے لیے اہم ترین ہے۔ جاپان نے سمجھا کہ اگر وہ پرل ہاربر کا اڈا تباہ کردے گا تو بحرالکاہل میں پھر اس کے سامنے کوئی کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس منصوبے کے پس پشت اس وقت کا جاپانی وزیراعظم اور طاقتور سیاست دان ہائیڈیکی توجو تھا۔ اس نے بحری فوج کے اہم کمانڈروں کی مخالفت کے باوجود اس حملے کا حکم جاری کیا۔ ایک سال کی منصوبہ بندی کے بعد جاپانی پرل ہاربر پر حملہ آور ہوئے۔ پرل ہاربر کو شدید نقصان پہنچا لیکن جاپانی اسے مکمل تباہ کرنے میں ناکام رہے۔ امریکیوں نے صرف ایک مہینے کے مختصر عرصے میں بندرگاہ کو پھر سے فعال کرلیا۔ امریکا سے نئے بحری جہاز اور طیارے آگئے اور امریکا بحرالکاہل کی جنگ میں کود پڑا جو جاپان کی مکمل شکست اور دو شہروں کی مکمل تباہی پر ختم ہوئی۔ وزیراعظم توجو کے اس سیاسی فیصلے کو جاپانی شکست کا ذمے دار قرار دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

سوویت یونین کے قیام اور کمیونزم کی تحریک کی کامیابی کے بعد ایشیا میں چین نے بھی اس کی پیروی کی اور ماؤزے تنگ کی قیادت میں لانگ مارچ کی مدد سے چین کو سامراجی شہنشاہیت سے نجات دلا کر سوشلسٹ ملک بنا دیا۔ اس کے فوراً بعد سوویت یونین نے چین کی بڑے پیمانے پر جنگی اور معاشی مدد شروع کردی۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سوشلزم میں فرق کی بنا پر دونوں ملکوں میں اختلاف پیدا ہوا اور چین اپنے تشریح کردہ سوشلزم پر ڈٹ گیا جس میں خارجہ عدم مداخلت کا پہلو نمایاں تھا۔ چین انقلاب برآمد کرنے کے نظریے کا مخالف تھا اور اس نے اپنے کسی پڑوسی پر سوشلزم مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی مشرق بعید کے تمام ملکوں میں کمیونزم اصل میں سوویت یونین کی کوششوں سے آیا۔ ہاں چین کسی حد تک مددگار رہا۔ تعلقات خراب ہوئے تو سوویت یونین نے چین میں جاری تمام پروجیکٹس پر کام روک دیا۔ حد یہ کہ جو پروجیکٹ جہاں تھا روسی اسے وہیں چھوڑ کر اس کی ساری ڈرائنگ تک ساتھ لے گئے۔

مگر یہ فیصلہ خود روس کے حق میں نامبارک ثابت ہوا۔ چین خوراک میں خود کفیل تھا جب کہ روس چین سے بڑا رقبہ رکھنے کے باوجود خوراک میں خود کفیل نہیں تھا۔ ویت نام سے فوجی پسپائی نے روس کو کچھ سالوں کے لیے بغلیں بجانے کا موقع دیا اور اس نے اپنی معاشی حالت کی پروا کیے بغیر افغانستان پر چڑھائی کا تباہ کن فیصلہ کیا۔ اسے بیسویں صدی کا سب سے غلط سیاسی فیصلہ بھی کہا جاتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر روسی جارحیت کے خلاف ووٹ دینے والوں میں چین بھی شامل تھا اور اس معاملے میں وہ امریکا اور پاکستان کے موقف کے ساتھ تھا۔ یہ چین کا سوویت یونین کو اس کی بے وفائی کا جواب تھا جو اس نے اس سے تعلق توڑ کر کیا تھا۔ چین نے خود کفالت

کی ٹھان لی اور آج چین سپر پاور ہے۔ جب کہ دس سالہ افغان جنگ نے سوویت یونین کو اس حالت میں پہنچا دیا جس میں وہ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے تھا۔ افغانستان سے پسپائی اس کے لیے تباہ کن اور موت کا پیغام ثابت ہوئی۔

گورباچوف نے اصلاحات کا عمل شروع کیا لیکن یہ اصل میں سوویت یونین کی آخری رسومات تھیں۔ صدی کے آخری عشرے کے ساتھ ہی روسی سپر پاور بکھر گئی۔ یہی نہیں بلکہ یہ پانچ صدی قبل کی ان سرحدوں تک واپس چلی گئی جہاں سے اس نے وسعت کا سفر شروع کیا تھا۔ ماہرین سوویت یونین کے زوال کو جدید دور کے سیاسی اسٹیج کا سب سے المناک ڈراما قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف ایشیائی مقبوضات نے آزادی حاصل کر لی اور دوسری طرف مشرقی یورپ کے ممالک اس کے چنگل سے آزاد ہو کر مغربی ممالک کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ جرمنی متحد ہو گیا۔ پولینڈ، بلغاریہ، رومانیہ، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری جیسے سوشلسٹ ممالک اب خالص سرمایہ دارانہ معیشت کے حامل ہیں۔ یوکرین اور جارجیا جیسے وفادار خطے اب روس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ دنیا کے نقشے میں سب سے ڈرامائی تبدیلی ثابت ہوئی۔

غلط فیصلہ کر کے سوویت یونین نے اپنا واحد حلیف کھو دیا۔ چین نے سوویت یونین کے بکھرنے سے سبق حاصل کیا اور اس نے سیاسی اور معاشی اصلاحات کا پروگرام شروع کیا خاص طور سے معیشت کھول دینے سے چین نے گزشتہ پچیس برس میں ترقی کی ناقابلِ یقین منازل طے کیں۔ سپر پاور تو وہ پہلے بھی تھا لیکن اب وہ دنیا کی دوسری بڑی معیشت کا حامل ملک ہے جس کے بارے میں ماہرین پیش گوئی کر چکے ہیں کہ اس عشرے کے خاتمے سے پہلے چین دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن جائے گا۔ آج کل معاشی طور پر مضبوط ہونے کا مطلب ہی سپر پاور ہونا ہے کیونکہ جدید جنگ بہت مہنگی ہو چکی ہے صرف دولت مند ممالک ہی اسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ایک غلط سیاسی خطا نے ایک سپر پاور کو بکھیر دیا اور ایک درست فیصلے نے ایک چھوٹی سپر پاور کو مستقبل کی بڑی سپر پاور میں تبدیل کر دیا۔

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 93

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان سے مقابلہ جاری تھا کہ مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ پھر عبداللہ کی کوٹھی پر۔ ہم وہیں تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ مگر شہلا نکل گئی۔ ہم مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائیرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر وہ میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا۔ میں نے رامن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی دل آ گیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پا لیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا ”شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔“ میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر مارا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنکاری جب ہیلی کاپٹر واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہو گیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے، میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر نئے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی نا کا بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی بیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ بینا کا شوہر ارون اسے حراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر......“ مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا بیتو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں رشا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا۔

اب آگے پڑھیں

اس سے پہلے مجھے کبھی اپنی وفات کا اتنا یقین نہیں ہوا تھا جتنا کہ مرشد کی کوٹھی کے احاطے میں زمین پر پڑے ہوئے آیا تھا۔ میرے ساتھی آ گئے تھے اور میں انہیں دیکھتے ہوئے اپنے طور پر دنیا سے گزر گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف دھند ہے یا روئی کی دھکے ہوئے بادل ہیں اور میں ان کے درمیان تیر رہا ہوں۔ میرا جسم اتنا ہلکا پھلکا ہو رہا تھا جیسے بس روح رہ گیا ہو۔ شاید مرنے کے بعد انسان ایسی ہی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ جسم دنیا میں رہ جاتا ہے اور وہ لطیف روح کے ساتھ دوسری دنیا میں پہنچتا ہے۔ میں اس جگہ اکیلا تھا۔ مگر نہیں میرے آس پاس کوئی تھا۔ مجھے کسی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ایک چہرہ میرے سامنے نمودار ہوا۔ وہ عین میرے اوپر تھا۔ وہ واضح نہیں تھا مگر مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”ہم کو نہیں پہچانتا۔“ اس نے کہا۔

”فتح خان۔“ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم بھی مر گئے ہو؟“

”ہم نہیں مرا جب تک ہم وہ ہیرے حاصل نہیں کر لے گا ہم نہیں مرے گا۔“ اس نے جواب دیا اس کا چہرہ واضح ہو گیا تھا۔ ”شہباز خان تم جانتا ہے وہ ہیرا کدھر ہے۔“

”فتح خان تمہاری ڈھٹائی پر حیرت ہے تم جانتے ہو میں تمہارے خون کا پیاسا ہوں اگر تم میرے سامنے آئے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

”ابھی تم ہم کو قتل نہیں کر سکتا، تم انگلی بھی نہیں ہلا سکتا، ابھی میں تم کو قتل کر دے تو تم کچھ نہیں کر سکے گا۔ پر شہباز خان، ہم تم کو قتل نہیں کرے گا۔ بس یاد رکھنا ہم کو وہ ہیرے چاہئیں۔ کسی بھی قیمت پر......“ بولتے ہوئے فتح خان کا چہرہ دھندلانے لگا اور پھر وہ اور اس کی آواز دونوں دھند میں غائب ہو گئے اور کچھ دیر بعد یہ دھند بھی غائب ہو گئی۔

☆☆☆

مجھے اچانک ہوش آیا تو میں نے خود کو اسی دنیا میں اور

اسی جانی پہچانی جگہ پایا جہاں مجھے ایک بار پہلے بھی اسی طرح ہوش آچکا تھا۔ میں اسی صوفے پر ڈیوڈ شا کے عین سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سفید فام گرگا اس کے عقب میں پوزیشن سنبھال رہا تھا شاید اسی نے مجھے وہ عجیب سی خوشبو والی دوا سونگھائی تھی جو بے ہوشی سے ہوش میں لے آتی ہے۔ میں نہایت صاف ستھری حالت میں اور صاف سفید لباس میں تھا۔ جسم ہلکا پھلکا اور درد کا نام و نشان نہیں تھا حالانکہ مجھے درگاہ مرشدیہ میں بے شمار زخم آئے تھے اور سانپ نے الگ کاٹا تھا۔ سب سے بڑھ کر میری کلائی پر بندھے کڑے سے سائنائڈ میرے جسم میں انجکٹ ہوا تھا۔ کڑا اب بھی میری کلائی میں تھا۔ مجھے خیال یہ آیا کہ شاید میں پھر خواب دیکھ رہا ہوں۔ مگر اب سب واضح تھا۔ وہ سب دھندلا اور غیر واضح تھا۔ اس لیے وہ خواب تھا اور بھلا فتح خان یہاں کہاں سے آگیا۔ میں اس وقت ہلکا پھلکا تھا اور اپنے وجود کو محسوس کررہا تھا۔ یہ خواب نہیں تھا۔

لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ دنیا کا مہلک ترین زہر ایک خاص میکنزم کے تحت میرے جسم میں انجکٹ ہوگیا تھا اور مجھے سو فیصد فوت ہو جانا چاہیے تھا تب میں زندہ کیسے تھا؟ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ جس طرح میرے جسم نے سانپ کے زہر کو ناکارہ بنا دیا تھا اسی طرح وہ پوٹاشیم سائنائڈ کو بھی ناکارہ بنا دے گا۔ سانپ کا زہر خطرناک ہوتا ہے مگر اس کے مالی کیولز آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں جس کے بعد یہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ باسو نے مجھے اینٹی ڈوٹ بھی دیا تھا جس سے میری حالت بہت تیزی سے سدھر گئی تھی مگر کیمیائی زہر کے مالی کیولز بہت سخت ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ زہر آسانی سے ناکارہ نہیں ہوتا ہے۔ پھر پوٹاشیم سائنائڈ کا تو کوئی توڑ ہی نہیں ہے ایک بار یہ ہلاکت خیز مقدار میں جسم میں داخل ہو جائے تو صرف قدرت ہی انسان کو مرنے سے بچا سکتی ہے۔ تو کیا مجھ پر قدرت نے مہربانی کی تھی یا؟

میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ”ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہو گئیں۔“

”میں نے غالب کو پڑھا ہے۔“ اس نے اردو میں کہا۔ ”میں اسے دنیا کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتا ہوں۔“

”شکر ہے کہ تم نے سمجھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ غالب کو تو یہاں کے لوگ نہیں سمجھتے۔ اگر تم مشکلوں کی جگہ حیرت کرلو تو میری کیفیت با آسانی سمجھ سکو گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تمہاری حیرت بجا ہے اور میرے پاس اس کی وضاحت ہے۔“

”کیسی وضاحت؟“

”ایک وضاحت تو یہ ہے کہ کڑے میں سائنائڈ نہیں بلکہ بے ہوشی کی دوا تھی اس لیے تم مرے نہیں صرف بے ہوش ہوئے۔“

”اور دوسری وضاحت؟“

”سائنائڈ کڑے میں نہیں بلکہ فاضلی کی انگلی میں موجود انگوٹھی میں تھا۔ چار سو ملی گرام خالص سائنائڈ۔“

میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں وقت جتنی پیچیدگی کے ساتھ گزرا۔ مجھے ہر لحظہ کسی نئی چیز سے دوچار ہونا پڑا۔ دشمنوں نے مجھے اور میں نے دشمنوں کو لاتعداد چکر دیے۔ دھوکا در دھوکا تھا۔ مگر ڈیوڈ شا کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ایسا چکر اور ایسے دھوکے میرے گمان میں بھی نہیں آئے تھے۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”فاضلی کی انگوٹھی میں سائنائڈ...... تو اس کا کیا ہوا؟“

”جیسے ہی پچاس گز کی حد پوری ہوئی اس کی انگوٹھی میں موجود میکنزم حرکت میں آگیا اور زہر اس کی انگلی میں انجکٹ ہوگیا۔“

”وہ مرگیا؟“ میں نے احمقوں کی طرح پوچھا۔ غالباً میرا منہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔

”مشکل سے دس سیکنڈ میں۔“

میں نے گہری سانس لی اور اپنے منتشر ہو جانے والے اعصاب کو پُرسکون کرنے لگا۔ اب کچھ کچھ معاملہ میری سمجھ میں آرہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے میرے حوالے سے غلط بیانی کی تھی اور بہ ظاہر مجھے غلام بنا کر فاضلی کے حوالے کردیا تھا تاکہ میں مرشد کے خلاف جنگ میں شامل ہوں۔ دوسری طرف اس نے باسو کو میرا نگران اور محافظ مقرر کردیا۔ باسو کا کام مجھے تجاوز ہونے سے روکنا اور فاضلی کی جانب سے میرا تحفظ کرنا تھا۔ اس نے اپنا یہ فرض بہ خوبی انجام دیا۔ حیرت کے دورے پر قابو پاکر میں نے چند منٹ بعد کہا۔ ”ڈیوڈ شا اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد نے اس خطے میں کن سیاستوں سے کام لیا اور پورے ایک صدی تک یہاں حکومت کی۔“

وہ مسکرایا تو اس کے انداز میں تفاخر تھا۔ ”میں ان باہمت لوگوں کی برابری نہیں کرسکتا کہ انہوں نے بہت ناموافق حالات میں کام کیا تھا۔“

”حالات موافق نہیں ہوتے کیے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ فاضلی کے مرنے کا سن کر مجھے ناقابلِ بیان خوشی ہو رہی تھی اور اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ رومانہ کے حوالے سے اپنے مکروہ منصوبے میں ناکام رہا ہوگا۔ اسے مہلت ہی کہاں ملی ہوگی کیونکہ باسو مجھے مشکل سے ایک منٹ میں باہر لے آیا تھا اور آخر وقت میں، میں نے مزاحمت ترک کرکے اس کا کام اور آسان کردیا تھا۔ ”مرشد زندہ ہے؟“

”ظاہر ہے۔“ ڈیوڈ شا نے جواب دیا۔

”رومانہ اور اس کا شوہر راشد......“

”سب ٹھیک ہیں۔“ اس بار اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”گزشتہ چوبیس گھنٹے کے حالات تمہیں اخبارات سے پتا چل جائیں گے۔ ابھی اپنی بات کرو۔“

میں اپنی بات کرنے کی بجائے سوچ رہا تھا کہ میں یہاں تک کیسے آیا۔ وسیم اور عبداللہ وہاں آگئے تھے اور ان کے ہوتے ہوئے باسو مجھے کیسے واپس لے آیا۔ میں نے کسی قدر سرد لہجے میں پوچھا۔ ”میرے ساتھیوں کے ہوتے ہوئے باسو مجھے یہاں کیسے لایا؟“

”بہت آسانی سے۔“ ڈیوڈ شا مسکرایا۔ ”اس نے تمہارے ساتھیوں کے سامنے دو آپشن رکھے، ایک تمہاری لاش لے جائیں اور دوسرا تمہیں زندہ سلامت باسو کے ساتھ جانے دیں۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ”ظاہر ہے میرے ساتھیوں نے دوسرا آپشن چنا۔ ڈیوڈ شا میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ تم نے فاضلی کی مدد کیوں کی اور پھر مجھے اس کے حوالے کیوں کیا اور پھر میرے بجائے اسے زہر دے دیا؟“

ڈیوڈ شا نے میرے سوالات سنے اور انہیں نظر انداز کرکے بولا۔ ”مرشد بچ گیا ہے مگر اس وقت سرکاری تحویل میں ہے اور اس سے درگاہ میں ہونے والی قتل و غارت گری کے بارے میں تفتیش ہورہی ہے۔“

”کیا فائدہ؟“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”وہ اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر بچ جائے گا۔“

”اب مشکل ہے۔“ ڈیوڈ شا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”درگاہ میں مارے جانے والے دو درجن سے زیادہ افراد ایسی تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے جن پر بین الاقوامی پابندیاں ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص ان پابندیوں کا نشانہ بن سکتا ہے۔ مرشد کی جان بخشی اتنی آسانی سے نہیں ہوگی۔“

”تم نے اسے سزا دی ہے۔“

”ایسا ہی سمجھ لو، وہ ایسا سانپ بن گیا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔“

میں نے کسی قدر بے چینی کے ساتھ کہا۔ ”لیکن وہ زندہ ہے اور جب تک وہ زندہ ہے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ جھٹکا اس کے لیے کافی ہے۔“

”ڈیوڈ شا مجھے تمہارے خیال کی نہیں ٹھوس یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ مرشد میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے بے ضرر بن گیا ہے۔“

میں بہ ظاہر ڈیوڈ شا سے سوالات کررہا تھا مگر اس کا کھیل میرے ذہن میں واضح ہوتا جارہا تھا۔ اس نے مرشد کو سزا دینے کے لیے فاضلی کو استعمال کیا مگر ساتھ ہی اس سے چھٹکارے کا بندوبست بھی کرلیا۔ مرشد کی اصل طاقت درگاہ تھی۔ ڈیوڈ شا نے اس جگہ کو تباہ کردیا۔ یہ مرشد کے لیے بہت بڑا نقصان تھا۔ اسے ڈیوڈ شا کی ضمانت ٹھکرانے کی سزا ملی۔ مگر ڈیوڈ شا نے اسے مارا نہیں ورنہ باسو کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ ڈیوڈ شا نے اسے اپنی طاقت دکھائی کہ وہ اپنی ایک بھی گولی ضائع کیے بغیر اس کے خلاف کیا کرسکتا ہے اور وہ راہِ راست پر نہ آیا تو وہ ایک گولی ضائع بھی کرسکتا ہے جو مرشد کے دل یا دماغ میں اتر جائے گی۔ دوسری طرف اس نے مجھے رام کرنے کے لیے میرے ایک دشمن کو ٹھکانے لگا دیا اور دوسرے کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ فی الحال وہ مجھ سے دشمنی کرسکے۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ اب میں آزاد تھا۔ میں نے اس سے جو سوالات کیے تھے، اس نے ان کا جواب نہیں دیا اور اب ان کے جواب خود واضح ہو رہے تھے۔

میں مطمئن نہیں تھا۔ میں مرشد کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنی سرشت نہیں چھوڑ سکتا تھا اور جیسے ہی وہ دوبارہ طاقتور ہوتا پھر سے میرے خلاف میدان میں اتر آتا۔ مقامی سطح پر اس کے خلاف کوئی انکوائری بیکار تھی اور نہ ہی اس سلسلے میں بین الاقوامی دباؤ کام کرسکتا تھا۔ کتنی ہی تنظیمیں بین الاقوامی پابندیوں کا شکار ہیں مگر وہ آزادی سے کام کررہی ہیں۔ ایک مرشد کو کیا فرق پڑتا۔ ڈیوڈ شا اس تماشے کے بعد مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور جب اس کا کام نکل جاتا تو اس کی بلا سے مرشد میرے ساتھ کیا کرتا ہے۔ وہ پلٹ کر بھی نہ پوچھتا اور جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا تو ڈیوڈ شا مجھ سے بھی کم خار نہیں رکھتا تھا صرف وادی تک جانے کی مجبوری اور وہ بھی اس کے خیال میں تھی جس کی وجہ سے وہ میرے آگے مجبور ہورہا تھا۔

جب میں سوچتا کہ جدید ترین دنیا کا باسی جو اس دنیا کے حکمرانوں میں بھی شامل ہے وہ ایک بوڑھے کی بات کو

اتنی سنجیدگی سے لے رہا ہے تو میرا اوپر والے کی ذات پر ایمان اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ ساری کائنات اور اس کا ایک ایک ذرہ اس کا کھلونا ہے وہ اس سے جیسے چاہے کھیلتا ہے۔ اکڑنے اور تکبر کرنے والا انسان بھی نہیں جانتا کہ وہ جو کررہا ہے اس میں اس کی کوئی مرضی شامل نہیں ہے وہ اس خالق حقیقی کے آگے اس سے زیادہ بے بس ہے جتنا سیلاب کے پانی کے آگے ایک حقیر تنکا ہوتا ہے۔ مگر ڈیوڈ شا اور مرشد جیسے لوگ یہ بات سمجھ نہیں سکتے۔ اگر سمجھ سکتے تو تکبر کیوں کرتے۔ اللہ جسے تباہ کرنا چاہتا ہے اسے اس لاعلاج بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ غرور کرنے والے کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور ڈیوڈ شا بہ غور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔

"اگر تم مرشد کی موت چاہتے ہو تو یہ بھی ممکن ہے۔"

"میں مرشد یا کسی کی بھی موت نہیں چاہتا۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ میرا کوئی مسئلہ حل کردو، یہ تو تم ہو جو میرے پیچھے پڑے ہو۔ اس لیے جو فیصلہ کرنا ہے تمہیں خود کرنا ہے۔ تم چالاکی سے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں ٹھوس ضمانت چاہتا ہوں اور اب یہ تم پر ہے کہ تم مجھے کس طرح مطمئن کرتے ہو۔"

ایک لمحے کے لیے ڈیوڈ شا کے چہرے پر جھنجلاہٹ نظر آئی تھی۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح تو تم کبھی رضامند نہیں ہو گے۔"

"دوسرا طریقہ بھی ہے میں تمہارے قبضے میں ہوں مجھے اسی طرح وادی کی طرف لے جاؤ اور اس بوڑھے کے سامنے پیش کردو جس نے میری جان عذاب میں کرنے والی شرط لگائی ہے۔ شاید تمہیں وادی میں اترنے کی اجازت مل جائے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "یہ آپشن تو میرے پاس ہمیشہ سے ہے لیکن میں تمہیں اس طرح نہیں لے جانا چاہتا۔"

"دوسرا طریقہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ مجھے مطمئن کرو اور میرے دو ساتھی بھی ساتھ جائیں گے۔ میں صرف وادی تک جاؤں گا اور پھر واپس آ جاؤں گا مجھے نیچے اترنے کا قطعی شوق نہیں ہے اور نہ ہی میں اتروں گا۔"

"اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن پہلے مرشد۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو ڈیوڈ شا سوچ میں پڑ گیا۔ میرے جسم پر آرام دہ پاجامہ اور کھلی سی ٹی شرٹ تھی۔ جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں میڈی کیٹڈ پٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ میں خود کو جسمانی طور پر بہترین محسوس کررہا تھا۔ اگرچہ درد کش دواؤں کا اثر بھی ہو سکتا تھا مگر میں اپنے اندر ایسی توانائی محسوس کررہا تھا جیسے میں بہت اچھا وقت گزارتا ہوا آیا ہوں۔ ڈیوڈ شا کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ وہاں کہیں کوئی گھڑی نہیں تھی جس میں، میں وقت دیکھ سکتا اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابھی کیا وقت ہو رہا ہے۔ میری بات پر ڈیوڈ شا نے گہری سانس لی۔

"شہباز میں کبھی کسی شخص کے سامنے اتنا بے بس نہیں ہوا۔"

"کیونکہ مجھے تم سے غرض نہیں ہے تمہیں مجھ سے غرض ہے۔" میں نے وجہ بیان کی۔ ہمارے درمیان گفتگو اردو میں ہو رہی تھی شاید اسی لیے ڈیوڈ شا نے اپنے گرگے کے آگے بھی کھل کر اعتراف کر لیا۔ اسے یقیناً اردو نہیں آتی تھی۔ ڈیوڈ شا نے سر ہلایا اور بولا۔

"ٹھیک ہے میں سوچوں گا کہ تمہیں کیسے مطمئن کروں۔ تب تک تم آرام کرو۔"

"میں آرام کروں گا لیکن میرے ساتھی سکون سے نہیں ہوں گے اور وہ مجھے تلاش کررہے ہوں گے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ وہ تمہارے ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے کوئی ہنگامہ ہو اس سے پہلے میرے بارے میں فیصلہ کر لو۔" میں نے اسے خبردار کیا اور کھڑا ہو گیا۔ میں نے ڈیوڈ شا کو حرکت کرتے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے کوئی خفیہ اشارہ ارسال کیا اور فوراً ہی باسو وہاں آ گیا۔ اس نے حسب معمول بڑی سی نیکر اور بنیان پہنی ہوئی تھی اور اس کے جسم پر جہاں جہاں زخم آئے تھے وہاں پٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ ڈیوڈ شا کو کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں باسو کے ساتھ ہولیا۔ میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔

"تم ٹھیک ہو نا؟"

اس نے صرف سر ہلایا اور میرے لیے مخصوص کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں نے اندر جانے سے پہلے اس سے کہا۔ "باسو اگرچہ تم میرے دشمن کے ساتھ ہو لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے کئی مواقعوں پر میری مدد کی اور میری جان بچائی۔"

وہ مجھے گھورتا رہا اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس قسم کے الفاظ اور جذبات اس کے لیے اجنبی تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے عقب سے دروازہ بند کر دیا۔ کمرا بہت سادہ سا تھا۔ چھت، فرش اور دیواریں بہت سفید تھیں اور ایک طرف

سفید ہی رنگ کا پتلے گدے والا سنگل بیڈ تھا۔ اس پر سفید تکیہ تھا۔ ایک طرف براؤن رنگ کی پلاسٹک کی میز اور پلاسٹک کی ہی کرسی تھی اور میز پر کھانے پینے کا خاصا سامان نظر آ رہا تھا۔ اس میں تازہ پھل، جوس اور انرجی ڈرنک کے ٹن تھے۔ میں نے چوبیس گھنٹے سے پانی نہیں پیا تھا اور منہ کسی قدر خشک تھا اس لیے پیاس نہ ہونے کے باوجود میں نے نصف گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور پھر اپنا جائزہ لیا شرٹ اتار کر دیکھنے پر پتا چلا کہ میرا تقریباً پورا ہی جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا اور جا بہ جا پٹیاں چپکی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی زخم اور نیل تھے مگر ان پر پٹی لگانے کی ضرورت نہیں تھی اور اب وہ بھرنے والی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ اتفاق سے کوئی زخم خطرناک نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن میں یہ بھر جائیں گے اور باقی زخموں کی پٹی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ تین دن بعد ان کے نشانات بھی غائب ہو جائیں گے۔

میں وقت گزاری کے لیے ایک بڑا سیب لے کر بستر پر دراز ہو گیا اور سیب سے شغل کرنے لگا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آیا کہ ان کی کیا حالت ہو گی جب ان کے سامنے مجھے بے بس کر کے لے جایا جا رہا ہو گا۔ اب وہ مجھے تلاش کررہے ہوں گے۔ میں نے ڈیوڈ شا کے سامنے بڑک ضرور ماری تھی کہ میرے ساتھی یہاں تک آ سکتے ہیں مگر مجھے امید نہیں تھی کہ ایسا ہو گا۔ ڈیوڈ شا کے آدمی بہت تربیت یافتہ اور ہوشیار ہیں۔ وہ مجھے یوں لائے ہوں گے کہ میرے ساتھیوں کو تعاقب کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ یہاں بھی وقت دیکھنے کا بندوبست نہیں تھا۔ مجھے ڈیوڈ شا کی بات یاد آئی کہ درگاہ میں بعد میں ہونے والے واقعات کی خبر مجھے اخباروں سے مل جائے گی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا تو چند لمحے بعد باسو نے دروازہ کھولا۔ میں نے فرمائش کی۔

"مجھے تازہ ترین اخبارات چاہئیں۔ اگر آج صبح کا وقت ہے تو کل کے اخبارات بھی درکار ہوں گے۔ جتنے بھی مل جائیں سب لے آؤ۔"

اس نے سر ہلایا اور دروازہ بند کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اخبارات کا ایک بنڈل اٹھائے نمودار ہوا اور اس نے یہ بنڈل فرش پر رکھ دیا۔ "اس میں شہر میں ملنے والا ہر اخبار ہے۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا۔ یہ گزشتہ روز کے اور آج کے تازہ اخبار تھے اس کا مطلب تھا کہ نیا دن طلوع ہو گیا تھا۔ اردو اور انگریزی کے کوئی درجن اخبار تھے اور پھر ان کی دو دن کی کاپیاں تھیں۔ میں نے چن کر کچھ معتبر اخبارات نکالے اور ان میں درگاہ سے متعلق خبریں دیکھنے لگا۔ وہاں ہونے والی قتل و غارت گری اور ہنگامہ اتنا بڑا تھا کہ آج کی بیشتر خبریں بھی اسی کے بارے میں تھیں۔ دراصل رات کے آخری پہر تک جاری رہنے والے ہنگامے کی اطلاعات اگلے دن کے اخبارات تک دیر سے پہنچیں اور اکثر اخبارات میں محدود خبر تھی البتہ آج بھرپور کوریج کی گئی تھی۔ مجھے تمام خبریں دیکھنے میں دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تھا۔

ان خبروں کا خلاصہ یہ تھا کہ درگاہ مرشد پر باہر سے نامعلوم افراد نے حملہ کیا اور وہاں موجود افراد کو قتل کرنے لگے۔ درگاہ کے محافظوں اور وہاں موجود ایسے مسلح افراد جن کے بارے میں پولیس کو یقین ہے کہ ان کا تعلق غیر قانونی قرار دی جانے والی مسلح تنظیموں سے تھا۔ انہوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا مگر وہ تعداد میں زیادہ اور منظم تھے ان کی قیادت فاضلی نامی شخص کررہا تھا جو کچھ عرصے پہلے تک درگاہ سے متعلق تھا مگر پھر کسی وجہ سے وہ مرشد اور درگاہ کی دشمنی پر اتر آیا۔ فاضلی کے بارے میں یہ بیان یقیناً مرشد نے دیا ہو گا۔ مگر اس نے میرا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر کیا تھا تو یہ خبر ابھی پریس اور میڈیا تک نہیں پہنچی تھی۔

باہمی لڑائی میں تقریباً ایک سو سے زیادہ افراد مارے گئے تھے اور درگاہ اور گدی نشین خاندان سے متعلق دو درجن سے زیادہ لوگ پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ بعض اخبارات نے یہاں ماضی میں ہونے والی ہنگامہ آرائیوں کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ اگرچہ بیشتر اخبارات اور خبر نویسوں کا جھکاؤ مرشد کی طرف تھا۔ کیونکہ بہ ظاہر اسے نقصان ہوا تھا اور اس پر حملہ کیا گیا تھا۔ لیکن کچھ سنجیدہ صحافیوں نے سوالات اٹھائے تھے اور اپنی رپورٹس میں اشارے دیے تھے کہ یہ درگاہ نہ صرف عیاشی کا اڈہ ہے بلکہ یہاں دوسرے غیر قانونی دھندے بھی زور و شور سے جاری رہے ہیں جن سے پولیس چشم پوشی کرتی رہی ہے۔ حکومت اس بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیق کرے کہ آخر یہ جگہ اتنے ہنگاموں کا مرکز کیوں ہے؟

پولیس رپورٹ بہت لگی بندھی تھی اور اعلیٰ پولیس افسران نے پریس سے کہا کہ اب تک کسی ملزم کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ بچ جانے والے حملہ آور پولیس کی آمد سے پہلے فرار ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ اس سوال پر کہ پولیس کئی گھنٹے کی تاخیر سے کیوں پہنچی تو ان افسران نے علاقے میں بجلی اور موبائل کمیونیکیشن کی بندش کو اس تاخیر کا

ذمے دار قرار دیا۔ حملہ آوروں نے تمام رابطے منقطع کردیے تھے البتہ وہ اس کی وضاحت نہیں کرسکے کہ علاقے میں گشت کرنے والی پولیس فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سن کر بھی جائے وقوع پر کیوں نہیں پہنچی تھی؟ تفتیش ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی اس لیے پولیس افسران کے پاس جان چھڑانے کا بہانہ تھا اور بعد میں وہ یہ کہہ کر بات کرنے سے انکار کرسکتے تھے کہ اس سے مجرموں تک رسائی میں مشکل ہوگی اور چند مہینے بعد خود پریس کو اس کیس سے کوئی دل چسپی نہیں رہے گی۔

میں نے محسوس کیا کہ مرشد پر فرد جرم عائد ہونا مشکل ہے۔ ایک تو وہ خود شکار ہوا تھا اور دوسرے کوئی حملہ آور پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ درگاہ کے تمام اہم لوگ اور وہاں باہر سے منگوائے گئے کرائے کے گوریلے مارے جاچکے تھے اور اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ مرشد کا ان کے بارے میں کیا موقف تھا۔ بہرحال وہ شاطر سیاست داں آدمی تھا۔ وہ جواز گھڑ سکتا تھا۔ اپنے چچازادوں کی موت کو بھی وہ اپنے حق میں استعمال کرسکتا تھا اور اس کا الزام فاضلی پر لگا سکتا تھا۔ فاضلی اس کی تردید کرنے کے لیے زندہ نہیں تھا۔ مرشد کا بہت بڑا نقصان ہوا تھا مگر ساتھ ہی اسے اپنے مریدوں اور علاقے کے لوگوں کی مزید ہمدردیاں بھی حاصل ہوگئی تھیں۔ وہ درگاہ دوبارہ تعمیر کرا لیتا اور زیادہ سے زیادہ ایک سال میں سب پہلے کی طرح ہوجاتا بلکہ اب آمدنی میں کوئی شریک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سب مرشد اور اس کی جائز اولاد کا تھا۔

میرے لیے سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس سارے ہنگامے میں میرا کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔ کچھ اخبارات میں دشمنی کے حوالے سے میرا ضمنی سا ذکر آیا تھا کہ ماضی میں میرا اور مرشد کا ٹکراؤ ہوتا رہا تھا اور اس سے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی ہوا تھا۔ مرشد کا بھائی نادر اور میرا بھائی بھی اس تنازعے کی نظر ہوئے تھے۔ میرے خلاف عدالتوں میں مقدمات چلتے رہے جو بالآخر میرے حق میں ختم ہوئے۔ مگر میں نے درگاہ میں ہونے والی قتل و غارت گری میں جو سرگرم کردار ادا کیا تھا اس کا کہیں بھی اشارہ نہیں تھا۔ پولیس کے مطابق درگاہ کے لوگوں کے علاوہ جو وہاں مارے گئے تھے ان میں سے اکثر اشتہاری اور سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ ایسے افراد کی تعداد مارے جانے والے کل افراد کا ساٹھ فیصد تھی۔ ایک سو بارہ افراد میں مطلوب افراد کی تعداد چھپن تھی۔

میں جانتا تھا کہ باقی جو مارے گئے وہ بھی کوئی شریف نہیں تھے۔ مرشد کے خاص افراد تھے جو اس کے جرائم میں برابر کے شریک تھے اور یہی لوگ وہاں کا نظام چلاتے تھے۔ کچھ عام ملازمین تھے جو مارے گئے۔ پولیس اور انتظامیہ نے درگاہ کو سیل کردیا تھا اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مرشد خاندان کو بھی مرشد ہاؤس منتقل کردیا گیا تھا اور پولیس وہاں کی سیکیورٹی کر رہی تھی۔ اس کے باوجود سو سے زیادہ افراد کی ہلاکت معمولی واقعہ نہیں تھی۔ صوبائی اور وفاقی حکومت نے اس کا نوٹس لیا تھا اور عدالت نے بھی از خود نوٹس کے تحت اس کی رپورٹ طلب کرلی تھی۔ ان سب خبروں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُمید تھی کہ مرشد کی اتنی آسانی سے گلوخلاصی نہیں ہوگی۔ ڈیوڈ شا ٹھیک کہہ رہا تھا مگر میں نے بھی اسے بالکل ٹھیک جواب دیا تھا۔ مجھے ٹھوس ضمانت درکار تھی۔ اگر ڈیوڈ شا اپنے طور پر مرشد کا پتا صاف کرسکتا تھا تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر میں اپنی زبان سے اس کی موت کی خواہش نہیں کرسکتا تھا۔ اس صورت میں ڈیوڈ شا اس کی ٹوپی میرے سر رکھ دیتا۔

میں ایک بار پھر قید میں تھا لیکن حالات بہرحال اتنے خراب نہیں تھے جتنے کہ فاضلی کی قید میں تھے۔ ڈیوڈ شا نے میری جان پر رسک لیا تھا اور اس دوران میں کتنے مواقع ایسے آئے جب موت میرے پاس سے گزری تھی۔ گولیوں اور دستی بموں سے میں کیسے بچا میں خود بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں اب بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب میں ڈیوڈ شا کے لیے اتنا ضروری تھا تو اس نے مجھے ایک ایسے معرکے میں کیسے جھوک دیا جس میں انسان کی زندگی کے اگلے پل کا پتا نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے ڈیوڈ شا لاشعوری طور پر میری موت چاہتا تھا اور شعوری طور پر میری زندگی کا خواہاں تھا۔ اس سے یہ فیصلہ اس کے لاشعور نے کرایا تھا لیکن یہ میرا خیال بھی ہوسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے اپنے تعین مجھے بچانے کے مکمل انتظامات کیے ہوں۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور باسو ناشتے کی ٹرالی اندر لایا۔ وہ اس نے میز کے پاس چھوڑ دی اور خود باہر نکل گیا۔

ٹرالی میں توس، مکھن، جیم، شہد اور ابلے و تلے ہوئے انڈوں کے ساتھ چائے اور کافی کے سربہ مہر مگ تھے جن میں دونوں چیزیں گرم حالت میں موجود تھیں۔ ان میں ملانے کے لیے کنڈینسڈ ملک، چینی اور کریم الگ سے تھی۔ یہ مکمل اور بھرپور ناشتا تھا اور میں نے اس سے پورا انصاف کیا۔ ناشتے کے بعد چائے اور اس کے بعد کافی دونوں سے شغل کرتے ہوئے باقی اخبارات اور ان کی خبروں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے بیشتر نے حقائق پر سنسنی خیزی کو ترجیح دی تھی۔ کچھ اخبارات نے تصاویر بھی حاصل کرلی تھیں جو بہت اہتمام سے کلر میں شائع کیں اور ان میں سے بیشتر ناقابلِ دید مناظر کی تھیں ان میں کٹی پھٹی لاشیں اور تباہ شدہ عمارات کی تصاویر شامل تھیں۔ بعض جغادری صحافی خاصی دور کی کوڑیاں لائے تھے اور اس واقعے کے ڈانڈے انہوں نے پڑوسی ملکوں سے لے کر خاصے دور دراز کے ملکوں تک پھیلاتے ہوئے اسے ایک بین الاقوامی سازش قرار دیا تھا۔ سیاسی جماعتوں کی اپنی اپنی تشریحات تھیں اور تقریباً سب نے اسے سازش قرار دیا۔

ناشتے اور اخبارات سے فارغ ہو کر میں آرام کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد باسو اندر آیا اور اس نے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ مجھے ڈاکٹر لینگ کے پاس لایا۔ یہ وہی مشینوں والا کمرا تھا۔ مگر اس نے مجھے ایک عام سی کاؤچ پر لیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سوائے انڈرویئر کے سب اتار دو اور یہاں لیٹ جاؤ۔“

”وہ کس لیے؟“

”تمہارے زخم دیکھنے ہیں۔“

میں نے اپنا پاجامہ اور ٹی شرٹ اتاری اور کاؤچ پر لیٹ گیا۔ اس نے پٹیاں ہٹا کر میرے زخموں کو دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی قدر حیران تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”تمہارے زخم عام انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے بھر رہے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہوتا ہے نارمل زخم دو تین دن سے زیادہ نہیں رہتے اور معمولی زخم بارہ گھنٹے میں ٹھیک ہوجاتے ہیں۔“

میرے جسم پر کوئی دو درجن پٹیاں چپکی ہوئی تھیں اس نے انہیں اتارا تو صرف دو زخموں پر دوبارہ پٹی لگانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ وہ متجسس تھا کہ میرے زخم اتنی تیزی سے کیوں بھرتے ہیں مگر میں نے اسے حکیم قادس اور اس کی دواؤں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ڈیوڈ شا جانتا تھا اگر وہ بتا دیتا تو اس کی مرضی تھی۔ جب سے فاضلی نے مجھے ڈاکٹر لینگ کی اصلیت بتائی تھی کہ وہ کس طرح سے انسانوں پر تجربات کرتا تھا اور اس نے باسو جیسی مخلوق تیار کرنے میں سات بچے مار دیے تھے اور باسو آٹھواں تھا تو وہ بھی زیادہ سے زیادہ بائیس سال تک زندہ رہتا۔ اس کے بعد اس کا دل اتنے بڑے جسم کو خون پمپ کرنے کا فریضہ انجام دینے سے قاصر ہوجاتا اور وہ کسی وقت بھی پڑنے والے دل کے دورے سے جاں بہ حق ہوجاتا۔ ڈاکٹر مسیحا ہوتے ہیں مگر ڈاکٹر لینگ انسانوں اور انسانیت کا قاتل تھا۔ مجھے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے ڈیوڈ شا اسے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔ کیا وہ پھر ڈاکٹر توفیق جیسے کسی تجربے کا احیا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر لینگ اب اپنے تجربات کسی پاکستانی پر کر رہا تھا؟ نہ صرف بیرونِ ملک بلکہ اپنے ملک کے اندر بھی ہم لوگوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں تھا ساری دنیا ہمارے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرنے کے لیے آزاد تھی۔

میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”تم کب سے ڈیوڈ شا کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”شروع سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرا باپ ڈیوڈ شا کے باپ کا ملازم تھا وہ تائیوان میں برطانیہ کا اوّلین سفیر بھی تھا۔ جب وہ ریٹائر ہو کر واپس برطانیہ گیا تو میرے باپ کو ساتھ لے گیا۔ میں اس وقت دس سال کا تھا اور میں نے تعلیم برطانیہ میں حاصل کی۔“

”گویا تم خاندانی غلام ہو۔“ میں نے حقیقت بیان کی تو اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

”میں ڈیوڈ شا کا ملازم ہوں۔“

”جیسے تمہارا باپ اس کے باپ کا ملازم تھا۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”کیا فرق ہے تم میں اور باسو میں۔ بلکہ وہ بہتر ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور تم سوچ سمجھ رکھ کر بھی ڈیوڈ شا کے غلام ہی ہو۔“

”میں ملازم ہوں۔“ وہ غرایا۔

”کیا تم ڈیوڈ شا کو چھوڑ سکتے ہو؟“ میرے لہجے میں چیلنج تھا۔

اس کا لہجہ بدلا۔ ”میں کسی وقت بھی ملازمت چھوڑ سکتا ہوں لیکن یہ کام میری مرضی کے مطابق ہے۔“

”یہ خیال ہے تمہارا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مغرب کا استعماری دور آج بھی جاری ہے اور اسے اس خطے میں اپنے لیے غلاموں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔“

ڈاکٹر لینگ نے ظاہر کیا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں ہو اور باسو سے کہا۔ ”اسے لے جاؤ۔“

میں کھڑا ہوگیا اور اپنا لباس پہننے لگا۔ ”تم شادی شدہ ہو؟“

”ہاں۔“ لینگ نے جواب دیا۔

”بچے ہیں؟“

”میرے تین بیٹے ہیں۔“

”تب ان میں سے کسی کو باسو جیسا کیوں نہیں بنایا۔ یہ بھی تو کسی کی اولاد ہوگا۔“

”تم فضول بکواس بہت کرتے ہو۔“ اس بار ڈاکٹر

لینگ کا ضبط جواب دے گیا۔ ”تم لوگوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے جو اتنا بولتے ہو۔“

”یہ ہمارا قومی مشغلہ ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”ہم آج کے عملی دور میں بھی قدیم یونانی سائنس کی عملی تفسیر ہیں۔ زبان سے مسئلے حل کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے اور عمل کرتے ہوئے ہمیں موت آتی ہے۔“

”تبھی تم ایشیا میں بھی سب سے پیچھے ہو۔“ ڈاکٹر لینگ نے سچ کہا۔

”مجھے تسلیم ہے اور وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”چلو۔“ باسو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ میں نے راستے میں [illegible] سے کہا۔ ”مجھے لنچ میں سبزیوں اور چکن کا سوپ درکار ہو[illegible]نک سائز پیالے میں۔“

اس نے بغیر کسی ردِعمل کے مجھے کمرے میں دھکیل دیا مگر مجھے معلوم تھا کہ سوپ آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ دو گھنٹے بعد سبزیوں ...اور چکن سے بنا ہوا کسی قدر گاڑھا اور مقوی سوپ آ گیا۔ جب میرے زخم تیزی سے بھرتے ہیں تو مجھے خوراک کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے صبح بھرپور ناشتا کیا تھا اور مجھے چند گھنٹے بعد بھوک لگنے لگی تھی۔ سوپ پی کر اور کوئی نصف درجن سیب کھا کر میری تسلی ہوئی تھی۔ اب مجھے آرام کرنا تھا۔ اب تک مجھے دواؤں کی مدد سے سلایا جاتا رہا تھا اس لیے قدرتی نیند کی کمی بہرحال قائم تھی۔ اس کا اثر جسم پر پڑتا ہے۔ میں لیٹا اور چند منٹ میں گہری نیند سو گیا تھا۔

جب سے میری زندگی بدلی اور میرے دن رات ہنگاموں میں گزرنے لگے تب سے مجھے سکون کے لمحات بہت کم نصیب ہوئے تھے اور جب کبھی سکون ملتا تب بھی ذہن کے کسی گوشے میں خیال ہوتا کہ یہ عارضی ہے ابھی میرے دشمن کوئی چال چلیں گے اور یہ سکون غارت ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ آئے دن میں دشمن کے ہاتھ لگتا تھا اور میری جدوجہد کا بڑا حصہ قید میں ہی گزرا۔ اب بھی میں ڈیوڈ شا کی قید میں تھا لیکن پہلی بار مجھے سکون اور اطمینان کا ایسا احساس ہوا جو پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔ میرے تقریباً تمام دشمن مارے گئے تھے۔ خاص طور سے فاضلی جیسے عیار اور گھٹیا دشمن کی موت نے میرے اندر جیسے کوئی پرانی خلش مٹا دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو گھناؤنا روپ اختیار کیا تھا اس کے بعد واحد حسرت یہ رہ گئی تھی کہ کاش میں اسے اپنے ہاتھ سے مارتا۔ دیکھا جائے تو اس نے خودکشی کی تھی۔ اس نے اپنے طور پر میری موت کا بندوبست کیا تھا مگر ڈیوڈ شا کی عیاری نے اصل میں اس کی موت کا انتظام کیا ہوا تھا۔ پتا نہیں جب اس کی جان نکل رہی ہوگی تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟

مرشد بچ گیا تھا اور مجھے اب فکر تھی کہ ڈیوڈ شا نے اسے کیوں چھوڑا تھا کیونکہ جس وقت باسو مجھے لے کر کوٹھی سے باہر آیا تو اندر مرشد بے بسی سے کرسی سے بندھا بیٹھا تھا اور باسو کے لیے ذرا مشکل نہیں تھا کہ اسے صرف ایک ہاتھ مار کر موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس کا مطلب ہے ڈیوڈ شا کی طرف سے اسے حکم نہیں تھا جس وقت وہ مجھے باہر لا رہا تھا تو اسے علم تھا کہ اصل میں کون موت کی طرف جا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ڈیوڈ شا نے مرشد کو ایک مہرے کے طور پر برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اگر میں اس کی بات ماننے سے انکار کروں تو وہ مرشد کو اشارہ کرے اور وہ پھر سے میری دشمنی پر کمربستہ ہو جائے۔ مرشد مجھے اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا مگر فاضلی ایسا دشمن تھا جو پہلی فرصت میں مجھے دنیا سے رخصت کر دینا چاہتا تھا اور اس نے میرے سامنے اقرار بھی کیا۔ اس لیے ڈیوڈ شا نے اس سے مرشد کو سزا دینے کا کام لیا اور پھر اس کا پتا یوں صاف کیا کہ خود اسے بھی اپنی موت کا سبب پتا نہیں چلا ہوگا۔

میری آنکھ کھلی تو ایسا لگا جیسے میں چھ سات گھنٹے تک سویا ہوں۔ طبیعت کسی قدر سست مگر ٹھیک تھی۔ میں انگڑائی لے کر اٹھا۔ واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا تو سامنے باسو کھڑا ہوا تھا اور خلافِ توقع اس نے مکمل لباس پہنا ہوا تھا۔ عام قسم کی پتلون اور شرٹ میں وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ پیروں میں لیدر شوز تھے ورنہ میں نے اسے ہمیشہ ننگے پاؤں ہی دیکھا تھا سوائے درگاہ پر حملے کے موقع کے جب اس نے خاص بلٹ پروف جوتے پہنے تھے۔ میں نے اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کیا تو اس نے سر ہلا کر ایک طرف ہوتے ہوئے مجھے راستہ دیا۔ میں اس کے ساتھ واش روم تک آیا۔ وہاں سے فارغ ہوا تو اس نے مجھے ڈیوڈ شا کا پیغام دیا۔

”باس تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

ڈیوڈ شا اپنے اسی کمرے میں تھا۔ ویسے وہ ہمیشہ سے سوٹ بوٹ میں ہوتا تھا لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خاص تیار ہے۔ اس کا بڑے سائز کا قیمتی بریف کیس اس کے پاس رکھا تھا۔ اس کا گرگا خاص حسبِ معمول اس کے عقب میں ساکت کھڑا ہوا تھا۔ باسو مجھے اندر چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈیوڈ شا نے چائے کا اہتمام کیا ہوا تھا اور یہ خالص انگریزی انداز کی چائے تھی اس کے ساتھ بہت اعلیٰ درجے کے خستہ بسکٹس اور کوکیز تھیں۔ اس کے گرگے نے اس کے اشارے پر ہم دونوں کے لیے چائے تیار کی اور سرو کی۔ میں منتظر تھا کہ وہ بات چھیڑے جس کے لیے مجھے طلب کیا ہے مگر وہ سکون سے چائے نوشی کرنے لگا۔ چند سپ لینے کے بعد اس نے اچانک کہا۔ ”شہباز میں واپس جا رہا ہوں۔“

میرا دل دھڑکا لیکن میں نے ردِعمل نہیں دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چند سپ اور لیے اور پھر بولا۔ ”میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے تم وادی آؤ گے اور ستارے کہتے ہیں کہ تم میرے ساتھ ہی وہاں پہنچو گے۔“

مجھے معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا کچھ پُراسرار علوم سے واقفیت کے ساتھ ستاروں کا علم بھی جانتا ہے جسے عرفِ عام میں علم نجوم بھی کہتے ہیں۔ میں نے اسے اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ ”ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بے جان ستارے اور سیارے انسان کے افعال پر اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔“

”جب ایسا ہوگا تب تم دیکھ لوگے۔“ اس نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ ”او کے پھر ملاقات ہوگی تم سے۔“

اس نے بریف کیس اٹھایا تو میں نے اٹھنا چاہا مگر مجھے لگا جیسے میرے جسم میں جان نہیں ہو، بہ مشکل میں ذرا سا اوپر ہوا اور دوبارہ صوفے پر گر گیا۔ اس بار میں سیدھا بھی نہیں رہ سکا بلکہ ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ ڈیوڈ شا میرے پاس آیا اور اس نے جھک کر میرا شانہ تھپکا۔ ”ڈونٹ وری یہ بے ضرری دوا ہے تین گھنٹے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

مجھے چائے میں کچھ دیا گیا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم چند گھنٹوں بعد اپنے ساتھیوں کے پاس ہوگے۔“

ڈیوڈ شا یہ کہتے ہی کمرے سے نکل گیا اور اس کا گرگا اس کے پیچھے تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب باسو آئے گا مگر اس کی جگہ دو مقامی آئے اور انہوں نے سب سے پہلے میرے چہرے پر کپڑے کا ایک غلاف چڑھایا اور پھر وہ وہیل چیئر لائے اور اس پر بٹھا کر وہ کسی گاڑی تک لائے اور مجھے اٹھا کر عقبی نشست پر ڈال دیا گیا۔ اس دوران میں میرا جسم مکمل طور پر بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ دوا یقیناً چائے کے کپ میں پہلے سے موجود تھی لیکن یہ عجیب دوا تھی اس نے میرا جسم مکمل طور پر مفلوج کر دیا تھا حد یہ کہ میں پلکیں بھی نہیں جھپکا پا رہا تھا اور نہ ہی آنکھوں کو اپنی مرضی سے گردش دے سکتا تھا۔ مگر میرا دماغ مکمل طور پر بیدار تھا اور سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت برقرار تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر روانہ ہوئی۔ اندر اے سی کی خنکی تھی اور گاڑی کے باہر اگر ٹریفک تھا بھی تو اس کا شور بہت کم تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاڑی کہیں رکی اور مجھے اس سے نکال کر تقریباً بیس پچیس قدم دور لے جایا گیا۔ یہ سفر میں نے دو آدمیوں کے ہاتھوں میں کیا۔ اب پتا نہیں یہ وہی تھے یا کوئی دوسرے دو افراد تھے۔ سفر کے دوران میں انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا تھا اور نہ ہی مجھے پارک کی اس بینچ پر بٹھاتے ہوئے کچھ کہا۔

ایک نے میرے سر سے غلاف اتارا اور دوسرے نے مجھے یوں ٹکا کر بٹھایا کہ میں گر نہ سکوں اور پھر میری ٹی شرٹ تلے پاجامے سے میرا ہی موبائل اٹکا کر وہ چلے گئے۔ بینچ کا رخ ایسا تھا کہ میں دیکھ نہیں سکا کہ وہ کس گاڑی میں مجھے یہاں تک لائے تھے۔ رات کا وقت تھا اور لگ رہا تھا کہ سورج غروب ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اپنی بناوٹ اور شادابی، نیز بے رونقی سے یہ اسلام آباد کا کوئی پارک لگ رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق پنڈی میں لیاقت پارک سب سے بڑا اور اچھا ہے لیکن وہاں اس موسم میں بہت لوگ نکلے ہوتے ہیں۔ اسلام آباد پہلے جیسا بے رونق تو نہیں رہا ہے لیکن شام ہوتے ہی یہاں سناٹا اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ دفاتر اور کمرشل ایریاز وقت پر بند ہو جاتے اور کراچی، لاہور یا دوسرے بڑے شہروں کی طرح رات گئے چہل پہل کا رواج نہیں ہے۔ مجھے چائے پیے ایک گھنٹے کا وقت گزر گیا تھا اور ڈیوڈ شا کا کہنا تھا کہ تین گھنٹے میں، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔

اگر وہ مجھے یوں چھڑوانے کی بجائے میرے ساتھیوں کو اطلاع کر دیتا تو مجھے یہاں بیٹھ کر اذیت ناک انتظار نہیں کرنا پڑتا کہ کب میں اس قابل ہوں کہ موبائل سے کال کر سکوں۔ کچھ دیر بعد میرے دائیں طرف سے کچھ افراد کے بات کرنے کی آواز آئی مگر میں گردن گھما نہیں سکتا تھا۔ ناک کی سیدھ میں دیکھنے پر مجبور تھا۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ بولنے والوں کو میری موجودگی کا علم نہیں ہے۔ شاید درمیان میں کوئی باڑ یا جھاڑی تھی۔ بولنے والا ایک جوڑا تھا جو میاں بیوی ثابت ہوئے اور وہ اپنے جوان ہونے والے بچوں کی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جو کچھ یوں تھی۔

خاتون: ”آپ نے عدنان کے گھر آنے کی ٹائمنگ

نوٹ کی؟"
مرد: "نہیں میں تو موبل کے لیے پریشان رہتا ہوں وہ آج کل مغرب کے بعد آتی ہے۔"
خاتون: "وہ کو چنگ جاتی ہے۔"
مرد: "عدنان بھی کوچنگ جاتا ہے۔ وہ بیٹا ہے، بیٹی پر زیادہ نظر رکھنی چاہیے۔"
خاتون: "بیٹوں پر بھی پوری نظر رکھنی چاہیے۔"
مرد: "ابھی تم صرف مجھ پر نظر رکھو۔ دیکھو یہاں سناٹا ہے اور موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔"
خاتون ہنس کر: "کیا بات ہے رومانٹک موڈ ہو رہا ہے۔"
مرد: "مجھے یاد آگیا جب میں تمہارے کالج کے باہر کھڑا ہوتا تھا کہ ایک ہی جھلک نظر آجائے۔"
خاتون شرما کر: "اور وہ جو ہم شام کو پارکوں میں ملتے تھے۔"
اس سے آگے کی گفتگو زیادہ رومانی اور زیادہ سنسنی خیز تھی۔ میں ٹھنڈی سانس بھرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ جس قسم کے رومان کے بعد انہوں نے شادی کی منزل پائی تھی اپنی اولاد کے بارے میں فکر مند ہونا سمجھ میں آتا تھا۔ بالآخر انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔
مرد خفگی سے: "یہ کون ہے ہماری باتیں سن رہا ہے۔"
خاتون برہمی سے: "چلیں یہاں سے، یہاں تو کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔"
چند منٹ بعد پھر کسی کی آواز آئی۔ "یہ کون ہے؟" بولنے والا آواز سے لڑکا اور لفنگا لگ رہا تھا۔ دوسرا بھی ویسا ہی نکلا۔ "آدمی ہے تجھے نظر نہیں آرہا۔"
"وہ تو ہے پر یہ ایسے کیوں بیٹھا ہے۔"
"جا کر پوچھ لے۔"
ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے کسی قدر عقب میں دائیں طرف تھے۔ مجھے خطرہ تو نہیں تھا مگر وہ مجھے بے بس پاتے تو شیر ہو جاتے اور شاید مجھے لوٹ لیتے۔ لٹنے کے لیے سوائے موبائل کے اور کچھ نہیں تھا میرے پاس اس کے باوجود لٹنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب میری طرف سے کوئی ردِعمل نہیں دیا گیا تو ان کی ہمت بڑھی اور وہ میرے پاس آئے۔ ایک نے میرا بازو ہلایا مگر میں گرا نہیں۔ دوسرے نے سامنے سے آکر دیکھا۔ "آنکھیں کھلی ہیں پر لگتا ہے ہوش میں نہیں ہے۔"
"پیے ہوئے ہوگا۔" پہلا بولا۔ "دیکھ اس کے پاس کیا ہے؟"
دوسرا میرے لباس پر ہاتھ مارنے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ موبائل تک پہنچتا۔ پہلے نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "اوئے یہ کہاں سے آگئے؟"
دوسرے نے سر گھما کر دیکھا اور بولا۔ "نکل یہاں سے۔"
ایسا لگ رہا تھا کہ ان دونوں سے بھی بڑے بدمعاش آگئے تھے جنہیں دیکھ کر وہ نو دو گیارہ ہو گئے تھے۔ آوازیں نزدیک آنے لگیں اور جلد مجھے ان کی گفتگو سے پتا چل گیا کہ وہ پولیس والے تھے۔ وہ کسی مبینہ مجرم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جو گزشتہ رات ان کی تفتیش کی تاب نہ لاتے ہوئے ملک راہیٔ عدم ہوا تھا اور انہیں اس کی موت کی وجہ ہارٹ اٹیک بیان کرنی پڑی تھی اس پر لواحقین نے حسب معمول ملزم کی موت کو پولیس تشدد کا نتیجہ قرار دیا۔ پولیس والے لواحقین کے شور شرابے پر خفا نہیں تھے۔ وہ تو مبینہ ملزم پر خفا تھے جو اقرار جرم کے بغیر ہی اور شریکِ جرم ساتھیوں کا نام بتائے بغیر مر گیا تھا۔ ایک گناہ بے لذت ان کے گلے پڑ گیا تھا۔ وہ شاید کہیں آس پاس کسی ہوٹل سے مال غنیمت اڑا کر اسے ہضم کرنے اور ہوا خوری کے لیے یہاں آئے تھے کیونکہ ان کی گفتگو میں جتنی گالیاں تھیں اتنی ہی ڈکاریں بھی تھیں۔
میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی کیونکہ میں گل محمد بنا ہوا تھا اور ذرا بھی جنبش نہیں تھی۔ پولیس والے بجا طور پر مجھے نشے میں سمجھ سکتے تھے اور اٹھا کر لے جا سکتے تھے۔ وہ نزدیک بینچ پر آبیٹھے اور میری پروا کیے بغیر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ آپس میں گفتگو کریں یا یہاں سے دفع ہو جائیں لیکن میری طرف متوجہ نہ ہوں۔ دعا کے بارے میں سنا ہے کہ وہ رائیگاں نہیں جاتی ہے یا تو جیسے مانگی جائے ویسے قبول ہو جاتی ہے یا آخرت کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے یا پھر اللہ تعالیٰ مزید بہتر عطا کر دیتے ہیں۔ میری یہ دعا بھی فوری قبول نہیں ہوئی اور بالآخر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ "اوئے یہ کون ہے اتنی دیر سے ایسے بیٹھا ہوا ہے؟" ایک نے کہا۔
"چیک کر زندہ بھی ہے یا کوئی مار کر ادھر بٹھا گیا ہے۔" دوسرا بولا۔
"چھوڑ یار کوئی بابو ہوا تو بعد میں گلے پڑ جائے گا۔" تیسرا بولا
وہ ڈر گئے کہ اسلام آباد میں ہر تیسرا بندہ کوئی نہ کوئی سرکاری افسر ہوتا ہے۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اب وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ مگر بدقسمتی سے اسی لمحے میرے پاجامے میں اٹکے موبائل نے بیل دی۔ وہ آن تھا

اور پتا نہیں کون مجھے اس وقت یاد کر رہا تھا۔ بیل سن کر وہ چونکے اور جب دوسری تیسری بیل بجنے پر بھی میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تو وہ متوجہ ہو گئے۔ پہلے نے کہا۔ "اوئے یہ تو ایسے ہی بیٹھا ہے اسے دیکھ سچ مچ نہ مر گیا ہو۔"
"سانس لے رہا ہے۔" دوسرے نے اعلان کیا۔
"پر دیکھنا تو چاہیے۔" پہلا بولا۔ وہ تینوں اٹھ کر میرے پاس آئے اور میں نے پہلی بار انہیں دیکھا۔ وہ اسلام آباد نہیں بلکہ پنجاب پولیس کی وردی میں تھے۔ جیسا کہ ان کی گفتگو اور گزشتہ رات کی سرگرمیوں سے بھی واضح تھا کہ ان کا تعلق اسلام آباد پولیس سے نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی کہ مسکراؤں تاکہ ان کو ذرا معمول کے مطابق لگوں مگر میرے ہونٹوں اور چہرے کے عضلات میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ ایک نے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ میری پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ موبائل کی بیل بج کر چپ ہو گئی تھی اور چند لمحے بعد دوبارہ بجنے لگی۔ پہلے نے مجھ سے کہا۔ "میاں جی خیر تو ہے۔"
"میرا خیال ہے پیے ہوئے ہے۔" دوسرا بولا اور میرا منہ سونگھنے کی کوشش کی۔ "پر بو نہیں آرہی۔"
"کوئی اور نشہ نہ کیا ہو۔" تیسرے نے کہا۔ "میں تو سوچ رہا ہوں ریسکیو کو کال کرتے ہیں۔"
"اوہ یاروں پہلے اس ماں کے...... کو چپ کراؤ، دماغ خراب کر رہا ہے۔" پہلے نے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔
"تو کرا دے، موبائل اس کے پاجامے میں ہے۔" تیسرا بولا۔ میں نے ان کی آوازوں سے انہیں شناخت کیا تھا۔ اس پر پہلے نے کہا۔
"اوئے پاجامے کی اولاد، اس میں جیب کہاں ہوتی ہے۔"
"ہو سکتا ہے خفیہ جیب ہو آج کل لوگ اسی میں موبائل رکھتے ہیں۔" دوسرا دور کی کوڑی لایا تو بادل ناخواستہ پہلے والے نے میری ٹی شرٹ اوپر کی اور پاجامے کی الاسٹک میں پھنسا موبائل نکال لیا۔ اسی لمحے بیل بند ہو گئی۔ ان کے پاس ٹارچ تھی۔ وہ جلا کر میرا معائنہ کرنے لگا اس نے میری آنکھیں چیک کیں اور بولا۔
"نشے میں نہیں ہے۔"
"تب بیمار نہ ہو، کوئی دورہ نہ ہو۔" تیسرے نے کہا۔ "ریسکیو کو کال کرتے ہیں۔"
"اوئے چپ کر ریسکیو کا ماما۔" پہلے نے کہا اس نے میری جامہ تلاشی مکمل کر لی تھی۔ "اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے، بندہ مشکوک ہے اسے تھانے لے چلتے ہیں۔"

"پہلے ہی ایک گلے پڑا ہوا ہے یہ بھی مر مرا گیا تو ڈبل مصیبت آئے گی۔" تیسرے نے خفگی سے کہا۔
"چھوڑ یار گھر چلتے ہیں۔" دوسرا بولا۔
"اوئے نہیں مجھے کھاتا پیتا لگ رہا ہے۔" پہلے والے نے کہا۔ "مال پانی مل جائے گا۔"
وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ دوسرا اور تیسرا اس تجویز کے خلاف تھے۔ مگر پہلے والے نے مال پانی کا ذکر کر کے ان کی مخالفت کو کمزور کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے شاید دوسری مرتبہ تھانے کی زیارت کرنی پڑے گی۔ پہلی بار جب اکرم چشتی کی وجہ سے گیا تھا اور وہاں میرا حشر ہونے والا تھا مگر ندیم نے بروقت پہنچ کر میری گلوخلاصی کرائی تھی۔ اس بار نہ جانے میرے ساتھ کیا ہو۔ انہوں نے آپس کی بحث میں پندرہ بیس منٹ ضائع کیے تھے۔ مگر فیصلہ میرے خلاف گیا۔ وہ مجھے تھانے لے جانے پر متفق ہو گئے۔ وہ بغیر ایف آئی آر کے مجھے حوالات میں ڈال دیتے تب بھی ان کو کوئی نہ پوچھتا۔ ان میں ایک ایس آئی تھا اور باقی دو اے ایس آئی تھے مگر ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ آپس میں دوست بھی تھے ورنہ اس طرح بات نہ کرتے۔
"پر لے کر کیسے جائیں گے؟" تیسرے نے نقطہ اٹھایا۔ "موٹر سائیکل پر بٹھا کر؟"
"ٹیکسی کریں گے۔" پہلا ہنسا۔ "اس کا کرایہ بھی بعد میں یہ دے گا۔"
تیسرا ٹیکسی لینے روانہ ہوا۔ میں اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا کہ ایک مشکل سے نکلتا نہیں ہوں کہ دوسری میں پھنس جاتا ہوں۔ اگر تھانے میں کوئی جان پہچان والا نکل آیا اور وہ مرشد کا وظیفہ خوار بھی ہوا تو میں مارا جاتا۔ پولیس والے مجھے مرشد کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ موبائل کی بیل پھر بجی تھی اور پہلے والے نے اسے بند کر دیا۔ یہ بات اس کی گالیوں اور باتوں سے ظاہر تھی جو وہ بار بار بیل بجنے پر کر رہا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی، شاید میرا کوئی ساتھی کال کر رہا تھا۔ اگر وہ ریسیو کر لیتا تو میری بچت کا امکان ہو جاتا مگر اس نے موبائل آف کر کے یہ امکان بھی ختم کر دیا تھا۔ میں اس دوران میں کوشش کر رہا تھا کہ میرا جسم میرے قابو میں آجائے مگر اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے کہ میں جسم کے کسی حصے کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتا تھا۔ ٹیکسی تقریباً بیس منٹ بعد آئی اور تب تک مجھے دوا استعمال کیے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ٹیکسی لانے والے نے اطلاع دی۔
"چلو اسے اٹھاؤ۔" پہلے نے حکم دیا۔ ایس آئی وہی

تھا۔

"اب اسے ڈھونا بھی پڑے گا۔" دوسرا کراہا۔ اس نے تیسرے کے ساتھ مل کر مجھے اٹھایا۔ پولیس والوں کو مشق ہوتی ہے بندے اٹھانے کی۔ انہوں نے بھی مجھے آرام سے اٹھایا۔ میں دل ہی دل میں ڈیوڈ شا اور اس کے آدمیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو مجھے اس مصیبت میں پھنسا گئے تھے۔ وہ دونوں مجھے اٹھا کر ٹیکسی تک لائے اور اس میں بٹھا رہے تھے کہ نزدیک ہی کوئی دوسری گاڑی آکر رکی اور اس کے دروازے کھلے پھر کسی نے کہا۔

"اسے کہاں لے جا رہے ہو؟"

میں جو چند لمحے پہلے انتہائی بے بسی اور مایوسی کی کیفیت میں تھا یہ آواز سن کر کھل اٹھا۔ میرا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ وہ وسیم تھا۔ مجھے اٹھانے والے تیسرے نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"بتاؤں میں کون ہوں۔" وسیم غرّایا۔ "یہ ہمارا بندہ ہے۔"

"اوے...... اوے یہ کیا؟" دوسرا بولا۔

"اسے پستول کہتے ہیں۔" عبداللہ کی آواز آئی۔ "شاباش بندے کو ادھر لے آؤ، تم بھی ادھر آجاؤ۔" عبداللہ نے شاید پہلے کو حکم دیا کیونکہ باقی دو تو مجھے اٹھائے ہوئے تھے۔

"تم پولیس کے کام میں مداخلت کر رہے ہو۔" پہلے والے نے ذرا بہادر بن کر کہا ورنہ اس کے دو ساتھیوں کی بولتی بند ہوگئی تھی۔

"تم لوگ ہمارے معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہو اگر پولیس سے تعلق نہ ہوتا تو تمہیں ساتھ لے جاتے اور تمہیں پتا چل جاتا کہ ہم کون ہیں۔ بہرحال اپنے افسران سے کہنا کہ کرنل مشہدی سے پوچھ لیں۔" وسیم نے کہا۔ "جلدی کرو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

ان لوگوں نے مجھے ہیلکس میں ڈالا۔ میں حرکت کرنے سے قاصر تھا اس لیے کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ ان لوگوں کو بھی عجلت تھی اس لیے میری طرف توجہ دینے کی بجائے وہ وہاں سے نکل لیے۔ پتا نہیں وہ کیسے عین موقع پر وہاں پہنچ گئے جب پولیس والے مجھے لے جانے ہی والے تھے۔ وسیم ڈرائیو کر رہا تھا اور اس نے عبداللہ سے کہا۔ "پیچھے دیکھتے رہو کہیں وہ تعاقب کی کوشش نہ کریں۔"

"یہ ہماری پولیس ہے۔" عبداللہ ہنسا۔ "مسلح افراد کا کبھی غلطی سے پیچھا نہیں کرتی ہے۔"

چند منٹ بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ پیچھا نہیں ہو رہا ہے تو عبداللہ پیچھے آیا اور میری نبض ٹٹولی۔ "وائٹل سائن تو ٹھیک ہیں۔"

"اطلاع دینے والے نے کہا تھا کہ کچھ دیر میں ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔ "ادھر ایف سکس میں ایک جاننے والا ڈاکٹر کلینک کرتا ہے۔"

"کہاں پر؟" وسیم نے پوچھا تو عبداللہ اسے گائیڈ کرنے لگا اور پندرہ منٹ بعد کلینک آگیا۔ عبداللہ اتر کر اندر گیا اور چند منٹ بعد اسٹریچر سمیت آیا اس نے ایک لڑکے کی مدد سے مجھے اسٹریچر پر منتقل کیا اور اندر لے گیا۔ کلینک پوش قسم کا تھا اور وہاں مریضوں کا جم غفیر نہیں تھا۔ مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک ڈاکٹر منتظر تھا۔ اس نے فوری طور پر میرا معائنہ کیا۔ آنکھیں اور وائٹل سائن چیک کیے۔ آنکھ کی پتلی میں روشنی ڈال کر دیکھی اور پھر بلڈ پریشر لیا۔ آخر میں اس نے کہا۔

"سب ٹھیک ہے ایسا لگ رہا ہے یہ کسی سن کرنے والی دوا کے زیرِ اثر ہیں۔"

"یار وہ تو میں بھی بتا سکتا ہوں۔" عبداللہ نے اس سے کہا۔ "اس کا توڑ کرو۔"

"توڑ تو میں کر دوں لیکن بعض اوقات اس قسم کی دواؤں کا توڑ کرنے سے ان کے آفٹر ایفکٹ رہ جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ اثر رہ جائے گا اور وہ بعد میں مسئلہ کرے گا۔ جسم خود اس مسئلے کو اچھی طرح سے حل کر لیتا ہے اور پھر دوا کے اثرات باقی نہیں رہیں گے۔"

"تب کیا کریں؟"

"انتظار...... اس قسم کی دوا کے اثرات چند گھنٹے سے زیادہ نہیں رہتے ہیں۔ کچھ پتا ہے کہ دوا استعمال کیے کتنی دیر ہوئی ہے۔"

"ہمارے پاس سے تو آدھے گھنٹے سے ہیں۔" عبداللہ بولا۔ گویا مجھے دوا دیے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور ڈیوڈ شا نے کہا تھا کہ تین گھنٹے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ "یہ ہوش میں ہیں؟"

"میرا خیال ہے۔" ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد عبداللہ نے جھک کر مجھے دیکھا تو میں بے ساختہ مسکرایا تھا اور میرے ہونٹ پھیل گئے۔ عبداللہ اچھل پڑا اس نے چلا کر ڈاکٹر کو آواز دی۔

"ریحان ادھر آؤ۔"

ڈاکٹر بدحواسی میں آیا۔ "کیا ہوا خیریت تو ہے؟"

"یہ دیکھو انہوں نے مسکرا کر دکھایا ہے۔"

ڈاکٹر میری طرف جھکا تو میں پھر مسکرایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کا کہنا غلط ثابت ہوا تھا۔ میں وقت سے پہلے ہی ٹھیک ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اس قسم کی دوائیں مجھ پر زیادہ اثر نہیں کرتی تھیں اور میں جلد ٹھیک ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر گلاس میں پانی لے آیا اور چمچ سے میرے منہ میں ٹپکایا۔ پانی حلق سے اترتے ہی میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ وقفے وقفے سے پانی ڈالتا رہا۔ آدھا گلاس پی کر میں نے اسے روک دیا۔ "بس اور نہیں۔"

عبداللہ خوش ہو گیا۔ "اب کیسا محسوس کر رہے ہیں۔"

"بہتر ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"آپ پانی لیں۔" ڈاکٹر نے بقیہ گلاس بھی مجھے جبراً پلایا۔ "جتنا پانی پئیں گے اتنی جلدی ٹھیک ہوں گے۔ دوا کے اثرات زائل کرنے میں گردے اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انہیں فنکشن کے لیے پانی درکار ہوتا ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" عبداللہ نے اس سے گلاس لے لیا اور وہ چلا گیا۔ عبداللہ نے وہیں رکھے ڈسپنسر سے پانی نکالا اور دس منٹ بعد پھر مجھے ایک گلاس دیا۔ مزید دس منٹ بعد تیسرا گلاس دیا تو میں واش روم جانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آگیا تو تقریباً ٹھیک تھا۔ ڈاکٹر ریحان نے پھر میرا معائنہ کیا اور مزید پانی پیتے رہنے کا کہہ کر جانے کی اجازت دے دی۔ میں ٹھیک تھا مگر عبداللہ زبردستی سہارا دے کر باہر لایا۔ وسیم نے عقل مندی کی کہ گاڑی میں رہا۔ اس کی اندر ضرورت نہیں تھی۔ اگر پولیس کسی طرح پیچھے آبھی جاتی تو ہم بے خبری میں نہ مارے جاتے۔ مجھے اپنے قدموں پر آتا دیکھ کر وہ نیچے اترا اور گرم جوشی سے بغل گیر ہو گیا۔

"اب کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا کرم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ کیسے ہو کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا میری غیر موجودگی میں؟"

"نہیں اللہ نے یہاں بھی کرم کیا۔" اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ "آئیں باقی راستے میں بات ہو گی۔"

میں بیٹھ گیا اور کچھ دیر میں عبداللہ بھی اندر سے آیا تو ہم روانہ ہوئے۔ اگرچہ میں سن چکا تھا کہ انہیں اطلاع ملی تھی لیکن میں پوری بات جاننا چاہتا تھا۔ وسیم نے کہا۔ "جب ہم پارک پہنچے تو آدھے گھنٹے پہلے ایک اجنبی نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ اس پارک میں موجود ہیں۔ آپ کے پاس موبائل کا بھی بتایا تھا ہم کال کر رہے تھے مگر ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ ہم فوری روانہ ہوئے اور بروقت پہنچے۔"

"بالکل ورنہ پولیس والے مجھے لے جاتے اور پتا نہیں تھانے میں میرے ساتھ کیا ہوتا۔ یہ پارٹی گزشتہ رات ہی تفتیش کے نام پر کسی مبینہ ملزم کو پار کر چکی تھی۔"

"ہم آپ کے پیچھے پاگل ہو رہے تھے" عبداللہ نے بتایا۔ "وہ دیو قامت آپ کو لے گیا تھا۔"

"وہ ڈیوڈ شا کا خاص مہرہ ہے۔ درگاہ میں ہونے والی تباہی میں بہت بڑا ہاتھ اس کا بھی تھا۔"

"جب اس نے آپ کے سر پر اپنا بڑا پستول رکھا اور ہم سے کہا کہ وہ صرف لاش چھوڑ کر جا سکتا ہے تو ہمارے پاس پیچھے ہٹنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔"

"تم لوگ وہاں تک کیسے پہنچے؟"

"درگاہ میں موجود ہمارے آدمی نے اطلاع دی تھی۔" وسیم نے کہا تو میں چونک گیا۔ میرے دماغ سے بالکل نکل گیا تھا کہ درگاہ میں ہمارا بھی ایک آدمی ہے ورنہ میں اس سے رابطے کی کوشش کرتا۔

"وہ اب کہاں ہے؟"

وسیم نے گہری سانس لی۔ "مارا گیا...... وہ مرشد کی کوٹھی میں تھا جب انہوں نے وہاں حملہ کیا تو وہ بھی لپیٹ میں آگیا۔"

"افسوس ہوا۔" میں نے کہا۔ "اس رات وہاں سو سے زیادہ آدمی مرے۔ ان میں سے بہت سے میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

"آپ کسی وجہ سے شامل ہوئے ہوں گے؟" وسیم نے درست اندازہ لگایا۔

"بالکل، جب بات تم لوگوں کی زندگی پر آئی تو مجھے فاضلی کی بات ماننا پڑی تھی۔" میں نے کہا اور پھر بتایا کہ فاضلی نے کس طرح حویلی پر میزائل لگا دیا تھا جو صرف ایک بٹن دبانے سے پوری حویلی کو تباہ کر سکتا تھا۔ "امکان تھا کہ وہ بلف کر رہا ہے لیکن میں ایک فیصد چانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے راضی ہو گیا۔ پھر ڈیوڈ شا نے یہاں ایک ڈیوائس باندھ دی تھی۔" میں نے کلائی اٹھا کر دکھائی۔ "یہ ملٹی پرپز ڈیوائس تھی اگر میں اس کے ریسیور کے ایک خاص حد سے زیادہ نزدیک جاتا تو مجھے شدید قسم کا برقی جھٹکا لگتا اور

ایک حد سے دور جاتا تو کڑے میں موجود سائنائڈ میرے جسم میں انجکٹ ہو جاتا۔"

"سائنائڈ۔" عبداللہ نے کہا۔

"پھر آپ کو کیسے چھٹکارا ملا۔"

"یہ ذرا لمبی اور پیچیدہ کہانی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا کہانی کار ڈیوڈ شا تھا اور اس نے ہمیں استعمال کیا۔ فاضلی مارا گیا۔ مرشد کا اڈہ تباہ ہوا اور اس کے تمام خاص آدمی مارے گئے۔ نیز وہ مصیبت میں پھنس گیا کہ مارے جانے والوں میں مطلوب دہشت گرد بھی شامل ہیں۔ ساتھ میں اس نے مجھ پر ایک طرح سے احسان دھر دیا۔"

"احسان کیسا؟" وسیم نے اعتراض کیا۔ "اس نے تو آپ کو موت کے منہ میں جھونک دیا تھا۔"

"اس یقین کے ساتھ کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ فاضلی سے تھا اور ڈیوڈ شا جانتا تھا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ مجھے نہیں چھوڑے گا اس لیے ڈیوڈ شا نے ڈیوائس کا ریسیور اس کے حوالے کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ استعمال کرے گا اور مارا جائے گا۔"

"مارا کیسے گیا؟" عبداللہ بے چینی سے بولا۔ دونوں کا تجسس سے برا حال تھا۔

"یار یہ سب میں ایک ساتھ بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟"

عبداللہ نے بتایا۔ "مجھے اور سفیر کو ہوش آیا تو سب ویسا ہی تھا سوائے آپ کے، آپ غائب تھے۔ حد یہ کہ وہ جاتے ہوئے ٹوٹا ہوا دروازہ تک چوکھٹ میں لگا گئے تھے۔"

"وہ مجھے لے جانے آئے تھے۔" میں نے سر ہلایا۔ "رومانہ اور راشد کی ڈیل کیسے ہوئی؟"

"ڈیوڈ شا نے براہِ راست ہم سے بات کی اور آپ کی زندگی کے بدلے انہیں طلب کیا۔"

"تمہیں یقین ہو گیا تھا کہ اگر ان دونوں کو حوالے نہ کیا تو وہ مجھے مار دے گا؟" میں نے اعتراض کیا۔

"نہیں اس نے دھمکی دی تھی کہ اس صورت میں آپ کو دماغ ماؤف کرنے والا انجکشن لگا دے گا۔ ہمیں اس بات پر اعتبار کرنا پڑا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس صورت میں آپ کو وادی تک لے جانا اور آسان ہو جائے گا۔"

"ڈیوڈ شا نے اصل میں مرشد کو ذلیل کرنے اور سزا دینے کے لیے ان دونوں کو فاضلی کے حوالے کرنا تھا۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "اس اسٹوری کا کسی حد تک علم ہے۔ عبداللہ نے اندر کے ایک آدمی سے بات کی۔ وہ پولیس انویسٹی گیشن میں ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور انہیں فاضلی کی شیطانیت سے آگاہ کیا وہ بھی دنگ رہ گئے تھے۔ "انسان اس قدر بھی گر سکتا ہے۔"

"انسان ہی اس قدر گر سکتا ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "شیطان تو پہلے ہی گرا ہوا ہوتا ہے۔"

روٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہم فیض آباد والی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ عبداللہ نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈیوڈ شا نے اچانک آپ کو کیسے چھوڑ دیا؟"

"سمجھ میں تو میری بھی نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "شاید وہ اس بارے میں پہلے ہی کوئی فیصلہ کر چکا تھا اور اس نے مجھے صرف اس لیے واپس منگوایا کہ وہ جتانا چاہتا تھا کہ جب چاہے مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔"

"وہ ہر ممکن طریقے سے آپ پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ آپ اس کے ساتھ جائیں۔"

"بس اب ایک یہی مسئلہ رہ گیا ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔

"آپ بھول رہے ہیں مرشد ابھی موجود ہے۔" وسیم نے یاد دلایا۔ "اگر وہ اس چکر سے نکل آیا تو آگے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پھر طاقت حاصل کر لے گا اور پھر سے ہمارے خلاف میدان میں آ جائے گا۔"

"ابھی وہ زخمی سانپ ہے اور بل میں گھسا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے اس قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ میں نے رومانہ کو فاضلی سے بچانے کی کوشش کی تھی اس لیے مرشد کے اندر میرے خلاف دشمنی کا زہر ختم ہو جائے گا۔ وہ اس قسم کا آدمی ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ آخر میں رومانہ کے لیے فاضلی سے کیسے التجا کرنے لگا تھا ورنہ شروع میں تو اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کی بلا سے ان کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔ شاید اس کے اندر کہیں چھپی بیٹی کی محبت جاگ گئی تھی لیکن میرے لیے اس کے اندر کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے صرف یہ امید تھی کہ وہ کمزور اور پھنسا ہوا تھا اور شاید وہ اس مشکل سے نہ نکل پاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ درگاہ کا معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا اور اس کی اصل طاقت یہی درگاہ تھی۔ اگر وہ واپس بھی آتا تو اسے پھر سے طاقت پکڑنے میں کچھ وقت لگتا۔ ہم کوٹھی پہنچے تو پورچ میں شاہ جی موجود تھا۔ اس نے استقبال کیا۔

"شکر ہے جی آپ کی صورت بھی نظر آئی۔"

"کیوں کیا ہماری صورتیں پسند نہیں ہیں۔" سفیر اندر سے برآمد ہوا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ "تو پھر بچ کر آ گیا اور سب کا بیڑا غرق کر دیا۔"

"تجھے مارے بغیر نہیں مروں گا۔" میں نے اس کی کمر پر مکا مارا تو وہ کراہا۔

"پہلے ہی مرا ہوا ہوں اور تو مزید مار رہا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہوش میں آنے کے بعد سر پر یہ موجود تھا۔" اس نے سر کے پچھلے حصے میں موجود گومڑ ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ "اب تک دکھ رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں تو بھی شہیدوں میں شامل ہو گیا ہے۔" میں نے کہا اور وسیم کی طرف دیکھا۔ "تمہارے آدمی کہاں ہیں؟"

"اسی حویلی میں؟"

"انہیں وہاں سے ہٹا لو، پتا نہیں فاضلی بلف کر رہا تھا یا سچ مچ اس نے کوئی میزائل لگایا ہوا ہے۔ اگر وہ غلطی سے بھی چل گیا تو یہ عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے گی۔"

"میں آس پاس چیک نہ کرا لوں۔" وسیم نے کہا۔ "آپ کو یاد ہے تصویروں میں حویلی کا کون سا حصہ نظر آ رہا تھا۔"

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ "شاید عقبی حصہ تھا، ہاں یاد آیا تمام تصاویر اسی طرف کی تھیں اور کچھ ذرا ہٹ کر لی گئی تھیں جن میں حویلی کے ساتھ جھیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔"

"میں چیک کراتا ہوں تب تک اپنے آدمیوں کو وہاں سے ہٹا دیتا ہوں۔" وسیم نے کہا اور کال کرنے لگا۔ ہم اندر آئے تو نو بج گئے یعنی ڈنر ٹائم تھا۔ اندر زبیدہ ڈنر تیار کر رہی تھی اور اس کی خوشبو پورے لاؤنج میں پھیلی تھی۔ میں نے ناک پر زور دیا۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ بریانی بن رہی ہے۔"

"صرف بریانی نہیں صاحب۔" زبیدہ نے کچن سے جھانک کر کہا۔ "آپ کی پسند کی اور بھی چیزیں ہیں۔ آپ کیسے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم سب کو ایک بار پھر دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"آپ فریش ہو کر آ جائیں تو میں کھانا لگا دوں یا جب آپ کہیں۔"

"ایک گھنٹے بعد لگا دینا۔" میں نے کہا اور اوپر آیا۔ میرے جسم پر وہی پاجامہ اور ٹی شرٹ تھی اور میں اس لباس کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے میں سب سے پہلے اوپر آیا۔ فی الحال زخموں کی وجہ سے نہا نہیں سکتا تھا اس لیے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوا اور کپڑے تبدیل کر کے سب سے پہلے حویلی کال کی۔ میں نے بابا کا موبائل نمبر ملایا تھا ان سے بات ہوئی اور پھر ماں جی سے بات ہوئی۔ اتفاق سے شجاع بھائی، بھابی اور بچوں سمیت آئے ہوئے تھے ان سے بات ہوئی اور پھر میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ وہ منتظر تھی۔ اس سے بات ہوئی اور حسبِ معمول آنسوؤں اور ہنسی کے درمیان ہوئی۔ مونا، سادی اور بانو سے کل بات کرنے کا کہا تھا۔ گھر والوں سے بات کر کے میں ہلکا پھلکا ہو کر نیچے آیا۔ بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ شجاع بھائی مجھ سے کچھ خاص بات کرنا چاہ رہے تھے۔ میں دو گھنٹے بعد انہیں کال کر لوں۔ میں نے سوچا کہ اس دوران میں ڈنر اور ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔ میں نیچے آیا تو نشست گاہ میں سب موجود تھے۔

"ایاز بھی آ رہا ہے۔" وسیم نے کہا۔ "میں نے اپنے بندے حویلی سے ہٹا دیے ہیں اور کل وہ صبح سے میزائل کی تلاش میں لگ جائیں گے۔"

"میں تو کہہ رہا ہوں اس میں رسک ہے۔ بہتر ہے حویلی چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے اگر کل میزائل نہیں ملا تو ہم حویلی چھوڑ دیں گے۔" وسیم نے سر ہلایا۔ "اب بتائیں کہ درگاہ میں کیا ہوا؟"

عبداللہ نے بھی سوال کیا۔ "اس سے پہلے وہ دیو قامت آپ کو کہاں لے گیا تھا؟"

"کچھ دیر رک جاؤ ایاز آ جائے تو ساتھ ہی سناتا ہوں۔" میں نے کہا۔ زبیدہ فالسے کا شربت لے آئی تھی۔ اگرچہ بارش کے بعد موسم خوش گوار ہو گیا تھا مگر فالسے کے یخ بستہ شربت نے دوبالا کر دیا تھا۔ دس منٹ بعد ایاز بھی آ گیا اور گرم جوشی سے ملا۔

"آپ تو لائٹ کی طرح ہو گئے ہیں چند گھنٹے کے لیے آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔" سفیر نے اسے داد دی۔ "یہ واقعی بس چند دن کے لیے آتا ہے اور پھر دشمنوں کے پاس دوڑا جاتا ہے۔ پتا نہیں ان کے پاس ایسی کون سی گیدڑ سنگھی ہے۔"

"تو کیا میں اپنی خوشی سے جاتا ہوں۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "وہ لے جاتے ہیں۔"

"اگر ڈیوڈ شا یا مرشد دوسری صنف سے تعلق رکھتے تو

میں کچھ اور سوچتا۔" سفیر ہنسا۔ "خیر تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"ایاز آگیا ہے اب بتائیں۔" وسیم نے یاد دلایا تو میں نے وہاں سے شروع کیا جب مجھے ڈیوڈ شا کی قید میں ہوش آیا تھا۔ فاضلی اور ڈیوڈ شا کے گٹھ جوڑ سے ہم پہلے ہی واقف ہو گئے تھے اس لیے فاضلی کو وہاں پا کر مجھے تعجب نہیں ہوا۔ البتہ جب میں نے انہیں ڈاکٹر لینگ اور اس کے ایجاد کردہ نمونے باسو کے بارے میں بتایا تو وہ سب حیران ہوئے تھے۔ وسیم نے سر ہلایا۔ "میں نے سنا ہے کہ چینی ایسے کاموں میں ماہر ہوتے ہیں۔"

"میں نے بھی سنا تھا لیکن یقین نہیں کیا تھا اب باسو کو دیکھ کر یقین آگیا ہے۔"

درگاہ پر حملے کی کہانی زیادہ سنسنی خیز تھی۔ البتہ جب میں نے وہاں ملنے والی عورتوں کا ذکر کیا تو سفیر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ "کیا چکر ہے بھائی جہاں جاتے ہو وہاں عورتیں ٹکر جاتی ہیں اور پھر تم ہیرو بن کر ان کو بچاتے ہو کسی نہ کسی ولن سے۔"

"بس قسمت کی بات ہے۔" میں نے جوابی چوٹ کی۔ "بعض لوگ تڑپتے ہیں مگر انہیں عورت کیا تالی بجانے والے بھی نہیں ٹکراتے ہیں۔"

اس پر وسیم نے بلند آہنگ قہقہہ مارا اور پھر اس کی وضاحت کی کہ ایک بار وہ اور سفیر کہیں جا رہے تھے تو سگنل پر انہوں نے پیٹھ موڑے کھڑی عورت دیکھی اور سفیر نے اس پر تبصرہ کیا تھا مگر جب وہ ان کی طرف مڑی تو تیسری دنیا کی مخلوق نکلی تھی۔ سب ہنسے تو سفیر کھسیا گیا۔ اس نے خفگی سے کہا۔ "میں نے اکیلے تو تبصرہ نہیں کیا تھا؟"

"میں نے صرف تمہارے خیالات کی تائید کی تھی۔"

یہ نوک جھوک کچھ دیر چلتی رہی لیکن جب میں نے معرکے کا ذکر شروع کیا تو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ سنسنی ایسی تھی اور واقعات میں اتنی تیزی تھی کہ بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی میں خود کو پھر اسی ماحول میں محسوس کرتا تھا جب چاروں طرف رقص اجل جاری تھا اور میں خود کتنی بار بچا تھا۔ صورتِ حال ہر پل بدل رہی تھی اور پھر اس میں مرشد، فاضلی اور رومانہ و راشد شامل ہوئے تو سنسنی مزید بڑھ گئی تھی۔ فاضلی نے اپنے طور پر میری موت کا فیصلہ کیا تھا مگر ڈیوڈ شا کی عیاری سے مات کھا گیا اور خود اجل کا شکار ہو گیا۔ مرشد، رومانہ اور راشد بچ گئے۔ داستان ختم ہوئی تو سب خاموش تھے۔ شاید وہ سب بھی اسی ماحول میں پہنچ گئے تھے۔ اس کیفیت کو زبیدہ نے کھانا لگنے کا اعلان کر کے ختم کیا اور ہم سب ڈائننگ ہال میں آگئے۔ زبیدہ نے بیچ بیچ میری پسند کی کئی ڈشز بنائی تھیں اور مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے سب کے ساتھ انصاف کیا۔ کھانے کے دوران میں بھی گفتگو جاری رہی۔ عبداللہ نے کہا۔

"کیا مرشد، رومانہ اور راشد کو معاف کر دے گا؟"

"ابھی کچھ کہنا دشوار ہے فی الحال تو وہ خود پھنسا ہوا ہے اور اسے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنی ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "مگر مرشد جیسے لوگ اپنی سرشت نہیں بدل سکتے۔ ممکن ہے ابھی وہ پھنسا ہے تو کچھ نہ کرے مگر آگے جا کر وہ راشد اور رومانہ کو سزا دے۔"

"رومانہ اور راشد اس کے قریبی خون کے رشتے ہیں۔ وہ اسے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور وہ شاید اس سے نمٹ لیں۔ یعنی اپنی جان بچالیں۔ بہرحال اب وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"یہ تو ہو گئی پالیسی۔" سفیر نے کہا۔ "اب مرشد کا کیا کرنا ہے میرے خیال میں تو وہ کتے کی دم ہے اور کبھی سیدھا نہیں ہو گا۔ اگر ہم اس کے عمل کا انتظار کریں تو یہ ہماری حماقت ہو گی۔"

"تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟"

"مرشد کا صفایا۔" سفیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں نے وسیم اور عبداللہ کی طرف دیکھا تو ان کے چہروں پر تائید لکھی ہوئی تھی صرف ایاز خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔ ایاز ہمارا ایسا ساتھی تھا جو فیصلوں میں شامل ہو نہ ہو عمل میں پوری طرح شامل ہوتا تھا۔ ایک طرح سے اس نے خود کو ہمارے سپرد کیا ہوا تھا حالانکہ ہمارے معاملات کا اس سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے ہاتھ سے یا میرے فیصلے سے کسی کی جان نہ جائے اور میں صرف بہت مجبوری کے عالم میں کسی کی جان لی یا اس کا فیصلہ کیا۔ مرشد کا معاملہ ایسا تھا کہ اب وہ اتنا بڑا خطرہ نہیں رہا تھا اور ہم نے اسے اس وقت بھی چھوٹ دی تھی جب وہ پوری طرح ہماری جان کا گاہک بنا ہوا تھا۔ میں ہچکچا رہا تھا۔ وسیم نے کہا۔

"شہباز صاحب آپ سوچ لیں، یہی وقت ہے جب سانپ قابو میں ہے ایک بار اس کی گردن چھوٹ گئی تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ وہ پھر قابو میں آئے گا نہیں۔"

"وہ جانتا ہے کہ اس حملے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔" عبداللہ نے بھی کہا۔ "ممکن ہے اس کی دلی دشمنی میں اس حملے کا حساب بھی شامل ہو گیا ہو اور وہ طاقت حاصل

کرتے ہی ایک بار پھر ہمارے خلاف صف آرا ہو جائے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "یارو، تم جانتے ہو کہ میں دشمنی میں آخری حد تک جانے کا قائل نہیں ہوں۔"

"مرشد ایسا نہیں سوچتا۔" سفیر نے کہا۔ "وہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔"

سفیر ٹھیک کہہ رہا تھا مرشد کے بارے میں میرا خیال بھی یہی تھا کہ وہ کبھی اپنی فطرت نہیں بدل سکے گا اس کی مثال سوکھی شاخ کی سی تھی جو ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن جھک نہیں سکتی۔ میں نے مزید بحث سے گریز کیا۔ "ہم اس پر بعد میں بات کریں گے۔"

میں نے کہا تو سفیر نے کچھ کہنا چاہا مگر وسیم نے بات بدل دی اس نے کہا۔ "ایک اچھی خبر اور بھی ہے۔ مانی نے انکل سے بات کر لی ہے اور شازیہ کا رشتہ مانگا ہے۔ انکل نے شازیہ سے پوچھ کر ہاں کر دی ہے۔"

میں خوش ہو گیا۔ "یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ شادی کب تک ہے۔"

"مانی کا کہنا ہے کہ جیسے ہمارے مسائل حل ہوتے ہیں وہ شادی کر لے گا اس سے پہلے کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔" عبداللہ نے بتایا۔ "اس نے لاہور میں آفس لے کر اسے سیٹ کر لیا ہے اور اپنی ٹیم بھی جمع کر لی ہے۔ میں نے اسے بیس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ میں زیادہ بھیجنا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ بیس لاکھ کافی ہیں۔"

"اگر وہ اسٹیبلش ہو جاتا ہے تو جلد شادی کر لے، ہمارا مسئلہ حل ہونے کی شرط کیوں لگا رہا ہے۔"

"اس کا کہنا ہے کہ اس کے بغیر مزہ نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے بات کی تھی مگر انہوں نے شازیہ کا رشتہ لے کر جانے سے انکار کر دیا اس لیے اب وہ خود شادی کر رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ہم ہی اس کی فیملی ہیں۔" وسیم نے وضاحت کی۔

"یہ تو اچھی بات ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ شادی دھوم دھڑکے سے ہو۔ سادگی سے شادی سب سے اچھی ہوتی ہے۔"

"یہ تو تو کہہ رہا ہے نا آج کل ایسی باتوں کو مانتا کون ہے۔" سفیر نے تلخی سے کہا۔ "میں نے سادگی سے کی تھی اس پر آج تک مجھے اپنے گھر میں باتیں سننے کو ملتی ہیں۔"

"بس یار ہم نمود و نمائش کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔ کھانے کے بعد زبیدہ نے فرمائش پر سب کے لیے چائے اور کافی بنائی تھی۔ میں نے کافی کا انتخاب کیا۔ مجھے مانی کی جرأت اور کردار نے متاثر کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شازیہ کے ساتھ کیا ہوا تھا اور پھر وہ ماں بننے والی تھی یہ تو قدرت نے اسے بچا لیا۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنا رہا تھا اور ترس کھا کر نہیں محبت سے اپنا رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہم اسے جو رقم دے رہے ہیں جب وہ سیٹ ہو جائے گا تو ہم اسے گفٹ کر دیں گے۔"

"یعنی ہم اس کے بزنس پارٹنر نہیں ہوں گے؟" سفیر نے پوچھا۔

"بالکل نہیں، مگر وہ خود دار لڑکا ہے اس لیے ابھی اسے کچھ مت کہنا، تاکہ اسے مزید رقم کی ضرورت ہو تو وہ بلا جھجک ہم سے لے سکے۔ آئی ٹی بزنس بھی اب بہت پیسا مانگنے لگا ہے اور اسے سیٹ ہونے اور بڑے پیمانے پر بزنس کرنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت ہو گی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وسیم نے تائید کی۔ "ہمارے ہاں گورنمنٹ کوئی مدد نہیں کرتی ہے ہم نے آئی ٹی کے میدان میں جو کیا ہے وہ اپنی کوشش سے کیا ہے۔"

"ہمارے مقابلے میں انڈیا نے اپنی آئی ٹی کی صنعت کو اتنی مراعات دی ہیں کہ وہ اب امریکا کا مقابلہ کرنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں میں نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو یہاں کی نسبت بہت آگے پایا ہے۔ دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں بھی انٹرنیٹ دستیاب ہے اور میں اسی کی مدد سے تم لوگوں سے رابطے میں رہا۔"

"ہمارے ہاں سارا زور موبائل پر ہے اور وہ منفی سرگرمیوں میں۔" عبداللہ نے کہا۔ "نائٹ پیکجز نکالے ہی اس لیے گئے ہیں۔"

"انٹرنیٹ تک کا استعمال بھی کم ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اخبار میں ایک رپورٹ پڑھی جو ایک بڑے سرچ انجن کی طرف سے شائع کی گئی اس کے مطابق ممنوعہ سائٹس کے لیے سب سے زیادہ سرچ ہمارے ہاں سے کی جاتی ہے۔"

اس دوران میں دو گھنٹے ہونے والے تھے اس لیے میں اوپر آگیا۔ شجاع بھائی کا نمبر نہیں تھا اس لیے بابا کا نمبر ملایا۔ موبائل شجاع بھائی کے پاس تھا کیونکہ بابا اس وقت تک سو جاتے تھے۔ "جی شجاع بھائی آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہ رہے ہیں؟"

"شہباز تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مرشد کی درگاہ میں

کیا ہوا ہے؟"
"جی جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"آرمی انٹیلی جنس نے بھی اس سے تفتیش کی ہے کیونکہ درگاہ سے مطلوب دہشت گردوں کی لاشیں بھی ملی ہیں۔"
"کیا مرشد کو ملوث قرار دیا جا رہا ہے؟"
"نہیں کیونکہ اس نے انہیں اپنا آدمی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" شجاع بھائی بولے۔ "اس نے الزام لگایا ہے کہ حملہ آوروں کی قیادت تم کر رہے تھے۔"
"اس کے پاس اس الزام کا کوئی ثبوت ہوگا؟"
"نہیں مگر اس کے الزام میں وزن ہے کیونکہ وہ ایک بااثر گدی نشین اور سیاست داں ہے۔"
"تب وہ مجھے عدالت میں کھینچ لے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔
"شہباز وہ تمہارے خلاف رپورٹ کروانا چاہتا ہے۔ تم جانتے ہو ایک بار تمہارے خلاف پھر ایف آئی آر آ گئی تو تمہارے لیے بہت سے مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔"
"شجاع بھائی میں ان سے نمٹتا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔"
"ڈونٹ بی فولش۔" وہ ناگواری سے بولے۔ "میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ مجھے کوئی مسئلہ ہے۔ مسئلہ تمہارے لیے ہے اور اس حویلی کے لیے ہے۔"
"تب آپ کیا کہتے ہیں؟" میں نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔
"مرشد سے بات کرو اور اس سے کہو کہ بات آگے نہ بڑھائے۔"
"بات وہ بڑھا رہا ہے۔"
"وہ اپنا دفاع کر رہا ہے۔" شجاع بھائی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "تم نے دیکھا ہے جب ایک نیل گائے شیروں میں گھر جائے تو وہ بہادر بنتی ہے۔ حملہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مرشد اسی طرح کی کوشش کر رہا ہے ورنہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس پوزیشن میں ہے۔"
"آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے یقین دلاؤں کہ اب میں اس کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "سب کیا دھرا معاف ہے۔ شاہد بھائی کا خون بھی بھول جاؤں۔"
"پولیس اس کی انویسٹی گیشن کر رہی ہے۔"
"کیس داخل دفتر ہو چکا ہے۔"
"یعنی کوئی ثبوت نہیں ہے۔" شجاع بھائی بولے۔ "اس صورت میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیا ذاتی انتقام لیں؟"
"میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ ورنہ مرشد صرف ایک آدمی ہے۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "اگر میں آپ کی بات مان لوں اور مرشد سے صلح کا ڈول ڈال لوں تب بھی کیا ضمانت ہے کہ وہ مان جائے اور بعد میں اپنی بات پر قائم رہے۔"
"ضمانت کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔" وہ بولے۔ "میں نے صورتِ حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ سرکاری سطح پر اس کے خلاف کوئی کارروائی بہت مشکل ہے اور وہ مظلوم بن رہا ہے۔"
"آپ کا مطلب ہے کہ اس سے باز پرس نہیں ہو گی؟"
"نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولے۔ "کیونکہ حملہ اس پر ہوا ہے اور مارے جانے والے بیشتر لوگ اس کے تھے۔"
"ٹھیک ہے میں آپ کا نقطہ نظر سمجھ گیا ہوں اور اب میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا۔"
"بس اتنا یاد رکھنا، تم جو فیصلہ کرو گے اس کا اثر حویلی اور اس کے ہر فرد پر پڑے گا۔"
"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا اور کچھ دیر مزید رسمی گفتگو کے بعد فون رکھ دیا۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ شجاع بھائی کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ وہ اپنے کیریئر کے اس حصے میں تھے جہاں انہیں آگے جانا تھا۔ وہ خاصی کم عمری میں کرنل کے رینک تک پہنچ گئے تھے اور بریگیڈیر کے بعد آرمی میں آگے جانے والے افراد کی صلاحیتوں اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ان کا بیک گراؤنڈ بھی دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے رشتے تھے۔ اباجی کا ایک نام اور علاقے میں عزت ہے۔ صغراں آپا کا سسرال جواب شمی کا سسرال ہونے والا تھا وہ بھی ذی حیثیت لوگ تھے۔ میری وجہ سے ان سب لوگوں پر کہیں نہ کہیں اثر پڑ رہا تھا۔ اس لیے شجاع بھائی نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس معاملے کو ختم کر دوں۔ مرشد سے صلح کر لوں یا پھر...... میں سوچتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔
مجھے وسیم، سفیر اور عبداللہ کی بات یاد آ گئی۔ شاید انہوں نے بھی دوسرے لفظوں میں مجھ سے یہی بات کی تھی

جو شجاع بھائی نے کہی تھی۔ وہ اب اس معاملے کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ قصہ بہت طول کھینچ گیا تھا اور اب سب ہی اس کا خاتمہ چاہتے تھے۔ کہانی کتنی ہی دل چسپ اور سنسنی خیز کیوں نہ ہو بالآخر اسے ختم ہونا پڑتا ہے۔ تو اب سب چاہتے تھے کہ قصہ ختم کیا جائے۔ چاہے دشمنی ختم کی جائے یا دشمن کو ختم کر دیا جائے تاکہ سب ہیپی اینڈ سے لطف اندوز ہوں اور اپنی نارمل زندگی میں آ جائیں۔ میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ میں اوپر کال کرنے جا رہا ہوں اس لیے کسی نے میرے ساتھ آنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کال کرنے کے بعد میں اکیلا تھا اور مجھے سوچنے اور دوسروں کے رویے جانچنے کا موقع مل رہا تھا۔ سفیر اور مونا کی اپنی زندگی تھی۔ اسی طرح وسیم اور سعدیہ کی اپنی زندگی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ عبداللہ بانو میں دل چسپی لے رہا ہے۔ لازمی اس کی بھی خواہش ہوگی کہ وہ جلد از جلد اسے اپنا لے۔ مانی نے یہی کیا تھا مگر ساتھ ہی حالات کی شرط بھی رکھ دی تھی۔
مجھے سویرا کا خیال آیا اس کا انتظار بھی طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا تعلق ایک اور خاندان سے تھا۔ وہ پہلے شاہد بھائی کی بیوی تھی مگر اب اس سے ہمارا کوئی قانونی رشتہ نہیں تھا کہ وہ حویلی میں رہتی۔ یقیناً بہت سے لوگ اس پر بات کر رہے ہوں گے۔ اس کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ میں جلد از جلد دشمنی کے چکر سے جان چھڑا لوں اور اسے اپنا لوں۔ خود میری ہمیشہ سے خواہش رہی کہ میں اپنی نارمل زندگی میں واپس چلا جاؤں۔ میں نے کبھی اس زندگی کو انجوائے نہیں کیا۔ ہاں میں نے ہمت نہیں ہاری، حالات اور دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ منفی ذہن سے نہیں سوچا اور نہ ہی تقدیر سے شکوے شکایت کیے۔ مگر اندر سے میں ہمیشہ آرزو کرتا رہا کہ کاش کسی دن میں سو کر اٹھوں تو ایسا ہو کہ میں خود کو اپنی سابقہ زندگی میں پاؤں اور یہ سب ایک خواب ہو۔ اب شاید تقدیر نے میری استقامت کا صلہ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور میرے دشمن یوں ختم ہو رہے تھے کہ میں حیران تھا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ سب اوپر والے کی مہربانی تھی۔
اب مرشد اور ڈیوڈ شا بچے تھے۔ مرشد کے بارے میں شجاع بھائی نے بتا دیا تھا کہ اس کی حالت گھر جانے والے جانور کی سی ہو رہی تھی اور وہ اب زندگی چاہتا تھا۔ البتہ ڈیوڈ شا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ میں اس کے ساتھ وادی تک جاؤں۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ اس کام کے بعد میں اس کے لیے بیکار ہو جاؤں گا اور عین ممکن ہے وہ مجھے ختم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ میں نے اسے بہت سے مواقعوں پر اتنا زچ کیا تھا کہ اگر اسے میری اشد ضرورت نہ ہوتی تو وہ مجھے وہیں ختم کرنے کا سوچتا۔ گویا مجھے جتنا خطرہ مرشد سے تھا اتنا ہی ڈیوڈ شا سے بھی تھا۔ اچانک موبائل نے بیل دی تو میں چونکا۔ سویرا کال کر رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی اور خوشگوار لہجے میں پوچھا۔
"سرکار کو اس وقت کیسے خیال آ گیا؟"
سویرا نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز میں نے آپ کی اور شجاع بھائی کی بات سنی ہے۔"
میں چونکا۔ "وہ کیسے؟"
"وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور میں اتفاق سے اس طرف چلی گئی تھی۔"
میں نے گہری سانس لی۔ "تو تم نے ان کی باتوں سے کیا نتیجہ نکالا؟"
"میں نے کوئی نتیجہ نہیں نکالا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے صرف ایک بات کہنے کے لیے کال کی ہے؟"
میں سنجیدہ ہو گیا مجھے لگا کہ اب وہ بھی کہے گی کہ میں معاملہ ختم کروں۔ مرشد سے صلح کر لوں یا اسے دشمنی کے قابل ہی نہ چھوڑوں۔ "کہو میں سن رہا ہوں۔"
"آپ جانتے ہیں سب کی اپنی زندگی ہے اور سب اسے محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی آزادی سے جینا

جمال حسینی

(غالباً 926ھ/1520ء)

ایک عالم دین اور مورخ امیر جمال الدین عطاء اللہ حسینی الدشتکی الشیرازی ان کا اعزازی لقب تھا۔ انہوں نے ہرات میں سلطان حسین تیموری کے عہدِ حکومت میں شہرت پائی۔ ان کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں "روضۃ الاحباب فی سیر النبی والآل والاصحاب" جو آنحضورؐ اور آپؐ کے خاندان اور صحابہؓ کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب انہوں نے میر علی شیر نوائی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ 1268ھ/1852ء میں ہوا۔ دوسری تصنیف "تحفۃ الاحبار فی مناقب آل العبا" جو آنحضورؐ حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور امام حسنینؓ کے فضائل پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب کا نام "ریاض السیر" ہے۔

مرسلہ: ندیم سید۔ لاہور

چاہتے ہیں۔"

"اتفاق سے میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔"

"لیکن میری زندگی آپ ہیں۔" اس نے کسی قدر کھل کر کہا۔ "آپ کے بغیر مجھے اپنی سانس تک ادھوری لگتی ہے۔"

"سویرا مجھے معلوم ہے۔"

"اس کے باوجود شہباز آپ کبھی یہ سوچ کر کوئی فیصلہ مت کریے گا کہ اس کا اثر مجھ پر آئے گا۔ میرے لیے آپ کی عزت اور آپ کا اطمینان دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ آپ مرشد کے آگے جھک کر صلح نہیں کریں گے، اگر آپ کے نزدیک میری قسم کی کوئی اہمیت ہے تو آپ کو میری قسم ہے۔" کہتے ہوئے اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی جس نے زندگی میں بہت کم خوشیاں دیکھی تھیں۔ اس وقت بھی وہ جیسے خلا میں زندگی گزار رہی تھی اس کے پیروں تلے زمین نہیں تھی۔ میرا ساتھ میری محبت ایک وعدہ تھا جس کا مستقبل واضح نہیں تھا۔ اگر میرے پیاروں میں سے کسی کو میری واپسی کا سب سے بیتابی سے انتظار تھا تو وہ سویرا تھی اس کے باوجود اس نے مجھے وہ بات کہی جو کسی اور نے نہیں کہی تھی۔ میں جذباتی آدمی نہیں ہوں لیکن اس وقت جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "سویرا اللہ کی قسم میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے مرشد سے جھک کر صلح کرنی پڑے تو میں کر لوں گا میں اپنے ساتھیوں اور پیاروں کو مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ میں دوسروں کے لیے یہ کر گزرتا مگر اس کے بعد شاید ساری عمر خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔ تم نے میرے دل پر آنے والا بوجھ اتار دیا ہے۔"

وہ خوش ہو گئی۔ "شہباز میں یہی چاہتی ہوں۔ میں آپ کو جانتی ہوں۔ شجاع بھائی نے آپ سے جس طرح بات کی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کیا سوچ رہے ہوں گے۔"

"صرف شجاع بھائی نہیں اب دوسرے بھی یہی چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ذرا مختلف انداز میں یہی بات کہہ دی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید میں ان سب کے دباؤ میں آ کر اپنے ضمیر کے خلاف کوئی فیصلہ کر جاتا مگر تم نے مجھے اس دباؤ سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ تمہارا حق سب سے زیادہ ہے۔"

"نہیں آپ کے ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔"

میں بے ساختہ مسکرایا۔ "ان کی تو بات ہی مت کرو۔ وہ صرف میرے لیے دعا گو ہوتے ہیں اور مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے بابا نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں کہا کہ میں یہ چکر ختم کروں، ایک بار وہ بول گئے تھے تو ماں جی ان سے لڑ گئی تھیں۔"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ پوری آزادی اور پورے اطمینان کے ساتھ فیصلہ کریں۔ میں ہر صورت اور ہر قدم پہ آپ کے ساتھ ہوں۔"

"سویرا مجھے اس سے بڑھ کر تمہارا ساتھ چاہیے۔"

"میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں۔" اس نے کہا اور پھر "ہائے اللہ" کہہ کر کال کاٹ دی۔ اسے اپنی بات پر شرم آ گئی تھی۔ میں نے سرشار ہو کر موبائل رکھ دیا۔ چند منٹ پہلے تک میرے، دماغ پر جو بوجھ آ رہا تھا وہ اتر گیا تھا اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسی کیفیت میں کب میری آنکھ لگی مجھے پتا نہیں چلا۔ آنکھ کھلی تو صبح کا وقت تھا اور سورج شاید نکل آیا تھا کیونکہ پردے کے پیچھے سے روشنی جھلک رہی تھی ویسے کمرے میں اندھیرا تھا۔ رات کسی وقت کوئی آ کر روشنی بجھا گیا تھا۔ میں نے موبائل میں وقت دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر واش روم میں آیا اور ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے پہلے لباس اتارا اور پھر اپنے زخموں پر رہ جانے والی پٹیاں اتار دیں۔ ان کے نیچے موجود زخم بھی تقریباً بھر گئے تھے اور اب میں غسل کر سکتا تھا۔ اگرچہ میں صاف ستھرا ہی تھا مگر کئی دن سے نہ نہانے کی وجہ سے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ نہا کر وہ بے چینی دور ہو گئی۔ میں باہر آیا تو شاہ جی نے دروازے پر دستک دی۔

"جناب ناشتے کا پوچھنے آیا ہوں۔"

"باقی سب کہاں ہیں؟"

"سفیر صاحب سو رہے ہیں۔ وسیم صاحب اور عبداللہ صاحب باہر گئے ہیں۔"

"تب ناشتا یہیں لے آؤ۔ دو ابلے انڈے ہوں، چار توس شہد کے ساتھ اور ایک گلاس دودھ۔"

"چائے کافی جناب؟"

"وہ اس کے بعد جب میں کہوں۔" میں نے جواب دیا اور اس کے جانے کے بعد مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا اور حسب معمول نستعلیق سیکریٹری کی بجائے ایک سریلی آواز والی خاتون نے کال ریسیو کی۔

"مرشد ہاؤس۔"

اس کے انداز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ آپریٹر

ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد نے بالآخر ایک ڈھنگ کی فون آپریٹر رکھ لی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کہاں گیا جو پہلے کال ریسیو کرتا تھا۔ مرشد کا سیکریٹری۔"

"وہ جا چکے ہیں۔" آپریٹر محتاط انداز میں بولی۔ "آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں شہباز ملک بات کر رہا ہوں اور مجھے مرشد سے بات کرنی ہے ویسے آواز تمہاری زیادہ خوب صورت ہے۔ کاش کہ مجھے مرشد سے کام نہ ہوتا۔"

"تھینک یو سر۔" وہ خوش ہو گئی۔ "ایک منٹ ہولڈ کریں۔"

مرشد ایک منٹ سے بھی پہلے لائن پر تھا اور اس نے آتے ہی تلخ لہجے میں کہا۔ "اب کس لیے فون کیا ہے؟"

"مرشد لہجہ درست کرو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تمہارے ساتھ جو ہوا وہ تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔"

"تم نے فاضلی کے ساتھ مل کر میری درگاہ پر حملہ کیا۔ کیا ہوا اس کا؟" اس کا لہجہ الزام دینے والا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔

"مرشد تم کس قسم کے آدمی ہو سب تمہارے ساتھ ہوا۔ میں فاضلی کے ساتھ ملا نہیں بلکہ وہ مجھے جبراً لے کر آیا تھا۔ میری کلائی کا کڑا تمہارے سامنے تھا جس کا ریسیور فاضلی کی انگلی میں موجود انگوٹھی تھی مگر ڈیوڈ شا نے اسے دھوکا دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ زہر کڑے میں ہے جب کہ زہر انگوٹھی میں تھا اور جیسے ہی میں اس سے پچاس گز دور گیا زہر اس کے جسم میں انجکٹ ہو گیا۔ اس وجہ سے تم ذلت سے بچ گئے۔ میں نے رومانہ کو بچانے کی پوری کوشش کی تھی۔"

"تم اصل میں میرا خاتمہ کرنے آئے تھے۔"

"یہ مجھے تسلیم ہے شاید موقع ملتا تو میں تمہیں جہنم رسید کر دیتا۔ مگر میں نے وہ سب نہیں کیا جو تم سمجھ رہے ہو۔ اصل پلان ڈیوڈ شا کا تھا جس کے تم ایک زمانے میں جوتے چاٹتے تھے۔ وہ تمہیں تمہاری سرکشی کی سزا دینا چاہتا تھا اور اس نے فاضلی سے یہ کام لیا اور پھر اسے ٹھکانے لگا دیا۔ میرا کردار ایک کٹھ پتلی کا سا تھا کیونکہ میری ڈور فاضلی کے ہاتھ میں تھی۔ بہرحال میں نے تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کال نہیں کی ہے۔ سنا ہے تم میرے خلاف نئی ایف آئی آر کروانا چاہتے ہو یعنی دشمنی کا راؤنڈ نئے سرے سے شروع ہو گا۔"

"میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"واقعی؟" میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ "یا تمہاری کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔"

"شہباز۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "تم مجھے کمزور مت سمجھو۔"

"میں نے دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھا جب بھی تمہارے خلاف حرکت میں آیا تو یوں آؤں گا جیسے شیر کا شکار کرنے جا رہا ہوں چاہے شیر کی جگہ آخر میں چوہا نکلے۔ میں صرف خبردار کر رہا ہوں اب تمہاری طرف سے ذرا بھی دشمنی کا اظہار بات کو وہاں تک لے جائے گا جہاں اس سے پہلے میں کبھی نہیں گیا اور نہ میں نے اپنے ساتھیوں کو جانے دیا۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو گے کیونکہ تم عقل مند آدمی ہو۔"

"تم مجھے قتل کی دھمکی دے رہے ہو۔" اس نے یوں کہا جیسے چاہ رہا ہو کہ میں اقرار کر لوں کہ میں اسے قتل کی دھمکی دے رہا ہوں لیکن میں نے ایسی بے وقوفی نہیں کی۔ یہ کال یقیناً ریکارڈ کی جا رہی ہو گی۔ اس کی بجائے میں نے چالاکی سے کہا۔

"مرشد میں کبھی تمہاری سطح پر نہیں آیا تمہارا بھائی اپنی وجہ سے مرا لیکن میرے بھائی کا خون تم نے کیا۔ میری بات سے تم جو چاہے سمجھو۔"

"تم سمجھ رہے ہو کہ شاید میں مشکل میں ہوں۔"

"مرشد میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ میں ایک بار پھر خبردار کر رہا ہوں۔ اب اگر تمہاری طرف سے کوئی قدم اٹھایا گیا تو تمہیں تمہاری زبان میں جواب دیا جائے گا۔" میں نے کہتے ہی کال کاٹ دی۔

یہ میری پرانی سم تھی جس سے میں کئی بار مرشد سے بات کر چکا تھا اور یہ ڈیوڈ شا کے علم میں بھی تھی۔ ہمارا فیض آباد والا ٹھکانا ڈیوڈ شا کے علم میں تھا مگر وہ واپس جا چکا تھا اور مرشد میں فی الحال دم خم نہیں تھا۔ پھر وہ اس جگہ سے بھی لاعلم تھا اس لیے میں نے یہیں رہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی تھی۔ ابھی میں نے ڈیوڈ شا کے بارے میں سوچا تھا کہ موبائل نے بیل دی۔ اس پر برطانیہ کا کوڈ نمبر آ رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی تو میرے ذہن میں ایمن کا خیال تھا مگر وہ ڈیوڈ شا ثابت ہوا۔

"تم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے ہو؟"

"اس کے لیے میں تمہارا کسی قدر شکر گزار ہوں۔"

"نہیں اس کے لیے تمہیں راجا عمر دراز کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس نے خود ہی مجھ سے رابطہ کیا اور تمہیں

چھوڑنے کو کہا۔"

"راجا صاحب نے کہا اور تم نے چھوڑ دیا یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے۔"

"میرے اور اس کے کچھ معاملات ہیں جن میں ہم ایک دوسرے کو رعایت دیتے رہتے ہیں۔"

"کیا تم نے یہی بتانے کے لیے کال کی ہے؟"

"کچھ دیر پہلے میری مرشد سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے۔"

"تبھی اس نے میرے خلاف رپورٹ کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "میں اس شخص پر ایک فیصد اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"اس بار وہ ضمانت دینے کو تیار ہے۔"

"کیسی ضمانت؟"

"کچھ مخصوص حلقوں کی ضمانت۔" ڈیوڈ شا نے مبہم انداز میں کہا۔ "یہ وہ حلقے ہیں جن کی ضمانت کوئی نہیں ٹھکرا سکتا ہے۔"

مجھے شجاع بھائی کی بات یاد آئی۔ انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ ضمانت کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ڈیوڈ شا تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، میں مفاہمت پسند آدمی ہوں۔ میری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔ اگر مناسب ضمانت ہوئی تو میں بالکل تیار ہوں۔"

"میں تمہیں جانتا ہوں۔" ڈیوڈ شا نے آہستہ سے کہا۔ "اسی لیے تمہارے ساتھ میرا رویہ دوسروں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اوکے میں تمہیں پھر کال کروں گا۔"

معاملات تیزی سے ایک واضح رخ اختیار کر رہے تھے۔ پہلے صرف میرے اور مرشد کے درمیان معاملات چلتے تھے اور کبھی وہ حاوی ہو جاتا اور کبھی میں حاوی ہو جاتا تھا۔ مگر اب دوسرے زیادہ ملوث ہو رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ یہ جنگ ختم کر دی جائے۔ درگاہ پر حملے کے بعد سیکیورٹی ایجنسیاں بھی میدان میں آ گئی تھیں اور مرشد کے لیے بہت سی باتوں کی وضاحت مشکل ہو گئی تھی۔ اس پر دباؤ آیا تھا اور اسے پہلے جیسا اثر و رسوخ اور سرکاری حلقوں میں مقام حاصل نہیں رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ جھکنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اگر مجھے ٹھوس ضمانت مل جاتی کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوگا اور نہ ہی مرشد کی طرف سے ہمیں تنگ کیا جائے گا تو میں صلح کے لیے تیار تھا۔ ایسا حل نکل آتا جس میں کسی کو اپنی ناک نیچی نہ کرنی پڑتی تو وہی سب سے بہتر تھا۔

کچھ دیر میں زبیدہ ناشتا لے آئی اور میں نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد میں نے شاہ جی کے نمبر سے حویلی کال کی اور خواتین پارٹی سے بات کی۔ مونا نے بہت دماغ کھایا کہ اب وہ واپس آنا چاہتی ہیں۔ سادی نے کہا نہیں مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی بھی یہی خواہش ہے۔ بانو بہت خوش تھی اس نے بتایا کہ وہ پھر سے ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ مونا اور سادی اسے باڈی بلڈر کہہ کر چھیڑتی تھیں اور تمام مشکل اور سخت کام اس سے کراتی تھیں۔ انہوں نے اصرار کر کے حویلی کے بہت سے کام ذمے لے لیے تھے اس طرح وہ مصروف رہتی تھیں۔ یوں بانو نے کوشش کر کے خود کو پہلے کی طرح نازک اندام کر لیا تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے ملے۔ آخر شازیہ نے صرف سلام دعا کی اور حال احوال پوچھا تھا۔ وہ جھجک والی لڑکی تھی اور میری اس سے کبھی زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ حویلی میں امن و سکون تھا اور بابا اور ماں جی ان لوگوں کی وجہ سے بہت خوش تھے کہ حویلی میں رونق لگی رہتی تھی۔ سادی کو ماں جی کی صورت میں تجربے کار خاتون میسر تھی۔ جس کی اسے ان دنوں اشد ضرورت تھی۔ وہ جان نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے گھنٹے بعد میں نے فون بند کیا۔

پھر ندیم سے ہیلو ہائے کی اور اس کی گالیاں سننے کے بعد اسے مرشد کے نئے عزائم سے آگاہ کیا۔ وہ فکرمند ہو گیا۔ "یہ بہت بڑا چکر ہے ایسا کر تو کہیں اور اپنی موجودگی ثابت کرنے کا بندوبست کر لے۔ بندہ ایسا معتبر ہو کہ اس کی گواہی جھٹلائی نہ جائے ورنہ تو پھر مشکل میں پڑ جائے گا اور میری جان عذاب میں رہے گی۔ اپنے کیس چھوڑ کر تیرے چکروں میں عدالتوں میں بھاگتا پھروں گا۔"

"بکواس نہ کر تو نے کتنی پیشیاں بھگتی ہیں میری وجہ سے، شاید درجن بھی نہیں؟"

"پندرہ۔" اس نے درست تعداد بتائی۔

"اس پر بھی تو واویلا مچا رہا ہے۔"

"بیٹے عدالت کے ساتھ ساتھ مرشد اور اس کے لفنگوں کو بھی بھگتتا رہا ہوں۔" ندیم نے یاد دلایا۔ "اس کے باوجود سینہ تان کر آزاد گھوم رہا ہے اسی سے اندازہ لگا لے کہ ہمارے ہاں لوگ وکیلوں سے کتنا ڈرنے لگے ہیں۔"

کچھ دیر ہنسی مذاق کے بعد ندیم نے فون بند کر دیا۔ وہ عدالت پہنچنے والا تھا۔ اس کی بات سے مجھے راجا صاحب کا

خیال آیا۔ وہ ایک ایسے آدمی تھے جن کی گواہی جھٹلائی نہیں جا سکتی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے ان سے بات کیے ہوئے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوئی کہ جب ان کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی ان کی یاد آتی ہے۔ میرے پاس ان کے محل کے نمبر نہیں تھے مگر وہ میں عبداللہ سے لے سکتا تھا۔ ایک تو مجھے ان کی مدد درکار تھی دوسرے میں ان کی مزاج پرسی بھی کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے مجھے خیال آیا کہ معاملات کو سیٹ ہونے تک ہمیں یہیں بیٹھے رہنے کی بجائے منتشر ہو جانا چاہیے۔ دشمن پاس رہے تو آدمی کو کچھ نہ کچھ خیال آتا رہتا ہے۔ اس وقت دوری مناسب تھی۔ جب تک کہ مرشد معاملات کو سمٹانے کے طریقہ کار پر آمادہ ہو جاتا۔ جیسے میں سوچ رہا تھا یہ خیال مناسب لگا اور میں نے فیصلہ کیا کہ راجا صاحب کے پاس جانا ہی مناسب ہوگا۔ اس دوران میں عبداللہ اور وسیم واپس آ گئے تھے۔ وسیم نے بتایا کہ اس کے آدمیوں نے ایک طرف پہاڑی پر نصب میزائل برآمد کر لیا تھا اور اسے جھیل کی تہہ میں ڈال دیا تھا جہاں وہ کسی خطرے کا باعث نہیں تھا۔

"یہ روسی ساختہ میزائل ہے اور بہت خطرناک ہے۔" میں فکرمند ہو گیا۔ "اگر جھیل میں کوئی مسئلہ ہوا تو یہ بلاسٹ نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں بلاسٹ تو یہ صرف ایک میکنزم سے ہوتا ہے جب تک وہ حرکت میں نہیں آئے گا یہ پھٹے گا نہیں۔ پانی میں رہے گا کچھ عرصے بعد ناکارہ ہو جائے گا۔" وسیم نے وضاحت کی۔

عبداللہ راجا صاحب کے ایک کام سے گیا تھا جو بیگ نے اس کے سپرد کیا تھا۔ راجا صاحب کا ذکر آیا تو میں نے عبداللہ سے کہا۔ "مجھے راجا صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"میں ابھی کرا دیتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں فون پر نہیں بالمشافہ۔" میں نے کہا تو سب چونک گئے تھے

"آپ راجا عمر دراز کے پاس جائیں گے۔" وسیم نے پوچھا۔

میں نے سر ہلایا اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ "تم جانے کا بندوبست کرو۔"

"ہیلی کاپٹر سے؟" عبداللہ نے پوچھا۔

"نہیں بائی روڈ اور صرف میں جاؤں گا۔"

"کیوں اکیلے کیوں؟" سفیر نے اعتراض کیا۔

"اس کی وجہ بتاؤں گا۔" میں نے کہا اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ "کوئی چھوٹی جیپ لے لو سیکنڈ ہینڈ مگر بہترین کنڈیشن میں ہو۔ میں پہلے سے موجود کوئی گاڑی استعمال نہیں کروں گا۔"

"ایسی کیا مصیبت آ گئی ہے ابھی تو سکون ہوا ہے۔" سفیر نے کہا۔ "کچھ دن تو آرام کرو، آئے نہیں اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔"

پہلے میرا خیال تھا کہ میں ذرا کھل کر بات کروں گا۔ پھر خیال آیا کہ اس سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا۔ ندیم کی تجویز نے ایک راہ سجا دی تھی۔ میں نے ندیم کی تجویز ان کے سامنے رکھی۔ "اس کا کہنا ہے کہ میں اس دوران میں اپنی موجودگی کہیں اور ثابت کر دوں تو بچت ہو جائے گی ورنہ پھر کیس میرے گلے پڑ جائے گا۔ راجا صاحب سے معتبر گواہی کس کی ہوگی۔"

"اس کے لیے جانا ضروری تو نہیں ہے۔" سفیر پھر بولا۔ "وہ ویسے ہی تیرے حق میں گواہی دے دیں گے۔"

"نہیں یار بہت عرصہ ہوا راجا صاحب کی خیریت بھی نہیں پوچھی۔ یہ کام بھی نمٹ جائے گا اور میری غیر موجودگی میں تم لوگوں نے بھی کئی کام نمٹانے ہیں۔"

"مثلاً؟" سفیر نے پوچھا۔ وہی بولے جا رہا تھا جب کہ عبداللہ اور وسیم خاموش تھے۔

"بتاتا ہوں یار تم تو کیکر بن رہے ہو۔" میں نے چڑ کر کہا تو سفیر بھی خاموش ہو گیا۔ میں نے موضوع بدل دیا اور حویلی میں ہونے والی گفتگو سنائی۔ البتہ رات شجاع بھائی نے کیا کہا تھا اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس بار سب نے خاموشی سے سنا اور مجھے لگا کہ ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ پہلے جیسی بے تکلفی نہیں تھی۔ سب تکلف زدہ انداز میں خاموش تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب میرے کمرے میں جمع ہوئے اور میں نے سفیر اور وسیم سے کہا۔ "تم دونوں فوری طور پر دبئی چلے جاؤ۔ وہاں بزنس کے حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ اس لیے بزنس سیٹ کرو۔"

"میں ہو کر آیا ہوں بہت سے کام کر لیے ہیں۔" سفیر نے کہا۔ "میرے پاس رہائشی ویزا ہے اب وسیم کا بھی بن گیا ہے جب چاہیں وہاں جا سکتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔"

"یہ اچھی بات ہے۔" میں نے کہا اور وسیم کی طرف دیکھا۔ "تمام آدمیوں کو چھٹی پر گھر بھیج دو۔"

"یہ کام میں کر لوں گا۔" وسیم نے سر ہلایا۔

"ایاز کے لیے بھی وہیں کام سیٹ کرو اگر وہ یہاں

سے جانے کے لیے تیار ہو؟''

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ یہاں خوش ہے اس نے ورکشاپ سیٹ کرلی ہے۔''

وسیم نے بھی تائید کی۔ ''اسے ہمارے ساتھی کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا ہے۔ وہ زیادہ تر پس منظر میں رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس سے پوچھ ضرور لینا۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''کوئی حکم نہیں ہے ہم سب دوست ہیں اور مل کر فیصلے کرتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم ہمارے ساتھ چلو گے۔''

عبداللہ نے سوچا اور بولا۔ ''باہر جانے کے لیے ماں جی کی اجازت چاہیے ہوگی۔ انہوں نے تو اسلام آباد آنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے دی تھی۔''

''تم ان سے بات کرلو۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''تم نے گھر میں بانو کی بات کی ہے؟''

عبداللہ جھینپ گیا۔ ''ابھی نہیں کی ہے۔''

''تو کرلو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''اس معاملے کو زیادہ دیر مت لٹکاؤ۔ وہ بے گھر لڑکی ہے جتنی جلد اپنے گھر کی ہوجائے اس کے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔''

''تب میں حویلی چلا جاتا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''یہاں کا کیا کرنا ہے؟''

''یہ کوٹھی چھوڑ دو۔ کوئی اور جگہ دیکھو۔ شاہ جی کو آگے رکھو اور جگہ اس کے سپرد کردو۔''

''یہ مناسب رہے گا۔'' وسیم نے تائید کی۔ ''یہ جگہ دشمن کے علم میں آچکی ہے۔''

''چیزوں کے چکر میں مت پڑنا۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی چھوٹی فرنش کوٹھی دیکھ لو۔ مین شہر سے ذرا ہٹ کر ہو اور آس پاس آبادی نہ ہو تو بہتر ہے۔''

''میں اس طرف دیکھتا ہوں۔ کشمیر ہائی وے کے آخری حصے میں کچھ نئی سوسائٹیز بنی ہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''یہ آپ نے اچھی تجویز دی ہے کہ شاہ جی اور زبیدہ کو آگے رکھتے ہیں۔''

''بس تو ابھی سے یہ کام شروع کردو اور گاڑی والا کام ایاز کے سپرد کردو۔'' میں نے کہا اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ''تو ٹکٹس کا... یہ کام نمٹاتے ہی سب سے پہلے مونا اور سادی کو باہر بلانا ہے۔''

''وسیم کرلے گا۔'' سفیر نے کسمسا کر کہا اس دوران میں عبداللہ ایاز کو کال کر رہا تھا۔ اس سے بات کرکے اس نے آگاہ کیا۔

''وہ کہہ رہا ہے کل تک مل جائے گی۔''

''جتنی جلدی ہوسکے۔'' میں نے کہا۔

عبداللہ اور وسیم چلے گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی سفیر میرے سر ہوگیا۔ ''یہ تو کیا کر رہا ہے، اتنی ہڑبونگ مچانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''معاملات سمٹ رہے ہیں اس لیے ہماری طرف سے بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے مرشد کو کال کی تھی اور اسے وارننگ دی ہے کہ اب اس نے ذرا سی بھی دشمنی کا اظہار کیا تو یہ اس کے ڈیتھ وارنٹ پر سائن ہوں گے۔''

''ہمیں سائن نہیں اس کا خاتمہ کرنا ہے۔'' سفیر برہمی سے بولا۔ ''اور تو آدمیوں کو چھٹی پر بھیج رہا ہے۔''

''یہ کام آرام سے بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دوسرے ناکامی کا امکان بھی ذہن میں رکھو۔ ضروری نہیں ہے کہ مرشد مارا جائے اس صورت میں وہ پوری قوت سے دشمنی پر اتر آئے گا اور ہمیں اس سے بچنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں اسے وار کرنے کے لیے کم سے کم جگہ ملے۔''

''نہیں تو چاہتا ہے کہ ہم تجھ سے دور چلے جائیں اور اپنی اپنی زندگی میں مگن ہوجائیں۔''

''میں صرف تمہارے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی یہی چاہتا ہوں اس لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔''

''وہ دونوں بھی سمجھتے ہیں۔'' سفیر نے کچھ دیر بعد کہا۔

''لیکن وہ خاموش ہیں۔''

''دیکھ یار وہ کتنے ہی مخلص اور دوست یار سہی لیکن ان کی اپنی ایک زندگی ہے اور میں ان کو لامحدود طور پر اپنے معاملے میں ملوث نہیں رکھ سکتا۔ تجھے بھی نہیں کیونکہ اب تجھ پر سب سے زیادہ حق مونا کا ہے۔''

''میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''چھوڑنے کو کون کہہ رہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اب سب اپنے مستقبل کا پلان کرلیں۔ اس دوران میں حالات بھی دیکھتے رہیں گے۔''

''تو اکیلا سپاہی بننے کے چکر میں لگا ہوا ہے۔'' سفیر نے الزام دینے کے انداز میں کہا۔

''اب صرف مرشد باقی رہ گیا ہے اس سے نمٹنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ ایک انسان ایک انسان ہی ہوتا ہے۔''

''درگاہ کی تباہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کمزور ہوگیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

سفیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تو صرف اسی مقصد کے تحت راجا صاحب کے پاس جا رہا ہے؟''

''نہیں یار۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''تو جانتا ہے کہ راجا عمر دراز مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

سفیر اچھل پڑا۔ ''تو تو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے؟''

''میں جاکر دیکھوں گا کہ اس کی کیا پوزیشن ہے۔ سنا ہے طبیعت بہتر ہوئی ہے لیکن کینسر کا موذی مرض اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس حالت کے ساتھ مشکل ہے کہ وہ سفر کرسکے اور وہ بھی اتنا دشوار سفر جو بہت فٹ لوگ بھی مشکل سے کرتے ہیں۔''

''انسان کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے بعض اوقات وہ موت کے منہ میں بھی ایسے کام کرجاتا ہے جو زندہ انسان سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔'' سفیر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''جو طے ہوگیا ہے اس پر عمل کرنا ہے۔ میرا خیال ہے تم لوگ دو تین ہفتے میں وہاں کے معاملات سیٹ کرلو گے اور اتنا ہی عرصہ مجھے یہاں لگے گا۔ اس دوران میں مرشد کی طرف سے بھی ردعمل سامنے آجائے گا۔ پھر ہم جمع ہوکر سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''تب بھی تو کرنا ہوگا تو اب کیوں نہیں؟''

''یار ذرا ٹھنڈے دماغ سے بھی فیصلہ کرنا اچھا ہوتا ہے۔ ابھی مرشد نے ایک تحقیقاتی ٹیم کے سامنے مجھ پر الزامات لگائے ہیں کہ درگاہ کی تباہی میں میرا ہاتھ ہے۔''

سفیر چونکا۔ ''تجھے کیسے پتا چلا؟''

میں نے اسے شجاع بھائی سے ہونے والی گفتگو سنائی تو اس نے شکوہ کیا۔ ''تو اب ہم سے باتیں چھپانے لگا ہے۔''

''چھپانا ہوتا تو ابھی کیوں بتاتا اور میں چاہتا ہوں کہ ایک لائحہ عمل طے کرلیا جائے۔ ان باتوں میں الجھے رہے تو ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔ صرف یہی نہیں ابھی بہت کچھ سامنے آئے گا۔''

''وسیم اور عبداللہ کو نہیں بتائے گا؟''

''کیوں نہیں بتاؤں گا ان سے چھپایا تھوڑی ہے۔''

عبداللہ اپنے واقف کار ریئل اسٹیٹ والوں سے بات کرنے گیا تھا۔ وسیم ٹکٹس کرانے گیا تھا۔ دونوں شام تک واپس آگئے۔ اتفاق سے دونوں کامیاب رہے تھے۔ دبئی کے لیے اگلے دن شام کی فلائٹ میں ٹکٹس مل گئے تھے اور ایک اسٹیٹ ایجنٹ نے عبداللہ کو ایک نئی آبادی میں چھوٹا فرنش بنگلا دکھایا تھا۔ یہ سات مرلے پر تھا اور اس میں نیچے تین اور اوپر ایک بیڈ روم تھا۔ کرایہ اور ایڈوانس اچھا خاصا تھا مگر عبداللہ مان گیا اور دو دن بعد اس کی چابی مل جاتی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''مکان کا ایگری منٹ شاہ جی سے کروانا۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' عبداللہ نے اطمینان دلایا۔ ''اچھی جگہ ہے آس پاس کوئی مکان نہیں ہے۔''

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ معاملات اسی طرح جا رہے تھے جیسے میں چاہتا تھا۔ جہاں تک ماحول کی بات تھی تو جب حالات بدلتے ہیں تو اس کا اثر ماحول اور لوگوں پر بھی پڑتا ہے برسوں ایک جگہ کام کرنے والے جب ریٹائر ہوتے ہیں تو دفتری کولیگ سے پھر ان کی پہلے جیسی بے تکلفی نہیں رہتی۔ اگرچہ ہم دفتری کولیگ نہیں تھے۔ زندگی اور موت کے کھیل میں ایک دوسرے کے ساتھی رہے ہیں۔ سفیر میرا یار اور شروع سے میرے ساتھ رہا لیکن وسیم، عبداللہ اور ایاز اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئے۔ ہمارے درمیان خلوص اور محبت کا رشتہ تھا اس کے باوجود جب ہم نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے تو ہمارے انداز میں غیر محسوس تبدیلی آئی تھی۔ ہمارا تعلق ٹوٹا نہیں تھا مگر اس کی نوعیت بدلنے والی تھی اور جب یہ تبدیلی مکمل ہوجاتی اور تعلق نئے سرے سے استوار ہوجاتا تو پھر سب نارمل ہوجاتا۔ اس لیے میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

شاہ جی اور زبیدہ کو پتا چلا کہ ہمیں یہاں سے جانا ہے تو انہوں نے سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ عبداللہ نے بتادیا تھا کہ صرف وہی چیزیں ساتھ جائیں گی جو گاڑیوں میں آجائیں۔ باقی سب یہیں رہے گا۔ کوٹھی ہمیں خاصے سامان کے ساتھ ملی تھی لیکن بہت کچھ یہاں ڈلوایا گیا تھا اور وہ سب بھی یہیں رہ جاتا۔ ہمیں اچانک روانہ ہونا تھا اور پھر واپس نہیں آنا تھا۔ کوٹھی کا دیا ہوا ایڈوانس عبداللہ اس اسٹیٹ والے کے توسط سے واپس حاصل کرتا جس سے یہ کوٹھی کرائے پر لی تھی۔ اس لیے اب سامان کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ رقم والا لاکر اور اسلحہ تو لازمی ساتھ جاتا۔ اس کے علاوہ ہمارا ذاتی سامان بھی ساتھ جاتا۔ باقی چیزوں میں سے انتخاب ہو رہا تھا۔ رات تک ایک ہنگامہ رہا پھر ایاز کی کال آگئی۔

''شہباز صاحب ایک تین سال پرانی جیپ ہے لیکن

بہت اچھی کنڈیشن میں ہے۔ ٹویوٹا ملٹری ماڈل کا سویلین ورژن ہے۔ صاف ستھری گاڑی ہے اور کاغذات میں بھی مسئلہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے اسے شاہین کے نام ٹرانسفر کرا لو اور ٹرانسفر کب تک ہو جائے گا؟''

''کل صبح یہ کام ہو جائے گا جس سے لے رہا ہوں اس کے جیک ہیں وہ دو گھنٹے میں کام کرا لے گا۔''

''بس تو کام کراتے ہی مجھے اطلاع کرو۔ میں جلد از جلد روانہ ہونا چاہتا ہوں۔''

''کل زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک۔'' ایاز نے وعدہ کیا۔ ''مگر آپ ابھی آئے اور اتنی جلدی پھر جا رہے ہیں۔ شاہین ملنے کے لیے کہہ رہی تھی۔''

''گھر تو مشکل ہے، میں کل تمہارے ورکشاپ آجاؤں گا۔ گاڑی لے کر وہیں آنا۔ میں وہیں سے نکل جاؤں گا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' ایاز خوش ہو گیا۔ ''میں آپ کو ورکشاپ بھی دکھاؤں گا۔''

رات کے کھانے کے بعد میں نے وسیم اور عبداللہ کو بھی شجاع بھائی اور پھر مرشد سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا۔ ندیم کا مشورہ تو سامنے تھا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ موجودہ صورتِ حال میں انتظار یا عمل کرنے کی بجائے ہم اپنے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کر لیں تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ مگر وسیم نے ایک سوال اٹھایا۔ ''فرض کریں راجا صاحب آپ سے اصرار کرتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ چلیں تو؟''

''تب میں اصرار کی شدت دیکھوں گا۔''

''اگر ان کا اصرار شدت کا ہوا تو؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''تب شاید میں انکار نہ کر سکوں۔ اب میرے پاس انکار کا جواز بھی نہیں ہے۔''

''یہ پاگل پن ہے۔'' سفیر نے بے چینی سے کہا۔ ''ایک بیمار آدمی ایسا سفر کیسے کر سکتا ہے؟''

''یار مفروضات پر پریشان مت ہو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''بہت سی باتیں آدمی کی قسمت میں ہوتی ہیں وہ اپنی مرضی نہیں چلا سکتا ہے۔''

''میرا دل کہہ رہا ہے راجا عمر دراز نہیں مانے گا۔'' سفیر نے یقین سے کہا۔ ''وہ بسترِ مرگ پر بھی وہاں جانا چاہے گا۔''

''دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے اب آرام کیا جائے کیونکہ کل سب کو بہت کام ہے اور سفر بھی کرنا ہے۔''

''سوائے میرے۔'' عبداللہ بولا۔ ''میری مصروفیات پرسوں سے شروع ہوں گی۔''

''کوشش کرو کہ کل ہی چابیاں مل جائیں تو تم اور شاہ جی بھی کل شفٹ ہو جاؤ۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' عبداللہ نے سر ہلایا۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور موبائل آن کر کے سویرا کو کال کی۔ میں جانے سے پہلے اسے بتانا چاہتا تھا۔ وہ سب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس لیے کال ریسیو نہیں کی کچھ دیر بعد اس نے خود کال کی۔ سلام دعا کے دوران میں، میں نے محسوس کر لیا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ میں نے پوچھ لیا۔ ''سویرا کیا بات ہے سب ٹھیک ہے نا؟''

''نہیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ابھی ایک گھنٹا پہلے میرے موبائل پر اجنبی نمبر سے کال آئی تو میں نے آپ کی سمجھ کر ریسیو کر لی۔''

''کس کی کال تھی؟''

''فتح خان......''

''وہ خبیث......'' میرے منہ سے گالی نکلی۔ ''اس کی جرأت کیسے ہوئی تمہیں کال کرنے کی۔''

''میں نے بھی یہی کہا تھا مگر وہ بے غیرتی سے ہنسنے لگا۔ اس نے کہا کہ آپ کو پیغام دے دوں کہ فتح خان ابھی مرا نہیں ہے۔''

''اس بار وہ میرے سامنے آیا تو زندہ نہیں رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے نمبر دو۔''

سویرا سہم گئی۔ ''پلیز شہباز وہ خطرناک آدمی ہے آپ اس سے دور رہیں۔''

''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں مجھے نمبر دو۔'' میں نے کہا تو اس نے مجھے نمبر دیا اسے نوٹ کر کے میں نے پوچھا۔ ''اور کیا کہا اس نے؟''

''اس نے تو بس یہی پیغام دیا مگر میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ اب نہیں بچے گا۔''

''سویرا تم جانتی ہو کہ بیتو میرے لیے کیا تھا اور اس کی موت کی ایک وجہ یہ شخص بھی ہے۔ یہ واحد فرد ہے جو زندہ ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' سویرا بولی۔ ''جب میں نے اس کی موت کا سنا تو مجھے لگا جیسے میرا کوئی اپنا مر گیا ہو۔ اس دن سب رو رہے تھے، ماں جی تک اسے یاد کر رہی تھیں۔ یہاں اس نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔''

''وہ ایسا ہی شخص تھا۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''بے جگر اور بے غرض۔''

''سوری شہباز میں نے غلطی سے فتح خان کی کال ریسیو کر لی۔''

''یہ تمہاری غلطی نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''اب میں تمہیں اسی نمبر سے کال کروں گا یا کسی اور نمبر سے کروں گا تو پہلے تمہیں میسج کر دوں گا کہ یہ میرا نمبر ہے اس کے علاوہ تم کسی نمبر کی کال ریسیو نہیں کرو گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔

''کل میں راجا عمر دراز کی طرف جا رہا ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیوں جا رہا ہوں۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئی کہ میں یہاں سے اپنے معاملات سمیٹ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے آپ وہاں سے آجائیں۔ حویلی کو ایک جوان آدمی کی ضرورت ہے۔ بابا صحت مند ہیں مگر ان کی عمر ہو گئی ہے۔''

''انشا اللہ میں حویلی ہی آؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرا امزاج زمینداری والا نہیں ہے۔ بہر حال تو مستقبل کی بات ہے۔ اس پر میں وہیں آکر بات کروں گا۔''

میرا ابھی یہی ارادہ تھا کہ راجا عمر دراز سے مل کر حویلی جاؤں گا۔ میں اب تک پُرسکون تھا مگر سویرا نے فتح خان کا بتا کر مجھے ٹینشن میں ڈال دیا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جو میرے آس پاس ہو اور میں سکون سے رہوں۔ مجھے اس خواب کا خیال آیا جو میں نے ڈیوڈ شا کی قید میں ہوش میں آنے سے پہلے دیکھا تھا اور جس میں فتح خان تھا۔ یہ خواب تقریباً سچ ہو گیا تھا۔ انڈیا سے واپسی پر میرا خیال تھا کہ اب مجھے فتح خان کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ مگر واپسی کے چند دن بعد ہی میرا یہ خیال غلط ثابت ہو رہا تھا۔ جب سویرا نے مجھے فتح خان کی کال کے بارے میں بتایا تو بلا مبالغہ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خون سرد ہو گیا اور اب میں ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہا تھا کہ آخر فتح خان نے کیوں مجھ سے رابطہ کرنا چاہا تھا؟ سویرا سے بات کرنے کے کچھ دیر میں نے اس کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی۔ چند بیل کے بعد کسی عورت نے کال ریسیو کی۔

''کون ہے؟''

''فتح خان سے بات کراؤ۔''

''ادھر کوئی فتح خان نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا اور اسی عورت نے اٹھایا۔

''یہ موبائل جس کا ہے اسے دو چاہے اس کا نام کچھ بھی ہو۔''

''وہ سو رہا ہے۔'' عورت کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ''میں نے اسے اٹھایا تو وہ مجھے مارے گا۔ یہ بہت ظالم آدمی ہے۔''

''جب تم اسے بتاؤ گی کہ شہباز ملک کی کال ہے تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''ہاں اسے نہ بتایا تو اس کا نقصان ہو گا اور پھر وہ تمہیں شاید قتل کر دے گا۔''

عورت کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ شاید فتح خان کی داشتہ تھی اور اس کے بیڈروم میں تھی۔ چند لمحے بعد فتح خان کی پُرخمار آواز آئی۔ ''شہباز خاناں۔''

''فتح خان۔'' میں نے سرد ترین لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ اب میرے اور تمہارے درمیان مروت کا تعلق ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمارا سامنا ہوا تو ہم میں سے ایک ہی فرد زندہ رہے گا۔ میں تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا لیکن تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے دور رہو۔''

''شہباز خان میں خود بھی تمہارے پیچھے نہیں آنا چاہتا، پر کیا کریں مجبوری ہے۔''

میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا مگر انجان بن کر بولا۔ ''کیسی مجبوری؟''

''تم سمجھتا ہے میں ہیروں کی بات کر رہا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرے کو بس وہ ہیرے مل جائیں۔''

''وہ ہیرے تمہیں جہنم میں ملیں گے۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''اور جہنم جانے کے لیے تمہیں میرے سامنے آنا ہو گا۔''

''ہم کو جہنم کا پروا نہیں ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''وہ غالب خان نے کیا فرمایا ہے کہ دل خوش رکھنے کو یہ خیال اچھا ہے غالب۔''

''وہ غالب نے جنت کے بارے میں کہا ہے۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ویسے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ فتح خان نے یہ ایک مصرع بھی کہاں سے سن کر یاد رکھا تھا۔ ''ٹھیک ہے تمہیں جنت جہنم کی پروا نہیں ہے لیکن میری زندگی کو کیوں جہنم بنا رہے ہو۔''

فتح خان کچھ دیر کے لیے خاموش رہا تھا پھر اس نے

کہا۔ ”شہباز میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہے۔“
”کیسا سودا؟“
”تم ہیرے تلاش کرنے میں میرا مدد کرو، ہیرے مل گئے تو میں تم کو مرشد سے نجات دلا دے گا۔ یہ فتح خان کا وعدہ ہے۔“
”فتح خان تم شاید نہیں جانتے کہ بیتو میرے لیے دنیا کی تمام دولت سے بڑھ کر قیمتی تھا اور وہ کیوں جان سے گیا تم یہ بھی جانتے ہو۔“
”مجھے اس کا افسوس ہے۔“
”مجھے تمہارے افسوس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آخری بار تمہیں خبردار کر رہا ہوں اب میرے سامنے مت آنا ورنہ میں بیتو کا انتقام لینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“
”شہباز میرا بات سنو......“ فتح خان نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔ میں نے فتح خان کو دھمکی دے دی تھی مگر وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو آسانی سے اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔ سویرا سے رابطے کا مطلب تھا کہ اس کے ذہن میں میرے حوالے سے کوئی بات ہے۔ اس کی باتوں سے بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ ہیروں کا خناس اس کے دماغ سے نکلا نہیں تھا۔ مگر میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے موبائل بھی بند کر دیا تھا۔ اب وہ مجھ سے رابطے کا کوئی دوسرا طریقہ نکالتا مگر مجھے اُمید تھی کہ وہ براہِ راست میرے سامنے آنے سے گریز کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اپنے الفاظ پر عمل کرنے والا شخص ہوں۔ فتح خان جیسے عیار خودکشی نہیں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر موقع پر جان بچا کر نکلنے میں کامیاب رہا۔ کنور پیلس سے بھی وہ جس طرح فرار ہوا تھا وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ بہت جلد واپس بھی آ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے دماغ سے یہ بات نکلی نہیں تھی کہ ہیرے اسے میری مدد سے ہی مل سکتے تھے۔ ورنہ اسے مجھ سے اور کوئی مطلب نہیں تھا وہ بس اسی ایک چیز کو لے کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔
رات دیر سے سونے کے باوجود میری آنکھ صبح جلد کھل گئی۔ میں تر و تازہ تھا اور غسل کر کے رہی سہی کسل مندی بھی دور ہو گئی۔ نیچے آیا تو پتا چلا کہ آج ریڈی میڈ ناشتا ہو گا کیونکہ کچن کا بیشتر سامان پیک کیا جا چکا تھا۔ شاہ جی باہر سے حلوا پوری اور کلیجے پائے لے آیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے مختصر میٹنگ کی۔ اس میں ایک بار پھر تمام امور کا جائزہ لیا۔ مجھے سب سے پہلے روانہ ہونا تھا اور زبیدہ نے میرا بیگ تیار کر دیا تھا۔ اس میں میرے چند جوڑے اور ضرورت کی چیزیں تھیں باقی سامان ان لوگوں کے ساتھ نئے بنگلے میں جاتا۔ سب سے مل ملا کر میں دس بجے عبداللہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مجھے ایاز کے ورکشاپ تک چھوڑ کر واپس آ جاتا۔ ایاز سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ جیپ لے کر وہیں آئے گا۔ پندرہ منٹ میں عبداللہ نے مجھے وہاں چھوڑا۔ وہ میرے لیے ایک اضافی موبائل اور دو مزید سم لے آیا تھا۔ یہ فریش تھیں اور عبداللہ نے انہیں ایکٹو کرایا تھا۔ میں اب اپنی سم استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ مرشد اور فتح خان دونوں کے علم میں آ چکی تھی۔ میں کم سے کم اس سفر میں اس سم کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔
ایاز جیپ کی رجسٹریشن کے لیے گیا ہوا تھا میں اس کے چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ عبداللہ کو بنگلے کی چابی لینے جانا تھا اس نے اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کر لی تھی اور وہ آج ہی تمام کام کرانے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس لیے عبداللہ مجھ سے مل کر چلا گیا۔ ورکشاپ میں تین نوجوان لڑکے کام کر رہے تھے اور وہ اپنے کام میں ماہر لگ رہے تھے۔ ایاز کی غیر موجودگی میں بھی وہ پوری لگن سے کام میں لگے ہوئے تھے۔ لڑکے ڈینٹنگ پینٹنگ اور دوسرے کاموں کے لیے تھے۔ انجن اور اس سے متعلقہ امور ایاز خود دیکھتا تھا اور گاڑی کی الیکٹرک وائرنگ کے لیے اس نے ایک الیکٹریشن ہائر کیا ہوا تھا جو طلب کرنے پر آ جاتا تھا۔ ایاز کے نائب نے میرے منع کرنے کے باوجود چائے منگوا لی تھی۔ جب تک میں نے چائے پی ایاز آ گیا۔ وہ ایک گہرے سبز رنگ کی ٹو ڈور جیپ میں آیا تھا۔ اس کا فولادی کیبن ایک ہی پیس کا بنا ہوا تھا۔ آگے مضبوط بمپر تھا اور عقب میں پیچھے کھلنے والا دروازہ تھا۔ میں دفتر سے نکل کر آیا۔ ایاز نے اتر کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور جیپ کی طرف اشارہ کیا۔
”کیسی ہے جناب؟“
”یہ تو تم بتاؤ گے، دیکھنے میں تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔“
”باقی بھی اے ون ہے۔ ابھی لڑکے آدھے گھنٹے میں سروس کر دیں گے۔ آئل نیا ہے اور باقی وہ دیکھ لیں گے۔“ ایاز نے کہا اور لڑکوں کو ہدایت دے کر میرے ساتھ دفتر میں آیا۔ یہ چھوٹا سا لکڑی اور شیشے کا بنا کیبن تھا۔ اس نے مجھے جیپ کی بک دی۔ یہ شاہین کے نام رجسٹر ہو گئی تھی۔ ایاز ہنسا۔

”جب میں نے شاہین کو بتایا تو وہ ہنسی تھی کہ اسے بھلا گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔“
”کیسی ہے وہ اور تم دونوں کا آنے والا بے بی۔“
”دونوں اے ون ہیں۔“ ایاز نے چہک کر کہا۔
”وسیم اور سغیر دبئی جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”عبداللہ بھی شاید حویلی چلا جائے، یہاں تم رہ جاؤ گے اور مجھے تمہاری فکر ہے۔“
”اللہ مالک ہے اور مجھے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔“ اس نے مخصوص بے پروائی سے کہا۔ اس نے حلیہ بدل لیا تھا۔ اپنے لمبے بال کریو کٹ کرا لیے تھے اور اب کلین شیو تھا۔
”وہ تو ہے مگر مجھے خدشہ رہے گا۔ ایاز میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ فی الحال یہاں بزنس کے حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ ٹورزم ٹھپ ہے۔ شاید میں حویلی چلا جاؤں یا پھر دبئی شفٹ ہو جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی دبئی آ جاؤ وہاں گاڑیوں کے کام کا بہت اسکوپ ہے۔“
”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہاں بھی کام اچھا چل رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اچھا اور کھل کر کما رہا ہوں۔“
”بات کمائی کی نہیں ہے یار تم ہنرمند آدمی ہو جہاں جاؤ گے کما لو گے تم میرے خدشات کو سمجھو۔ ابھی مرشد کا خطرہ ٹلا نہیں ہے جب تک معاملہ سیٹ نہ ہو جائے مجھے اس کی طرف سے خطرہ رہے گا اور ظاہر ہے میرے ساتھیوں کو بھی رہے گا۔“
”ٹھیک ہے میں شاہین اور خالہ سے پوچھتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان کے بغیر نہیں جا سکتا۔“
”ان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے تم وہاں بزنس ویزا لو گے اور اپنی فیملی کو بلا سکو گے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”رہائش کا مسئلہ نہیں ہے جب تک تمہارا اپنا بندوبست نہیں ہو جاتا سغیر کے ساتھ رہو گے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی بڑا گھر لے لیں اور سب ساتھ رہیں۔“
”شاہین کا مسئلہ نہیں ہے وہ تو سب کے ساتھ خوشی سے رہے گی، البتہ خالہ شاید نہ مانیں کیونکہ یہ ان کا آبائی گھر ہے بچپن سے رہ رہی ہیں۔ محلّہ اور دوسرے رشتے دار بھی ہیں۔ ان کا سوشل سرکل خاصا وسیع ہے۔“
”تم بات کر کے دیکھو۔“ میں نے کہا۔ اس دوران میں جیپ تیار ہو گئی تھی۔ زبیدہ نے کھانے کا پوچھا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ ایاز شاہین سے تکا بوٹی، پراٹھے اور پلاؤ بنوا لایا تھا یہ سب ایک بڑے سے ہاٹ پاٹ میں تھا۔ اس نے مجھے تھمایا۔
”اس کی کیا ضرورت تھی؟“
”تھی جناب تب ہی تو شاہین نے ساتھ کیا ہے۔ یہ دوپہر تک تو گرم رہے گا۔“
”کوئی بات نہیں اُمید ہے میں شام تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔“
”ان دنوں بارشوں کی وجہ سے راستے خراب ہیں۔“ ایاز نے بتایا۔ ”آپ شاید کل ہی پہنچ سکیں رات کو کسی ہوٹل میں رک جائیں تو بہتر رہے گا۔“
”شاید ایسا ہی کروں۔“ میں نے اس کے گلے لگ کر کہا۔ ”شاہین کو شکریہ کہنا۔“
”اس میں شکریے کی کیا بات ہے جناب۔“ ایاز نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اپنا بیگ اور ہاٹ پاٹ پیچھے رکھا وہاں کولڈ ڈرنک کے ٹن، منرل واٹر کی بوتلیں اور ایک عدد تھرماس پہلے سے رکھا ہوا تھا جس میں کافی تھی۔ سب شاہین نے بھجوایا تھا۔ گویا راستے کی ضرورت کی ہر چیز تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے نئے موبائل میں نئی سم لگائی۔ عبداللہ موبائل چارج کر کے لایا تھا۔ پھر یہ جیپ کے چارجر سے بھی چارج ہو سکتا تھا اس لیے اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ میں ورکشاپ سے نکلا تو سڑک پر مڑتے ہوئے میں نے مخالف سمت میں ایک مارگلہ کار میں ایک قبائلی کو دیکھا۔ میں چونکا کیونکہ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور ہماری نظریں ملیں تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ میں آگے نکلا اور عقب میں دیکھا تو کار مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ اتفاق تھا۔ دراصل حالات نے مجھے اعصاب زدہ کر دیا ہے اور میں ذرا سی بات سے چونک جاتا ہوں۔ وہ قبائلی صورت سے فتح خان کے علاقے کا رہنے والا لگ رہا تھا۔ یہ وجہ بھی تھی اور پھر وہ مسکرایا تھا۔
راجا عمر دراز کے علاقے تک جانے کا مختصر راستہ تو مردان سے گزرتا تھا۔ میں ہری پور روڈ سے اس طرف مڑ جاتا۔ جو اصل میں قراقرم ہائی وے کا آغاز بھی ہے۔ مگر وہاں تک جانے کے لیے مجھے پورا پنڈی، پھر فتح جنگ اور ٹیکسلا کے پاس سے ہوتے ہوئے واہ کینٹ کے نیچے سے نکلنا پڑتا اور یہ خاصا لمبا روٹ تھا جس میں جی ٹی روڈ والا حصہ ہمیشہ خراب ملتا ہے۔ اس لیے میں نے مری ایبٹ آباد والے راستے کو ترجیح دی۔ اس کا بڑا حصہ پہاڑوں سے گزرتا ہے مگر یہ میرے پسندیدہ مناظر ہیں۔ میں روانہ ہوا اور آدھے گھنٹے بعد مارگلہ کو عبور کر کے مری کے پہاڑوں میں

داخل ہو رہا تھا۔ مارگلہ کا سلسلہ ہائے کوہ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن اس نے اس علاقے کو کسی سانپ کی طرح اپنے بل میں لے رکھا ہے۔ ایک طرف یہ مری کے پہاڑوں تک جاتا ہے اور دوسری طرف ہزارہ پٹی کو چھوتا ہے۔ پنڈی اور اسلام آباد کو ہری پور، واہ کینٹ اور حسن ابدال کی اہم آبادیوں سے جدا کیا ہوا ہے۔

اگر دامن کوہ سے چند کلو میٹر طویل ایک سرنگ نکالی جائے جو دوسری طرف خان پور پر نکلے تو یہ سارا علاقہ ایک ہو جائے گا۔ ہری پور اور مانسہرہ کی مسافت بہت کم رہ جائے گی اور یہاں رہنے والوں کو پنڈی اسلام آباد آنے کے لیے ایک مختصر راستہ مل جائے گا۔ واضح رہے کہ اس خطے کی آبادی ایک کروڑ سے اوپر ہے اور ان سب کے مفادات آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ نئے راستے بنیں گے تو معاشی سرگرمیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایاز کا کہنا درست ثابت ہوا جب راستے میں پہلی لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ پڑا۔ مگر یہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ایک بلڈوزر مٹی ہٹا رہا تھا اور بیس منٹ کے وقفے کے بعد میں دوبارہ روانہ ہوا۔ جیپ چھوٹی لیکن اس کا بارہ سو سی سی کا ڈیزل انجن طاقتور تھا۔ ایاز نے نہ صرف ٹینک فل کرا دیا تھا جو آنے اور جانے دونوں کے لیے کافی تھا مگر ساتھ ہی اس نے بیس بیس لیٹر کے دو بھرے ہوئے جیری کین بھی پیچھے رکھے تھے۔ مری کے قریب پہنچ کر سگنل ملے تو میں نے وسیم کو کال کر کے اپنے نکل جانے کی اطلاع دی۔

''میں مری تک پہنچ گیا ہوں۔''

''ہم بھی سامان پیک کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''شاید عبداللہ اینڈ پارٹی بھی آج ہی نکل جائے۔ بنگلے کی چابی مل گئی ہے۔''

''یہ اچھا ہے، ہمیں طے شدہ کام جلد نمٹا لینے چاہییں۔''

''میری سادی سے بات ہوئی تھی وہ خوش ہے۔ اسے دبئی ویسے ہی پسند آیا تھا اور وہ وہاں رہنا چاہتی ہے۔''

''بس تو تم ان کے لحاظ سے وہاں سیٹنگ کر لو اور پھر انہیں آ کر لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میری تو خواہش ہے کہ تم لوگ اب وہیں رہو۔''

''آپ کے بغیر نہیں۔'' وسیم نے انکار کیا۔ ''ہاں سونیا کا فون آیا تھا۔ میں ماموں بننے والا ہوں۔''

''مبارک ہو، وہ کہاں ہے؟''

''خیر مبارک۔'' وسیم ہنسا۔ ''لاہور میں ہی ہے۔ اس کے صحافی شوہر نے نیا بزنس شروع کر دیا ہے۔ وہ کیبل آپریٹر بن گیا ہے آدھے لاہور کو وہی کیبل ٹی وی مہیا کر رہا ہے۔''

''یہ تو اچھا ہے ورنہ صحافی بن کر دھکے کھاتا رہتا۔''

''آج کل تو صحافیوں کے بھی مزے ہیں۔ مگر سب کے نہیں اخباروں میں کام کرنے والے آج بھی دھکے کھاتے ہیں۔''

گرمی کی وجہ سے مری کی طرف جانے والوں کا رش تھا مگر مجھے آگے جانا تھا صرف کال کرنے کے لیے رکا تھا۔ یہاں مسلسل گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ جتنی دیر میں نے کال کی جیپ کے آگے پیچھے کئی گاڑیاں جمع ہو گئی تھیں اور مزید آ رہی تھیں۔ ہارنوں کے شور سے پہاڑیاں گونج رہی تھیں۔ میں نے جیپ نکالنے کی کوشش شروع کی اور آگے پیچھے والی گاڑیاں بھی حرکت میں آ گئیں۔ پیدل چلنے والے پہاڑ کی ڈھلان کے ساتھ چھوٹے سے کچے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے کیونکہ گاڑیوں کی وجہ سے سڑک پر جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے جیپ کو ڈھلان کی طرف کیا تو مجھے اس کچے فٹ پاتھ پر ایک قبائلی نظر آیا۔ اس نے روایتی لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور جب میں نے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا اور پھر اس نے غیر متوقع انداز میں انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر مجھے دکھایا۔

میں اسے چند لمحے کے لیے دیکھ سکا تھا اور پھر عقب سے آنے والی گاڑیوں کے دباؤ نے مجھے آگے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے سائیڈ مرر میں اس قبائلی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی قدر کھلی جگہ آتے ہی مجھے گاڑی روکنے کا موقع ملا اور میں نے جیپ روکتے ہوئے جلدی سے اتر کر دیکھا۔ عقب میں جاتے لوگوں میں مجھے اس حلیے کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا میں واپس آیا اور ایک مقامی نوجوان کو روکا اور اسے قبائلی کا حلیہ بتاتے ہوئے اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔''

یہ نوجوان اس قبائلی کے پاس ہی تھا مگر اس نے اسے نہیں دیکھا۔ جب تک میں جیپ روک کر آیا وہ غائب ہو گیا تھا ورنہ میں اسے پکڑ کر ضرور پوچھتا کہ اس نے مجھے وکٹری کا نشان کیوں دکھایا تھا۔ کیا اس سے مراد فتح تھی یعنی فتح خان۔ اگرچہ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ وہ قبائلی بلا مقصد بھی یہ حرکت کر سکتا تھا مگر میرے اندر بے چینی سی بھر گئی تھی۔ میں اسے تلاش کرنے لگا اور کچھ دیر میں، میں نے ہر ممکن جگہ دیکھ لیا۔ قبائلی کے یوں غائب ہونے سے میرا شبہ بڑھ گیا تھا۔ فتح خان جیسے شاطر سے ایسی ہی حرکتوں کی اُمید کی جا سکتی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کھیلتا رہا تھا۔ یعنی اپنی جھلک دکھانا یا اپنی موجودگی کا احساس دلانا اور پھر غائب ہو جانا۔ ایسا کر کے ایک طرف وہ مجھے بے اطمینانی کا شکار کرتا تھا تو دوسرے مجھے ہنکا کر اپنے پھندے کی طرف لانا چاہتا تھا۔ یہ تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے ہیروں کی تلاش میں مدد چاہتا ہے۔ اگر اسے علم ہو گیا تھا کہ میں راجا عمر دراز کے پاس جا رہا تھا تو وہ لازمی اسی سمت میں محو سفر ہو گا، کیونکہ وہ وادی وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے جہاں ہیرے موجود تھے۔

فتح خان کے خطرے کے باوجود مجھے آگے تو جانا تھا۔ چند منٹ بعد میں پُرسکون سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ اوپر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ خالی سڑک دیکھ کر مجھے اندیشہ ہوا کہ آگے پھر کوئی لینڈ سلائیڈنگ نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ایبٹ آباد کی طرف نکلنے والی سڑک آ گئی۔ ایک زمانے میں یہ سڑک بہت خطرناک اور تنگ ہوتی تھی مگر اب اسے بھی بہتر کر دیا گیا تھا۔ البتہ مری کی نسبت یہاں پہاڑوں پر درخت کم تھے۔ وجہ وہی ہے، ٹمبر مافیا نے جا بہ جا پورے پورے جنگل صاف کر دیے ہیں۔ ڈرائیو کرتے ہوئے میں عقب کا بھی خیال رکھے ہوئے تھا۔ مگر مجھے پیچھے کوئی مشکوک گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ چار بجے کے قریب میں ایبٹ آباد پہنچ گیا تھا اور خلافِ توقع کہیں لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

یہیں ایک پارک میں رک کر میں نے لنچ کیا اور پانچ بجے آگے روانہ ہو گیا۔ آج کے دن راجا عمر دراز کے محل تک رسائی نظر نہیں آ رہی تھی اس لیے میری کوشش تھی کہ الائی یا بشام تک پہنچ جاؤں۔ یہ دونوں بہت خوب صورت ہل اسٹیشن ہیں اور اس کے بعد چند گھنٹے کا سفر تھا جو میں اگلے دن بھی کر سکتا تھا۔ مگر مانسہرہ سے جب میں قراقرم ہائی وے پر مختصر سفر کر کے دوسری سڑک پر آیا تو یہاں سے راستے کی خرابی کا آغاز ہو گیا اور ایک جگہ لینڈ سلائیڈنگ تھی۔ اگرچہ یہ بھی معمولی سی تھی مگر اس کی وجہ سے وقت ضائع ہوا اور میں آٹھ بجے کے قریب سوات ویلی میں داخل ہوا۔ الائی کی بجائے میں نے بشام میں رکنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ مین روڈ پر ہے جب کہ الائی مین روڈ سے ذرا ہٹ کر ہے۔ وہاں سے مجھے واپس دوبارہ مین روڈ پر آنا پڑتا اور پھر بشام آگے تھا اس لیے میں نے اسے ترجیح دی۔ یہاں سے میں اگلی صبح وقت ضائع کیے بغیر روانہ ہو سکتا تھا۔

سیزن کی وجہ سے یہاں بھی سیاحوں کا رش تھا اس لیے کمرے کی تلاش میں مجھے کئی ہوٹلوں میں گھومنا پڑا اور بالآخر ایک جگہ کمرا مل گیا۔ تھکن بہت زیادہ تھی اس لیے کھانا کھا کر میں سو گیا۔ اسلام آباد سے نکلتے ہوئے مارگلہ میں نظر والے قبائلی کی وجہ سے مجھے خدشہ تھا کہ کوئی پیچھے نہ ہو خاص طور سے فتح خان کی طرف سے اندیشہ آ گیا تھا۔ پھر مری میں ملنے والی اور انگلیوں سے فتح کا نشان بنانے والے قبائلی نے میرے خدشات مزید بڑھا دیے تھے۔ اس لیے سفر کے دوران میں، میں نے عقب کا خاص خیال رکھا تھا۔ مگر پہاڑی سڑکوں پر کسی کا تعاقب کرنا بہت آسان ہے کیونکہ یہاں راستے محدود ہوتے ہیں اور آپ کو کسی کی منزل کا علم ہو تو آپ آسانی سے فاصلہ رکھ کر پیچھے چل سکتے ہیں۔ اگر فتح خان کو میرے سفر کا علم ہو جاتا تو منزل کا اسے خود پتا چل جاتا اور وہ میرے پیچھے آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے تعاقب کا خیال رکھنا تھا۔ حفاظت کے لیے میرے پاس ایک پستول اور ایک چھوٹی شاٹ گن تھی۔ دونوں چیزیں میرے بیگ میں تھیں۔

رات سونے سے پہلے میں نے صبح آٹھ بجے کا الارم لگایا اور الارم نے مجھے جگا دیا۔ پہلے میں نے عبداللہ کو کال کی اور اس نے اطلاع دی کہ وسیم اور سفیر اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے بھی راتوں رات شفٹنگ کر لی تھی۔ یہ سن کر میں نے اطمینان محسوس کیا، میرے ساتھی محفوظ ہو گئے تھے۔ ناشتا کرتے ہی میں آگے روانہ ہو گیا۔ میری کوشش تھی کہ دوپہر تک راجا عمر دراز کے محل تک پہنچ جاؤں۔ مگر ہائی وے پر ذرا آگے نکلتے ہی پھر لینڈ سلائیڈنگ نے راستہ مسدود کر دیا۔ یہ داسو کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ اوپر سے مٹی اور پتھروں کا ایک انبار تھا جو سڑک پر آ گرا تھا اور اسے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کیونکہ مٹی ابھی تک سرک رہی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس طرف صرف چند گاڑیاں تھیں اور سڑک کی صفائی اور راستہ بنانے کے لیے دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا۔ حالانکہ یہ مین ہائی وے ہے جو اس علاقے کو نیچے کے علاقوں سے ملاتی ہے۔ مگر یہاں بھی ہنگامی حالات میں کام آنے والا عملہ اور مشینری ہمہ وقت دستیاب نہیں تھی۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا جگی ہوٹل تھا۔ وقت گزاری کے لیے مسافر وہاں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ ہوٹل کا مالک چائے بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''آگے جانے کا کوئی اور راستہ ہے؟''

اس نے اپنی میلی قمیص سے اپنا دھواں آلود چہرہ صاف کیا اور بولا۔ ”پکا راستہ تو نہیں ہے، پر ہے۔“

”کس طرف ہے۔“

”ادھر پیچھے کی طرف واپس جاؤ۔“ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”کوئی دو میل پہلے کچا راستہ اوپر جاتا ہے۔ پر ادھر سے صرف جیپ جاسکتا ہے فور وہیل ڈرائیو والا۔“

”میرے پاس ہے۔“ میں نے اپنی جیپ کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے جیپ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ چلا جائے گا۔ پر راستہ بہت خراب ہے، خطرہ بھی ہے۔“

چائے نوشی میں آدھا گھنٹا اور گزر گیا تھا اور ابھی تک راستہ صاف کرنے کے لیے بلڈوزر اور عملہ نہیں آیا تھا۔ میں نے وہیں گوبھی آلو کا لنچ کیا اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اس لیے قیلولہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں چارپائی پر لیٹا ہوا باقاعدہ اونگھ رہا تھا کہ ہوٹل میں کام کرنے والے لڑکے نے مجھے ہلایا اور جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تمہارا گاڑی ہے؟“

”ہاں؟“

”ادھر صبح کے بعد ایک آدمی آیا تھا۔ اس نے تمہارا گاڑی کا نمبر اور رنگ بتا کر پوچھا تھا کہ یہ گاڑی ادھر سے تو نہیں گزرا ہے۔“

میری غنودگی غائب ہوگئی اور میں چوکنا ہوگیا۔ ”اچھا کیسا آدمی تھا دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟“

”ادھر ہی کا تھا، بوڑھا ہونے والا، لٹکا ہوا مونچھ اور آنکھوں کے نیچے گوشت الگ سے تھا۔“ لڑکے نے خاصی تفصیل سے فتح خان کا حلیہ بتایا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سفر کے دوران میں جو رہ رہ کر کھٹک رہا تھا تو اس کھٹک کی وجہ سامنے آگئی تھی۔ فتح خان میرے سفر سے آگاہ ہوگیا تھا اور پھر وہ میرے پیچھے تھا بلکہ فتح خان میرے آگے سفر کر رہا تھا۔ اس کے آدمی یقیناً پیچھے تھے جو اسے میرے بارے میں اطلاع دے رہے تھے اور ساتھ ہی مجھے نفسیاتی حربوں سے مرعوب کر رہے تھے۔ یہ شروع سے اس کا وطیرہ رہا تھا۔ جب وہ میرے چکر میں ہوتا تو جان کر مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ شاید فتح خان کسی وجہ سے سمجھا کہ میں آگے نکل گیا ہوں اس لیے اس نے یہاں پوچھ لیا۔ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ہر جگہ آدمی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ خود وہ آگے تھا کہ اسے میری منزل کا علم تھا۔ اس حصے میں آکر وہ میرے بارے میں لاعلم ہوگیا۔ کیونکہ میں رات بشام میں ٹھہر گیا تھا اور فتح خان اس سے بے خبر رہا ہوگا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

”کیا وہ آگے چلا گیا تھا لینڈ سلائیڈنگ سے پہلے؟“

لڑکے نے سر ہلایا۔ ”وہ ایک گھنٹا پہلے نکل گیا تھا۔ پھر سلائیڈ ہوا۔“

لڑکا ہوشیار تھا اگرچہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی شاید وہ تیرہ چودہ برس کا تھا مگر اس میں ہوشیاری تھی۔ میں نے اس کی خدمت کے صلے میں ایک سو کا نوٹ انگلیوں میں دبا کر پیش کیا جو اس نے خاموشی سے وصول کیا اور چلا گیا۔ اس نے اسی اُمید میں مجھے معلومات فراہم کی تھیں۔ میں جواب تک کسی قدر امن و سکون سے سفر کرتا رہا تھا منزل کے پاس آکر یک دم ہی جیسے خطرہ سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں کیا کرتا آگے جاتا یا یہیں سے پلٹ جاتا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ فتح خان میرا آگے کہیں انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر اس کے ڈر سے واپس جانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے لڑکے کو تازہ چائے لانے کو کہا۔ میرے پاس ابھی بہت وقت تھا اور میں عجلت میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے سکون سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

اس دوران میں کئی گاڑیاں اور ان کے مسافر آگئے تھے۔ وہ سب ہوٹل کی طرف آئے اور ظاہر ہے ہوٹل کا مالک بہت خوش اور بہت مصروف تھا۔ اس لینڈ سلائیڈنگ نے اچانک ہی اس کے کاروبار کو ترقی دی تھی۔ بیٹھنے کے لیے چارپائیاں بھی کم پڑ گئی تھیں اس لیے اب وہ ان مسافروں کی طرف ذرا ناپسندیدگی سے دیکھ رہا تھا جو کھا پی چکے تھے اور اب صرف ستا رہے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ جائیں تاکہ نئے آنے والے اس کے بزنس کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔ شکر ہے میں نے چائے منگوالی تھی اس لیے اس کی ناپسندیدہ نظروں سے محفوظ رہا۔ ویسے نئے آنے والوں کو بھی جگہ مل گئی تھی۔ اکا دکا مستورات بھی تھیں مگر خواتین گاڑیوں میں رہیں۔ لڑکا چائے لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”اس کے ساتھ اور کوئی تھا؟“

لڑکے نے سر ہلایا۔ ”ایک عورت تھا جوان اور خوب صورت۔“

لڑکے کی نظر اس لحاظ سے بھی تیز تھی۔ یہ شاید وہی عورت تھی جس نے میری کال ریسیو کی تھی۔ فتح خان میں یہ عیب بھی تھا کہ وہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بہت سے مواقعوں پر اسے اس وجہ سے نقصان بھی ہوا مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ میں نے بچے کو مزید سو کا ایک نوٹ دیا اور آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات کسی اور سے مت کہنا، میرے دشمن بہت خطرناک ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہوگیا کہ تم نے ان کے بارے میں مجھے بتایا ہے تو وہ تمہیں مار دیں گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

لڑکے نے سر ہلایا۔ اس کے تاثرات میں خوف شامل ہوگیا تھا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک خیال ذہن میں آیا۔ شروع میں تو بس صرف خیال تھا مگر جیسے جیسے اس پر سوچتا رہا مجھے یہ خیال اچھا لگا۔ دو بجے میں ہوٹل سے نکلا۔ اس وقت تک سڑک بدستور بند تھی۔ میں نے جیپ واپس گھمائی اور روانہ ہوگیا۔ اب مجھے ایک اور سڑک کی تلاش تھی۔ وہ سڑک کوئی دس میل پیچھے ملی اور میں نے جیپ اس پر ڈال دی لیکن یہ سڑک راجا عمر دراز کے محل تک نہیں جاتی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میں اس مخصوص پل تک پہنچ گیا تھا جہاں میں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا مگر اس بار پل سے نیچے ندی میں اترنے والا راستہ پانی کے سبب بند تھا اور اوپر بارش کی وجہ سے خاصی مقدار میں پانی تھا۔ مجھے جیپ کا کچھ کرنا تھا میں اسے یونہی چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ پل کے ساتھ ہی ایک کوٹھری تھی جس میں پل کا رکھوالا چوکیدار موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آموجود ہوا۔

”جی صاحب کوئی حکم کوئی خدمت؟“

”مجھے آگے جانا ہے۔“ میں نے ندی کی طرف اشارہ کیا۔

”ادھر جیپ نہیں جائے گی صاحب۔“ اس نے آگاہ کیا۔ ”پیدل کا راستہ بھی مشکل ہے، ندی میں بہت پانی ہے۔“

”مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ میں جیپ یہاں چھوڑ کر جاؤں گا۔“

”بالکل صاحب، ہم اس کی رکھوالی کرے گا۔“ اس نے دانت نکال کر کہا۔ ”جیسا چھوڑ کر جائے گا واپسی میں ویسا ہی ملے گا۔“

میں نے جیپ کوٹھری کے ساتھ کھڑی کی اور اسے دو سو دے کر اس کی چوکیداری پر معمور کیا۔ شہر میں اس کام کے پانچ سے کم نہ لیتا اور میں اسے پانچ سو دے سکتا تھا مگر اس علاقے میں بعض اوقات فراغ دلی آدمی کے گلے پڑ جاتی ہے۔ لوگوں کو پتا چل جائے کہ آپ کے پاس زیادہ پیسے ہیں تو ان کی نیت بھی خراب ہو سکتی ہے۔ یہ عمومی بات ہے کہ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں نے دو سو دیے اور ساتھ ہی اسے خبردار کرنے کے لیے بیگ نکالتے ہوئے پستول اور شاٹ گن کی نمائش بھی کی تاکہ اس کے دل میں کسی قسم کی بے ایمانی نہ آئے۔ میں نے بیگ پشت پر باندھ کر کہا۔

”میں آگے جا رہا ہوں کل واپس آؤں گا تب تک تم جیپ کی حفاظت کرو گے۔“

”ضرور کرے گا صاحب۔“ اس نے تابعداری سے کہا۔ ”ہم ادھر اور کس لیے ہے؟“

میں نے بچا کچا کھانے پینے کا سامان ساتھ ہی رکھا تھا آگے مجھے اس کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں موسم خنک تھا اور چیزوں کے خراب ہونے کا امکان کم تھا۔ جگی ہوٹل سے نکلتے ہوئے نان بھی لے لیے تھے۔ یہ خشک نان اس وقت کام آتے جب کھانے کے لیے اور کچھ باقی نہ رہتا۔ ساتھ ہی تھرماس میں چائے بھروالی تھی۔ پانی کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ مجھے ندی کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ میں نیچے اترا اور ندی کے کنارے آگے روانہ ہوا۔ یہاں پہلے پتھر اور جھاڑیاں تھیں مگر پانی اوپر تک آنے سے مجھے اب ترچھی ڈھلان پر سفر کرنا پڑ رہا تھا جو پھسلواں تھی اور کہیں کہیں اس میں سرکنے والی ریت بھی تھی۔ جب اس پر قدم جماتا تو وہ سلپ کرنے لگتی تھی۔ مگر مجھے اس قسم کے راستوں پر سفر کرنے کا تجربہ تھا اس لیے خاص مشکل نہیں آئی۔ میں نے اس سے کہیں زیادہ خطرناک راستوں پر سفر کیا ہوا ہے جہاں ایک غلط قدم آدمی کو تحت الثریٰ میں لے جاتا اور وہاں سے زندہ سلامت واپسی کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ندی کا راستہ تو میرے لیے ہموار سڑک جیسا تھا۔

میں پانچ بجے ندی میں اترا تھا اور میری کوشش تھی کہ تاریکی چھانے سے پہلے میں منزل مقصود پر پہنچ جاؤں۔ میرے پاس تاریکی کا سدباب بھی تھا اور ایک طاقتور ٹارچ کے ہمراہ دو عدد چھوٹی ایمرجنسی لائٹس تھیں جو آرام سے چھ سات گھنٹے تک چل سکتی تھیں۔ اس کے باوجود میری کوشش تھی کہ میں تاریکی سے پہلے وہاں پہنچوں۔ یہ سفر دو گھنٹے کا تھا اور سورج سات کے کچھ دیر بعد غروب ہو رہا تھا۔ اس لحاظ سے امکان یہی تھا کہ میں پہنچ جاتا۔ مگر میں نے پہلے خشک ندی میں سفر کیا تھا جس میں سفر آسان تھا اور یہاں مجھے ڈھلان پر سفر کرنا پڑ رہا تھا بعض جگہوں پر راستہ نایاب ہو جاتا تو مجھے اوپر سے گھوم کر واپس آنا پڑتا تھا اس میں خاصا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ شاٹ گن بیگ میں تھی لیکن پستول

میں نے پتلون کی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا۔ میں ایک لمحے کے نوٹس پر اسے نکال سکتا تھا۔

اس لیے جب اچانک اوپر جھاڑیوں میں ہلچل سی مچی تو میں نے سیکنڈ سے پہلے پستول نکال لیا اور ایک پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔ جھاڑیوں کی حرکت ایسی تھی جیسے اس میں کوئی زندہ چیز ہو۔ میری نظر جھاڑیوں پر مرکوز تھی اور پھر اس میں سے خرگوشوں کا ایک جوڑا نکلا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پانی پینے ندی تک آئے تھے۔ پہلے انہوں نے سن گن لی، میں ساکت رہا، خرگوش کی نظر کمزور ہوتی ہے مگر سونگھنے اور سننے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ چند لمحے کان گھماتے اور نتھنا پھڑکاتے رہے اور پھر پھدک پھدک کر نیچے آنے لگے۔ انہوں نے دھارے کے پاس آکر پانی پینا شروع کیا اور ایک منٹ بعد وہ دوبارہ اوپر جا رہے تھے ان کے غائب ہونے کے بعد میں حرکت میں آیا اور دوبارہ سفر شروع کیا۔ میں پہلے بھی حرکت کر سکتا تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ ان کی پیاس میں مداخلت کروں۔ میری موجودگی محسوس کر کے وہ پانی پیے بغیر بھاگ جاتے۔

سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور روشنی کم ہو رہی تھی۔ ندی دو پہاڑیوں کے درمیان میں تھی اس لیے یہاں روشنی اور کم تھی۔ میں خاصے عرصے بعد اس طرف آیا تھا اس لیے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ ابھی منزل کتنی دور ہے۔ بس اتنا یاد تھا کہ آگے جا کر ندی نیم دائرے میں گھومتی اور یہ اس بات کی نشانی ہوتی کہ میں منزل کے نزدیک پہنچ گیا ہوں۔ پونے سات کے بعد ندی نے گھومنا شروع کیا اور اب اس میں پانی کم ہو گیا تھا کیونکہ زیادہ پانی لانے والے نالے پیچھے رہ گئے تھے۔ ندی کا پاٹ بھی کم ہو رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ آخری حصے میں یہ خود رو نالے جیسی رہ جائے گی۔ پانی مسلسل کم ہو رہا تھا کیونکہ بارش کا بیشتر پانی بہہ چکا تھا اور اب پیچھے سے آنے والے پانی کی مقدار کم ہو رہی تھی۔ نیم دائرے میں گھومتے ہوئے میں نے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں اس وادی کو دیکھا جہاں وہ خونی ہیرے پوشیدہ تھے جو اب تک درجنوں لوگوں کی جان لے چکے تھے۔

وادی کی وسطی کھنڈر نما چٹانیں سائے میں آچکی تھیں۔ صرف اوپری مشرقی ڈھلان پر روشنی تھی اور وہ بھی تیزی سے غائب ہو رہی تھی۔ میں نالے سے باہر آیا اور مشرقی ڈھلان کی طرف بڑھا۔ دراصل یہ شمال مشرقی ڈھلان تھی۔ مگر میں نے کھلی جگہ آنے سے گریز کیا اور درختوں کے درمیان سے گزرتا رہا۔ مگر جب میں مطلوبہ مقام تک پہنچا تو وہاں تاریکی چھا گئی تھی۔ تاریکی بہت تیزی سے اور اچانک آئی تھی۔ اب درختوں کے نیچے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ کھلی جگہ بہت معمولی سی روشنی باقی تھی۔ میں گہری سانس لے کر درختوں سے نکل آیا اور کھنڈر نما چٹانوں کی طرف بڑھا۔ ان چٹانوں سے ابھی تک تپش نکل رہی تھی۔ مجھے انتظار تھا کہ چاند نکل آئے اور کچھ روشنی ہو تو میں دوبارہ ڈھلان کی طرف جاؤں۔ میں نے سامان اتارا اور بچ جانے والی بوٹیاں نان کے ساتھ کھائیں۔ چائے ہلکی سی گرم رہ گئی تھی مگر اس نے مزہ دیا۔ میں کھا پی کر آرام کرتا رہا۔ گرمائش کی وجہ سے یہاں خنکی کا احساس نہیں تھا مگر صبح کے قریب یہ چٹانیں بہت زیادہ ٹھنڈی ہو جاتیں اور اس وقت آگ کے بغیر گزارا نہیں ہوتا مگر میں آگ جلانا نہیں چاہتا تھا۔

یہاں آتے ہوئے میرے ذہن کے کسی گوشے میں خیال تھا کہ کسی وقت بھی میرا فتح خان سے سامنا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ وہ یہاں پایا جائے۔ مگر وہ ایسا آدمی تھا جو دوسروں کو حیران کر دیتا تھا اور اسی وجہ سے وہ مجھے اپنے کسی بھی دشمن کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ خطرناک لگا۔ اس لیے میں محتاط تھا اور میں نے خود کو ممکن حد تک پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی چاند طلوع ہوا اور اس کی روشنی وادی میں داخل ہوئی میں چٹانوں کے اندرونی حصے میں آگیا۔ میں نے کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا تھا جس سے میرے بارے میں پتا چلتا۔ اب شاٹ گن بھی نکال لی تھی اور وہ میرے شانے پر تھی۔ رفتہ رفتہ چاند اوپر آنے لگا۔ نو بجے اس کی روشنی خاصی تیز ہو گئی تھی اور کوئی کھلے میں حرکت کرتا تو وہ فوراً نظروں میں آجاتا۔ یہ سولہویں یا سترھویں کا چاند تھا اس کے باوجود بھی اس وقت خاصا بڑا لگ رہا تھا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا اور میری ساری توجہ آوازوں پر مرکوز تھی۔ تاریکی چھاتے ہی قسم قسم کے کیڑے مکوڑے اور ذرا بڑی نسل کے جانور آوازیں نکالنے لگے تھے۔ کچھ پرندے بھی بول رہے تھے اور میں ان آوازوں کے درمیان کوئی ایسی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا جو غیر فطری ہو اور اس جگہ سے باہر سے آنے والے انسان یا چیز سے پیدا ہو مگر فی الحال ایسی کوئی آواز نہیں تھی۔ اوپر کہیں گیدڑ یا اسی قبیل کا کوئی جانور آوازیں نکال کر ماحول کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مخالف سمت کی ڈھلان سے کوئی اُلو اس کا جواب دے رہا تھا۔ میں آرام کرنے کے ساتھ اونگھ بھی رہا تھا۔ غنودگی کا ہلکا سا جھونکا آیا تھا کہ میں چونکا اور مجھے لگا جیسے میں نے کوئی نامانوس آواز سنی ہو مگر میں اس کی نوعیت نہیں سمجھ سکا تھا۔ یقیناً میری چھٹی حس نے چونکایا تھا اور ہوشیار ہوتے ہی میں نے کان پھر سے مرکوز کیے۔ میرا پستول ہاتھ میں تھا اور میں کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔

مگر دس منٹ گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسی آواز نہیں آئی جسے میں مشکوک قرار دے سکتا۔ شاید نیند میں میں نے خیالی آواز سنی تھی۔ یہ سوچ کر میرے چوکس اعصاب پھر سے ست پڑ گئے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور مجھے مزید دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ یہ وقت میں نے اونگھتے ہوئے گزارا۔ ایسے وقت کتنی سستی سے گزرتا ہے مجھے اس کا تجربہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا جب گھڑی کی طرف دیکھو تو اس کی سوئیاں اسی جگہ اٹکی نظر آتی تھیں۔ مگر میں نے اسے اعصاب پر سوار نہیں کیا۔ وقت بہر حال گزر جاتا ہے۔ ایک بار میں نے وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہے تھے۔ میں کھڑا ہوا اور چہل قدمی کر کے اپنا بندھ جانے والا جسم کھولا۔ سنگلاخ زمین پر آرام کہاں سے ملتا الٹا جسم دکھ گیا تھا مگر تھکن ختم ہو گئی تھی اور میرا ذہن چاق و چوبند تھا۔ میں نے ایک جگہ سے جنوب کی طرف والی ڈھلان کا جائزہ لیا۔ یہ اصل میں جنوب مغرب میں تھی اور چاند اس کی طرف جھک گیا تھا اس لیے اب یہاں سایا تھا۔

ایک چھوٹی سی پٹی تھی جو ابھی تک چاندنی میں تھی۔ مگر یہ ایسی جگہ تھی کہ جب تک چاند پہاڑ کے پیچھے نہ چلا جاتا تب تک یہاں روشنی رہتی اور جب چاند غروب ہو جاتا تو مجھے صبح کی روشنی کا انتظار کرنا پڑتا جب کہ میرا ارادہ تھا کہ روشنی ہونے سے پہلے ہی میں اس جگہ سے نکل جاؤں گا۔ اس لیے میں نے اس پٹی کو چاندنی میں ہی عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یعنی رسک لیا، اگر کوئی یہاں موجود تھا تو اس کا امکان تھا کہ وہ مجھے دیکھ لے گا۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے کام لیا اور جسم جھکا کر بھاگتا ہوا درختوں کے درمیان پہنچ گیا۔ تاریکی میں آنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو وادی کے روشن حصوں میں کوئی حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ میں مخالف سمت کی ڈھلانوں کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں چاند کی روشنی تھی اور کسی حد تک منظر واضح تھا۔ جب کہیں سے کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی تو میں محتاط اور خاموش قدموں سے شمال مشرقی ڈھلان کی طرف بڑھا۔

نیم دائرے میں گھومتے ہوئے میں آدھے گھنٹے میں اس ڈھلان تک پہنچ گیا۔ یہیں وہ آخری معرکہ ہوا تھا جس میں برٹ شا اپنی جان سے گیا تھا اور فتح خان کا منصوبہ ناکام رہا تھا جب اس نے ایمن کو اغوا کر کے اس کی مدد سے برٹ شا سے ہیرے نکلوانے کی کوشش کی اور اس کے ایک ساتھی نے غلطی سے برٹ شا کو گولی ماردی تھی اس پر فتح خان نے غصے سے پاگل ہو کر اپنے ہی ساتھی کو گولی ماردی تھی۔ اس کے باوجود اسے اتنا ہوش تھا کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا کیونکہ آخری وقت میں، میں ہی برٹ شا کے قریب تھا اور فتح خان کو شبہ تھا کہ اس نے مجھے ہیروں کی لوکیشن کے بارے میں بتایا ہے اور یہ سچ تھا۔ برٹ شا نے میری رہنمائی کر دی تھی اور میں جان گیا تھا کہ ہیرے کہاں ہیں؟ مگر میں نے فتح خان کو نہیں بتایا تھا کیونکہ مجھے شبہ تھا کہ وہ ہیرے حاصل کرنے کے بعد مجھے مار دے گا۔ اب تک وہ صرف ان ہیروں کی خاطر بدترین حالات میں بھی مجھے مارنے سے گریز کرتا آیا تھا۔ ہیرے حاصل کرنے کے بعد اس کی مجبوری ختم ہو جائے گی اور پھر شاید وہ مجھے نہ بخشتا۔

ہیرے اسی ڈھلان پر ایک درخت کے تنے میں پوشیدہ تھے۔ جب فتح خان نے ایمن کو بارودی جیکٹ پہنا کر ایک طرح سے یرغمال بنا لیا اور اس کا تاوان طلب کیا تھا۔ میں انہی ہیروں کے چکر میں یہاں آیا تھا اور میں انہیں درخت کے ساتھ زمین اور جڑوں میں تلاش کرتا رہا۔ میں بے خبر تھا کہ فتح خان بمعہ اپنے ساتھیوں کے میرا تعاقب کرتا ہوا وادی تک آیا ہے اور اس کے ایک ساتھی کی غلطی سے مجھے اس کی موجودگی کا علم ہو گیا اور میں نے ہیروں کی جگہ جان لینے کے باوجود انہیں وہاں سے نکالنے سے گریز کیا تھا۔ میرا پاؤں ایک درخت کی کھوکھلی ہو جانے والی جڑوں کے خلا میں چلا گیا تھا اور تب میں سمجھا تھا کہ ہیرے اس میں ہیں۔ اتفاق سے وہ سب سے بڑے تنے والا درخت تھا۔ جڑ کے خلا میں تلاش کے لیے میں شاخ توڑنے کے لیے تنے پر چڑھا تھا تب میں نے تنے میں موجود سوراخ میں ہیروں والا سیاہ بکس دیکھا تھا۔ اب مجھے اسی درخت کو تلاش کرنا تھا۔

جب میں شمال مشرقی ڈھلان تک پہنچا تو وہاں ترچھی پڑنے والی چاندنی کی وجہ سے کسی قدر اجالا تھا۔ اسی اجالے کے انتظار میں، میں نے اتنا وقت گزارا تھا۔ میں مصنوعی روشنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے اس درخت کی تلاش تھی۔ اس ڈھلان پر وہ سب سے بڑے تنے والا درخت تھا اور

پہلے میں نے رسی کی مدد سے تنے کی موٹائی ناپی تھی مگر اب میرے پاس رسی نہیں تھی اور اس کی جڑوں میں موجود گڑھا بھی یقیناً غائب ہو گیا ہوگا۔ اس لیے مجھے اندازے سے اپنا کام کرنا تھا۔ میں درختوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کے تنوں کو جانچ رہا تھا۔ لیکن میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مذکورہ درخت کون سا ہو سکتا ہے۔ مہینوں پہلے ہونے والی بات یاد رکھنا آسان نہیں تھا۔ پھر وہاں سب درخت ایک جیسے اور ایک ہی نسل کے تھے۔ سب بہت بڑے تھے۔

صرف دیکھ کر اندازہ کرنا بہت مشکل تھا اس لیے میں نے آسان طریقہ نکالا اور تنوں پر سوراخ تلاش کرنے لگا۔ مجھے یاد تھا کہ وہ سوراخ کسی قدر بلندی پر تھا اور مجھے ذرا اوپر ہونا پڑا تھا تب میرا ہاتھ وہاں تک گیا تھا۔ جب میں نے شاخ توڑنے کے لیے ہاتھ اوپر کیا تھا وہ شاید آٹھ فٹ کی بلندی پر تھی اور میں ذرا اوپر چڑھا تھا تب میں نے وہ سوراخ ..... اور اس میں ہیروں والا سیاہ بکس دیکھا تھا۔ مجھے یہ یاد تھا کہ درخت درمیانی ڈھلان پر اور سوراخ کا رخ ڈھلان کی طرف تھا اس لیے مجھے پورے تنے کو نہیں دیکھنا پڑ رہا تھا مگر ہر درخت کے تنے کو دیکھنا پڑ رہا تھا۔ درمیانی ڈھلان پر درختوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی اور ان سب کو کم وقت میں دیکھنا آسان نہیں تھا جب کہ چاند کی روشنی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ کئی درجن ناکامیوں کے بعد مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں یہاں کیوں آیا؟ مجھے ہیروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فتح خان ان کے پیچھے پاگل تھا اور اب میں بھی اس چکر میں یہاں چلا آیا تھا۔ میں ہیروں کے پیچھے نہیں بلکہ فتح خان کی کمزوری اپنے ہاتھ میں لینے آیا تھا۔ ایک آفر اس نے مجھے کی تھی اور ہیرے حاصل کر کے میں اسے ایک آفر کرتا، مگر ہیرے تھے کہ مل کر نہیں دے رہے تھے۔ ناکامی نے مجھے بیزار کرنا شروع کر دیا تھا۔

کچھ دیر میں روشنی کم ہونے لگی۔ اب تنے واضح نظر نہیں آ رہے تھے اور سوراخ دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھ مار کر ٹٹولنے سے کیڑے مکوڑے مجھ پر چڑھ رہے تھے اور ظاہر ہے کاٹ بھی رہے تھے۔ ایک تو خاصا زہریلا تھا اس کے کاٹنے سے باقاعدہ سوزش ہونے لگی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد چاندنی مکمل طور پر بند ہو گئی اور مجھے اپنی تلاش روکنی پڑی تھی۔ میں ایک چٹان سے لگ کر بیٹھ گیا اور تھرماس سے ٹھنڈی ہو جانے والی چائے نکال کر پی جو اب بدذائقہ بھی ہو گئی تھی مگر میرے پاس پینے کے قابل یہی ایک چیز تھی۔ پانی یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا اور میں ندی کی طرف اسی صورت میں جانا چاہتا تھا جب میرے پاس ہیروں والا بکس ہوتا۔ کچھ دیر آرام کے بعد میں نے نئے سرے سے کمر کسی اور اس بار ایمرجنسی لائٹ جلا کر تنوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی روشنی محدود تھی اور امید تھی کہ وہ دور سے نظر نہیں آتی۔

میں تنوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک تنے کی نئی نکلنے والی شاخ کے اوپر مجھے خلا سا دکھائی دیا۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر تھا اور اسی سمت میں تھا جس سمت میں، میں نے سوراخ دیکھا تھا۔ شاخ تقریباً ڈیڑھ فٹ تک نکل آئی تھی اور اس کے عین اوپر موجود خلا اسی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے تنے کے ساتھ ابھری جڑوں پر پاؤں رکھا اور اچک کر اوپر ہوا تھا۔ خلا اب واضح تھا۔ میں نے پہلے اندر کی طرف روشنی کی تاکہ کوئی کیڑا مکوڑا ہو تو نکل جائے اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اندر ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور میں اسے ٹٹول رہا تھا کہ اسی لمحے عقب سے تیز روشنی مجھ پر آئی اور فتح خان کی منحوس آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ”شاباش شہباز خان، بالآخر تم یہاں تک پہنچ گیا...... اپنی جگہ سے ہلنا مت اپنا ہاتھ آہستہ سے باہر لاؤ...... شاباش...... تم میرا رائفل کے نشانے پر ہے۔“

”فتح خان۔“ میں نے سکون سے کہا اگرچہ اندر سے میں اتنے سکون سے نہیں تھا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں نے ہیرے نہیں کچھ اور تلاش کیا ہے۔“

”اپنا ہاتھ باہر لاؤ۔“ فتح خان نے للکار کر کہا۔ اس کے بارے میں میرا خدشہ بالآخر ہمیشہ کی طرح سچ نکلا تھا۔ وہ یوں میرے تعاقب میں تھا کہ میں اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا مگر مجھے کامیابی کے قریب پا کر وہ سامنے آ گیا تھا۔ اس کے حکم پر میں اپنا ہاتھ آگے لایا اور مڑا۔ روشنی بہت تیز تھی اور میرے ہاتھ میں موجود چیز نمایاں تھی۔ فتح خان نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کا موڈ آف ہو گیا۔ ”شہباز خان یہ کیا ہے؟“

”اسے انڈہ کہتے ہیں۔“ میں نے کہا اور انڈہ واپس سوراخ میں رکھنے کے لیے مڑا تھا کہ اوپر سے ایک غیر انسانی چیخ سنائی دی۔ اسی لمحے میرے پیر تلے جڑ ہلی اور اچانک اس میں خلا آیا جس میں میرا پاؤں گیا تھا میں نیچے گرنے لگا تھا کہ عقب سے برسٹ چلا اور میرے پہلو میں شدید ٹیس اٹھی تھی۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(شاہد جہانگیر شاہد پشاور کا جواب)

کائنات فاطمہ......... لاہور

اکھڑی ہوئی سانسوں نے جو آثار بتائے
لوگوں نے مرے چہرے سے محسوس کیے ہیں

آصف ملک......... کراچی

اندر سے انتہائی ہوتے ہیں کھوکھلے بھی
جو لوگ اپنے فن کی شیخی بگھارتے ہیں

شہناز ممتاز ملک......... شیخوپورہ

آغوش اجل میں جو پہنچے نیند ایسی انہیں آجاتی ہے
بیدار اسی دن ہوتے ہیں جس روز قیامت آتی ہے

برجیس احمد......... جہلم

آنکھیں ہیں وسیلہ یہ ملاقات وسیلہ
اس تک مرا احساس بہ عنوان غزل جائے

آصفہ بتول......... واہ کینٹ

اس کو اوروں سے جدا سمجھے تھے ہم
سادگی میں جانے کیا سمجھے تھے ہم

زاہد علی......... خانیوال

آزادی کے سورج نے کل ایسی جوت جگائی تھی
بزم طرب سے دار و رسن تک ہنگامہ آرائی تھی

(محمد عمران جونانی کراچی کا جواب)

ابرار احمد......... کراچی

اس کا سینہ بھی زخمی تھا اس کے سُر بھی گھائل تھے
میرا درد سمجھنے والا کوئی نہ تھا شہنائی تھی

زویا......... کراچی

ان غموں کا مداوا بتا کیا کروں
زخم برحق ہیں ان کی دوا کیا کروں

(بتول اصغر کا جواب)

راجا ابراز خان......... ملتان

وہ پشیماں ہے خطا پر تو اسے کچھ نہ کہو
ہے بہت قدر کے قابل یہ ندامت کی نظر

طالب حسین طلحہ......... ملتان

یوں کہنے سے تو کوئی اپنا نہیں ہوتا
کسی بھی آئینے میں چہرہ بڑی دیر نہیں رہتا

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

نزہت احمد......... گجرات

آ دیکھ میرے سینے میں ہے دل ہی دل تمام
اور وہ بھی تیرے شور و شغف سے بھرا ہوا

فہیم انصاری......... کراچی

آئے ہیں جیسے شہر بدر کر کے یہ ناداں
وہ شعلہ لب رنگ نہیں ہے میرے دل میں

فیاض حسن......... بہاولپور

آ تجھ کو بتا دوں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

(منشی محمد عزیز مے لڈن کا جواب)

عزیز ملک......... حاصل پور

یہ سمجھ لینا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے

اسحاق بٹ......... میرپور اے کے

یہ کیا ایک پھول پہ آنکھیں جما لیں
تمہیں گلشن پہ مرنا چاہیے تھا

ابریز اطہر......... نیوہالہ

یوں جنوں بڑھ گیا یوں خرد گھٹ گئی
دل پہ غالب ہوئے جب سے رنج و محن

نوازش علی......... نگر گلگت

یادوں کے حسیں بت خانے سے ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا سردار کہاں ہے محفل میں

(مرزا ہادی بیگ لطیف آباد کا جواب)

نوشین اختر......... لاہور

غزل کہوں جو نماز عشا کے بعد کبھی
سر مصلیٰ اثر کی پھوار برساؤں

عنایت مسیح......... کراچی
غم کا موسم بیت جائے شادمانی آئے گی
زرد شاخوں کے لیے پوشاک دھانی آئے گی

عباس اطہر......... فیصل آباد
غم میسر ہو تو اس کے بعد پھر کیا چاہیے
یہ مقامِ شکر ہے شکوہ نہ کرنا چاہیے

فیاض حسن خان......... لاہور
غیر بھی پھولوں سے ہلکے تھے کبھی اس دل کو
آج یہ حال کہ احباب گراں بار ہوئے
(سعید احمد چوہان لالن کا جواب)

رضوان حمزہ......... لاہور
اے بہارِ رنگ ورامش اے نگارِ شوخ و شنگ
تیرے ہونٹوں کا نشہ ہے میں تیرے عارض کا رنگ

کاشف ظہیر......... مظفر گڑھ
اب اسی شکل سے جینا ہے خرابی میں سو ہم
درو دیوار کو بہلائے چلے جاتے ہیں

فیاض حسین......... لاہور
اک ٹیس بھی اٹھتی ہے تو کہہ دیتے ہو اشعار
تم درد کو اقبال نکھرنے نہیں دیتے

محمد ندیم اختر......... گلگت
اے داورِ محشر بخش بھی دے میں نادم ہوں شرمندہ ہوں
انسان خطا کا پتلا ہے انسان سے خطا ہو جاتی ہے
(شیخ ریاض چنیوٹ کا جواب)

ناعمہ تحریم......... ملیر کراچی
گھر سے خوشبو کے تعاقب میں نکلنے والو
میری مانند کہیں تم بھی بے گھر نہ ہو جانا
(بلقیس قمر جھنگ کا جواب)

احمد علی صدیقی......... ملتان
اس کی دہلیز پہ کب سے کھڑا ہوں میں فراز
مجھ سے ملنے کے جو لمحات گنا کرتا تھا

فروغ محسن......... گجرات
آسماں سے ابھر کے نجمِ سحر
وسعتِ آسماں میں ڈوب گیا

فہیم احسن......... فیصل آباد
ایک جرعہ بھی بہت ہے تشنگی کے واسطے
وہ تو پیاسا ہی رہے گا جس کو دریا چاہیے

قاضی مشرف معروف حیدری
اس کے بغیر آج بہت دل اداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

شاہد جہانگیر شاہد......... پشاور
پھولوں کی نمائش میں اگر تو بھی ہوا تو
اس بار گلابوں کو بڑی آگ لگے گی

نگہت افروز......... کراچی
پھول کی طرح بسا ہے شاعر
ایک نغموں کا قبیلا مجھ میں
(اکرم علی بھٹو میر پور خاص کا جواب)

مرزا ہادی بیگ......... حیدر آباد
تھام لیتی ہے اس کی یاد شاہ
ہم کبھی جب بھی ڈگمگاتے ہیں

ماہ رخ......... لطیف آباد
وہ نفرتوں کے بھنور میں بھی مسکرا کے ملا
اب اس سے بڑھ کے بھلا ہو کمال کیا اس کا
(عشناء نور بلوچ نواب شاہ کا جواب)

عبدالغفور خان ساغری خٹک......... اٹک
نہ دو کسی کو اپنی زندگی کا اتنا حق فرید
کہ خوشی نہ رہے باقی اس کے روٹھ جانے سے

امجد اکرام......... بہاولپور
نہ جنوں کی فتنہ خیزی نہ سبو، نہ جام و مینا
نہیں جانے کیسے گزرے گا یہ موسم بہاراں

واصف علی......... جھنگ
نہ گل زخم کوئی اب ہے نہ گلدستہ مہر
خواب تنہائی کو مہکائے چلے جاتے ہیں

عدنان حسین خان......... احسن آباد کراچی
جل جاؤ حالات کی کڑی دھوپ میں لیکن
اپنوں سے کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جنوری 2015ء تک علمی آزمائش 110 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) 70

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جنوری 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

15 اپریل 1895ء میں پھول پور جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کے سن میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ اپنی عمر پر پہنچتے پہنچتے کافی نام پیدا کر لیا اور صحافت کی آبرو کے خطاب سے نوازے گئے۔

علمی آزمائش 108 کا جواب

مولوی شفیع اوکاڑوی 1930ء میں کھیم کرن میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے اوکاڑہ آ گئے۔ مولانا غلام علی اوکاڑوی کے شاگرد رہے۔ 1965ء کی جنگ کے وقت علامہ عبدالحامد بدایونی کے ساتھ مختلف محاذوں پر تشریف لے گئے۔ 1970ء کے انتخابات کے وقت کراچی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔

انعام یافتگان

1- عباس علی پھولپو، سکھر 2- نوشین اختر، لاہور 3- یاسر بٹ، جھنگ

4- سلیم چشتی، کراچی 5- عنایت علی، گجرات

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید عزیز الدین، نعیم حسن (اورنگی)، نوید سراج۔ محمد فرحان یامین (نارتھ کراچی)، ناعمہ تحریم (ملیر) خاقان احمد، نبیل اختر، عنایت گجر، فرحت عباس نقوی، عنایت مسیح، سبطین سید، الیاس محمد خارج، غلام حسن، طفیل احمد، باسط فاروقی، نذر حسین، انعام گل، صباحت مرزا، محمد احمد، یاسین خان، منظر حسن، قیام الدین انصاری،

وردہ بتول، اکبر علی رئیسانی، ارشد علی، عنبرین اختر، اسرار احمد، مولیٰ بخش بٹ، تنویر حسین، ہارون محمد، فتح یاب خان اچکزئی، انیس بھٹو، فہیم بٹ، سعید الدین مروت، صوفی تبسم، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نواز سلیم کھوکھر، مہوش علی خان، فرحین بشیر، فیروز رحمانی۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی، بشارت خان۔ فرمان حسن۔ علی عباس، محمد ذیشان، خالد عثمانی، تحریم فاطمہ، ماہ جبین فاطمہ، نعیم اختر، عزیز الحسن، فہد عثمانی۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، توصیف حسین، طارق ظفر، مسعود اظہر، معین انور، افتخار حسن خان، کاظم زیدی، حضور خان، عتیق الرحمن خان، برجیس مرزا، ذکی سید، تقی عباس تقی، قادر علی قادری، نوید حسن خان، کاظم جعفری، مہدی علی خان، صابر علی، محمد اسلام الدین انصاری۔ لڈن وہاڑی سے منشی محمد عزیز مے۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، محمد فیض، عتیق احمد، ذیشان مرزا۔ ملتان سے محمد معین چشتی، محمد یحییٰ معین، محمد افتخار، فرحین گل، احمد یار خان، قیام الدین گردیزی، رخسانہ یاسمین، خالد حسن توصیفی، یسم احمد، نصیر احمد، فوزیہ اختر، بیگم الطاف گوہر، ذکیہ احسن کمال، نفیسہ جمال انصاری، گل باز خان، خالد حسن، ارشد آفاق، ممنون الحسن، پیام احسن، مظہر قادری۔ لاہور سے نیاز چوہان، کائنات مرزا، فہد علی خان، عباس رضا سید، اقبال اصغر، عبدالخالق، احمد علی بٹ، توصیف باری، آل پنجتن نقوی، اصغر علی اصغر، نواز کبیر، یاسمین فرحت، مصباح الرضا، کاظم حسین رضوی، نوید احسن، نعیم عباس، علی نواز کارگلی، صابر علی خان، سلمان احمد، تاثیر احسن۔ رحیم یار خان سے عتیق الرحمن، اسرار احمد، فہیم الدین، بخشش حسین، ثنا مرزا، ملک یاسین، حبیب علی، ذکی حسن، ابرار بھٹ ڈرائیور، ارباز حسن زئی۔ ساہیوال سے صوفی مقبول احمد نقشبندی، صفی مبارک علی نقشبندی، حکیم اللہ، کاظم علی، مختار قاضی، فہیم عباس، نعمت اللہ۔ کوہاٹ سے ابرار اچکزئی، فدا حسین طوری، نصیر عباسی، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ شیخوپورہ سے پروفیسر عبدالوحید خان، ثریا فاطمہ، عقیل احمد، معیب بٹ، ناصر حسن، عرفان قاسمی۔ پشاور سے خاقان خان، قیام احمد، مہناز عرفان، ظہیر الدین، نجم شاہ، اصغر شاہ، زاہد حسین طوری بنگش، فدا حسین زیدی، ارباب خان۔ جہلم سے کنیز کبریٰ، فہد علی خان، حکیم صدر الدین، ناصر کوکب خان۔ بہاولپور سے مسرت اسلم ملک، مہوش خان، فطرت عباس، نور علی، اقبال احمد، تقی حسن، جاوید تقی عثمان، اکرام ملک، نواز کھوکھر، امتیاز حسن، محمد فہیم، نوشین ملک، صفی اللہ خان۔ بہاولنگر سے صغریٰ بیگم، انتخاب الحسن، افضال محمد، ذکیہ امتیاز، ملک امتیاز، فصاحت اللہ، ظہیر شاہ، آفتاب احمد، عثمان مضطر، یاور علی سید۔ مظفر گڑھ سے ارباب رضا، نعمان ملک، چودھری فیض اللہ، ساجد علی، عنایت فاطمہ (شہر سلطان) نیاز حسین، فاروق نیازی، ارباز خانزادہ، فصیح الدین، جاوید حسن خان، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ جامشورو سے راشد مغل، حیدر علی بھٹو، مدحت لاشاری، ایاز سومرو۔ حیدرآباد سے عباس علی، ماہ رخ، امجد بٹ، محمد محی الدین خان، احمد لون، فیصل شیخ۔ سکھر سے شیخ یاسر، نجم الدین ثاقب، بیاس گل، اقبال انصاری۔ جیکب آباد سے امین عباسی، ذوالفقار خان، فہد شیخ، کائنات یاسمین۔ میر پور خاص سے سدرہ ناصر علی، پروفیسر طارق حبیب، سلطان جوکھیو، نصیر ہایانی۔ میر پور ماتھیلو سے فہد سومرو، عباس حسن، سلیم ثانی۔ میر پور آزاد کشمیر سے جمیل اختر، یوسف خان، اطہر عباس، نینا بٹ۔ خیر پور سے احمد علی زیدی، عباس ماچھی۔ گجرات سے انیس طاہر تاگی۔ شادی پور سے لطیف الرحمن۔ خانیوال سے ناہید عباسی۔ ڈی آئی خان سے سید نسیم، مغنی ایاز، محمد شاد خان، خالد یوسف۔ ڈی جی خان سے یونس احمد، یوسف شاہ، کنول، ظاہر خان۔ جھنگ سے عطاء المصطفیٰ، ناصر قاضی، التماس عباس، ظاہر شاہ، ضیاء الحسن، علیم الدین۔ شجاع آباد سے غلام جیلانی، وزیر محمد، غلام الثقلین، خالد یاسر۔ چنیوٹ سے سہیل آفندی، خورشید رضوی۔ تلہ گنگ سے شاہ زیب، وصی الحق۔ سرگودھا سے ہارون محمد، رشید تبسم، شکیب آفاقی، فرخندہ یاسمین، آذر لودھی۔ حاصل پور سے ابریز احمد۔

بیرونِ ملک پاکستان سے اشرف زیدی (شارجہ)، آصف علی (عمان سعودیہ)، انصار ملک (العین)، محمد جنید انصاری ہندی (دبئی)، صادق علی صادق (فرینکفرٹ)، ایاز سومرو (بیڈفورڈ)۔

بابا

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
اُمید قوی ہے کہ یہ میری اپنی سرگزشت ہے جو ماہنامہ سرگزشت کے معیار پر کھری اترے گی۔ انسان کو قدرت کس طرح مواقع فراہم کرتی ہے یہ میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے۔ میں جب ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا تو غیب سے میری مدد ہو گئی۔

ایاز احمد سومرو
(ٹھٹھہ)

یہ آج سے پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے۔اس وقت میں بارہ سال کا تھا اور ٹھٹھہ میں اپنے گاؤں کے چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔میں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا اور اسکول جانے والا اپنے گھر کا پہلا فرد تھا۔اماں اور بابا بالکل ان پڑھ تھے مگر انہوں نے اپنی اولاد کو پڑھانے کا سوچا تھا۔میں سب سے بڑا تھا اور مجھے پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کرادیا گیا تھا۔بابا صبح خود کام پر جاتے ہوئے مجھے اسکول چھوڑتا ہوا جاتا اور جب دوپہر میں روٹی کھانے آتا تو مجھے لیتا آتا تھا۔ہمارا گھر اپنا تھا مگر زمین نہیں تھی۔بابا ایک زمیندار کی زمین پر ہاری کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔میں ذرا بڑا ہوا اور مجھ سے چھوٹا ریاض بھی اسکول جانے لگا تو ہم بھائی خود آنے جانے لگے تھے۔ہمارا گھر گاؤں کے آخری سرے پر واقع ایک چھوٹے سے ٹیلے پر تھا اور اسکول گاؤں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔شروع میں ہم بھائیوں کو بھیجتے ہوئے اماں ڈرتی تھی مگر جب ہم ذرا سیانے ہوئے اور میرا تیسرا اور سب سے چھوٹا بھائی فیاض بھی اسکول جانے لگا تو اماں کو کچھ اطمینان ہوا تھا۔

دراصل اسکول اور گاؤں کے درمیان میں ایک جنگل ساتھا۔کسی زمانے میں یہ دریا کی کوئی پرانی شاخ تھی جس میں سمندر کا پانی آجاتا تھا پھر اس میں منگروز اگ آئے تو رفتہ رفتہ سمندر سے زمین چھن گئی۔لوگ یہاں اپنے مویشی چرانے آتے تھے اور یہاں سے جلانے کے لیے لکڑی لیتے تھے مگر یہ زمین رہائش یا کاشت کے قابل نہیں تھی اس لیے غیر آباد رہی۔منگروز ایک قسم کے جھاڑی نما درخت ہیں جو سمندر کے کھارے پانی میں بھی اگ سکتے ہیں۔ان کی جڑیں مٹی سے ذرا باہر رہتی ہیں اور پانی کے ساتھ آنے والی مٹی پکڑ کر زمین کی سطح اونچی کرتی رہتی ہیں۔اس سے سمندر سے زمین ملتی ہے۔جب میں چھوٹا تھا تو ہمارے علاقے میں جو سمندر سے بس ایک کلومیٹر دور تھا منگروز کے بہت سے جنگل تھے اور ان میں میٹھے پانی کے جنگل بھی تھے۔مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میٹھے پانی کے جنگل غائب ہو گئے اور اب وہاں صرف سمندری پانی والے منگروز باقی رہ گئے ہیں۔

ہم منگروز کے اس جنگل سے گزر کر اسکول تک جاتے تھے۔یہاں سانپ ہوتے تھے اور سمندر سے آنے والے کیکڑے بھی ہوتے تھے جو زہریلے تو نہیں تھے مگر اپنے زنبور نما بازو سے بہت برا کاٹتے تھے۔ان ہی دنوں ایک کیکڑے نے مجھے پاؤں پر کاٹا اور میرا زخم ٹھیک ہونے کی بجائے خراب ہونے لگا تھا۔بچپن کی یہ یاد اسی زخم سے متعلق ہے۔گاؤں میں ڈاکٹر تو کیا حکیم تک دستیاب نہیں تھا۔ایسے میں

جب زخم ہرا رہا تو اماں بابا پریشان ہو گئے۔بابا نے کہا کہ وہ مجھے ٹھٹھہ شہر کے اسپتال لے جاتا ہے۔مگر وہ یہاں سے بہت دور تھا۔علاقے میں پکی سڑک بھی کوئی چار میل دور تھی جہاں سے بس گزرتی تھی۔سڑک مکلی سے ہوتی ٹھٹھہ تک جاتی تھی۔اولاد کا معاملہ تھا اس لیے بابا نے ہمت کی اور مجھے اٹھا کر روانہ ہو گیا۔میں زخم کی وجہ سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔مگر ابھی ہم راستے میں تھے کہ ایک فقیر نے راستہ روک لیا۔"بابا کچھ دیتا جا۔"

"کیا دوں سائیں، میں تو بیٹے کا علاج کرانے لے جا رہا ہوں۔" بابا نے عاجزی سے کہا۔فقیر جوان آدمی تھا اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔سیاہ لمبے بال اور بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں تھیں۔رنگت شاید کبھی صاف رہی تھی مگر اب مٹیالی ہو گئی تھی۔آنکھیں سرخ اور بڑی تھیں۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

"یہ دیکھو سائیں بابا اس کا پاؤں، اسے کیکڑے نے کاٹ لیا تھا۔" بابا نے اسے میرا زخم دکھایا۔"اس نے زخم سونگھا اور فکر مندی سے بولا۔"

"بابا اس میں تو زہر پھیل رہا ہے۔کیا سانپ نے کاٹا تھا؟"

"نہیں سائیں کیکڑا ہی تھا۔"میں نے یقین سے کہا۔"میں نے خود دیکھا تھا۔"

"تب اس کیکڑے کے پنجے پر کسی قسم کا زہر لگا ہو گا۔" فقیر نے کہا۔"ایک منٹ مجھے دیکھنے دو۔"

"بابا تم کیا کر سکو گے؟"

"اللہ بادشاہ ہے وہی سب کرتا ہے۔"فقیر نے مست لہجے میں کہا۔"اسی کے حکم سے سب ہوتا ہے۔"

بابا نے مجھے ایک درخت کے نیچے جگہ صاف کر کے لٹا دیا۔فقیر نے اسی درخت سے کچھ پتے توڑے اور میرے پاؤں کا زخم صاف کیا اور پھر اسے دبا کر اندر بھرا ہوا مواد نکالا۔مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا اس لیے میں صبر کر کے برداشت کرتا رہا۔اس نے مواد سونگھا اور پھر اپنا ہاتھ صاف کیا۔میرا دھیان بٹانے کے لیے وہ سوال کر رہا تھا۔"بیٹا نام کیا ہے تیرا؟"

"ایاز احمد سومرو۔"

"پڑھتا ہے؟"

"ہاں بابا چھٹی جماعت میں ہوں۔" میں نے فخر سے کہا۔

"شاباش پت، یاد رکھ تعلیم ہے جو انسان کو جانور سے الگ کرتی ہے ورنہ کھاتے پیتے اور جیتے مرتے تو جانور بھی ہیں۔"

"میں آگے بھی پڑھوں گا۔"میں نے اسے آگاہ کیا۔

"جتنا پڑھے گا اتنا ہی اوپر جائے گا۔"اس نے کہا

پھر اس نے اپنے جھولے سے ایک مرتبان نکالا اور اس میں موجود سبز رنگ کی مرہم نما چیز میرے زخم پر لیپ دی۔ پھر مرتبان واپس رکھ کر وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے بابا سے کہا۔ ”دو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ اگر اللہ سائیں نے چاہا تو اس کا زخم ٹھیک ہو جائے گا ورنہ اسے اسپتال لے جانا۔“

بابا مان گیا۔ وہ آپس میں بات کرنے لگے۔ بابا دل اور زبان کا بہت میٹھا تھا۔ اس سے ملنے والے ذرا سی دیر میں اس کے دوست بن جاتے تھے۔ فقیر سے بھی اس کی دوستی ہوگئی۔ حالانکہ ان کی عمروں میں فرق تھا۔ بابا اس وقت بھی پینتالیس برس کا تھا۔ وہ بابا کو اپنے عجائبات دکھانے لگا۔ اس میں عجیب و غریب جڑی بوٹیاں اور ان سے تیار کی ہوئی دوائیں تھیں۔ سانپوں کا زہر تھا۔ وہ سانپ پکڑ کر ان کا زہر نکال کر انہیں چھوڑ دیتا تھا۔ زہر وہ چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں یوں بند رکھتا تھا کہ اسے ہوا نہ لگے۔ اس نے بابا کو بتایا۔ ”اگر زہر کو ہوا لگ جائے تو وہ خراب ہونے لگتا ہے۔ اسے ہوا سے بچانا ہوتا ہے۔“

بابا متاثر ہوا۔ ”تمہارے پاس تو بہت سی چیزیں ہیں سائیں بابا۔ تمہیں سانپ پکڑتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟“

”بابا سانپ سے کیا ڈرنا۔ اس کا زہر بندے کو اتنا نہیں مارتا جتنا اس کا خوف مار دیتا ہے۔“ فقیر نے کہا۔ ”اصل زہر تو ہن کھن میں ہوتا ہے۔“

گاؤں دیہات میں رہنے والے ہن کھن نام کی اس چھپکلی سے واقف ہیں۔ یہ چھپکلی مختلف رنگوں میں ملتی ہے۔ پیلے، کسی قدر ہرے، لال، گلابی اور ہلکی سرمئی رنگ کی بھی ہوتی ہے لیکن سب پر سیاہ یا گہرے بھورے رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بہت زہریلی ہوتی ہے۔ اگر آدمی کو کاٹ لے تو وہ بچتا نہیں ہے لمحوں میں مر جاتا ہے۔ اسی لیے اسے ہن کھن یا ہن خان کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے جہاں کاٹا وہیں رہ گیا۔ باہر کی دنیا میں اسے پتا نہیں کیا کہتے ہیں مگر ہم اسے ہن کھن یا ہن خان بھی کہتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی مگر دوسروں سے سنا تھا کہ ہمارے علاقے میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی سنا تھا کہ یہ زہریلی ہوتی ہے مگر آج تک کسی کے بارے میں یہ بھی نہیں سنا تھا کہ اسے ہن کھن نے کاٹا اور وہ مر گیا ہاں سانپ کے شکار بہت تھے۔ خود بابا کو ایک بار سانپ نے ڈسا تھا مگر وہ ٹھیک رہا۔ بابا نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایک بار دیکھی تھی۔ تم نے بھی دیکھی ہو گی؟“

”بابا دیکھی نہیں ہے میرے پاس ہے۔“ جوگی نے کہا۔ اس نے اپنا جھولا کھولا اور اس میں سے ایک کپڑے کا تھیلا نکالا۔ پھر اس نے ایک مرتبان میں موجود مردہ کیڑے نکالے اور انہیں زمین پر بکھیر دیا۔ بابا ذرا پریشان ہوگیا۔

”سائیں تم ہن کھن باہر نکالو گے ادھر بچہ بھی ہے۔“

”فکر مت کرو میری پالتو ہے۔ صرف کھانا کھائے گی اور واپس تھیلے میں چلی جائے گی۔ مگر جب تک وہ باہر رہے کوئی حرکت نہ کرے۔“

”بات بھی نہ کرے؟“

”نہیں بات کرے، اسے سنائی نہیں دیتا ہے لیکن معمولی سی حرکت بھی جان لیتی ہے۔ وہ ڈر گئی تو بھاگ بھی سکتی ہے۔ اسے پکڑنا شاہ کوبرا پکڑنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔“

بابا میرے پاس آگیا۔ فقیر نے احتیاط سے تھیلے کے منہ پر بندھی رسی کھولی اور پیچھے ہوگیا۔ چند لمحے تک تو کچھ نہیں ہوا مگر پھر تھیلے کے اندر حرکت ہوئی اور مزید کچھ دیر بعد چھپکلی کا سر باہر آیا۔ بابا خوفزدہ تھا مگر میں دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ یہ گلابی رنگ کی چھپکلی تھی جس پر ہلکے بھورے رنگ کے دھبے تھے اور یہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کا سر گوہ کے برابر تھا اور جب وہ تھیلے سے پوری طرح باہر آئی تو اس کی لمبائی دو فٹ کے قریب تھی۔ وہ کچھ دیر منہ اٹھائے ہوا میں سونگھتی رہی۔ میں نے پوچھا۔ ”سائیں بابا یہ کیا کر رہی ہے؟“

”یہ سونگھ رہی ہے کہ میں آس پاس ہوں۔ یہ بو سونگھ لیتی ہے۔ اگر میں پاس نہ ہوں تو یہ واپس تھیلے میں گھس جائے گی۔“

ہن کھن اسی طرح سر اٹھائے ساکت کھڑی رہی۔ پھر اس نے سر نیچے کیا اور زبان سے مردہ کیڑے چن چن کر کھانے لگی۔ فقیر بتا رہا تھا۔ ”یہ صرف کیڑے نہیں بلکہ چھوٹی چھپکلیاں اور چھوٹے سانپ و مینڈک بھی کھا لیتی ہے۔ دیکھنے میں سست لگتی ہے مگر جب شکار پر لپکتی ہے تو اس کی تیزی دیکھنے والی ہوتی ہے۔“

”اس کے دانت ہوتے ہیں؟“

”نہیں مگر اس کے ہونٹ دانتوں کی طرح سخت ہوتے ہیں یہ اسی سے کاٹتی ہے زہر اس کی کھال میں ہوتا ہے۔“

وہ کیڑے کھاتی رہی اور جب کیڑے ختم ہو گئے تو کچھ دیر سر اٹھائے ساکت کھڑی رہی پھر واپس گھوم کر تھیلے میں گھس گئی۔ جب اس نے حرکت کرنا بند کر دیا تو فقیر نے آگے بڑھ کر رسی کھینچ کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ اب تک بابا سانس روکے بیٹھا تھا اور وہ خوفزدہ لگ رہا تھا۔ ہن کھن کے واپس تھیلے میں جانے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور فقیر سے بولا۔ ”تمہارا کمال ہے سائیں ورنہ یہ انسانوں کو قریب بھی نہیں آنے دیتی ہے۔“

”سارے جانور انسان سے ڈرتے ہیں اس سے دور بھاگتے ہیں کیونکہ جانور صرف پیٹ یا بچاؤ کے لیے دوسرے پر حملہ کرتے ہیں انسان اپنے نفس کے لیے دوسروں کو تکلیف دیتا ہے۔“

اماں نے ہمارے لیے دوپہر کا کھانا ساتھ کیا تھا کیونکہ کھانے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے ہم نے کھانا کھایا۔ کھانا زیادہ تھا ہم تینوں کو کافی ہوگیا۔ اس دوران میں دو گھنٹے کا وقت بھی گزر گیا۔ فقیر نے میرے زخم پر لگا ہوا لیپ اتارا تو حیرت انگیز طور پر زخم کی نیلاہٹ ختم ہو گئی تھی اور اب وہ سرخ ہو رہا تھا۔ درد بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ فقیر نے خوش ہو کر کہا۔ ”اللہ سائیں نے کرم کیا۔ سمجھ لو یہ ٹھیک ہے بس دو بار مرہم اور لگانا ہے۔ ایک ایک دن کے وقفے سے اور اس دوران میں زخم کھلا رکھنا ہے اگر مکھی سے بچانا ہو تو کوئی جالی والا صاف کپڑا رکھ دینا مگر باندھنا مت۔“

بابا خوش ہو گیا۔ ”سچ کہہ رہے ہو سائیں بابا۔ کیا اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں ہے؟“

”نہیں اور اسے خود چل کر جانے دو۔ اس سے زخم کی طرف خون جائے گا تو یہ اور بہتر ہو جائے گا۔“

فقیر نے دو وقت کا مرہم نکال کر دیا۔ بابا نے اس سے پوچھا۔ ”سائیں بابا میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی، ابھی تو میرے گھر چلو کچھ دن مہمان رہو۔“

”نہیں بابا فقیر کو ابھی دور جانا ہے۔ اگر تمہارے بچے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں رکتا بھی نہیں۔“

بابا کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ادھر کھاڑی میں ان دنوں ایک قسم کے کیڑے آئے ہوئے ہیں وہ انہیں پکڑتا ہے اور ان سے دوا تیار کرتا ہے۔ اس کا کام یہی تھا۔ بہ مشکل بابا نے اسے ایک رات کے لیے اپنے ہاں رکنے پر آمادہ کیا اور ہم واپس چلے آئے۔ اس کا نام رسول بخش تھا مگر مٹھا سائیں کے نام سے مشہور تھا۔ ویسے وہ لاڑکانہ کا رہنے والا تھا مگر اس کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد اور ٹھٹھہ میں گزرا تھا۔ اس کے کہنے پر میں پیدل چل رہا تھا اور آسانی سے چل رہا تھا ورنہ اس سے پہلے مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ اس کے مطلب کی ساری چیزیں ان ہی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں رکتا تھا بلکہ ہمیشہ سفر کرتا رہتا تھا صرف لال شہباز قلندر کے عرس کے موقع پر وہ ان کے مزار پر ہوتا تھا اس کے علاوہ وہ کہیں نہیں رکتا تھا۔ اماں اور بھائی ہمیں آتے دیکھ کر حیران ہوئے تھے لیکن جب انہیں پتا چلا کہ میرا زخم فقیر نے اپنے علاج سے ٹھیک کر دیا ہے تو وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔

ہم غریبوں کے لیے یہ خوشی بھی بہت بڑی تھی کہ ہمیں اسپتالوں میں دھکے کھائے بغیر علاج اور صحت مل جائے۔ مٹھا سائیں رات ہمارے ہاں رکا اور اماں بابا نے اس کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ جو اچھے سے اچھا بنا سکتے تھے وہ اس کے لیے بنایا۔ رات اس کے لیے چارپائی پر سب سے اچھی والی رلی بچھائی۔ سونے سے پہلے وہ بابا سے باتیں کرتا رہا اور قصے سناتا رہا۔ اس کی اکثر باتیں ہمارے لیے ناقابل یقین تھیں مگر اس نے جس طرح میرا زخم ایک ہی بار میں اچھا کر دیا تھا اب ہم اس کی ہر بات پر یقین کر رہے تھے۔ ہم تینوں بھائی دوسری چارپائی پر ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب میں نے بھائیوں کو بتایا کہ میں نے ہن کھن دیکھی ہے تو وہ بے چین ہو گئے انہوں نے مٹھا سائیں سے فرمائش کی کہ انہیں بھی دکھائی جائے۔ مگر اس نے انکار کیا۔

”ابھی اسے باہر نہیں نکال سکتا۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ میں اسے صرف اسی وقت نکالتا ہوں جب وہ بھوکی ہوتا کہ اپنا پیٹ بھر کر واپس چلی جائے دوسری صورت میں اسے مستی سوجھتی ہے اور وہ بھاگ بھی سکتی ہے۔“

”سائیں یہ کہاں سے ملتی ہے؟“

”یہ چھوٹی چٹانوں میں رہتی ہے لیکن بہت مشکل سے ملتی ہے، اسے پکڑنا تو بس موت کو پکڑنے کے برابر ہے۔“ مٹھا سائیں نے کہا۔ ”قسمت سے ہاتھ آتی ہے۔“

ہن کھن دیکھنے کے شوق میں ہم سب صبح صبح اٹھ گئے تھے کیونکہ مٹھا سائیں بھی فجر کے وقت اٹھ گیا تھا۔ اس نے وعدے کے مطابق ہمیں ہن کھن دکھائی تھی۔ پھر وہ ناشتا کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے نہیں دیکھا۔ جب وہ جانے لگا تو بابا نے اسے کچھ رقم دینا چاہی مگر اس نے انکار کر دیا۔ ”بابا فقیر صرف ضرورت کے وقت لیتا ہے اگر بلا

ضرورت لے تو فقیر تو نہ ہوا نا۔"

☆☆☆

میں دفتر سے آیا تو رِمل پریشان تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے تھے۔ میں بھی فکرمند ہوگیا۔ "کیا ہوا خیر ہے، شازیب ٹھیک ہے؟"

"وہی تو ٹھیک نہیں ہے۔" رِمل روہانسے لہجے میں بولی۔ "آج پھر اس کی طبیعت خراب ہے سانس رک رک کر آرہی ہے اور چہرہ بھی نیلا ہو رہا ہے۔"

رِمل میری خالہ کی بیٹی اور بچپن سے میری منگ تھی۔ تین سال پہلے ہماری شادی ہوئی اور دو سال پہلے اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا دیا تھا۔ ہم نے اس کا نام شازیب رکھا تھا۔ ان ہی دنوں کراچی میں ایک خوب صورت سے نوجوان شازیب کو بے گناہ قتل کر دیا گیا تھا۔ رِمل اس واقعے سے بہت متاثر ہوئی تھی اور اس نے بیٹے کا نام شازیب رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ڈیڑھ سال تک وہ بالکل ٹھیک رہا مگر پھر اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اس کی سانس رکتی تو وہ رونے لگتا تھا اور پھر اس کا چہرہ نیلا پڑ جاتا تھا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے کہا کہ بچے کو سانس کا مسئلہ ہے اس نے اسی لحاظ سے دوائیں دے دیں۔ ان دواؤں سے عارضی افاقہ ہوا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد طبیعت پھر خراب ہوئی۔ ہم نے دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا اس نے بھی سانس کا مسئلہ کہا اور دوائیں دے دیں۔ ان سے بھی عارضی فائدہ ہوا اور آج میں دفتر سے آیا تو رِمل نے پھر بتایا کہ شازیب کی وہی حالت ہو رہی ہے۔ اولاد ماں باپ کے لیے کیا ہوتی ہے یہ صرف ماں باپ ہی جانتے ہیں ان کی ساری زندگی کا محور اولاد ہوتی ہے اور اسے کچھ ہونے لگے تو اس سے زیادہ ماں باپ کی حالت خراب ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنے علاقے کے اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اسکول یہیں تک تھا اس لیے مزید تعلیم کے لیے میں کراچی چلا گیا۔ کیونکہ یہاں بھینس کالونی کے پاس میری ایک پھوپی رہتی تھیں۔ پھوپا کا جانوروں کا کاروبار تھا۔ وہ اندرونِ سندھ سے جانور لاکر کراچی میں فروخت کرتے تھے اور یہ اچھا خاصا کاروبار تھا۔ پھوپی کا گھر بڑا تھا۔ ان کے نو بچے تھے اور مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ اگرچہ میرا خرچ بابا بھیجتا تھا مگر میں رہتا اور کھاتا پیتا تو یہیں تھا۔ میں نے دو سال میں میٹرک کیا اور اس کے بعد ایک باڑے میں منشی لگ گیا۔ یعنی حساب کتاب کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ پھر میں چاہتا تھا کہ اپنے بھائیوں کو یہاں بلا لوں تاکہ وہ بھی آگے پڑھ سکیں۔ لیکن میں انہیں پھوپی کے گھر نہیں بلا سکتا تھا۔ اس لیے ملازمت ملتے ہی ایک کوٹھری کرائے پر لے کر اس میں منتقل ہو گیا اور ریاض کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے بھی مڈل کر لیا تھا اور اسے نویں میں داخلہ دلایا۔

تنخواہ معمولی تھی مگر ہمارا خرچ بھی زیادہ نہیں تھا اس لیے گزارا ہوتا رہا۔ میٹرک کے بعد میں نے انٹر میں داخلہ لیا کیونکہ حساب سے شوق تھا اس لیے آئی کام منتخب کی۔ ملازمت کی وجہ سے کالج نہیں جا سکتا تھا اس لیے پرائیویٹ داخلہ لیا۔ دو سال بعد انٹر کیا اور پھر بی کام کی تیاری شروع کر دی۔ اس دوران میں ریاض نے بھی میٹرک کر لیا تھا اور اس نے گلشن حدید میں اسٹیل مل کے ایک ڈیلر کے پاس ملازمت کر لی، ساتھ ہی وہ آگے بھی پڑھ رہا تھا۔ آمدنی بڑھی تو ہم نے گلشن حدید کے پاس کچی آبادی میں چھوٹا مکان لے لیا اور اماں بابا اور فیاض کو بھی یہیں بلا لیا۔ بابا بوڑھا ہو گیا تھا اور اس سے اب محنت والا کام نہیں ہوتا تھا۔ اسے بھی اسی باڑے میں ملازمت مل گئی جہاں میں کام کرتا تھا۔ جانوروں کی دیکھ بھال تو ہم گاؤں والوں کے معمولات میں شامل ہوتی ہے۔ بابا یہی کام کرنے لگا۔ فیاض بھی اسکول میں داخل ہو گیا۔

بی کام کی پڑھائی ذرا مشکل تھی اس لیے میں شام کے اوقات میں ٹیوشن بھی پڑھنے لگا۔ اس سے مجھے مدد ملی اور میں نے بی کام مکمل کر لیا۔ سرکاری ملازمت یا تو سفارش سے ملتی تھی یا پھر رشوت سے اور دونوں چیزیں میرے پاس نہیں تھیں مگر اللہ نے سب کے مقدر کا رزق رکھا ہے۔ جن دنوں میں بی کام کے آخری دنوں میں تھا تو باڑے کا مالک جو ایک مشہور تاجر بھی تھا وہ باڑے کے دورے پر آیا اور مجھ سے حساب پوچھنے کے دوران میں اس نے میرے بارے میں بھی پوچھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں بی کام فائنل میں ہوں تو وہ حیران ہوا۔ "تم نے بتایا نہیں، تمہاری تو تنخواہ بھی کم ہے۔ خیر اب پتا چل گیا ہے۔ میں تنخواہ بڑھا رہا ہوں اور جب رزلٹ آجائے تو میرے دفتر میں آنا۔ تمہارے لیے دفتر میں جگہ نکالوں گا یہ جگہ اب تمہارے لائق نہیں ہے۔"

میں خوش ہو گیا۔ مالک کو سب حاجی صاحب کہتے تھے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ "میں ضرور آؤں گا حاجی صاحب۔"

میری تنخواہ بڑھی اور ساتھ ہی حیثیت بھی بڑھی تھی۔ شروع میں یہ معمولی سا دیسی طرز کا باڑا تھا۔ کیونکہ اس میں مشکل سے دو درجن بھینسیں اور گائیں تھیں۔ پھر حاجی صاحب نے یہ باڑا خرید لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے آس پاس کے کئی باڑے خرید لیے اور پھر انہیں ایک کر لیا۔ اب یہ جدید طرز کا ڈیری فارم تھا۔ یہاں چار سو سے زیادہ جانور تھے اور دودھ براہِ راست ٹیٹرا ایک کمپنیوں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ دودھ نکالنے کے لیے جدید مشینیں لگ گئی تھیں اور اب صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ فرق نہیں آیا تھا تو ملازموں کی تنخواہوں میں نہیں آیا تھا وہ اسی تنخواہ پر کام کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے میری تنخواہ کا بڑھنا خوش قسمتی تھا۔ رزلٹ آتے ہی میں حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور انہوں نے بھی حسبِ وعدہ دفتر میں میرے لیے جگہ نکال لی۔

فیاض بھی میٹرک کر کے ریاض کے ساتھ ڈیلر کے پاس کام پر لگ گیا تھا۔ اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا البتہ ریاض پڑھ رہا تھا۔ کیونکہ میرا دفتر مین صدر میں تھا اس لیے اب مجھے نزدیک ہی کوئی گھر دیکھنا تھا۔ اتنی دور سے روز آنا جانا ممکن نہیں تھا۔ بس میں دو گھنٹے لگ جاتے اور پھر میں آگے بھی پڑھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں شہر میں رہوں۔ بابا کو ہم نے کام سے منع کر دیا تھا اب ہم تینوں بھائی کما رہے تھے اس لیے مالی مسئلہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ایک یونیورسٹی میں ایم بی اے ایوننگ میں داخلہ لے لیا کیونکہ میرا شعبہ اکاؤنٹس تھا اس لیے فنانس منتخب کیا۔ رہائش کے لیے نزدیک ہی ایک فلیٹ میں کمرا شیئر لے لیا۔ تین کمروں کے اس فلیٹ میں کل چھ لڑکے تھے۔ سب کو ایک بیڈ اور الماری کے برابر جگہ ملی ہوئی تھی۔ کھانا وغیرہ سب باہر کھاتے تھے کیونکہ فلیٹ میں کچن نہیں تھا اس کی جگہ واش روم بنا کر تیسرے کمرے سے اٹیچ کر دیا گیا تھا۔ جگہ دفتر اور یونیورسٹی دونوں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ آمد و رفت میں جو وقت اور پیسا بچتا وہ میں تعلیم کو دے رہا تھا۔

ہفتے کی شام گلشن حدید چلا جاتا تھا۔ اتوار کا دن اماں بابا اور بھائیوں کے ساتھ گزار کر رات کو واپس آجاتا تھا۔ فراغت کا بس یہی ایک دن ملتا تھا ورنہ صبح سات سے رات بارہ بجے تک سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ایم بی اے کے دو سال کلیئر کر لیے تو اماں کو میری شادی کی فکر ہوئی۔ اصل میں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ میری اور ریاض کی شادی ایک ساتھ کر دے۔ ریاض نے گریجویشن کر لیا تھا اور اب ڈیلر کے پاس اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ وہ ایک طرح سے اس کا نائب بن گیا تھا اور اس کے بعد سارے کام وہی دیکھتا تھا۔ فیاض گودام انچارج بن گیا تھا۔ اماں نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے ماننا پڑا ورنہ میں چاہتا تھا کہ ایم بی اے مکمل کر لوں اس کے بعد شادی کروں۔ ابھی میں ایک سال تک الگ گھر بھی نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اماں سے کہا۔

"شادی کے بعد رِمل تمہارے پاس رہے گی۔ میں ابھی اسے الگ نہیں رکھ سکتا۔"

"تو رہ لے گی اتنا بڑا گھر تو ہے۔" اماں نے کہا۔ "اور تو کون سا دور ہے ہفتے کے ہفتے تو آئے گا نا۔"

گھر کچی آبادی میں تھا مگر پکا بنا ہوا اور پانچ کمروں کا تھا۔ اس لیے اماں نے کہا کہ رِمل ان کے ساتھ رہ لے گی۔ خالہ حیدرآباد میں رہتی تھیں اور رِمل ان دنوں گریجویشن کر رہی تھی مگر اماں نے جیسے ہمیں راضی کیا اسی طرح خالہ کو بھی راضی کر لیا اور یوں رِمل میری زندگی میں آگئی۔ چند دن اس کے ساتھ گزار کر میں دوبارہ ملازمت پر واپس آگیا۔ چھ دن یہاں گزرتے تھے مگر اتوار جس کا اب بہت زیادہ شدت سے انتظار رہتا تھا وہ رِمل کے ساتھ گزرتا تھا۔ یہ وقت میں نے بہت مشکل سے گزارا اور ان ہی دنوں رِمل اُمید سے بھی ہو گئی تھی۔ ایسے میں اسے میری زیادہ ضرورت تھی مگر میں مجبور تھا۔ شازیب وہیں ہوا اور اس کی پیدائش کے دو دن بعد میں نے آخری پیپر دیا تھا۔

شازیب آتے ہی سب کی توجہ کا مرکز بن گیا اور جب میں نے دو کمروں کا چھوٹا فلیٹ لیا جو شاہراہ فیصل پر تھا اور رِمل کو شازیب کے ساتھ وہاں لایا تو سب بہت اداس تھے۔ مگر یہ اداسی زیادہ دن نہیں رہی کیونکہ رِمل سے چھوٹی موٹل جو ریاض کی بیوی بنی تھی وہ بھی ماں بننے والی تھی۔ تین مہینے بعد ریاض بھی بیٹی کا باپ بن گیا۔ اتوار والے دن ہم بھی چلے جاتے تو اماں بابا کے گھر میں خوب رونق ہو جاتی تھی۔ بابا نے اپنا گاؤں والا مکان فروخت کر دیا تھا اور نیشنل ہائی وے کے پاس ایک سوسائٹی میں پلاٹ لے لیا۔ اس نے ہم سے کہا۔ "جس جس کے پاس پیسا ہوتا جائے وہ اپنا مکان بناتا جائے۔"

مگر ابھی سوسائٹی میں زیادہ آبادی نہیں تھی اور ہم میں

سے کسی کے پاس اتنا پیسا بھی نہیں تھا کہ مکان بنا سکتا۔ اس لیے یہ کام مستقبل پر چھوڑ دیا گیا۔ فی الحال تو سب سیٹ ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایم بی اے کے بعد حاجی صاحب نے فرم میں میرا عہدہ تو بڑھایا تھا مگر تنخواہ میں اتنا اضافہ نہیں کیا اس لیے جیسے ہی مجھے دوسری جگہ موقع ملا میں ملازمت چھوڑ کر وہاں چلا گیا۔ یہ ایک آئی ٹی کمپنی تھی یہاں مجھے تنخواہ بہتر مل رہی تھی۔ رمل اچھی اور سمجھدار بیوی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے شازیب کی پیدائش سے پہلے کراچی یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی اے سال اوّل کا امتحان دیا تھا۔ شازیب کی پیدائش کے بعد ایک سال ضائع ہوا پھر اس نے فائنل کی تیاری شروع کی اور جن دنوں شازیب کی طبیعت پہلی بار خراب ہوئی وہ پیپرز دے رہی تھی۔ جب تیسری بار اس کی طبیعت خراب ہوئی تو میں شازیب کو ایک اسپیشلسٹ کے پاس لے گیا۔ وہ شازیب کی حالت دیکھ کر فکر مند ہو گیا اس نے ہم سے کہا۔

''یہ سانس کا مسئلہ نہیں لگ رہا۔ اس کے دل میں کوئی مسئلہ ہے شاید لیکن یہ ٹیسٹ کرانے سے پتا چلے گا۔''

''دل کا؟'' یہ سن کر ہم میاں بیوی کا دل رک گیا تھا۔

''امکان ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں ٹیسٹ لکھ کر دے رہا ہوں یہ کرالیں اور رپورٹ کے ساتھ آئیں۔''

اس نے جو ٹیسٹ لکھ کر دیئے وہ خاصے مہنگے تھے مگر ہمارے بچے کی صحت کے مقابلے میں کچھ نہیں تھے اس لیے میں نے اگلے ہی دن ٹیسٹ کرائے اور جب رپورٹ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے رپورٹ دیکھ کر کہا۔ ''میرا اندازہ درست نکلا۔ بچے کے دل کے وال میں مسئلہ ہے۔''

''اب کیا ہو گا ڈاکٹر صاحب۔'' میں پریشان ہو گیا۔ رمل نے رونا شروع کر دیا تھا۔

''دیکھیے پہلے مسئلے کی شدت کا اندازہ لگانا ہو گا اسی کے مطابق فیصلہ ہو گا۔'' اس نے کہا اور دو عدد ٹیسٹ اور لکھ دیئے۔ مجبوری تھی یہ ٹیسٹ بھی کرانے تھے، ہم نے کرائے اور اس سے یہ رپورٹ سامنے آئی کہ شازیب کے دل کا ایک وال ناکارہ ہو رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خرابی بڑھتی۔ مگر اس کی عمر اتنی بھی نہیں تھی کہ اس کا آپریشن ہو سکتا۔ اسپیشلسٹ نے ہم سے کہا۔ ''ہمارے ہاں اتنے چھوٹے بچے کا آپریٹ نہیں ہوتا ہے۔''

''تب کہاں ہوتا ہے؟''

''سنگاپور میں ہوتا ہے اور شاید انڈیا میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بہت زیادہ خرچا آئے گا۔''

''کتنا خرچ آئے گا ہم اپنا سب بیچ دیں گے۔'' رمل نے جذباتی ہو کر کہا۔ ڈاکٹر نے ہمدردی سے ہمیں دیکھا۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا لیکن اس آپریٹ پر شاید ستر سے نوّے لاکھ روپے خرچ ہوں۔''

یہ سن کر ہمارے چہرے اتر گئے تھے۔ ستر یا نوّے لاکھ کیا ہم تو اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کر سکتے تھے اگر اپنا سب کچھ بیچ دیتے تب بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے سارے جاننے والے اور رشتے دار بھی ہماری طرح غریب تھے وہ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہم شازیب کو لے کر واپس آئے تو ہماری آواز نہیں نکل رہی تھی اور اپنی بیماری اور ہماری کیفیت سے بے خبر شازیب خوش ہو رہا تھا کہ اب ہم اسے جلدی جلدی باہر لے کر جا رہے تھے۔ رمل روتی رہی اور میں اسے دلاسہ دیتا رہا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''ایاز کیا ہمارا بچہ ایسے ہی بغیر علاج کے......''

''نہیں۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''ہم کچھ بھی کر لیں تب بھی اتنے پیسے تو نہیں ملیں گے۔'' رمل دھاڑیں مار کر رونے لگی اور اس کی دیکھا دیکھی شازیب بھی رونے لگا تھا۔ میرے بھی آنسو نکل آئے تھے۔ اتفاق سے اگلے دن اتوار تھا اور جب ہم اماں بابا کے پاس گئے اور وہاں یہ خبر سنائی تو چند منٹ کے لیے سب ہی سکتے میں آ گئے تھے۔ پھر ریاض اور فیاض نے کہا۔

''شازی ہمارا خون ہے اس کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں جو ہمارے پاس ہے وہ سب دے سکتے ہیں۔''

بابا نے پوچھا۔ ''بیٹا پلاٹ کتنے میں بک جائے گا؟''

''بابا یہ ڈھائی لاکھ کا لیا تھا زیادہ سے زیادہ تین کا چلا جائے گا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ رقم بھی ناکافی ہے۔''

''حوصلہ کر یار۔'' ریاض نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ابھی پہلے معلوم تو کریں کہ اس کا علاج پاکستان میں کہاں کہاں ہے اور باہر ہوتا ہے تو کہاں اور کتنے میں ہوتا ہے۔''

''آپ اپنے آفس والوں سے بھی بات کریں۔'' فیاض نے کہا۔ ''ہم قرض لے سکتے ہیں جو بعد میں اتار دیں گے۔''

میں سب کی تجویزیں سن رہا تھا وہ سب خلوص سے بول رہے تھے میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے ہم پہلے معلوم کرتے ہیں۔''

میں نے معلوم کرایا تو اسپیشلسٹ کی بات درست نکلی۔ ہمارے ہاں اس قسم کا آپریشن ہوتا ہے لیکن بڑے بچوں کا جن کی عمر کم سے کم دس بارہ سال ہو اس سے چھوٹی عمر کے بچوں کو آپریٹ نہیں کیا جاتا ہے۔ پھر شازیب کی رپورٹس سنگاپور اور انڈیا کے اسپتالوں کو ای میل کیں۔ ان کی طرف سے جواب آئے۔ سب سے کم خرچ انڈیا کے ایک اسپتال کا تھا اور وہ بھی ساٹھ لاکھ روپے تھا۔ یہ جان کر میں اور رمل دونوں مرجھا گئے تھے۔ ساٹھ لاکھ کسی صورت ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے دفتر میں بات کی تھی مگر میری جاب بھی نئی نئی تھی اور مجھے پانچ لاکھ سے زیادہ قرض نہیں مل سکتا تھا۔ اس وقت میں پچھتایا کہ حاجی صاحب کی فرم کیوں چھوڑی بے شک وہاں تنخواہ کم تھی مگر حاجی صاحب اس قسم کے معاملات میں اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتے تھے اور فراغ دلی سے مدد کرتے تھے لیکن میں اب ان کے پاس کس منہ سے جاتا۔

ڈاکٹر نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ پانچ سال کی عمر سے پہلے شازیب کا لازمی آپریشن کرانا ہو گا۔ یہ بھی آخری حد تھی اس سے پہلے ہی اس کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی۔ طبیعت خراب ہونے پر اسے آکسیجن اور بعض دواؤں کی ضرورت پڑتی وہ ہمیں گھر پر رکھنا پڑی تھیں۔ جب پیسوں کی طرف سے ناامیدی ہوئی تو ہم نے دوسرے طریقہ علاج کا سوچا اور حکیموں اور ہومیو پیتھک والوں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ جاننے والے نت نئے حکیموں اور ڈاکٹروں کے مشورے دیتے تھے اور ہم شازیب کو لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ ان میں جو مخلص ہوتے وہ پہلے ہی بتا دیتے تھے کہ یہ مسئلہ ان کے بس کا نہیں ہے اور ہمیں شازیب کا آپریشن ہی کرانا ہو گا اور اس کا علاج دواؤں سے ممکن نہیں ہے۔ جو پیسا کمانے کے لیے بیٹھے تھے وہ علاج کی یقین دہانی کراتے اور ڈھیروں دوائیاں تھما دیتے۔ ہم شازیب کو دوائیاں دیتے مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔

میں پیروں فقیروں کا قائل نہیں ہوں۔ میرے خیال میں آدمی سب سے بہتر اللہ سے خود مانگ سکتا ہے کیونکہ آدمی کی مشکل اللہ ہی سب سے بہتر جانتا ہے۔ مگر اولاد ایسی ہستی ہے جو ماں باپ سے سب کرا لیتی ہے۔ شازیب کے لیے ہم پیروں فقیروں کے پاس بھی بھاگے۔ بابا اپنے علاقے کے ایک پیر سائیں شاہ جیوانی کے مرید تھے ہم شازیب کو لے کر ان کے پاس بھی گئے اور ایک رات اور ایک دن درگاہ میں ہی رہے۔ سائیں شاہ کا کہنا تھا کہ بچے پر شدید قسم کا سفلی عمل کیا گیا تھا اور اس کے توڑ کے لیے اسے چوبیس گھنٹے مزار پر رکھنا لازمی تھا۔ مگر کچھ نہیں ہوا ہر گزرتے دن شازیب کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ جب اسے تکلیف شروع ہوتی تو اس کی رنگت نیلی پڑ جاتی اور وہ اتنی اذیت سے سانس کھینچتا کہ اس کی حالت دیکھ کر ہم میاں بیوی رو پڑتے تھے۔

اس دوران میں، میں کوشش کر رہا تھا کہ کہیں سے ہمیں مدد مل جائے۔ میں نے ہر ممکن جگہ رابطہ کیا۔ وہ مخیر حضرات جو لوگوں کی مدد میں پیش پیش رہتے تھے ان سے بات کی مگر کہیں سے بات نہیں بنی۔ شاید اس لیے کہ ایم بی اے تھا اور حلیے سے کھاتا پیتا لگتا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ شاید میں مدد کے نام پر ان کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر یہ تو ہم سفید پوش لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے۔ اوپر سے ہم کھاتے پیتے لگتے ہیں مگر اندر سے کیا ہوتے ہیں یہ ہم جانتے ہیں یا خدا جانتا ہے۔ رمل سے شادی کے بعد مجھے لگا کہ میری زندگی مکمل ہو گئی ہے۔ پھر اللہ نے شازیب کی صورت میں اولاد دی تو ہمارے لیے دل کا چین و قرار آ گیا۔ مگر جب اس کی بیماری کا پتا چلا تو سارا چین و قرار چھن گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات ذہن سے محو نہیں ہوتی تھی۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے دھیان بٹانا پڑتا تھا لیکن جب گھر آتا اور شازیب مسلسل سامنے ہوتا اور اس کی بیماری کا خیال آتا تو جیسے اندر سے ہوک اٹھتی تھی۔

ہماری ساری تفریحات ختم ہو گئی تھیں کیونکہ دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کھانا بھی بس زندہ رہنے کے لیے کھا لیتے تھے۔ باہر نکلتے تو شازیب کو ڈاکٹر یا کسی کو دکھانے کے لیے یا پھر اسے گھمانے پھرانے لے جاتے تھے۔ ٹی وی بھی دیکھتے تو بس بت بنے خالی نظروں سے اسکرین دیکھتے رہتے تھے۔ اس دن بھی میں اور رمل شازیب کو لیے بیٹھے تھے۔ رمل شازیب سے باتیں کر رہی تھی اور میں بے خیالی میں ریموٹ سے چینل بدل رہا تھا۔ پھر میں نے ایک چینل لگایا۔ یہ نیوز چینل تھا اور اس پر ایک رپورٹ آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی کہ گزشتہ کچھ عرصے سے پاکستان سے وائلڈ کی اسمگلنگ بہت زور و شور سے جاری تھی۔ سیاہ بچھو اور ایک خاص قسم کی چھپکلی بہت مہنگے داموں خرید کر بیرونِ ملک بھیجی جا رہی تھیں۔ رپورٹ کے ساتھ فوٹیج بھی آ رہی تھی جب

چھپکلی کی تصویر آئی تو میں چونکا اور میں نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ تو ہن کھن ہے۔“

رل چونکی۔ ”ہن کھن کیا؟“

”یہ بتا رہے ہیں کہ یہ چھپکلی بہت مہنگے داموں بک رہی ہے۔“ میں نے کہا تو رل بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ہم دیکھنے لگے اور یہ جان کر تو حیران ہی رہ گئے کہ ہن کھن چھپکلی دس سے پندرہ کروڑ روپے میں بک رہی ہے۔ رپورٹ میں کچھ لوگوں کو دکھایا گیا جو شہر کے فائیو اسٹارز ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے غیر ملکیوں سے رابطے میں تھے اور وہی اتنی بڑی قیمت پر یہ جاندار خرید رہے تھے۔ رل نے حسرت سے کہا۔

”دس پندرہ کروڑ کی ایک چھپکلی اور ہمارے بچے کے لیے ساٹھ لاکھ روپے نہیں ہو رہے۔ یہ ان کا کیا کرتے ہوں گے۔“

”پتا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے آج کل یہ کاروبار ہو رہا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جس کے ہاتھ سیاہ بچھو یا چھپکلی لگ جاتی ہے اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔“

”کاش کہ ہمیں بھی ایک چھپکلی مل جائے۔“ رل نے حسرت سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوتا کہ کہاں ملتی ہے تو میں خود جا کر پکڑ لاتی۔“

رل کا معمولی چھپکلی دیکھ کر خوف سے برا حال ہو جاتا تھا اگر اسے گھر میں کہیں چھپکلی نظر آ جاتی تو وہ اس وقت تک اس حصے میں نہیں جاتی تھی جب تک میں چھپکلی تلاش کر کے اسے مار نہ دوں۔ میں نے کہا۔ ”تم نے پکڑ لی، چھوٹی سی چھپکلی سے تو اتنا ڈرتی ہو؟“

”اپنے لاڈلے کے لیے میں موت کے منہ میں ہاتھ دے سکتی ہوں۔“ اس نے شازیب کو سینے میں بھینچ کر کہا۔ ”یہ تو ایک چھپکلی ہے۔“

”لوگ کہتے ہیں یہ بے انتہا زہریلی ہوتی ہے سانپ کا ڈسا بچ جاتا ہے لیکن اس کا کاٹا نہیں بچتا۔“

”بھلے مجھے کاٹ لے لیکن مجھے مل جائے میرا بچہ ٹھیک ہو جائے۔“ رل نے رونا شروع کر دیا۔ میں اسے تسلی دینے لگا۔

”چپ کر جا پگلی یوں روئے گی تو شازی بھی سہم جائے گا دیکھ اس کا کتنا سا منہ نکل آیا ہے۔“

وہ شازیب کی خاطر خاموش ہو گئی اور اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو اچانک مجھے خیال آیا اور میں اٹھ بیٹھا۔ رل جو نیم غنودگی میں تھی میرے اس طرح چونکنے سے اٹھ گئی۔ ”کیا ہوا اٹھ کیوں گئے ہیں؟“

”رل مجھے ابھی خیال آیا ہے۔ ہم یہ چھپکلی حاصل کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟...... کہاں سے؟“

میں نے اسے اپنے بچپن کا واقعہ سنایا جب ہمیں مٹھا سائیں ملا تھا اور اس کے پاس ہن کھن تھی۔ ”مٹھا سائیں کے پاس یہ چھپکلی تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ کہاں سے ملتی ہے؟“

رل خوش ہو گئی۔ ”آپ جانتے ہیں وہ کہاں ملے گا؟“

”اس کا پتا تو نہیں معلوم ہے۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ لال شہباز قلندر کے عرس میں لازمی شریک ہوتا ہے۔ وہ وہاں ملے گا۔“

”یہ تو بہت پرانی بات ہے سولہ سال ہو چکے ہیں۔“ رل نے حسرت سے کہا۔ ”اب وہ پتا نہیں وہاں ہو گا بھی یا نہیں۔“

”امید پر دنیا قائم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھ رل عرس قریب آ رہا ہے اور میں وہاں جاؤں گا۔ اگر مٹھا سائیں مل گیا تو میں اس کے پیچھے پڑ جاؤں گا۔“

رل بھی پرجوش ہو گئی۔ ”اگر ہمیں چھپکلی مل گئی تو ہم اسے بیچ کر شازیب کا اچھے سے اچھا علاج کرا سکیں گے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے کہا۔ میں دوبارہ لیٹا تو مجھے ایک خیال اور آیا اور اگلے دن میں نے دفتر سے اپنے ایک سابق کولیگ کو کال کی جو پہلے اسی فرم میں جاب کرتا تھا پھر اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں جاب کی آفر ہوئی تو وہ وہاں چلا گیا تھا۔ ”ماجد کیا حال ہیں؟“

”تم سناؤ کیسے ہو، بہت دن بعد یاد کیا۔“

”بس یار بیٹے کی بیماری نے سب بھلا دیا۔“

”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ اس نے پوچھا تو میں نے اسے شازیب کی بیماری کا بتایا۔ وہ بھی دکھی ہو گیا۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے یار اولاد کی تکلیف کہاں دیکھی جاتی ہے۔ خدا تمہیں اس آزمائش سے نکلنے کا حوصلہ دے۔“

”بس یار دعاؤں کی ضرورت ہے۔“

”میرے لائق کوئی خدمت؟“

”یار میں نے سنا ہے کہ تمہارے ہوٹل میں کچھ ایسے غیر ملکی ٹھہرے ہیں جو یہاں سے سیاہ بچھو اور زہریلی چھپکلیاں خرید رہے ہیں۔“

”ٹھہرے ہیں۔“ ماجد ہنسا۔ ”بھائی وہی تو ٹھہرے ہوئے ہیں ورنہ اب غیر ملکیوں نے یہاں کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک بندہ تو تین مہینے سے ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی پارٹی سے اس کی ہوٹل میں ہی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ پارٹی اور چیز یہیں منگواتا ہے۔“

”خریدتا بھی ہے؟“

”یہ نہیں پتا کیونکہ میٹنگ ہوٹل کے ایسے کمروں میں ہوتی ہے جہاں کوئی اور نہیں جا سکتا۔“

”کیا میری اس سے بات ہو سکتی ہے؟“

”نہیں یار یہ مشکل کام ہے۔“

ماجد انتظامیہ میں اچھے عہدے پر گیا تھا میں نے کہا۔ ”یار تم چاہو تو ہو سکتی ہے۔“

”لیکن تم اس سے کیوں بات کرنا چاہتے ہو؟“

”مجھے شازیب کے علاج کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے اور میں اندرونِ صوبے کا رہنے والا ہوں ان چیزوں کے بارے میں جانتا ہوں۔“

ماجد سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں اسے تمہارا کونٹیکٹ نمبر دے دوں گا مگر وہ رابطہ کرتا ہے یا نہیں یہ اس کی مرضی ہو گی۔“

”تم نمبر دے کر دیکھو، ہو سکتا ہے بات بن جائے۔“

”تم کیا کر سکو گے؟“

”مجھے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ کہاں سے اور کن لوگوں سے مل سکتی ہے۔“

”تب تو شاید بات بن جائے۔“ ماجد نے کہا۔ ”یہ بندہ آیا ہی اس لیے ہے اور روزانہ پچیس ہزار کرایہ بھر رہا ہے۔ سمجھ لو اب تک کرائے میں ہی اکیس لاکھ روپے دے چکا ہے۔“

مجھے خیال آیا کہ میں مٹھا سائیں کو تلاش کرنے سے پہلے اس چھپکلی کے بارے میں مزید معلومات لے لوں اور سب سے بہتر معلومات وہی دے سکتے تھے جو یہ چیزیں خرید رہے تھے۔ یہاں کے لوگوں کا مجھے اندازہ تھا کہ اول تو وہ صحیح بات بتائیں گے نہیں اور دوسرے کسی کو پتا چل گیا کہ میں کس چکر میں ہوں تو وہ میرے پیچھے پڑ سکتا ہے۔ میں اس میں کام کرنے والے اور لوگوں سے واقف نہیں تھا میرے پاس بس ایک ہی نام تھا مٹھا سائیں کا اور میں اسے تلاش کر سکتا تھا۔ اگر وہ مل جاتا تو امکان تھا کہ چھپکلی بھی مل جائے گی اور وہ مل جاتی تو اس کا گاہک تلاش کرنا پڑتا۔ میں پہلے گاہک یوں تلاش کر رہا تھا کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس بات میں حقیقت بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ میرا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک معمولی سی چھپکلی اتنی قیمت کی کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس چکر میں کوئی نہ کوئی صداقت تو تھی ورنہ اتنے سارے لوگ جھوٹ تو نہیں بول سکتے۔ اگلے دن ماجد کی کال آئی اس نے کہا۔

”میری اس سے بات ہو گئی ہے۔ سنگاپور کا شہری ہے اور شاید ایجنٹ ہے۔“

”کس کا ایجنٹ؟“

”پتا نہیں لیکن وہ خود اتنا دولت مند نہیں لگتا ہے۔“

”کیا وہ مجھے کال کرے گا؟“

”دیکھتے ہیں اگر نہیں کیا تو میں اس سے پھر بات کروں گا۔“ ماجد نے کہا مگر اس کی نوبت نہیں آئی مجھے اگلے ہی دن ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

”مسٹر سومرو؟“

لہجہ غیر ملکی تھا میں نے کہا۔ ”بات کر رہا ہوں آپ کون ہیں؟“

”وانگ لی مائن۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے کسی کے توسط سے تمہارا نمبر ملا ہے۔“

میں نے فائیو اسٹار ہوٹل کا نام لے کر پوچھا۔ ”تم وہاں سے بات کر رہے ہو؟“

”یس مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے پاس وائلڈ لائف کے حوالے سے کچھ بزنس ہے؟“ اس نے مبہم انداز میں کہا۔

”بالکل اسی لیے میں نے اپنا نمبر دیا ہے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کل سہ پہر تین بجے ہوٹل آ جاؤ۔ ریسپشن پر اپنا نام بتاؤ گے تو مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔“

اگلے دن میں پونے تین بجے ہوٹل پہنچ گیا تھا۔ وہاں ریسپشن پر اپنا نام بتایا تو آئی ڈی کارڈ چیک کر کے ایک آدمی نے میری رہنمائی کی اور مجھے ایک الگ تھلگ جگہ لے آیا۔ یہاں قطار سے میٹنگ رومز تھے۔ ایک میٹنگ روم کے باہر ہوٹل سیکیورٹی کا ایک آدمی موجود تھا۔ اس نے کچھ آلات کی مدد سے میری تلاشی لی اور پھر میرا موبائل لے کر اس کی

بیٹری نکال کر موبائل مجھے واپس کیا۔ ’’آپ اندر جاسکتے ہیں واپسی میں بیٹری مل جائے گی۔‘‘

میں اندر داخل ہوا تو میٹنگ روم میں ایک چینی نقوش والا شخص موجود تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ’’وانگ لی مائن۔‘‘

’’ایاز احمد سومرو۔‘‘

’’کیا میں آئی ڈی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟‘‘ اس نے مہذب انداز میں کہا تو میں نے اسے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر دیا اس نے غور سے دیکھا اور مطمئن ہو کر مجھے واپس کر دیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ’’یہ سیکیورٹی پروسیس ہے۔ یہاں کئی دھوکے باز بھی بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔‘‘

’’میں سمجھتا ہوں جہاں اتنی دولت ملوث ہو وہاں دھوکے بازی کا امکان ہوتا ہے۔‘‘

’’پلیز۔‘‘ اس نے اپنے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ برابر میں کئی طرح کے مشروب اور اسنیکس آئٹم رکھے تھے۔ ’’تم کیا لینا پسند کرو گے؟‘‘

’’صرف چائے۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے میرے لیے چائے بنائی اور اس دوران میں اپنا تعارف کرایا۔ وہ سنگاپور کا شہری تھا۔ مگر اس نے یہ وضاحت نہیں کی وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ چائے میرے سامنے رکھ کر اس نے پوچھا۔

’’مسٹر سومرو...... کیا وائلڈ لائف تمہاری فیلڈ ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ’’میں اکاؤنٹس کی فیلڈ سے تعلق رکھتا ہوں۔‘‘

’’تب تم نے مجھ سے ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر کی؟‘‘ اس نے ذرا آگے جھکتے ہوئے کہا۔

’’کیونکہ میرا خیال ہے میں وہ چیز مہیا کر سکتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔‘‘

’’مثلاً؟‘‘

’’ایک زہریلی چھپکلی جو بہت نایاب ہے۔‘‘

پہلی بار اس کے چہرے پر دلچسپی کا تاثر نظر آیا۔ ’’ٹھیک ہے آگے کہو۔‘‘

’’مجھے رقم کی ضرورت ہے اس لیے میں یہ کام کرنے کے لیے آمادہ ہوا۔‘‘

’’سب دولت کے لیے کام کرتے ہیں۔‘‘ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ہمارے درمیان انگریزی میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس کی انگریزی مجھ سے بہتر تھی مگر لہجہ ذرا مشکل تھا۔

’’میں نے دولت کے لیے نہیں کیا ہے میں نے کہا نا مجھے رقم کی ضرورت ہے۔‘‘

’’تمہیں رقم کی ضرورت کیوں ہے؟‘‘

میں نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر اسے صاف بتا دیا کہ مجھے رقم کی ضرورت کیوں ہے۔ ’’اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو میری تم سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ میں ان چکروں میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔‘‘

’’اوکے مسٹر سومرو اب بتاؤ کہ تم کب اور کتنی تعداد میں مہیا کر سکتے ہو؟‘‘

’’پہلے میں اس بارے میں کچھ معلومات لینا چاہوں گا؟‘‘ میں نے سر ہلایا۔ ’’کیونکہ مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔‘‘

’’کیسی معلومات؟‘‘

’’ایک تو یہ کہ چھپکلی کے لیے تمہاری شرائط اور قیمت کیا ہوگی؟‘‘

’’مجھے کم سے کم پانچ سو گرام وزنی چھپکلی کی ضرورت ہے۔ اس کے دھبوں کا رنگ گہرا ہونا چاہیے۔ جتنا گہرا ہوگا اس کا مطلب ہوگا اس کی عمر زیادہ ہوگی۔ مادہ کی قیمت نر سے دوگنی ہوگی۔ چھپکلی پوری طرح صحت مند ہو۔ وہ بیمار یا زخمی نہ ہو۔‘‘

’’اگر مطلوبہ چھپکلی مل جائے تو اس کی کیا قیمت ہوگی؟‘‘

’’پانچ سو گرام وزن کی چھپکلی کی قیمت پانچ کروڑ روپے ہوگی۔‘‘

’’لیکن ٹی وی پر بتا رہے تھے کہ یہ دس سے پندرہ کروڑ میں بک رہی ہے۔‘‘

’’یہ بین الاقوامی قیمت ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ہم جو یہاں آئے ہیں اور اتنا خرچا کر رہے ہیں تو کچھ کمانے کے لیے کر رہے ہیں اور پھر یہاں سے انہیں لے جانا بھی آسان نہیں ہے۔‘‘

’’مادہ ہوئی تو اس کی قیمت دس کروڑ ہو جائے گی؟‘‘

’’یہ مادہ کی قیمت ہے، نر کی قیمت ڈھائی کروڑ روپے ملے گی۔‘‘ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ’’اگر تم راضی ہو تو جب تمہارے پاس کوئی چھپکلی ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔‘‘

میں نے اس کا نمبر لیا کیونکہ اس نے مجھے ہوٹل کے نمبر سے کال کی۔ ’’یہ میرا خاص نمبر ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’اسے زبانی یاد کر لو کہیں نوٹ مت کرنا۔‘‘

اس کا نمبر آسان تھا میں نے آسانی سے یاد کر

لیا۔ ’’فرض کرو مجھے اس سے کم وزن کی چھپکلی ملے تو کیا وہ چلے گی؟‘‘

’’ہاں مگر اس صورت میں قیمت کم ہو جائے گی۔ چار سو گرام تک وزنی چھپکلی کے ساڑھے تین کروڑ ملیں گے، تین سو گرام تک وزن کی چھپکلی کے دو کروڑ ہوں گے اور دو سو گرام کی چھپکلی کے ایک کروڑ ملیں گے اس سے کم وزن کی چھپکلی قبول نہیں ہوگی۔‘‘

میں سمجھ گیا تھا، میں نے کہا۔ ’’آخری سوال کہ آخر ایک معمولی سی چھپکلی کی اتنی زیادہ قیمت کیوں؟‘‘

’’سچی بات ہے کہ اصل بات تو میں خود بھی نہیں جانتا لیکن فاریسٹ میں اس کے کچھ گاہک ہیں جو اس کی منہ مانگی قیمت دیتے ہیں میں ان کے لیے ہی کام کر رہا ہوں۔‘‘

گویا ماجد کا کہنا درست تھا وہ ایجنٹ تھا۔ ’’ادائیگی کس طرح ہوگی؟‘‘

’’یہیں پاکستانی روپے میں نقد ہوگی۔‘‘

اب میرے سامنے مٹھا سائیں کو تلاش کرنے کا ٹاسک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اسے تلاش کر لیا تو میں چھپکلی بھی حاصل کر لوں گا۔ اگر مجھے مٹھا سائیں کو نصف رقم کا حصے دار بنانا پڑتا تو میں اس کے لیے بھی راضی تھا۔ میرے لیے ڈھائی کروڑ کا آدھا بھی کافی تھا۔

☆☆☆

گرمی بے پناہ تھی اور لوگوں کا ہجوم بھی بے پناہ تھا۔ صرف سندھ نہیں بلکہ ملک اور دنیا کے کونے کونے سے لال شہباز کے عقیدت مند اور چاہنے والے آئے ہوئے تھے۔ سیہون چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس وقت انسانوں کا سمندر لگ رہا تھا۔ چاروں طرف لوگ آجا رہے تھے۔ کہیں کہیں لوک فنکار اور موسیقی کے آلات بجانے والے سرعام اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور لوگ ان کے گرد جمع تھے۔ بعض جگہوں پر تو ایک ساتھ ہی کئی موسیقار مصروف تھے اور کسی کی آواز ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ہجوم اور شور سے بے نیاز مٹھا سائیں کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ آج عرس کا پہلا دن تھا۔ آسمان پر سورج جیسے انگارے برسا رہا تھا مگر لوگ گرمی اور حبس سے بے نیاز لگ رہے تھے۔ میرے پاس یہ تین دن تھے اور مجھے ان تین دنوں میں مٹھا سائیں کو تلاش کرنا تھا۔

اگرچہ مٹھا سائیں کو دیکھے سولہ طویل برس گزر چکے تھے اور وہ جوان سے ادھیڑ عمری میں داخل ہو چکا ہوگا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال سفید ہو گئے ہوں گے مگر اس کے نقوش میرے ذہن میں موجود تھے اور میں ممکنہ فقیروں میں وہی چہرہ کھوج رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ آسان کام نہیں تھا۔ ان دنوں یہاں لاکھوں کی تعداد میں افراد آتے ہیں اور ان لاکھوں میں کسی ایک فرد کو تلاش کرنا ایسا تھا جیسے سمندر میں پانی کا قطرہ یا صحرا میں ریت کا ایک مخصوص ذرہ نکالنا۔ مگر میں شازیب کی خاطر یہاں چلا آیا تھا۔ صبح سب سے پہلے میں نے مزار کے پاس فقیروں کے ڈیرے پر جا کر دیکھا۔ یہاں صرف فقیر رکتے تھے۔ میں صرف دیکھتا نہیں رہا بلکہ ایک ایک سے مٹھا سائیں کے بارے میں پوچھتا بھی رہا۔ دو فقیروں نے اس سے جان پہچان کا اقرار کیا مگر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے دو سال پہلے اسے آخری بار یہیں دیکھا تھا اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔ یہ سن کر میں پُرامید بھی ہوا تھا کہ کم سے کم دو سال پہلے تک مٹھا سائیں موجود تھا مگر مایوسی کی بات یہ تھی کہ وہ دو سال سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب مٹھا سائیں فقیروں میں نظر نہیں آیا تو میں شہر میں نکل گیا۔ گلیوں میں گھومنے لگا۔ ایک ایک فرد کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں مستقل رہنے والوں سے جو کاروبار کرتے تھے ان سے مٹھا سائیں کے بارے میں پوچھتا۔ جب میں جا رہا تھا تو ریاض نے مشورہ دیا کہ اپنا کھانا ساتھ لے کر جاؤں کیونکہ وہاں ان دنوں لوگ موقع سے فائدہ اٹھا کر بہت ناقص اور نقصان دہ اشیا بھی بیچ دیتے ہیں۔ لوگ بیمار پڑتے ہیں اور بہت سے مر بھی جاتے ہیں۔ اس لیے جب میں جانے لگا تو رمل نے مجھے سوجی اور میدے سے بنی ہوئی میٹھی ٹکیاں بنا دیں۔ یہ اتنی تھیں کہ میں ہفتے بھر بھی کھاتا تو ختم نہ ہوتیں۔ پانی کے لیے میں منرل واٹر کی لیٹر بوتل لے لیتا اور اسے چلاتا جب وہ ختم ہو جاتی تو دوسری لے لیتا کیونکہ یہ بھی دیکھا کہ پانی انتہائی خراب اور آلودہ تھا۔ اسے پینا ڈائریا کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

اہم بات یہ تھی کہ میں بیمار پڑنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں تو اپنے بیمار بیٹے کے علاج کے لیے یہاں آیا تھا۔ خود بیمار پڑ جاتا تو اس کا علاج کیسے تلاش کرتا۔ اس لیے میں بہت احتیاط کر رہا تھا۔ میں اپنے ساتھ ایک رلی لایا تھا دن میں اسے بیگ میں رکھ لیتا اور رات میں کسی جگہ بچھا کر سو جاتا۔ دوپہر کے سورج میں میرا سر چکرانے لگتا تو کچھ دیر کے لیے کسی سایہ دار جگہ رک جاتا مگر وہاں اتنا ہجوم ہوتا کہ

کچھ دیر بعد ہی حبس سے بے حال ہو کر پھر گلیوں میں نکل آتا۔ اس بار عرس بھرپور گرمی کے موسم میں آیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر چند ٹکیاں کھائیں اور یوں لنچ کر کے پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ شام تک چل چل کر میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ حالانکہ میں چن کر بہت آرام دہ سینڈل ساتھ لایا تھا۔ اس کے باوجود میری حالت خراب ہوگئی تھی۔ دن میں چھالے بن کر پھوٹ بھی گئے تھے۔ شام کو سینڈل اتارے تو پیروں کی حالت سامنے آئی۔

اتفاق سے رِل نے ساتھ جو دوائیاں کی تھیں ان میں برنول بھی تھا۔ میں نے وہ چھالوں پر لگایا اور کچھ دیر آرام کے بعد پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ رات ہوتے ہی مزار کے آس پاس روشنیوں کا سیلاب آگیا تھا۔ اب سب لوگ مزار کے پاس جمع ہو رہے تھے اس لیے یہاں ہجوم بڑھنے لگا۔ میں ان کے درمیان لنگڑاتا ہوا مٹھا سائیں کو تلاش کرنے لگا۔ یہاں بیک وقت قوالی بھی چل رہی تھی اور لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے بے پناہ آواز تھی اور ساتھ ہی احاطے میں کئی ڈھول بجانے والے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اپنے بیگ کی طرف سے بہت ہوشیار تھا کیونکہ سنا تھا اس وقت یہاں جیب کترے بھی سرگرم ہو جاتے تھے اور بہت سے لوگ اپنی رقم سے محروم ہو جاتے تھے۔ رقم میں نے شلوار کے اندر کی جیب میں رکھی تھی اور وہیں موبائل بھی تھا۔ رات بارہ بجے میں خستہ حال اور تھکن سے چور ہو کر سونے کے لیے لیٹا تو مایوسی کا غلبہ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ تین دن کیا اگر میں سارے سال بھی یہاں مٹھا سائیں کو تلاش کروں تو وہ ملنے والا نہیں تھا۔

شور کے ساتھ درد کی بھی شدت تھی اور مجھے پین کلر لینا پڑی تھی تب کہیں جا کر میں سو سکا۔ بیگ کو تکیہ بنالیا تھا اسی طرح اس کی حفاظت ممکن تھی۔ ورنہ رات کوئی اسے لے جاتا۔ پہلی صبح ہی ایسے کئی کیس سامنے آئے جب سوتے لوگوں کا سامان غائب ہوگیا تھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ مجرموں نے اولیا اللہ کے مزارات کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ایسے مواقعوں پر ہجوم کا فائدہ اٹھانے کے لیے چلے آتے ہیں۔ حالانکہ لوگ بس زاد راہ ساتھ لائے تھے۔ اوڑھنے بچھانے کی چادریں اور چند کپڑے تھے۔ مگر وہ بھی لٹ گئے۔ بہت سے اپنے موبائل فونز سے محروم ہوگئے تھے۔

اگلے دن میری حالت ذرا ست تھی مگر میں نے اپنا کام صبح سویرے شروع کر دیا۔ لوگ دیر تک جاگتے رہے تھے اور پھر دیر تک سوتے رہے۔ میں جلدی اٹھ گیا۔ اس لیے تلاش کے کام میں آسانی رہی۔ پہلے مزار کے احاطے میں سوتے فقیروں والے حصے میں گیا اور وہاں مٹھا سائیں کو دیکھا۔ اس کے بعد باقی احاطے کا معائنہ کیا۔ احاطہ بہت بڑا تھا اور بہت سے لوگ منہ لپیٹے سو رہے تھے۔ مگر میں کیا کرتا اس کا منہ کھول کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے انہیں پر قناعت کی جو دکھائی دے رہے تھے۔ جب ان سے بھی کام نہیں بنا تو میں باہر نکل گیا اور آس پاس فٹ پاتھوں اور مختلف کھلی جگہوں پر سوتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک ہوٹل پر چائے لے کر پی۔ ناشتا میں نے میٹھی ٹکیوں سے کر لیا تھا۔ چھالے بہتر تھے مگر چلنے سے تکلیف دینے لگے تھے۔ میں ان کی پروا کیے بغیر پھر نکل کھڑا ہوا۔ دوپہر تک اور پھر دوپہر سے شام تک گلیوں میں گھومتا رہا ہر چہرے میں مٹھا سائیں کا چہرہ تلاش کرتا رہا۔ مگر کوئی چہرہ اس سے ملتا جلتا نہیں تھا اور کچھ ایسے نظر آئے جن پر شبہ ہوا تو وہ مٹھا سائیں نہیں نکلے تھے۔

دوسرا دن ڈھلا تو میری مایوسی بڑھ گئی تھی۔ کل آخری دن تھا اور وہ بھی گزر جاتا تو لوگ واپس جانا شروع ہو جاتے تھے۔ پھر میں مٹھا سائیں کو کہاں تلاش کرتا۔ رات سونے کے لیے لیٹا تو طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی۔ رات کسی وقت مجھے لگا جیسے میرا دماغ گرم ہو رہا ہو۔ مجھے بخار ہو گیا تھا اور اس گرم موسم میں بھی کپکپی چڑھ رہی تھی۔ بہ مشکل میں نے اٹھ کر چند گولیاں حلق سے اتاریں تو آدھے گھنٹے بعد ڈھیروں پسینا آیا اور بخار اتر گیا۔ مگر صبح جب سورج طلوع ہوا تو مجھے لگا کہ میرے جسم میں جان نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح گھسیٹ کر برآمدے میں دیوار سے ٹک گیا۔ کچھ دیر بعد لوگ اٹھنا شروع ہو گئے تھے اور میں بے بسی سے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ منہ کا ذائقہ ایسا ہو رہا تھا جیسے میں نے کریلے چبائے ہوں۔ بوتل میں پانی بہت کم رہ گیا تھا اسے ہی حلق سے اتارا۔ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

جب درگاہ کے خادموں نے احاطے کی صفائی شروع کی تو مجبوراً مجھے اٹھنا پڑا۔ باہر نکل کر ایک درخت تلے بیٹھ گیا۔ جسم سے جان نکل گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس حالت میں کیسے مٹھا سائیں کو تلاش کروں گا۔ اگر میں اسے تلاش نہیں کر سکا تو شازیب کے علاج کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ احساس بے بسی ایسا تھا کہ مجھے رونا آگیا۔ میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور بھاری آواز میں بولا۔ ”کیوں روتا ہے بچہ؟“

میں نے ہاتھ رکھنے والے کو دیکھا۔ وہ فقیر تھا۔ ادھیڑ عمر اور سفید بالوں والا مگر وہ مٹھا سائیں نہیں تھا۔ ”میرا بچہ بیمار ہے۔“ میں نے آنسو صاف کیے۔ ”اس کے علاج کے لیے ایک بندے کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”اوہ کیا بیماری ہے تیرے بچے کو؟“

میں نے اسے آسان زبان میں شازیب کی بیماری کے بارے میں بتایا۔ تو اس نے اگلا سوال کیا۔ ”جس بندے کو تلاش کر رہے ہو کیا وہ حکیم ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”وہ تمہاری طرح ملنگ ہے۔ مٹھا سائیں نام ہے۔“

”اس نام کے تو کئی جاننے والے ہیں۔“ اس نے داڑھی میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ ”بندہ کیسا ہے؟“

میں نے اسے تفصیل سے مٹھا سائیں کا حلیہ اور دوسری تفصیلات بتائیں مگر اس کے علم میں موجود مٹھا سائیں اس حلیے اور تفصیلات پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اس نے کہا۔ ”جب وہ حکیم نہیں ہے تو اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟“

میں ہچکچایا مگر پھر سچ بول دیا۔ ”سائیں اس کے پاس ہن کھن ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ چھپکلی کہاں سے ملتی ہے۔“

فقیر چونکا۔ ”بابا ہن کھن تو بہت زہریلی ہوتی ہے اس کا کیا کرنا ہے؟“

”اسے فروخت کر کے میں اپنے بیٹے کا آپریشن کراؤں گا۔“

”سنا تو میں نے بھی ہے کہ یہ بہت مہنگے داموں بک رہی ہے۔“ اس نے داڑھی میں خلال جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پر یہ تو دنیا والوں کے چکر ہیں ہم فقیروں کو اس سے کیا؟“

”بابا میری مدد کرو مجھے مٹھا سائیں کی تلاش ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔“

وہ ہنسا۔ ”ہم تو خود دوسروں کو یہ دعا دیتے ہیں۔“

”بابا جس کی ضرورت پوری ہوتی ہے وہی دعا دیتا ہے۔ اس وقت میں ضرورت مند ہوں۔“

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”آج میں بھی یہ کام کرتا ہوں۔ مٹھا سائیں کو تلاش کرتا ہوں۔ تم کل صبح اسی جگہ مجھ سے ملنا۔“

”بابا میں بہت شکر گزار ہوں گا۔“

”اللہ بھلا کرے گا۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد میری ہمت ہوئی تو ایک ہوٹل تک آیا۔ وہاں سے چائے لے کر ٹکیاں کھائیں تو طبیعت بہتر ہوئی۔ دوا لے کر میں کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر مٹھا سائیں کی تلاش میں نکل گیا۔ عرس کا آخری دن تھا اس لیے گرمی کے ساتھ رش بھی عروج پر تھا جب میں تھک جاتا اور ہانپنے لگتا تو کہیں ٹک جاتا اور جیسے ہی حالت ٹھیک ہوتی پھر سے چلنا شروع کر دیتا۔ اب میں ہر نظر آنے والے فقیر سے مٹھا سائیں کا پوچھ رہا تھا۔ مگر ہر فقیر نفی میں جواب دے رہا تھا اور جو اثبات میں جواب دے رہے تھے وہ بھی مطلوبہ مٹھا سائیں سے ناواقف تھے۔ دوپہر تک میں تھک گیا تو واپس درگاہ آگیا۔ یہاں پڑا ہانپتا رہا جب سورج ذرا ڈھلا تو کھا پی کر پھر باہر نکل آیا۔ مگر شام تک نتیجہ حسبِ سابق نکلا تھا۔ میری ساری اُمیدیں دم توڑ گئی تھیں۔

اب عرس کا آخری وقت تھا۔ اگلی صبح لوگ یہاں سے جانے لگتے۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ فقیر لوگ تو کچھ دیر اور رکتے ہوں گے تو میں ہجوم کم ہونے کے بعد کل ایک بار پھر کوشش کروں گا دوسرا آسرا مجھے اس فقیر نے دلایا تھا جس نے کل صبح ملنے کو کہا تھا اگر وہ مٹھا سائیں کو تلاش کر لیتا تو اسے ساتھ لے آتا۔ اس رات میں بے خبر سویا اور صبح جب آنکھ کھلی تو سورج نکل آیا تھا اور خادم صفائی کے لیے لوگوں کو اٹھا رہے تھے۔ میں ہراساں ہو کر اٹھا کہ فقیر نے مجھے صبح کا وقت دیا تھا اور ایسا نہ ہو کہ وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا ہو۔ میں بھاگم بھاگ درخت کے نیچے پہنچا تو وہاں فقیر کو پا کر اطمینان کا سانس لیا مگر ساتھ ہی اسے اکیلا پا کر مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے سلام دعا کے بعد پوچھا۔ ”بابا مٹھا سائیں کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں بیٹا۔“ اس نے داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پر تیرا کام ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیسے بابا؟“

”تجھے ہن کھن چاہیے نا؟“

”ہاں بابا اصل میں تو وہی چاہیے۔“

”تب میرے ساتھ چل، میں ایک جگہ جانتا ہوں شاید وہاں سے مل جائے تو تیرا کام ہو جائے۔“

میں پُرجوش ہو گیا۔ ”سچ بابا تم جانتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”مگر کچھ سامان لینا ہوگا۔“

”میں لوں گا بابا۔“

”میرے ساتھ چل سامان لے لے ہم کل چلیں گے۔“

فقیر نے تنکوں سے بنی ٹوکری، رسی، ایک مضبوط کپڑے والی تھیلی اور کچھ چیزیں اور لیں۔ عرس ختم ہوتے ہی عقیدت مند واپسی کے لیے روانہ ہو رہے تھے اور شام تک بہت حد تک رش کم ہو گیا تھا۔ یہ دن میں نے آرام کرتے گزارا اور ساتھ ہی رل کو کال کر کے اطلاع دی کہ اب میں کچھ تاخیر سے آؤں گا کیونکہ ایک اُمید بندھی تھی اگرچہ مٹھا سائیں نہیں ملا تھا۔ رل خوش ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت دعا کر رہی ہے۔ میں اسے اور شازیب کو اماں بابا کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ دن میں آرام اور رات کو سکون کی نیند نے میری حالت بہت بہتر کر دی تھی۔ اگلی صبح میں فقیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس نے ٹھٹھہ جانے کی بات کی تھی ہم نے بس پکڑی اور سیہون سے ٹھٹھہ آئے۔ ٹھٹھہ اگرچہ میرا آبائی علاقہ ہے لیکن میں نے بھی پورا ٹھٹھہ نہیں دیکھا۔ فقیر رائے شاہ مجھے ایک ایسے ویران علاقے میں لایا جہاں ہر طرف چھوٹی چھوٹی ٹیلوں جیسی پہاڑیاں تھیں اور ان سنگلاخ پہاڑوں کے رخنوں اور دامن میں جہاں جہاں کچھ مٹی جمع ہوئی تھی اس میں سبزہ اگ آیا تھا۔ مگر مجموعی طور پر یہ بہت سنسان اور اجاڑ سا علاقہ تھا۔ رائے شاہ نے کہا۔

”ہن کھن یہاں پائی جاتی ہے مگر سنا ہے اب بہت کم رہ گئی ہے کیونکہ بہت سے لوگ پکڑ کر لے جا چکے ہیں۔“

”اگر میرے نصیب میں ہو گی تو مل جائے گی۔“

ہم جو سامان لائے تھے اس میں ایک باریک نیٹ والا کپڑا بھی تھا۔ رائے شاہ نے اس سے جال بنایا اور کیڑے شکار کرنے لگا۔ شام تک ہم اسی مشغلے میں رہے۔ جو کیڑے ملتے ان کو مار کر رکھ لیتے۔ شام تک اچھے خاصے کیڑے جمع کر لیے تھے۔ اس کے بعد رائے شاہ نے پہاڑیوں کے درمیان آگ جلائی اور کیڑے تھوڑے تھوڑے کر کے ان پہاڑیوں کے آس پاس بکھیر دیے۔ یہ تو میں دیکھ چکا تھا کہ ہن کھن کیڑے کھاتی ہے اور اگر آس پاس کوئی چھپکلی ہوتی تو وہ یہ کیڑے کھانے ضرور آتی۔ رائے شاہ نے کہا کہ اب ہمیں چوکس رہ کر انتظار کرنا تھا۔ ہم آگ کے پاس بیٹھ گئے کیونکہ کیڑے مکوڑے اور ہن کھن جیسی چیزیں آگ سے دور رہتی ہیں۔ ہم دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ دونوں طرف نظر رکھ سکتے تھے۔ ہم نے طے کیا تھا کہ ایک سوئے گا تو دوسرا جاگے گا۔

رائے شاہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کامیابی کا امکان بہت کم ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہفتہ دس دن کے بعد بھی ہم خالی ہاتھ واپس جا رہے ہوں۔ یہاں آتے ہوئے ہم پانچ دن کا کھانا پانی ساتھ لائے تھے۔ کھانے میں خشک نان اور اچار تھا۔ پانی کے لیے پانچ پانچ لیٹر والی چار بوتلیں لی تھیں جو ہمارے لیے کافی ہوتیں۔ اس علاقے میں پینے کا صاف پانی دستیاب نہیں تھا۔ پہلے دن کچھ نہیں ہوا۔ ہم نے جو کیڑے مار کر ڈالے تھے ان کو چیونٹیاں اور دوسرے جانور کھا گئے تھے۔ ہن کھن کی صورت بھی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ دن بھی ہم نے کیڑے پکڑتے گزارا اور رات دوسری جگہ پڑاؤ ڈالا۔ یہاں بھی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ہم نے مردہ کیڑے ان کے دامن میں بکھیر دیے۔ جگہ ایسی رکھی کہ جہاں ہمیں نظر رکھنے میں آسانی ہو۔

اس دن ہمیں دو پارٹیاں اور بھی نظر آئیں جو لازمی ہن کھن کی تلاش میں یہاں آئی تھیں۔ مگر وہ ہم سے دور رہیں۔ رات کو جب نیند زیادہ آنے لگتی تھی تو ہم میں سے ایک جاگتا اور ایک سوتا تھا۔ اس طرح دونوں اپنی نیند کسی حد تک پوری کر لیتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ رائے شاہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میرا ساتھ دے رہا تھا یا پھر وہ بھی حصے دار بنتا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسے بھی حصہ دوں گا۔ ویسے وہ خاموش طبع اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا۔ جب فارغ ہوتا تو زیر لب شاہ بھٹائی کے اشعار گنگناتا اور اس کی لے بہت اچھی لگتی تھی۔ سچی بات ہے کہ ہم مشکل میں تھے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ رائے شاہ مجھے اپنی زندگی کے قصے سناتا اور میں اسے اپنی زندگی کے بارے میں بتاتا۔ یہاں موبائل سگنل نہیں تھے اس لیے گھر والوں سے بات نہیں ہو پاتی تھی۔ مگر یہ مشکل تو وہ بھی برداشت کر رہے تھے۔

تیسری اور چوتھی رات بھی رائیگاں گزری تھی۔

پانچویں دن ہم نے حسب معمول کیڑے جمع کیے اور آج ہمیں کیڑے بھی کم ملے تھے۔ جس جگہ ہم نے پڑاؤ ڈالا تھا وہاں چھوٹے ٹیلے تھے جن میں بہت زیادہ دراڑیں تھیں۔ الاؤ جلا کر ہم نے رات کا کھانا کھایا اور پھر نصف شب تک دونوں جاگتے رہے۔ اس کے بعد نیند نے غلبہ شروع کیا تو ہم باری باری سونے لگے۔ صبح فجر کے قریب میں اٹھا اور رائے شاہ سو گیا۔ میں الاؤ کے بجھ جانے والے انگارے کرید رہا تھا۔ اگرچہ موسم خنک نہیں تھا مگر انگاروں

کی گرمی اچھی لگ رہی تھی اسی طرح انگارے کریدتے ہوئے ایک بار میں نے آس پاس نظر دوڑائی تو خود سے صرف دو گز دور ایک ہن کھن کو پا کر دنگ رہ گیا۔ میں نے آنکھیں جھپکیں کہ مجھے دھوکا تو نہیں ہو رہا ہے لیکن وہ ہن کھن ہی تھی۔ وہ مخصوص انداز میں پیروں پر اچک کر ساکت تھی۔ جیسے آس پاس کی سن گن لے رہی ہو۔ میں نے سانس بھی روک لی تھی۔ پھر وہ آگے آئی اور رائے شاہ کے جھولے میں گھس گئی۔ جیسے ہی وہ جھولے میں گئی میں نے پھرتی سے اٹھ کر اس کا منہ بند کر دیا اور جھولا اٹھا لیا۔ ہلچل ہوئی تو رائے شاہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

”کیا ہوا......؟“

”ہن کھن۔“ میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہارے جھولے میں گھسی میں نے پکڑ لی۔“

”تمہیں یقین ہے وہ ہن کھن ہے؟“ اس نے شک سے پوچھا۔

”سو فیصد میں نے خود دیکھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم نے جھولے میں کوئی کھانے کی چیز رکھی ہے؟“

”مردہ کیڑے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”بس تو یہ اسی کے چکر میں آئی تھی۔“ میں نے جھولے میں کلبلاتی چھپکلی کی طرف اشارہ کیا۔

”واری قسمت۔“ رائے شاہ نے کہا۔ ”جسے ہم نے پانچ دن سے دیکھا نہیں تھا وہ خود آ گئی۔ چل بچہ تیرا کام ہو گیا نا۔“

”نہیں بابا صرف میرا نہیں اس میں تمہارا حصہ بھی ہے جو ملے گا اس میں آدھا تمہارا آدھا میرے بچے کے نصیب کا۔“

وہ ہنسا۔ ”فقیر دولت لے کر کیا کرے گا۔ جو مقدر کا فقیر ہو اسے فقیر ہی رہنا چاہیے۔“

واپسی کے سفر میں، میں نے رائے شاہ کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ مان کر نہیں دیا۔ ہن کھن ایک دوسرے تھیلے میں منتقل کر کے اس نے اپنا جھولا لیا اور ٹھٹھہ میں بس سے اتر کر چلا گیا۔ میں حیران رہ گیا کہ چند روپے کے لالچ میں آج کل لوگ قتل سے لے کر ایمان فروشی تک سب کر جاتے ہیں، کوئی اتنا بے نیاز بھی ہو سکتا ہے کہ کروڑوں نہ سہی لاکھوں کی دولت چھوڑ دے۔ کم سے کم میں نے ایسا ایک آدمی دیکھ لیا ہے۔ سارے راستے میں چھپکلی والا تھیلا مضبوطی سے تھامے بیٹھا رہا اور میرے اندر دھڑکا سا تھا کہ ابھی کہیں بس ڈاکو نہ روک لیں یا کسی کو پتا چل جائے کہ

میرے پاس کتنی قیمتی چیز ہے تو وہ مجھ سے چھیننے پر آ جائے۔ مگر خیریت رہی اور میں کراچی پہنچ گیا۔ میں براہِ راست گلشن حدید والی بس میں بیٹھا تھا اس لیے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر اترا۔ گھر پہنچا تو سب ہی میرے گرد جمع ہو گئے اور جب میں نے بتایا کہ ہن کھن لے آیا ہوں تو سب کی توجہ کا مرکز تھیلا ہو گیا تھا۔ ریاض کو مچھلیوں کا شوق تھا اس نے ایک چھوٹا سا ایکوریم رکھا تھا۔ اس نے ایکوریم خالی کیا اور ہن کھن کا تھیلا اس میں خالی کیا۔ جیسے ہی وہ ایکوریم میں گئی فوراً اس کا ڈھکن لگا دیا گیا۔ بابا نے اس کا معائنہ کیا اور تصدیق کی۔

”یہ ہن کھن ہے لیکن بچہ ہے۔“

”بچہ ہے۔“ میرا دل دھڑک اٹھا۔ ”اس کا وزن کتنا ہو گا؟“

”شاید ڈیڑھ سو گرام یا اس سے کم۔“ ریاض نے کہا۔

”کیا اس کا وزن کیا نہیں جا سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا تو جا سکتا ہے مگر اس میں خطرہ ہے اسے پکڑے گا کون؟“

”میں یہ کام کروں گا۔“ فیاض بولا۔ ”میرے پاس موٹے ربر کے دستانے ہیں جو ہم لوہے کا سامان اٹھاتے رکھتے ہوئے پہنتے ہیں۔“

فیاض ڈیجیٹل ترازو اور دستانے لے آیا اور ہم نے کسی نہ کسی طرح چھپکلی کا وزن کیا تو وہ کل ایک سو انچاس گرام نکلا تھا۔ میں مایوس ہو گیا۔ یہ تو کم تھا کیونکہ وانگ لی نے کہا تھا کہ وہ دو سو گرام سے چھوٹی چھپکلی نہیں لے گا۔ میں نے بتایا تو سب کے چہرے اتر گئے تھے۔ رل نے کہا۔ ”کیا ہم اس کا وزن بڑھا نہیں سکتے؟“

”وہ کیسے؟“

”اسے کھلا پلا کر۔“ رل نے کہا۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

بابا نے مشورہ دیا۔ ”اسے کسی بڑی جگہ بند کرو اور اسے مٹی اور پتھر دو یہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہتی ہے۔“

ہم نے اس کے لیے پلاسٹک کا ایک بڑا ٹب لیا اور اس میں مٹی پتھر ڈال کر اوپر سے شیشے کا ڈھکن لگا کر اسے چھوڑ دیا۔ شیشے میں اور ٹب کے کناروں پر سوراخ تھے جن سے تازہ ہوا اندر جا سکتی تھی۔ اسے دن میں کئی کیڑے

مکوڑے اور چھوٹی چھپکلیاں مار کر کھلاتے تھے مگر جب ایک ہفتے بعد اس کا وزن کیا تو وہ تقریباً اتنا ہی تھا پہلے ایک سو انچاس گرام سے ذرا کم تھا تو اب ایک سو انچاس گرام سے ذرا زیادہ ہوگیا تھا۔ میں پریشان ہوگیا اس رفتار سے تو اسے دو سو گرام کا ہونے میں شاید چھ سات مہینے لگ جاتے۔ یہ شاید وقت کے حساب سے بڑھتی تھی۔ مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں اپنے قدرتی ماحول سے نکلنے کے بعد یہ زندہ بچتی ہے یا نہیں۔ مگر دو ہفتے بعد بھی وہ صحت کے لحاظ سے ٹھیک رہی تھی۔ ہم اسے باقاعدگی سے دھوپ دکھاتے تھے اور اس کے کھانے کا خیال رکھتے تھے۔ یہ ذمے داری بابا نے اپنے سر لے لی تھی۔ وہی اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ دو ہفتے بعد اس کا وزن بہ مشکل ایک سو پچاس گرام ہوا تھا۔

شازیب کی طبیعت پھر خراب ہونے لگی تھی۔ اس کو دوائیاں دے رہے تھے اور جب اس کی سانس رکنے لگتی تو اسے آکسیجن بھی لگاتے تھے مگر یہ اس کا علاج نہیں تھا اسے آپریشن کی ضرورت تھی اور اس کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ جب تیسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور چھپکلی کے وزن میں خاص فرق نہیں آیا یہ اب بھی ایک سو اکاون گرام کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر شازیب کو فوری علاج کی ضرورت نہ ہوتی تو میں اسے آرام سے رکھتا اور زیادہ سے زیادہ وزن کا ہونے پر بیچتا مگر ابھی مجھے رقم چاہیے تھی۔ میں نے اس دوران میں دو مرتبہ وانگ لی سے رابطہ کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ میں زہریلی چھپکلی کا بندوبست کر رہا ہوں۔ دراصل میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ یہاں موجود ہے، کہیں چلا تو نہیں گیا ہے مجھے نئے سرے سے چھپکلی کا گاہک تلاش کرنا پڑے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ رل نے کہا۔ ”آپ وانگ لی سے بات کریں اسے بتائیں کہ اتنے گرام کی چھپکلی ملی ہے وہ پورے ایک کروڑ نہ دے بس اتنے دے دے کہ ہم شازیب کا علاج کرا سکیں۔“

”پتا نہیں وہ مانتا بھی ہے یا نہیں۔“

”آپ اس سے بات تو کر کے دیکھیں۔“ رل نے اصرار کیا۔

میں نے وانگ لی کو کال کی اور کہا۔ ”میرے پاس ایک چیز آئی ہے اسے دکھانا چاہتا ہوں۔“

”ہوٹل آجاؤ مگر اسے چھپا کر لانا۔“

”چھپا کر کیسے؟ ہوٹل میں آنے پر ہر چیز کی تلاشی لی جاتی ہے۔“

”ہوٹل والوں کا مسئلہ نہیں ہے عام لوگوں کی نظر میں نہ آئے۔“

میں نے ایک چھوٹا شیشے کا بکس لیا اور ہن کھن کو اس میں رکھ کر اسے ایک چھوٹے سے ہینڈ کیری میں رکھ دیا۔ اسے لے کر میں ہوٹل پہنچا اور سیکیورٹی والوں نے بیگ کو چیک کیا مگر چھپکلی کو دیکھ کر کچھ کہا نہیں۔ یہ ان کے لیے روزمرہ کا معمول تھا اور انہیں ہدایت تھی کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کریں۔ میں نے ریسپشن پر وانگ لی سے ملاقات کا کہا تو حسب معمول مجھے ایک میٹنگ روم کی طرف بھیج دیا گیا۔ وہاں پہلے کی طرح آلات سے میری تلاشی لی گئی اور جب میں اندر جانے لگا تو گارڈ نے روک دیا۔ ”ایک منٹ سر ابھی اندر میٹنگ جاری ہے آپ اس میٹنگ کے بعد جا سکتے ہیں۔“

چند منٹ بعد میٹنگ سے جو شخص نکلا اسے دیکھ کر میں بری طرح چونکا تھا۔ اس نے بہت اعلیٰ قسم کے غیر ملکی کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اس کے دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں نہایت قیمتی جواہرات کی جڑی انگوٹھیاں تھیں اور کلائی میں گولڈ پلیٹڈ راڈو گھڑی تھی۔ گارڈ نے اس کے جدید ترین آئی فون کی بیٹری واپس کی اور وہ اسے لے کر جھومتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ مٹھا سائیں تھا اور میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اگرچہ اس کے بکھرے بال اور داڑھی اب سلیقے سے تراشے ہوئے تھے اور صحت بھی پہلے سے اچھی ہوگئی تھی۔ مگر یہ وہی مٹھا سائیں تھا جسے میں پاگلوں کی طرح عرس میں تلاش کر رہا تھا اور وہ نہایت ٹھاٹ سے یہاں موجود تھا۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت زیادہ امیر ہو گیا تھا۔ یہاں اس کی موجودگی بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح امیر ہوا تھا۔ ایک وقت تھا جب اس نے بابا سے علاج کا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر جب اسے بہت زیادہ دولت نظر آئی تو وہ رہ نہ سکا اور رامے شاہ نے دولت سامنے ہوتے ہوئے بھی اسے ٹھکرا دیا تھا۔ دونوں فقیر تھے مگر دونوں میں بہت فرق تھا۔

گارڈ نے مجھے آواز دی تو میں چونکا۔ وہ مجھے اندر جانے کو کہہ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو وانگ لی میرا منتظر تھا۔ آج میز پر خاطر تواضع کی عام چیزوں کے ساتھ ام الخبائث کی بوتل بھی موجود تھی۔ میں نے بیگ اس کے سامنے رکھا اور کھول کر شیشے کا بکس باہر نکالا۔ اس نے چھپکلی دیکھتے ہی نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ نہیں چلے گی یہ شاید ڈیڑھ سو

گرام کی ہے۔"

"ہاں لیکن مجھے یہی ملی ہے۔ تم اس کے ایک کروڑ مت دو بس مجھے اتنی رقم دے دو کہ میں اپنے بچے کا علاج کرالوں۔ اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

وانگ لی میری بات سنتے ہوئے چھپکلی دیکھ رہا تھا مگر اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ "مجھے افسوس ہے مسٹر سومرو، لیکن میں دو سو گرام سے کم وزن کی چھپکلی نہیں لے سکتا۔ میں کیا کوئی بھی نہیں لے گا ورنہ میں تمہیں کسی دوسرے کے پاس بھیج دیتا۔ دراصل یہ اپنے اصل ماحول میں ہی بڑھتی ہے اگر اسے وہاں سے نکال دیا جائے تو پھر اس کی گروتھ نہیں ہوتی ہے۔"

اب پتا چلا کہ اس کا وزن کیوں نہیں بڑھ رہا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر بکس واپس بیگ میں رکھا۔ وانگ لی مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھ سے معذرت کی۔ "مجھے سچ سچ افسوس ہے مسٹر سومرو کاش کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا۔"

"کوئی بات نہیں مسٹر لی، ہم مسلمان مقدر پر یقین رکھتے ہیں مجھے آپ کے خلوص پر شبہ نہیں ہے بات میرے اور میرے بچے کے مقدر کی ہے۔"

میں گھر آیا تو مایوس تھا اور رمل میری صورت دیکھ کر سمجھ گئی تھی۔ وہ رونے لگی۔ میں بھی رو رہا تھا۔ آنے والے ایک ہفتے کے دوران میں نے کوشش کی اور چند دوسرے خریدار میرے علم میں آئے تھے ان سے رابطہ کیا مگر انہوں نے چھپکلی کا وزن سن کر ہی ملنے سے بھی انکار کر دیا۔ ہفتے کا دن آیا تو میں رمل اور شازیب کو لے کر اماں بابا کے گھر آیا۔ اتوار والے دن میں تیار ہو رہا تھا تو رمل نے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"اسے اس کے گھر چھوڑنے۔" میں نے چھپکلی کی طرف اشارہ کیا۔ "جب ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو اسے بیکار میں قید رکھنے کا فائدہ؟"

بابا اور دوسروں نے مخالفت کی لیکن جب میں نے بتایا کہ یہ اپنے ماحول سے نکل کر نہیں بڑھتی ہے تو وہ بھی مان گئے۔ میں ہن کھن کو لے کر روانہ ہوا۔ دوپہر تک میں اس مقام پر پہنچا جہاں ہم نے اسے پایا اور پکڑا تھا۔ میں نے ان چٹانوں کے پاس شیشے کا بکس رکھا اور اس کا ڈھکن کھول دیا۔ چھپکلی تیزی سے باہر نکلی اور بھاگتی ہوئی چٹانوں پر چڑھ گئی۔ غائب ہونے سے پہلے اس نے ایک بار مڑ کر مجھے دیکھا اور مجھے لگا کہ آزادی دینے پر وہ میری شکر گزار ہو۔ میں واپس روانہ ہوا اور رات تک گھر پہنچ گیا تھا۔ اگلے دن وہیں سے میں دفتر چلا گیا۔ رمل اور شازیب کو ریاض چھوڑ آتا۔ میں دفتر میں کام کر رہا تھا کہ میرے موبائل پر ایک کال آئی۔ میں نے دیکھا تو نمبر باہر کا تھا میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے کسی نے عورت نے انگریزی میں کہا۔

"مسٹر ایاز احمد سومرو؟"

"بات کر رہا ہوں؟"

"این شی کوئن فرام سنگاپور میں...... اسپتال میں کارڈیالوجی میں پی آر ہوں۔ کسی نامعلوم شخص نے اسپتال کو آپ کا نمبر اور ایک لاکھ امریکی ڈالرز کی رقم بھیجی ہے۔ آپ کے بیٹے شازیب احمد سومرو کے دل میں پرابلم ہے۔"

"ہاں۔" میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"آپ جتنی جلدی ہو سکے شازیب احمد سومرو کی تمام رپورٹس اسکین کر کے ای میل کر دیں۔ تاکہ آپ کو علاج کا وقت دیا جا سکے۔ یہاں آپ کی رہائش اور آنے جانے کے تمام اخراجات بھی اسپتال کے ذمے ہیں۔ ای میل نوٹ کر لیں پلیز۔"

میں نے خواب کی سی کیفیت میں ای میل نوٹ کیا۔ این شی کوئن نے اپنا اور اسپتال کے نمبر بھی دیے پھر مجھ سے میرے مزید کونٹیکٹ نمبر اور ای میل لیا۔ میں نے اگلے ہی دن شازیب کی تمام رپورٹس ای میل کر دیں۔ پاسپورٹ ہم پہلے ہی بنوا چکے تھے اور چار دن بعد ہمارے پاسپورٹ ویزے کے لیے جا چکے تھے۔ مزید ایک ہفتے بعد ہم سنگاپور میں تھے۔ وہاں ایک مہینے قیام کے دوران میں شازیب کا کامیاب آپریشن ہوا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ مگر ڈاکٹروں نے بتایا کہ بارہ سال کی عمر میں اس کا ایک چھوٹا آپریشن اور ہوگا اس کے بعد وہ مکمل صحت یاب ہو جائے گا۔ کوشش کے باوجود ہمیں اپنے اس محسن کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ جب مجھے سنگاپور کے اسپتال سے کال آئی تو مجھے سب سے پہلے وانگ لی کا خیال آیا تھا اور میں نے اسے کال کی مگر اس کا نمبر بند تھا اور ہوٹل سے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ وہ تین دن پہلے جا چکا تھا۔ اسپتال والوں نے اس سلسلے میں معذرت کر لی تھی کہ وہ عطیہ دینے والے کا نام نہیں بتا سکتے۔ مگر مجھے اور رمل کو یقین ہے کہ وہ وانگ لی ہی ہے۔ اللہ نے شاید اس کے دل میں رحم ڈالا کہ میں نے اس کی ایک مخلوق کا خیال کیا تھا۔

فاصلوں کا کرب

محترم معراج رسول
سلام مسنون

یہ میری نہیں میری سب سے عزیز دوست کی آپ بیتی ہے۔ اس آپ بیتی میں جو سبق ہے اسے ہر ایک کو ذہن نشین کرلینا چاہیے۔ ماں باپ کی آئے دن ہونے والی لڑائیاں بچوں پر کیا اثر کرتی ہیں اس کا آپ کو بخوبی اس روداد سے ادراک ہو جائے گا۔ اُمید ہے قارئین بھی پسند کریں گے۔

زویا اعجاز
(لاہور)

چٹاخ کی ایک زوردار آواز کے ساتھ مغلظات کی گھن گرج کوئی نیا واقعہ تو نہیں تھا مگر گیلری کے انتہائی کونے میں دبکا میرا وجود آج بھی روزِ اوّل کی طرح لرز اٹھا تھا اور میں جانتی تھی کہ چند ثانیوں بعد امی جی کسی مجرم کی طرح سر نیہوڑائے، ٹوٹے کانچ سمیٹے کمرے سے باہر آئیں گی اور اپنے سرخ طمانچوں زدہ چہرے کے ساتھ آنسوؤں پر بند باندھتی کچن میں چلی جائیں گی۔ جہاں وہ سنک کھول کر جی بھر کر نیر بہائیں گی۔ اور متورم آنکھوں کے

ساتھ اپنی کسی مشین کی مانند اپنی روٹین میں مصروف ہو جائیں گی۔

اس طرح کے واقعات میرے گھر کے روز مرہ کے معمول کی طرح تھے لڑکپن، بچپن سے شعور کی سطح سنبھالتے میں ان جیسے ان گنت طمانچوں کی عینی شاہد تھی۔ آٹھ سال کی عمر تک پہنچتے تک میں نے آگاہی کی کئی منازل طے کر لی تھیں۔ والد صاحب ایک پیچیدہ نفسیات کے حامل انسان تھے جن کے لیے اہلِ خانہ سے مسکرا کر شیریں لہجے میں بات کرنا شاید کوئی گناہ تھا۔ اہلِ خانہ بھی فقط تین افراد تھے والدہ، میں اور میرا چھوٹا بھائی حماد۔ والدین میں روزِ اول سے ناچاقی ایک اٹوٹ زنجیر کی طرح قائم تھی۔ دونوں فریقین انتہائی مزاج کے حامل انسان تھے۔ سمجھوتا اور نرمی کسی کے بھی مزاج کا خاصہ نہ تھی۔ والد صاحب بچپن میں چچا زاد سے منسوب ہوئے مگر بلوغت کی عمر میں پہنچے تو نئے ریال اور درہموں میں کھیلتے چچا نے کمتر معاشی حیثیت کو جرم گردانتے ہوئے ان کی منگنی توڑ کر دوسرے تایا زاد سے کر دی جس کو حال ہی میں عربی شیخ کے محل میں نوکری ملی تھی۔

اس واقعے نے ان کی نفسیات کو کافی حد تک توڑ پھوڑ دیا۔ اور وہ اس کا بدلہ لاشعوری طور پر بیوی اور بعد میں بچوں سے لینے لگے۔ رہی سہی کسر بیوہ دادی نے پوری کر دی جو ہمہ وقت ان کے کانوں میں زہر انڈیلتی رہتیں کہ بیٹا کہیں ان کے ہاتھ سے نکل کر بیوی کا نہ ہو جائے۔ انہوں نے خود کو پیسا کمانے کی مشین بنا لیا سولہ سے اٹھارہ گھنٹے انتھک محنت کے بعد کمایا جانے والا پیسا بہت احسان جتلاتے ہوئے ہم لوگوں کو کسی فقیر کی طرح دیا جاتا تھا۔ والدہ ان سے بھی زیادہ انا پرست تھیں انہوں ان سب حالات میں ایک جامد خاموشی تان لینے میں اپنی عافیت سمجھی مگر یہ خاموشی ان کے رشتے کو مزید گنجلک بناتی گئی۔ والد صاحب ان کی طرف سے التفات اور گرمجوشی کے متقاضی تھے مگر والدہ کی سرد مہری اور خاموشی ان کو مزید غصیلا بناتی تھی۔ اور تختہ مشق ہم لوگ بنتے تھے۔ والد صاحب کے کام پر چلے جانے کے بعد امی سارا دن اپنی تذلیل پر کوفت اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے برتنوں کی بلا وجہ اٹھا پٹخ کا مشغلہ جاری رکھتیں۔ یہ صورتِ حال مزید بدتر تب ہوتی جب ہمارے ددھیالی یا ننھیالی رشتہ داروں میں سے کوئی گھر آتا۔ اول الذکر کو ابو مظلومیت کا پیکر لگتے جنہیں بدقسمتی کی معراج کی بدولت ایسی نافرمان بیوی ملی تھی اور موخر الذکر کو امی سے بے پناہ ہمدردی کا بخار چڑھ جاتا تھا۔ جن کو ایسا جابر شوہر ملا تھا اور اولاد بھی آخر انہی کی تھی تو سنپولیے ہی نکلتی۔

زندگی اسی جبرِ مسلسل میں اپنی آب و تاب برقرار رکھے ہوئے تھی۔ میں اس ماحول کی وجہ سے بے حد ڈرپوک بن چکی تھی۔

وقت کے تھال میں لمحوں کا رقص جاری رہا اور اسی کشمکش میں چند مزید سال گزر گئے میری عمر اب بارہ سال ہو چکی تھی صحت اور جسمانی اعتبار سے میں اپنی عمر سے قدرے بڑی نظر آتی تھی۔ یہ دور میری زندگی میں مزید بھیانک واردات لے کر آیا۔ ابو نے ان دنوں ایک نیا وطیرہ اپنا لیا تھا۔ باہر کی سرگرمیاں مزید زیادہ کر دی تھیں۔ گھر آتے تو کوئی نہ کوئی دوست ساتھ ہوتا۔ یہ وہ خوشامدی دوست تھے جو اپنی چرب زبانی سے ان سے فائدہ اٹھانا فرض عین سمجھتے تھے۔ اور ابو ٹھہرے سدا کے خوشامد پسند وہ بخوشی ان گدھوں کو خود کو نوچنے دیتے۔ امی نے اپنی سرد مہری میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ حماد اکثر گھر سے باہر پایا جاتا۔ مگر میں ٹھہری لڑکی۔ میرے لیے اس جہنم نما گھر کے سوا کہیں اور جانا ممکن نہ تھا۔ اس جہنم کی لپٹوں اور تپش میں اب مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ امی نے ابو کے سامنے جانا بہت کم کر دیا تھا۔ ان کے دوستوں کی خاطر لوازمات تو تیار کر دیتی تھیں مگر وہ لوازمات میرے توسط بھیجے جاتے تھے۔ شروع شروع میں تو یہ سرگرمی مجھے کافی بے ضرر اور فائدہ مند لگی کہ شاید اس سے ابو کی توجہ ملنی شروع ہو جائے۔ مگر مجھے قطعی علم نہ تھا کہ میرے لیے ایک نئی عفریت منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ ابو کے دوستوں کی نظریں مجھے بے حد الجھن میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ مگر اس الجھن کا کوئی سرا اب میرے ہاتھ نہ آتا تھا۔ چائے کی ٹرے یا کوئی پلیٹ لینے کے بہانے جان بوجھ کر میرے جسم سے ہاتھ مس کیے جاتے جو میرے دل میں ایک کراہیت اور نفرت کا احساس پیدا کرتے تھے۔ کبھی میرے گالوں پر ہاتھ پھیر کر بظاہر چٹکی بھری جاتی اور کہا جاتا۔ ”واہ گڑیا! آپ تو بہت معصوم ہو بالکل پری لگتی ہو۔ کبھی ہماری طرف آؤ ناں۔ ہماری بیٹی بھی آپ ہی کی ہم عمر ہے آپ کی خوب دوستی ہو جائے گی اس سے۔“

مجھے یوں لگتا کہ میرے گال پر کوئی سانپ یا بچھو رینگ رہے ہوں۔ پہلے پہل تو میں خاموشی سے نظر انداز کرتی رہی مگر ایک دن صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے انکل کا کھردرا ہاتھ زور سے جھٹکا اور ٹرے وہیں پٹخ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی قبر میں زندہ جا کر لیٹ جاؤں یا سمندر اوڑھ لوں۔ اس چیخ چیخ والے ماحول اور ایسی اذیت سے چھٹکارا مل جائے گا۔

مذکورہ انکل سے یہ جسارت مجھے بہت مہنگی پڑی ان کے جانے کے بعد ابو کسی طوفان کی طرح باہر آئے اور امی کو پکارنے لگے۔ ”فردوس! ذلیل عورت! کہاں مری ہوئی ہو تم؟“

امی یہ سن کر تیوریاں چڑھائے باہر آئیں اور ازلی پتھر مار انداز میں بولیں۔ ”ہاں جی! کیا ہے؟ چلا گیا آپ کا ٹولہ جو آپ یوں آسمان سر پر اٹھا رہے ہیں۔“

ابو بولے۔ ”آسمان کی بچی!! منحوس عورت! تو کسی عذاب کی طرح میرے گلے پڑ چکی ہے۔ ساری زندگی تیری گندی شکل اور وجود برداشت کرتا آیا ہوں، اب اولاد بھی اسی راہ پر چل پڑی ہے۔ لعنت ہے ایسی اولاد پر! جس کو کسی سے برتاؤ کی تمیز نہیں۔ ایک بیٹا ہے جسے سڑکیں ناپنے سے فرصت نہیں اور یہ لعنتی بیٹی جو مردم بیزار ہے۔ تیری ہی طرح اولاد بھی گندی ہے تیری۔“

امی نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے کھولتے لہجے میں کہا ”نہ وحید صاحب! میں کیا یہ اولاد اپنے پیچھے سے لائی تھی؟ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ ہی کا خون اور نسل ہے تو آپ ہی کا عکس ہو گی ناں۔“

ابو نے یہ سن کر انہیں لاتوں اور گھونسوں کی زد پر رکھ لیا۔ خرابی قسمت اسی لمحے کھڑکی کے پیچھے سے جھانکتے میرے وجود پر نظر پڑی تو میں بھی اس تبرک میں حصہ دار بن گئی جو بعد میں میرے نیلو نیل وجود پر ختم ہوا۔

اس کے بعد میرا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا۔ کھانے پینے کے لوازمات سرو کرنا میری ان چاہی ڈیوٹی بن چکی تھی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جا رہی تھی میری خوبصورتی اور جسمانی کشش میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور مجھ پر پڑنے والی نظریں مزید آلودہ ہوتی جا رہی تھیں۔ میری عمر کا پندرھواں سال شروع ہو چکا تھا۔ میرے لیے صرف وہی وقت سکون آمیز ہوتا تھا جب میں اسکول میں ہوتی تھی۔ پڑھائی میں بہترین طالبہ شمار ہوتی تھی لہٰذا اسکول میں ملنے والی ستائش مجھے گھنٹوں سرشار رکھتی تھی۔ اسکول سے واپسی کا سفر میرے لیے کسی پھانسی گھاٹ کی... طرف جانے والے مجرم کی طرح ہوتا تھا۔

گھر میں آنے والے انکلو کی جسارت اب حد سے بڑھتی جا رہی تھی۔ امی کچن کا کام میرے ذمے لگا کر کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ ایک دن واش روم جانے کے بہانے ابو کے گدھ نما دوست رفیق انکل ڈرائنگ روم سے باہر آئے۔ میں حسبِ معمول کچن میں امی کی جاری کردہ ہدایات کے مطابق چائے کی ٹرالی سیٹ کرنے میں مصروف تھی۔ جب مجھے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ رینگنے کا کراہت آمیز احساس ہوا تو میں کرنٹ کھا کر پیچھے پلٹی رفیق انکل آنکھوں میں خباثت لیے اپنے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولے۔ ”آج تو تم نظر ہی نہیں آئی۔ ہمیں ہی باہر آنا پڑا۔“

میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آ...... آ...... آپ یہاں...... کک...... کیوں آئے ہیں...... میں ابو کو آواز دیتی ہوں۔“

ان کے ہاتھوں کی حرکات بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ میں خوف سے چیخنا چاہتی تھی مگر انھوں نے میرا ارادہ بھانپ لیا اور سختی سے میرے ہونٹوں پر ہاتھ جما کر کسی درندے کی طرح غرا کر بولے۔ ”خبردار! جو آواز نکالی تو۔ جو کہتا ہوں چپ چاپ نہ مانا تو تمہارے باپ کو تمہارے معاشقوں کی جھوٹی خبر پہنچا دوں گا اور یقین تو اسے مجھ پر ہی آئے گا۔“

میں کسی بے بس چڑیا کی طرح ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ جب اچانک باہر ڈور بیل کی آواز میرے لیے نجات کی نوید بن کر آئی۔ رفیق انکل اسی وقت باہر لپکے مگر جاتے جاتے مزید وارننگ دینا نہ بھولے۔ ”لڑکی! یہ ذکر کسی سے بھی کیا تو انجام کی ذمہ دار خود ہو گی۔“ وہ رات میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ خوف کے مارے بخار نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں نے حوصلہ مجتمع کر کے امی کو بتانے کی کوشش کی مگر الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے۔ کسی لمحہ بھی سکون نہ مل رہا تھا۔ بالآخر تھوڑی ہمت پیدا کر کے امی کو پکارا۔

”امی جان! آپ سے کچھ کہنا تھا“ امی بے پروائی سے بولیں

”آدھی رات کو تم کونسے الف لیلوی قصے چھیڑنے بیٹھ گئی ہو لائبہ؟ سو جاؤ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر۔ میری تو قسمت میں سکون ہی نہیں نہ اولاد کی طرف سے اور نہ شوہر کی طرف سے۔ نصیب ہی پھوٹ گئے تھے جو اس آدمی کے پلے بندھ گئی تھی۔ ہونہہ! جاؤ سو جاؤ اور مجھے بھی

سونے دو۔“ یہ کہہ کر امی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور میں ڈار سے بچھڑی کسی کونج کی طرح وہیں کھڑی رہی۔ اگلے دن شدید بخار کے باوجود میں اسکول چلی گئی مگر وہاں بھی چین نہ مل رہا تھا۔ میں ٹیچر سے کہہ کر کلاس کے پچھلے بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اچانک مجھے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہماری کلاس میں آنے والی ایک نئی لڑکی یمی کھڑی تھی۔ یہ کافی پُر اعتماد، ہرفن مولا ٹائپ لڑکی تھی جو ہر کسی سے آسانی سے گھل مل جایا کرتی تھی۔ اس کے بے فکرے انداز و اطوار، خود اعتمادی اور وسیع حلقہ احباب دیکھ کر میں اکثر رشک و حسد کے ملے جلے جذبات میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ کیونکہ میرا حلقہ احباب سرے سے ناپید تھا میں کسی سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کوئی میرے اندر کا... خوف اور خلا نہ دیکھ لے۔ میں اپنے خیالات سے تب چونکی جب یمی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ”ہیلو! اداس پنچھی! کیا ہوا...... ایسے کیوں دیکھ رہی ہو جیسے میرے سینگ نکل آئے ہوں۔ کم آن یار اتنی ذہین اور پریٹی ہو تم۔ میرے پاس اتنے گٹس ہوتے تو فاتح عالم ہوتی میں۔“ پھر میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی ”فرینڈز“۔

میں نے جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر وہ مجھے لیے اپنے گروپ کی طرف چل دی۔ ان کے شوخ فقرات، بے فکرے انداز اور ہنسی کی پھلجڑیوں نے کچھ لمحوں کے لیے مجھے اپنی فکروں سے آزاد کر دیا۔

دن اسی طرح گزرتے گئے۔ یمی سے میری قربت بڑھتی گئی۔ گھر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مگر اب مجھے یمی کی صورت میں ایک روزن مل چکا تھا۔ میرا دل گھبراتا تو امی کی صلواتوں اور ابو کے خوف کے باوجود یمی کی طرف چلی جاتی۔ اور وہاں کے خوش باش ماحول میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔ اسی دوران میٹرک مکمل کرنے کے بعد میں یمی کے ساتھ کالج جوائن کر چکی تھی...... جو بھی تھا ابو نے محبت اور شفقت کے سوا تمام بنیادی ضروریات دی تھیں۔

کالج کی دنیا یوں تھی جیسے کسی کنویں سے نکل کر دریا میں سمانا...... مگر میرا احسن یہاں بھی میری بدقسمتی بن کر میرے ساتھ رہا تھا۔ میں ہمہ وقت ذہنی دباؤ اور خوف کا شکار رہتی تھی۔ گھر میں نت نئے انکلز کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ میں مزید عدم تحفظ کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی تھی میرے والدین شاید بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ انہیں نظر کیوں نہیں آتا کہ ان کے ناک کے نیچے کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

تبھی ایک دن ایسا طلوع ہوا جس نے ہماری زندگیاں بدل کے رکھ دیں۔ لیل و نہار تو قدرت کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حادثہ، کوئی واقعہ کسی خاص دن کو ناقابلِ فراموش بنا دیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ جب ایک ہمسائی کے توسط پتا چلا کہ ابو کو متواتر ایک عورت کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا جا رہا ہے۔ اور غالب امکان یہی ہے کہ انہوں نے خفیہ نکاح کر لیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ امی کا پارا ساتویں آسمان تک جا پہنچا۔ کسی گھائل شیرنی کی طرح گھر میں تلملاتی پھر رہی تھیں ان کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔ ”بس یہی کسر رہ گئی تھی! اب جب اولاد کو اگلے گھر بھیجنے کا وقت قریب آیا ہے تو یہ انسان اپنی سیج سجا کے بیٹھ گیا ہے۔ یہی دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ ہائے میرے اللہ!! اور کیا کیا برداشت کرنا رہ گیا ہے اس گھر میں؟“ ابو کے آنے کی دیر تھی کہ گھر پانی پت کا میدان بن گیا توپوں کے دہانے کھل چکے تھے۔ ابو کا کہنا تھا۔ ”منحوس عورت! میری زندگی جہنم بنا رکھی تھی تو نے کبھی دو گھڑی پیار سے بات کی تو نے“

امی بھی دوبدو جواب دے رہی تھیں۔ ”تم نے کونسا مجھے پھولوں کی سیج پر بٹھا رکھا تھا۔ ساری زندگی تمہاری زبان سے انگارے ہی برسے ہیں پھر مجھ سے محبت کی اُمید کیوں۔“

تب اچانک حماد کے منہ سے نکلا ”ابو جی! آپ نے جو بویا ساری زندگی وہی کاٹتے رہے یہ سب آپ کے عمل ہی کا ردِ عمل ہے“۔

ابو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ حماد سمیت ہم سب کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ ڈالا۔ اور کہنے لگے ”تم سب اپنا منحوس اور گندا وجود لے کر نکل جاؤ۔ میں ایک پل بھی تم لوگوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ طلاق نامہ بھی مل جائے گا تمہیں جلد ہی۔“

اس سرد اندھیری رات میں ہم تینوں اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس ماموں کے گھر پہنچے جنہیں ہمہ وقت امی کے لیے تپ ہمدردی رہتا تھا۔ لیکن وہاں موجود لوگوں کے ہماری ناگہانی ذمہ داری کے احساس سے

رنگ فق ہو گئے۔ ہم وہاں پندرہ دن رہے اور انسانی رشتوں کی قلعی خوب کھلتے دیکھی۔ وہی رشتہ دار جو امی کو ابو کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے اب انہی کے نزدیک امی کا یہ اقدام غلط تھا۔ ممانیوں اور خالاؤں کا کہنا تھا۔ ”ارے مرد کیا کیا نہیں کرتے باہر۔ عورت کا کام ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔ معاف کرنا فردوس! تم نے انتہائی عاقبت نا اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔ ارے نکاح ہی کیا تھا دوسرا۔ کوئی طلاق تھوڑی دی تھی تمہیں جو تم نے یوں واویلا مچا دیا تھا اب اس پرائی اولاد کی ذمہ داریاں کون نبھاتا پھرے۔“

امی میں اب وہ دم خم باقی نہ رہا تھا مگر میں اور حماد قطعی واپس جانے کو تیار نہ تھے۔ ہماری کوشش تھی کہ چھوٹی موٹی نوکری کر کے ایک کمرے کا ہی سہی الگ گھر لے لیں۔ مگر ایک دن بغیر بتائے ماموں نے جا کر ابو سے معافی تلافی کی اور ہمیں واپس بلوانے پر رضامند کر لیا۔ اپنی دوسری منکوحہ کو ابو نے الگ گھر لے کر سیٹل کر دیا تھا۔ حماد اس صورتِ حال سے دلبرداشتہ ہاسٹل میں رہائش پذیر ہو گیا اور امی کو کہہ گیا ”اس جہنم میں رہنا آپ کی چوائس تھی سو آپ ہی کو مبارک ہو۔“

کالج جانا دوبارہ شروع کیا تو میری سوچ ایک نئی سمت لے چکی تھی۔ مجھے لاشعوری طور پر تحفظ درکار تھا میرا وجود کسی صحرا کی طرح بن چکا تھا جسے چاہت اور تحفظ کے چند چھینٹے بھی سیراب کر دیتے۔ یمی کا ساتھ بدستور برقرار تھا۔ وہ میرے حالات سے کسی حد تک واقف ہو چکی تھی۔ اور مسلسل میری برین واشنگ کرتی رہتی تھی۔ جس کے طفیل میں انتہائی خودسر بدمزاج اور بے حس ہو گئی تھی۔ گھر میں ہونے والے ہر دنگل پر میں کندھے اچکا کر اپنے کمرے میں جانے کو ترجیح دیتی تھی۔ اس دوران رفیق انکل کی ایک جسارت پر ان پر گرم چائے گرا کر اپنے خطرناک عزائم آشکار کر چکی تھی۔ حماد اپنے دوستوں کی مدد سے ملائیشیا جا کر جاب کرنے لگا تھا۔ اور میں شاخ سے ٹوٹے کسی پتے کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ میری اس خزاں رسیدہ زندگی میں بہار کا جھونکا تب آیا جب ایک دن یمی کے گھر میں اس کے ساتھ کالج سے واپسی پر گئی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر واش روم میں گئی تھی کہ اس کا سیل فون متواتر گنگنانے لگا۔ یمی اندر سے چلّا کر بولی

”لائبہ! کس مراقبے میں گم ہے؟ یار! ریسیو کر لے کال۔“

میں نے سکرین پر نظر دوڑائی ”علی بھائی کالنگ“ کے الفاظ جگمگا رہے تھے یہ یمی کے کزن پلس منگیتر کا دوست تھا جو یمی سے کافی بے تکلف تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کال ریسیو کی تو ایک خوبصورت گھمبیر مردانہ آواز نے انتہائی شائستگی سے یمی کے بارے دریافت کیا۔ میں اسے دس منٹ بعد کال بیک کرنے کا کہہ کر کال ڈراپ کرنے ہی لگی تھی جب اس نے اچانک کہا۔ ”ایکسکیوز می مس! کیا میں جان سکتا ہوں کہ میں کس سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں؟“

اس کی آواز، لہجہ، شائستگی میرے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا میرا دل ایک میٹھی سی لے پر دھڑکنے لگا۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال دستک دے رہا تھا۔ ”کیا کوئی مرد اتنا شائستہ بھی ہو سکتا ہے کہ بات کرے تو اس کے لہجے سے شہد ٹپکے۔“

چند دن بعد یمی مجھے کالج کے فری پیریڈ میں گراؤنڈ میں لے گئی اور بڑے مدھم اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”دیکھ لائبہ!! میں کئی سالوں سے تجھے جانتی ہوں تیرا کردار، شخصیت میرے سامنے آئینے کی طرح ہیں۔ میں کبھی تیرا برا نہیں سوچ سکتی۔“

میں اس کی تمہید سے اکتا کر بولی۔ ”ڈائریکٹ بات کرو جو بھی ہے پہیلیاں مت بجھاؤ۔“

اس نے مجھے علی کے بارے میں کھل کر بتایا کہ وہ مجھ سے بات کرنے کا خواہاں ہیں۔ میں بھی اس دن سے غیر اختیاری طور پر اسی کے بارے سوچ رہی تھی۔ یمی نے بہت سمجھایا کہ تمہارے گھر کے جو حالات ہیں تمہیں اپنی زندگی کی راہیں خود متعین کرنی چاہئیں۔ میں نے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد ہامی بھر لی۔ یمی نے اسے میرا سیل نمبر دے دیا اور یوں لامتناہی کالز اور میسجز کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ علی کے الفاظ، چاہت، برتاؤ، کیئر اور سب سے بڑھ کر عزت و احترام نے میرے وجود کے کیکٹس پر کئی گلاب کھلا دیے تھے، میں جو عرصے سے محبت کی متلاشی تھی اس کی چاہت کی بارش میں پور پور بھیگتی جا رہی تھی۔ اپنے کمرے میں بند گھنٹوں رات گئے اس سے بات کرتی رہتی تھی۔ گھر والوں کی پروا پہلے ہی نہیں تھی اس راہ عشق کی مسافت کے بعد ہر لحاظ اور مروت ختم ہوتا جا رہا تھا۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے ہم کئی دفعہ باہر مل

چکے تھے تنہائی میں بھی دو ملاقاتیں ہوئیں مگر ہمارے مابین فاصلہ برقرار رہا تھا۔ جس نے مجھے مزید اس کا اسیر کر دیا تھا۔ لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟ ابو کو ان کے کسی سسرالی رشتے دار نے میرے اور علی کے تعلق کے بارے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ حسبِ معمول آپے سے باہر ہو گئے۔ اور گھر آتے کے ساتھ ہی ایک عدالت لگالی۔ آغاز امی پر فردِ جرم سے ہوا۔ ان کے خیال میں مجھے بگاڑنے میں ماں کی ہٹ دھرمی کا ہاتھ تھا۔ مگر آج کچھ مختلف تھا۔ آج میرے اندر ایک لاوا تھا جو پھٹ کر بہنے کے لیے بیتاب تھا اور ہوا بھی یہی مجھ پر سوالات اور الزامات کی بوچھاڑ جیسے ہی ہوئی میں نے اس آتش فشاں کا دہانہ کھول دیا اور ابو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی بے خوف لہجے میں بولی۔ ”آپ مجھ سے سوال کرنے اور جواب دہی کا قطعی اختیار نہیں رکھتے۔ آج آپ کی غیرت جاگ گئی ہے تب یہ غیرت کہاں سوئی ہوئی تھی جب آپ کے بدکردار دوست پُرہوس نگاہوں سے مجھے دیکھتے اور چھوتے تھے۔“

ابو ششدر رہ گئے اور امی سے بولے۔ ”دیکھا! یہ ہے تمہاری تربیت۔“

میں زہر خند لہجے میں بولی۔ ”تربیت؟ کون سی تربیت؟ آپ نے ہمیں ڈر خوف اور تکلیفیں تو بہت دی ہیں تربیت بالکل نہیں دی۔“

کمرے میں موت کا سناٹا طاری تھا امی ابو کے فق چہرے مجھے عجیب سا سکون دے رہے تھے۔ ابو کا دم خم کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بولے۔ ”تم اس بھول میں مت رہنا کہ میں تمہیں اپنی مرضی کرنے دوں گا۔“

میں دوبدو بولی۔ ”آپ بھی اس بھول میں مت رہیے گا کہ میں آپ کی مرضی پر عمل کروں گی۔ قانونی طور پر بالغ ہوں مجھے اپنی مرضی پوری کرنے سے اس ملک کا صدر بھی نہیں روک سکتا آپ تو کسی شمار میں نہیں۔“

وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے لگے تو جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ ان کا ہاتھ تھام کر میں نے بلند اور چٹانی لہجے میں کہا۔ ”خبردار! مجھے ہاتھ لگایا تو میں یہ نام نہاد باپ بیٹی کا رشتہ بھول جاؤں گی قانون اور میڈیا تک پہنچ کر آپ کو کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑوں گی۔“

ابو ایک دم سے ڈھے گئے۔ امی آگے بڑھ کر انہیں اٹھانے لگیں تو ان کا ہاتھ جھٹک کر بولے۔ ”میں تم دونوں کو گھر سے نکال دوں گا چھوڑ دوں گا تمہیں۔“

میرے ذہن پر بے حسی کی برف جمی ہوئی تھی میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ کام تو آپ کو بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا“ اب امی کی برداشت بھی جواب دے گئی اور وہ بھی مجھے کوسنے لگیں۔ آہیں، منتیں، دھمکیاں سب بیکار ثابت ہوئیں اور مجھے علی کے سنگ انتہائی خاموشی سے رخصت کر دیا گیا مگر میکے کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے تھے امی کو حماد نے اپنے پاس بلوالیا۔ رہے ابو تو وہ پہلے بھی کونسا اکیلے تھے؟

شادی کے اوّلین مہینے تو محبت پا لینے کی سرشاری اور خماری میں گزر گئے۔ جب پریکٹیکل لائف کا آغاز ہوا تو اپنے اندر ایک عجیب سا خلا محسوس ہونے لگا۔ گو علی بہت اچھے تھے مگر نادانستگی میں میرے ماضی کے بارے کوئی ایسی بات کر جاتے تھے جو نیزے کی انی کی طرح دل میں گڑ جاتی بعد میں جب ان کو احساس ہوتا تو ہر ممکن تلافی کرتے تھے۔

آج میری شادی کو پانچ سال بیت چکے ہیں۔ میرے گلشن میں دو پھولوں کا اضافہ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن وجود کا خلا ابھی بھی ویسے ہی برقرار ہے۔ علی سے رشتہ استوار ہوا تھا تو لگتا تھا میرے اندر کا صحرا سیراب ہو گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ قدرت نے ہر رشتے کو انسان کی کمزوری بنا رکھا ہے۔ رشتے مضبوط ہوں یا کمزور انسان کی تکمیل ہوتے ہیں آج اپنے گھر میں خوش ہونے کے باوجود اپنے والدین اور بھائی کی کمی بیحد محسوس ہوتی ہے۔

اس آپ بیتی کو منظرِ عام پر لانے کا مقصد صرف ان والدین کی آنکھیں کھولنا ہیں جو باہمی چپقلش میں اولاد کو روند ڈالتے ہیں ایسے حالات میں پروردہ بچے معاشرے کا بوجھ ہوتے ہیں جو ہر کسی میں محبت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ جب اندرونِ خانہ تحفظ نہ ملے تو باہر کا راستہ دیکھتے ہیں جوان ہوتی اولاد کی موجودگی میں اپنے دوستوں کو گھر لانا اور آنکھیں بند کر لینا کہاں کی تجربہ کاری ہے؟ بھئی آپ کو خدا نے والدین کا رتبہ دیا ہے تو اس کو نبھانا بھی سیکھیں۔ اگر آپ کے لائف پارٹنر کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے تو اس کا حل ابتدائی دنوں میں ہی تلاش کیجیے رشتوں کو گھسیٹ کر نبھانا اور اولاد پیدا کر کے زمانے کے سرد و گرم پر چھوڑ دینا انسانیت کے منافی ہے۔

◆●◆

بھینٹ

ڈیئر ایڈیٹر
السلام علیکم
دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھتے پڑھتے سوچا کہ اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بھی قارئین سرگزشت کو سنا دوں۔ یہ واقعہ قارئین کو کیسا لگا یہ مجھے خطوط سے ہی پتا لگ پائے گا۔

احسن فاروقی
(کراچی)

اس دن اچانک ہی دفتروں کی چھٹی ہوگئی تھی۔ رات کو ایک سیاسی تنظیم کے تین کارکن ٹارگٹ کلنگ میں ہلاک ہوگئے تھے۔ نتیجے کے طور پر پورا شہر بند کرا دیا گیا تھا۔ سیاسی تنظیم نے سوگ کا اعلان کیا تھا اور تاجر برادری اور ٹرانسپورٹرز نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے چھٹی کرنا پڑی تھی۔ ناشتے کے بعد حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلا تو مجھے ہر طرف ایک سناٹا دکھائی دیا۔ جس معروف سڑک پر دن رات ٹریفک کا اژدھام رہتا

تھا وہاں اس وقت بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

میں مایوس ہو کر واپس آگیا۔ اپنے میں اگر میں آفس چلا بھی جاتا تو فائدہ کوئی نہیں تھا۔ آفس کا دوسرا عملہ تو غیر حاضر رہتا اور میں آفس میں اکیلا بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا۔

میں نے گھر آکر پہلے تو پورا اخبار پڑھا، پھر اشتہارات تک پڑھ ڈالے۔ ٹینڈر نوٹس، ضرورت رشتہ اور اس قسم کے اشتہارات پڑھتے ہوئے میری نظر ایک عامل بنگالی بابا کے اشتہار پر پڑی۔ اس قسم کے تمام اشتہاروں کی زبان تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ بے اولادوں کو اولاد کی گارنٹی، پلک جھپکتے روزگار کی فراہمی اور اشتہار کا حاصل مطالعہ محبوب آپ کے قدموں میں۔

میں نے بدمزہ ہو کر اخبار ایک طرف پھینک دیا۔ اسی قسم کے ایک اشتہار سے میری بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ذہن ماضی میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

میں ان دنوں یونیورسٹی میں بی آنرز کا طالب علم تھا۔ میرے ساتھ عامر بھی تھا۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں کی کلاس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ کروڑ پتی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میرے والد ایک سرکاری محکمے میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہم ناظم آباد کی ایک متوسط درجے کی آبادی میں رہتے تھے۔ گھر میں میرے علاوہ مجھ سے بڑی ایک بہن اور مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ یوں ہمارا خاندان امی ابو سمیت سات افراد پر مشتمل تھا۔

عامر سے دوستی کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ عامر شہر کے ایک اعلیٰ اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس کے برعکس میں ایک سرکاری اسکول کا طالب علم تھا لیکن اس دور میں سرکاری اسکولوں کی حالت ایسی نہیں ہوتی تھی جیسی آج ہے۔ اساتذہ بہت محنت سے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور اکثر اسکولوں میں تو چھٹی کے بعد ایکسٹرا کلاسز بھی ہوا کرتی تھیں۔ وہ بھی بغیر کسی معاوضے کے۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور کے سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچے بھی تعلیمی لحاظ سے کم نہیں ہوتے تھے۔

میرا اسکول عامر کے اسکول سے ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ میں آتے جاتے اس شان دار اسکول کے بچوں کو چمچماتی گاڑیوں سے اترتے دیکھتا تھا۔ ان کے چہروں پر دولت کی فراوانی سے ایک عجیب سا اعتماد بلکہ تکبر رہتا تھا۔ جب کہ ہم لوگ دھوپ میں اسکول سے پیدل ہی گھر جایا کرتے تھے۔

اس دن میں واپسی میں اس شاندار اسکول کے سامنے سے گزرا تو مجھے اسکول کے باہر خوب صورت سا ایک لڑکا نظر آیا جو پریشانی کی حالت میں ٹہل رہا تھا۔

اسکول کی چھٹی ہوئے دیر ہو چکی تھی اس لیے اب وہاں انواع واقسام کی گاڑیوں کا اژدھام بھی نہیں تھا۔

وہ لڑکا میرا ہی ہم عمر تھا۔ اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اچانک وہاں بڑی سی ایک گاڑی آکر رکی۔ اس کے چاروں دروازے ایک ساتھ کھلے اور گاڑی سے پانچ لڑکے باہر نکلے۔ وہ عمر میں ہم سے خاصے بڑے تھے، غالباً نویں یا میٹرک کے لڑکے تھے۔ ان کے جسموں پر بھی اسی اسکول کی یونیفارم تھی۔ وہ پانچوں لڑکے اس لڑکے کی طرف یوں بڑھے جیسے اس سے ملنا چاہتے ہوں لیکن ان کے چہروں کے تاثرات خوش گوار نہیں تھے۔

ان میں سے نسبتاً بڑا لڑکا آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر نہ صرف مونچھیں تھیں بلکہ ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان برائے نام فیشن ایبل داڑھی بھی تھی۔ یوں جیسے شیو کرتے وقت وہ ان بالوں کو صاف کرنا بھول گیا ہو۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ ”تو بڑا چیمپئن ہے عامر مجھے چیلنج کرے گا۔ وقار کو جسے آج تک کسی نے شکست نہیں دی۔“

”دیکھو وقار!“ عامر نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”اس کا فیصلہ تو گراؤنڈ میں ہوگا۔“

”اس کا فیصلہ یہیں ہوگا۔“ وقار نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اور ابھی ہوگا۔ میں تجھے اس قابل ہی نہیں رہنے دوں گا کہ تو آیندہ مجھے چیلنج کی جرأت کر سکے۔“ اس نے آگے بڑھ کر عامر کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے، مجھے چیلنج کر کے تو اسکول کی لڑکیوں میں ہیرو بن جائے گا؟“

”اپنی حد میں رہو وقار!“ عامر بھی بپھر گیا۔ ”اب مجھ پر ہاتھ مت اٹھانا۔“

”ورنہ کیا کرے گا تو؟“ وقار نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا اور اسے دوسرا تھپڑ مارنا چاہا لیکن عامر نے اس کا ہاتھ کلائی کے پاس سے پکڑ لیا اور اس کی ناف پر اتنی زور سے گھٹنا مارا کہ وہ تکلیف کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔

وقار کا حال دیکھ کر اس کے ساتھی اس کی طرف بڑھے لیکن مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ میں اچانک ان کے

سامنے آگیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”ایک لڑکے کو تم پانچ لڑکے مارو گے۔ اپنے اس سورما کو مقابلہ کرنے دو۔“

”تو اپنے کام سے کام رکھ۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے تجھ جیسے گھٹیا لوگوں کو ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے گھونسا مارنا چاہا۔

میں نے ایک طرف جھک کر خود کو بچایا اور اس کے پیٹ میں اتنی زوردار لات رسید کی کہ وہ اچھل کر پیچھے گرا۔ میں لڑنے بھڑنے میں یوں بھی ماہر تھا اور ان لوگوں کی طرح نازک اندام نہیں تھا۔ میں نے انہیں مزید موقع دیے بغیر جھپٹ کر دو لڑکوں کے لمبے لمبے بال مضبوطی سے اپنی مٹھیوں میں جکڑے اور ان دونوں کو آپس میں ٹکرا دیا۔ میری ضرب زیادہ شدید تھی یا پھر وہ لوگ زیادہ نازک تھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اپنے ساتھیوں کا حال دیکھ کر ان کا چوتھا ساتھی وہاں سے بھاگ گیا۔

وقار دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر اب بھی شدید تکلیف کے آثار تھے۔

عامر نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑا اور اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے بولا۔ ”اب دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میری دوسری لات پڑی تو کبھی اٹھنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

”میں تجھے دیکھ لوں گا عامر!“ وقار نے چیخ کر کہا۔ ”ابھی تک تو اس تھرڈ کلاس اسکول کے کرائے کے ٹٹو پر اچھل رہا ہے۔“

عامر ان سب سے قد میں بھی چھوٹا تھا اور عمر میں بھی لیکن تھا بہت جی دار! جہاں تک میرا سوال ہے تو میرا تو یہ روزمرہ کا کام تھا۔ میری کلاس بلکہ دوسری کلاسوں کے لڑکے بھی میرے سامنے چوں نہیں کر سکتے تھے۔

”اب تو جاتا ہے یا......“ میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وقار کو دیکھا۔

وہ سب وہاں سے دم دبا کر بھاگ گئے۔ ان کے جانے کے بعد عامر نے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ دوست! تم نہ آتے تو یہ لوگ نہ جانے میرا کیا حشر کرتے۔“

”شکریے کی کوئی بات نہیں ہے عامر۔“ میں نے کہا۔ ”میں کسی بے گناہ پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں اکثر مجھے نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ عامر نے پوچھا۔

”میرا نام احسن ہے اور میں گورنمنٹ اسکول میں کلاس سیون میں پڑھتا ہوں۔“ پھر میں نے پوچھا۔ ”تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے تھے؟“

”یار، آج نہ جانے کیوں میرا ڈرائیور نہیں آیا۔ میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔“ عامر نے کہا۔ (اس دور میں سیل فون نہیں ہوتے تھے)۔

اس وقت عامر کی چمچماتی ہوئی گاڑی وہاں آگئی۔ عامر ڈرائیور پر برس پڑا۔ ”تم کہاں رہ گئے تھے۔ میں ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم......“

”چھوٹے صاحب...... وہ دراصل...... بیگم صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ صاحب بھی اس وقت گھر میں نہیں تھے۔ میں انہیں لے کر اسپتال گیا تھا۔ وہاں سے سیدھا یہاں آیا ہوں۔“

”کیا ہوا مما کو؟“ عامر گھبرا کر بولا۔ ”اب وہ کہاں ہیں؟“

”ان کی طبیعت اب ٹھیک ہے لیکن وہ ابھی اسپتال میں ہیں۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”چلو، مجھے اسپتال لے چلو۔“ عامر کے چہرے پر شدید پریشانی تھی۔

”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی چلوں؟“ میں نے کہا۔ ”تم اکیلے تو اور پریشان ہو جاؤ گے۔“

میں عامر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کی امی کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی اور اسپتال والوں نے اس کے ڈیڈی کو بھی اطلاع کر دی تھی۔ وہ بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔

یوں عامر سے میری دوستی ہو گئی۔ پھر ہم تقریباً روز ہی ملنے لگے۔ اس میں غرور اور تکبر تو نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ اکثر میرے گھر بھی آجاتا تھا۔ میں بھی اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کے گھر جانے سے مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جب وہ ٹیوشن پڑھتا تھا تو میں بھی وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ یوں میری انگریزی بھی بہت اچھی ہو گئی اور دیگر مضامین بھی۔ وہ میرا ہی ہم جماعت تھا۔ اس کے تمام مضامین انگلش میں تھے لیکن دو تین مہینے بعد میری سمجھ میں سب کچھ آنے لگا۔ میری انگریزی کی صلاحیت مزید بڑھ گئی۔

میٹرک کے بعد ہم نے ایک ہی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت تک حکومت تمام اسکول اور کالج قومی تحویل میں لے چکی تھی۔ اس لیے مجھے اس کے کالج میں داخلہ مل گیا۔ کالج کے بعد ہم یونیورسٹی میں بھی ایک ساتھ تھے۔

ہم دونوں کو کرکٹ کا اب بھی جنون تھا۔ ہم پہلے کالج کی کرکٹ ٹیم میں کھیلتے رہے۔ پھر یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم میں بھی شامل ہوگئے۔

عامر میرے مقابلے میں کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ وہ بہترین باؤلر اور بہت اچھا بیٹ مین تھا اور ہمیشہ ون ڈاؤن کھیلا کرتا تھا۔ میں تو ٹیم میں پانچویں اور کبھی چھٹے نمبر پر رہتا تھا۔

ہمارے کرکٹ کوچ کا خیال تھا کہ عامر ایک روز قومی ٹیم میں شامل ہو جائے گا۔

یونیورسٹی میں ہمارا دوسرا سال تھا۔ نئے داخلے ہو رہے تھے۔ ان ہی دنوں میری ملاقات شائستہ سے ہوئی۔ وہ خوب صورت سی بھولی بھالی لڑکی پریشانی کے عالم میں کسی کا انتظار کر رہی تھی یا پھر یہ ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

میں اس کے نزدیک گیا اور نہایت مہذب انداز میں کہا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ آپ ایڈمیشن کے سلسلے میں آئی ہیں؟“

”جی ہاں...... میں...... اسی سلسلے میں آئی تھی لیکن......“

”آیے میرے ساتھ۔“ میں اسے ایک اسٹال پر لے گیا۔ طلبہ کی کئی تنظیموں نے اپنے اپنے اسٹال لگا رکھے تھے۔ میرا تعلق دائیں بازو کی تنظیم سے تھا۔ یوں بھی کرکٹ کی وجہ سے یونیورسٹی کے تمام لڑکے مجھے پہچانتے تھے۔ شائستہ کا کام ہاتھوں ہاتھ ہوگیا۔ اس دن عامر یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ ایڈمیشن کے بعد میں شائستہ کو کیفے ٹیریا لے گیا۔ جہاں بیٹھ کر ہم نے ایک ایک کپ چائے پی اور شائستہ میرا شکریہ ادا کر کے اٹھ گئی۔

”او کے!“ جانے کے بعد بھی میں اس کے تصور میں کھویا رہا۔

تین دن بعد باقاعدہ کلاسز شروع ہونے والی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ شائستہ اس سے پہلے یونیورسٹی نہیں آئے گی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں اس کے انتظار میں رہتا تھا۔

عامر نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کرلیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے احسن! تو کچھ پریشان ہے؟“

”جی...... نہیں تو......“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے بھلا کیا پریشانی ہوسکتی ہے؟“

یہ بھی اتفاق تھا کہ دوسرے ہی دن عامر اپنے ایک کزن کی شادی میں اسلام آباد چلا گیا۔

شائستہ یونیورسٹی پہنچی تو میں نے دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ وہ میرے سامنے سے گزری تو میں اپنے ایک کلاس فیلو سے باتوں میں مصروف ہوگیا۔ یوں جیسے شائستہ کو دیکھا ہی نہ ہو۔

وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی اور پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ”السلام علیکم احسن صاحب۔“

”وعلیکم السلام۔“ میں نے چونکنے کی اداکاری کی اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔

”آپ شاید مجھے پہچانے نہیں۔“ شائستہ نے کہا۔

”میں شائستہ ہوں...... آپ نے میرا ایڈمیشن کرایا ہے۔“

”میری یادداشت ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی ہے شائستہ۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔“ پھر میں مسکرا کر بولا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”شکر الحمد للہ۔“ اس نے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“

”کرم ہے اللہ کا۔ ویسے جہاں تک میرا خیال ہے آپ کے ابتدائی دو پیریڈز تو فری ہیں؟“

”آپ کا خیال درست ہے۔“ شائستہ نے بھی مسکرا کر کہا اور آرٹس لابی کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

میں بھی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”شائستہ! آپ کی کسی فرینڈ نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں لیا؟“

”میری دو تین فرینڈز نے ایڈمیشن لیا تو ہے لیکن وہ سائنس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ اب اتنا فاصلہ طے کر کے ان کے پاس کون جائے؟“

آرٹس اور سائنس ڈیپارٹمنٹ کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ اب تو وہاں خاصی تغیرات ہوگئی ہیں، اس زمانے میں تو دونوں شعبوں کے درمیان لق و دق میدان تھا۔

”اگر مناسب سمجھیں تو کیفے ٹیریا کی طرف چلیں؟“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”ایک شرط پر!“ شائستہ نے کہا۔ ”اس مرتبہ پے منٹ میں کروں گی۔“

”یہ تو مجھے قطعاً اچھا نہیں لگے گا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اگر آپ واقعی بہ ضد ہیں تو پھر مجبوری ہے۔ آیے چلیں۔“

اس دن شائستہ سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس کے والد کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر تھے۔ وہ والدین کی اکلوتی تھی اور نارتھ ناظم آباد کے بلاک اے میں رہتی تھی۔ اسے شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی اور وہ کرکٹ کی دیوانی تھی۔ اتنی جنونی کہ اس نے بہت سے کرکٹ میچ انڈیا اور سری لنکا جا کر دیکھے تھے۔ اس کا بس چلتا تو وہ انگلینڈ، آسٹریلیا اور دوسرے ملکوں میں جا کر بھی میچ دیکھتی لیکن وہ اتنی دولت مند نہیں تھی کہ وہاں جاسکتی۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں بھی کرکٹ کا دیوانا ہوں اور یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم میں کھیلتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی۔

وہ خاصی ہنس مکھ، خوش اخلاق اور ملنسار لڑکی تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر وہ مجھ سے یوں گھل مل گئی جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہے۔ میں اس کے حسن اور معصومیت کا پہلے سے زیادہ اسیر ہوگیا۔ اس دوران میں اس نے کلاس کی چند لڑکیوں سے بھی دوستی کرلی تھی لیکن ابھی تک میرے علاوہ کسی لڑکے سے بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔

میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا تھا کہ اس سے اظہارِ محبت کردوں کیوں کہ مجھے واقعی اس سے محبت ہوگئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ شائستہ بھی مجھے ناپسند نہیں کرتی ہے۔

ان دنوں میں اپنے دوسرے دوستوں سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہ آتے جاتے مجھ پر جملے چست کرتے تھے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اگر شائستہ نہ ہوتی تو شاید میں بھی عامر کے بغیر شدید بور ہو کر چھٹی کرلیتا۔

میں اکثر عامر کے گھر چلا جاتا تھا۔ وہاں سے ٹیلی فون پر اس سے بات ہو جاتی تھی۔ ابھی مزید ایک ہفتے تک اس کا اسلام آباد میں رکنے کا پروگرام تھا۔ اس کے کزنز اور دوسرے رشتے دار مری اور سوات کی سیر کو جا رہے تھے۔ وہ تو مجھے بھی آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اگر یونیورسٹی میں شائستہ نہ ہوتی تو شاید میں اس کی دعوت قبول کرلیتا لیکن اب میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر بہت خوب صورتی سے انکار کردیا۔

اس دن اچانک موسم کے تیور بدل گئے اور پہلے تو بوندا باندی شروع ہوئی پھر اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ذرا سی دیر میں وہاں جل تھل ہوگیا۔ لڑکیاں اور لڑکے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ مجھے شائستہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی افراتفری میں اپنے گھر چلی گئی ہے۔

میں ہوسٹل میں ایک دوست عرفان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے ضد کر کے مجھے روک لیا اور بولا کہ اپنے گھر ٹیلی فون کردو اور آج یہیں میرے ساتھ رک جاؤ، اس موسم میں تمہیں کوئی سواری نہیں ملے گی۔ وہ یونیورسٹی کی میس سے کھانا بھی لے آیا تھا اور تھرماس میں چائے بھی۔ ویسے چائے بنانے کا بندوبست لڑکوں نے وہاں اپنے طور پر بھی کر رکھا تھا۔

میں نے ہوسٹل سے اپنے گھر ٹیلی فون کرادیا کہ میں بارش کی وجہ سے آج ہوسٹل میں ہی رکوں گا۔

پھر ہم دیر تک بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

سورج تو آسمان پر پہلے ہی نہیں تھا لیکن اب تو شام کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔

اس وقت میرا ایک کلاس فیلو عابد وہاں آیا اور بولا۔ ”یار وہ تمہاری دوست پریشانی کے عالم میں لائبریری کے دروازے پر کھڑی ہے۔“

”کون دوست؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یار وہی خوب صورت لڑکی جو آج کل تمہارے ساتھ نظر آتی ہے۔“

”تم شائستہ کی بات کر رہے ہو؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”ہاں ہاں شائستہ ہی نام ہے اس کا۔“ عابد نے کہا۔

”یار عرفان!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں کھڑا ہوگیا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

باہر اب بھی اچھی خاصی بارش ہو رہی تھی۔

لائبریری تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے پانی میں شرابور ہوگئے۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا اس لیے مجھے شائستہ نظر نہیں آئی۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ عابد نے مجھے بے وقوف بنا دیا۔ جب میں اس حالت میں واپس ہوسٹل پہنچوں گا تو وہ لوگ میرا خوب مذاق بنائیں گے۔

غصے کی شدید لہر میرے تن بدن میں دوڑ گئی اور میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ مجھے شائستہ کی سہمی ہوئی آواز آئی۔ ”احسن!“ میں چونک کر پلٹا۔ وہ سمٹی ہوئی ایک چھجے کے نیچے کھڑی تھی۔ اس کے باوجود خاصی بھیگ گئی تھی۔

”شائستہ! تم ابھی تک یہیں ہو، گھر نہیں گئیں؟“ میں
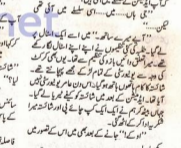
نے سرد لہجے میں پوچھا۔
"میں تو لائبریری میں نوٹس بنا رہی تھی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ باہر اتنی بارش ہو رہی ہے؟" شائستہ نے جواب دیا۔ "مجھ سے لائبریرین نے بھی کئی مرتبہ کہا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ سب لوگ جا چکے ہیں۔ آپ بھی چلی جائیں۔"
"اب کیا کرو گی؟" میں نے پوچھا۔ "گھر کیسے جاؤ گی؟"
"میں گزشتہ ایک گھنٹے سے یہاں کھڑی ہوں اور یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ گھر کیسے پہنچوں گی۔ پاپا کمپنی کے کام سے جاپان گئے ہوئے ہیں۔ امی گھر میں اکیلی ہیں۔ میں نے گھر میں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن گھر کا ٹیلی فون بھی ڈیڈ ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟"
"یہاں کھڑے کھڑے تو کچھ سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چلو، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"
"تم...... تم مجھے کیسے چھوڑو گے؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "تمہارے پاس گاڑی ہے کیا؟"
"تم جانتی ہو میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ اگر گاڑی ہوتی تو میں خود اب تک گھر نہ چلا گیا ہوتا۔ چلو کوئی نہ کوئی بندوبست تو اللہ کر ہی دے گا۔"
بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بارش کی یہ جھڑی اب کئی دن تک یوں ہی ہوتی رہے گی۔
شائستہ کے پاس دو تین کتابیں اور ایک فائل بھی تھی۔ بارش میں اس کی کتابیں اور فائل دونوں برباد ہو جاتیں۔
اس وقت مجھے یونیورسٹی کا ایک چوکیدار نظر آیا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ وہ سر پر بوری اوڑھے تیزی سے اپنے اقامتی کمرے کی طرف جا رہا تھا۔
میری آواز پر وہ رک گیا اور چکر دار ڈھلوان زینہ طے کرتا ہوا اوپر آ گیا۔ "صاب ابھی تک ادھر ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ پھر عجیب سی نظروں سے شائستہ کو دیکھا۔
"رحمت خان!" میں نے کہا۔ "ایک کام کرو۔ یہ کتابیں بارش کے پانی سے بچا کر اپنے کمرے تک لے جاؤ۔ میں کل کسی وقت تم سے لے لوں گا۔"
اس نے کتابیں لے کر انہیں بوری کے اندر دبایا اور بوری کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹ کر تقریباً دوڑتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
"چلیے میڈم!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب چلیں۔"
ہم بہت مشکل اور پریشانی میں تھے کیوں کہ اس ماحول میں سواری ملنا مشکل تھا بہت انتظار کے بعد نیپا سے ہمیں ایک سوزوکی کیری مل گئی اس نے ہمیں گلبرگ تک چھوڑ دیا۔ سڑک پر اتنا پانی تھا کہ مجھے خوف تھا کہ سوزوکی کہیں بند نہ ہو جائے۔
گلبرگ پہنچ کر ہم پھر پیدل چلنا شروع ہو گئے۔ پھر ہمیں کوئی سواری نہ ملی۔ شائستہ کے گھر پہنچتے پہنچتے رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس کا بنگلا بہت شاندار تھا۔ لمحے بھر کو تو میں مرعوب ہو گیا۔
اس کی امی پاگلوں کی طرح بنگلے کے برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔
شائستہ کو دیکھ کر وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئیں۔ پھر انہیں میرا خیال آیا تو انہوں نے استفسار طلب نظروں سے اسے دیکھا۔
"امی! یہ احسن ہیں۔ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ یہ بے چارے مجھے گھر تک چھوڑنے کے لیے میلوں پیدل چلے ہیں۔"
"تمہارا بہت شکریہ احسن بیٹا۔" اس کی امی نے کہا۔
"امی شکریے کو چھوڑیں۔ پہلے ہمیں گرما گرم چائے پلائیں۔" شائستہ نے کہا۔
شائستہ کی امی نے مجھے اس کے پاپا کا ایک جوڑا دے دیا۔ چائے پینے کے بعد جسم میں گرمی آئی تو مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ اسی وقت شائستہ کی امی کی آواز آئی۔ "میں نے کھانا لگا دیا ہے۔ تم لوگ کھانا کھا لو۔"
کھانے کے بعد میں کمر سیدھی کرنے کو انہی کے بیڈ پر لیٹا تو پھر مجھے ہوش نہ رہا۔
میں دوسرے دن گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ شائستہ کی امی ناشتے کی میز پر بھی میرا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ مجھے رات سے مسلسل شرمندہ کر رہی ہیں آنٹی۔"
"بیٹا میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تم نہ ہوتے تو......"
"آنٹی پلیز۔" میں نے برا مان کر کہا تو وہ شفقت سے مسکرا دیں۔
ناشتے سے فارغ ہو کر میں اپنے گھر کے لیے نکل پڑا۔
کئی دن بعد مجھے عامر کا خیال آیا تو میں اس کے گھر چلا گیا۔
"کہاں غائب ہو احسن!" آنٹی نے کہا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"جی آنٹی!" میں نے ہنس کر کہا۔ "میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس پچھلے دنوں مصروفیت کچھ ایسی رہی کہ یہاں آنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"
"ہاں بھئی! اب عامر موجود نہیں ہے۔" آنٹی نے کہا۔ "تم ہم سے ملنے بھلا کیوں آنے لگے؟"
میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ آنٹی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف عامر تھا۔ انہوں نے عامر سے چند باتیں کرنے کے بعد کہا۔ "احسن بھی آیا ہوا ہے۔ لو بات کرو۔" انہوں نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔
"ابے تو زندہ ہے ابھی تک!" عامر نے ہنس کر کہا۔ "میں نے جب بھی ٹیلی فون کیا۔ امی نے یہی بتایا کہ احسن کئی دن سے نہیں آیا۔"
"میں تو زندہ ہوں، تو بتا کب آرہا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میں کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے کراچی پہنچوں گا۔"
"شکر ہے، تجھے واپسی کا خیال تو آیا۔" میں نے کہا۔ "میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تو نے سوات یا کاغان میں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"
اچھا، فضول باتیں مت کر، اب کل شام کو ملاقات ہو گی۔
دوسرے دن عامر آ گیا۔ اس کی صحت پہلے سے بھی زیادہ اچھی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے کچھ زیادہ ہی وجیہہ و خوب رو لگ رہا تھا۔ یوں بھی وہ خاصا پرکشش تھا۔ سرخ و سفید رنگت، براؤن بال، ورزشی جسم اور مجھ سے بھی نکلتا ہوا قد۔
ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے کزن کی شادی، مری، سوات اور کاغان کے قصے سنا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے شائستہ کے بارے میں بتا دوں لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اسے سرپرائز دوں گا۔
"یار میں تو ابھی ایک ہفتہ مزید نہ آتا لیکن تو تو جانتا ہے کہ اگلے ہفتے سے قائداعظم ٹرافی کے میچ شروع ہو جائیں گے۔"
"ہاں یار!" میں نے چونک کر کہا۔ "نصیر بھائی نے کئی مرتبہ تیرے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے انہیں یہی جواب دیا کہ عامر بس آنے والا ہے۔" نصیر بھائی یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کے کیپٹن تھے۔
"تو بھی تو قائداعظم کھیل رہا ہے؟" عامر نے پوچھا۔
"ہاں، ٹیم بی میں میرا نام تو ہے۔ فائنل سلیکشن ابھی نہیں ہوئی ہے۔"
"یار، نصیر بھائی تجھے ڈراپ کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے پاس کوئی اور بیٹس مین بھی تو نہیں ہے۔"
عامر دوسرے دن یونیورسٹی پہنچا تو میں نے شائستہ سے اس کا تعارف کرایا۔ اسے دیکھ کر شائستہ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی۔ اس نے اس وقت تو مجھے بھی نظر انداز کر دیا۔
میں نے سوچا کہ عامر کو اپنے اور شائستہ کے بارے میں بتا دوں لیکن مجھے اس کا موقع ہی نہ ملا۔
پھر ہم قائداعظم ٹرافی کھیلنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔
میچ شروع ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ عامر بہت اچھی فارم میں ہے۔ وہ بہترین بیٹس مین اور فاسٹ باؤلر تھا۔ اس کی فیلڈنگ بھی بہت زبردست تھی۔
اس دن ہمارا ایک اہم میچ تھا۔ اس کا دار و مدار سیمی فائنل پر تھا اگر ہم وہ میچ جیت جاتے تو سیمی فائنل کے لیے کوالیفائی کر لیتے۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ہمارا اوپنر راشد پانچویں اوور ہی میں زخمی ہو کر پویلین لوٹ گیا۔ عامر ہمیشہ ون ڈاؤن کھیلتا تھا۔
وہ بیٹ ہلاتا ہوا پُراعتماد انداز میں پچ کی طرف بڑھا۔
اچانک میری نظر کنٹری باکس کے نزدیک بیٹھی ہوئی شائستہ پر پڑی۔ وہ بہت پُرشوق اور والہانہ انداز میں عامر کو دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت اس کی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور ایک مرتبہ پھر عامر کی طرف دیکھنے لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں میں حسرت ہو۔
عامر بہت سنبھل کر کھیل رہا تھا اور ہٹ لگانے سے گریز کر رہا تھا۔

چار اوورز گزرنے کے بعد اس کی جارحانہ بیٹنگ کا آغاز ہوا۔ اس نے بہت محنت سے باون قیمتی رنز بنالیے۔

اچانک ہمارا ایک اور کھلاڑی کیچ آؤٹ ہوگیا۔ عامر اور اس کی پارٹنرشپ بہت کامیابی سے جاری تھی۔

میرے نزدیک ہی امجد پیڈ باندھے تیار بیٹھا تھا۔ عظیم کے آؤٹ ہوتے ہی وہ میدان کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میچ ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے لیکن امجد نے ایسی شان دار بیٹنگ کا مظاہرہ کیا جس کی کوئی بھی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ دو اوور کھیلنے کے بعد عامر نے اسے کوئی مشورہ دیا تو امجد انتہائی جارحانہ انداز میں کھیلنے لگا۔ وہ ہر گیند کو ہٹ کرنے لگا۔ اس کی ہٹ اتنی زوردار ہوتی تھی کہ گیند سیدھی باؤنڈری پار کرجاتی تھی۔ اس نے ایک اوور میں تین چوکوں ایک چھکے اور ایک رن لے کر اپنی نصف سنچری پوری کی تو ہمارے کھلاڑیوں کے مرجھائے ہوئے چہرے دمکنے لگے۔

دوسری طرف عامر تھا جو ایک ایک دو دو رنز لے رہا تھا اور کسی گیند پر چوکا بھی مار دیتا تھا۔ اس نے اس طرح اٹھاسی رنز پورے کرلیے۔

پھر اچانک ایک چھکا مارنے کی کوشش میں امجد باؤنڈری لائن پر کیچ آؤٹ ہوگیا۔

اب میرا نمبر تھا۔ میں پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔

میں نے جاتے ہوئے شائستہ کی طرف دیکھا لیکن مجھے اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر دکھائی نہ دیا۔ میں نے سوچا آخر شائستہ کو ہو کیا گیا ہے۔ کیا وہ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہے؟ میں اسی ادھیڑبن میں کریز پر پہنچا۔

میں نے شائستہ کو متاثر کرنے کے لیے پہلی ہی گیند پر چھکا مار دیا۔ گیند صحیح طرح سے بیٹ پر نہیں آئی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس طرف مخالف ٹیم کا کوئی فیلڈر نہیں تھا۔ ورنہ گیند اتنی نیچی تھی کہ وہ اچھل کر اسے پکڑ سکتا تھا۔

عامر کریز کے درمیان میں آیا تو میں بھی اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”سنبھل کر کھیلو احسن، تمہیں جے سوریا بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنی وکٹ بچانے کی کوشش کرو۔ اپنی سنچری مکمل کرتے ہی میں ساری کمی پوری کردوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ لوٹ گیا۔

مجھے اس کی بات پر شدید غصہ آیا۔ ہم اب بھی پریشر میں کھیل رہے تھے۔ مخالف ٹیم کا ٹارگٹ پورا کرنے کے لیے ابھی ہمیں مزید ایک سو چالیس رنز کی ضرورت تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ میں صرف کریز پر کھڑا رہوں۔ گویا وہ خود ہیرو بننا چاہتا تھا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر تو گویا مجھ پر جنون طاری ہوگیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے زوردار ہٹ لگا کر گیند کو پویلین میں پھینک دیا۔ شائقین مارے جوش کے تالیاں بجانے لگے۔

عامر پھر ایک مرتبہ کریز کے درمیان آیا اور اس مرتبہ درشت لہجے میں بولا۔ ”یہ تم سنبھل کر کھیل رہے ہو؟ تم کیا چاہتے ہو ہماری ٹیم ہار جائے؟ تم کیا خود کو برائن لارا سمجھتے ہو۔ مجھے ڈسٹرب مت کرو اور احتیاط سے کھیلو۔“

”میں سنبھل کر ہی کھیل رہا ہوں۔“ میں نے بھی تلخی سے جواب دیا۔ ”اب کوئی گیند سیدھی میرے بیٹ پر آئے گی تو میں اسے ضائع تو نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں اس کا جواب سنے بغیر لوٹ گیا۔

میں جانتا تھا کہ عامر کی سنچری پوری ہونے میں صرف سات رنز باقی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ رنز پورے ہونے کے بعد وہ خود انتہائی جارحانہ بیٹنگ کا مظاہرہ کرے گا۔ مجھے واقعی سنبھل کر کھیلنا چاہیے۔ میرے بعد صرف ایک بیٹس مین تھا لیکن کسی بھی کھلاڑی کو نئے کھلاڑی کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ ہمارے پاس زیادہ اوورز بھی نہیں تھے۔

میں نے وہ اوور تو سنبھل کر کھیلا اور صرف گیند کو روکنے پر اکتفا کیا۔ اگلے اوور میں، میں پھر باؤلر کے سامنے تھا۔ وہ مخالف ٹیم کا بہترین اسپنر تھا۔ اس نے اوور کی پہلی گیند بہت بے دلی سے سیدھی سیدھی پھینک دی۔

میں نے بیک فٹ پر کھیلتے ہوئے زوردار ہٹ لگائی اور گیند تماشائیوں کے درمیان جاگری۔ لوگوں کے شور سے پورا اسٹیڈیم گونجنے لگا۔ میں عامر سے مشورہ کرنے کے لیے آگے بھی نہ بڑھا۔ دوسری گیند سیدھی آتے آتے اچانک دائیں طرف گھوم گئی۔ تیسری گیند پھر بہت آسان تھی۔ میں نے گھٹنا زمین پر ٹکاتے ہوئے پھر زوردار ہٹ لگادی۔ اس دفعہ مجھ سے اندازے کی غلطی ہوگئی۔ گیند باؤنڈری کی طرف جانے کی بجائے ہوا میں بلند ہوئی۔ مخالف ٹیم کے دو کھلاڑی اس کی طرف لپکے۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے مخالف ٹیم کے فیلڈر نے اچھل کر اسے پکڑ لیا۔ ایمپائر نے انگلی اٹھادی۔ میں بوجھل قدموں سے پویلین کی طرف چل دیا۔

پھر ہماری ٹیم وہ میچ نہ جیت پائی۔ عامر سنچری بھی نہ بنا سکا۔

میں اس دن عامر کے گھر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوگا لیکن اس کے چہرے پر ناراضی کا شائبہ بھی نہ تھا۔

میں نے اپنی غلطی کی وضاحت کرنا چاہی تو وہ ہنس کر بولا۔ ”چھوڑ یار! آؤٹ ہونے میں تیری کوئی غلطی نہیں تھی۔ تیری جگہ میں ہوتا تو میں بھی وہی شاٹ کھیلتا اور کرکٹ میں ہار جیت تو چلتی رہتی ہے۔“

پھر اس نے موضوع بدل دیا اور اچانک بولا۔ ”یار! یہ شائستہ مجھ سے کچھ زیادہ فری ہونے کی کوشش کررہی ہے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو کیا نہیں سمجھا؟“ عامر طنز سے بولا۔ ”شائستہ کا مطلب یا فری ہونے کا مطلب! وہ تیری دوست ہے اس لیے تجھے بتا رہا ہوں ورنہ اسے جھڑک بھی دیتا۔“

”وہ ایسی لڑکی تو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے سمجھا دوں گا۔ ویسے تجھے ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

پھر مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں گیا۔ گھر آنے کے بعد بھی ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ سوال مجھے ساری رات ڈستا رہا کہ آخر شائستہ نے عامر سے ایسی کیا بات کردی ہے کہ وہ اتنا برہم تھا۔

میں دوسرے دن یونیورسٹی پہنچا تو کلاس میں جانے کی بجائے لان میں بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد مجھے شائستہ نظر آئی۔ میں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلالیا۔ اس کے چہرے پر ایک سرد مہری تھی۔ اسی وقت عامر بھی وہاں آگیا۔ وہ عادت کے مطابق اپنی فائل ایک طرف پھینک کر میرے نزدیک ہی گھاس پر نیم دراز ہوگیا۔

اسے دیکھ کر شائستہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آگیا۔ اس نے عامر سے کہا۔ ”عامر صاحب! یہ یونیورسٹی ہے۔ آپ کا ٹی وی لاؤنج نہیں ہے جو آپ یہاں لیٹے ہوئے ہیں۔“

عامر نے گھور کر اسے دیکھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ کو میرا یہاں لیٹنا برا لگ رہا ہے تو آپ یہاں سے کہیں اور چلی جائیں یا میں ہی چلا جاتا ہوں۔“

شائستہ کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ عامر نے اپنی فائل اٹھائی اور میرے روکنے کے باوجود وہاں سے چلا گیا۔

شائستہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلی گئی۔

کچھ دیر تک تو صورتِ حال میری سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ میں شائستہ کے پیچھے لپکا لیکن وہ نہ جانے کس طرف چلی گئی تھی۔

پھر آنے والے تین دن میرے لیے عذاب بن کر گزرے۔

عامر کو اچانک بخار آگیا تھا۔ وہ یونیورسٹی نہیں آرہا تھا۔ شائستہ بھی غائب تھی۔ میں نے کئی بار اس کے گھر ٹیلی فون کیا لیکن شائستہ سے بات نہ ہوسکی۔

تیسرے دن میں شائستہ کے گھر پہنچ گیا۔

آنٹی نے شفقت سے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں نے ان سے شائستہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔ میں ابھی اسے بھیجتی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد شائستہ وہاں آئی تو میں پہلی نظر میں اسے پہچان ہی نہ سکا یہ وہ شائستہ تو نہیں تھی۔ اس وقت اس کے جسم پر ملگجے سے کپڑے تھے۔ بال الجھے ہوئے تھے جنہیں اس نے پونی کی شکل میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ کملا کر رہ گئی تھی اور چہرے سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ شاید وہ زیادہ وقت روتی رہی تھی۔

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا شائستہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن تمہارے دوست نے میری جو توہین کی ہے اس سے مجھے شدید تکلیف پہنچی ہے۔“

”تم عامر کی بات کررہی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”وہ ایسا نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی جھنجلاہٹ میں اس کا رویہ عجیب سا ہوجاتا ہے۔ میں بچپن سے اسے جانتا ہوں۔ وہ ہرگز اتنا برا نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھ رہی ہو۔ اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو وہ تم سے معذرت کرلے گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آگیا۔

اس نے دوسرے دن پھر یونیورسٹی آنے کا وعدہ کرلیا۔ میں نے عامر کو بھی معذرت کرنے پر راضی کرلیا۔ عامر نے اس سے معذرت بھی کرلی اور اس سے نارمل ہوکر باتیں کرنے لگا۔

پھر کئی ہفتے یوں ہی گزر گئے۔ شائستہ اب زیادہ سے زیادہ عامر کے نزدیک رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے مجھے تو بالکل نظر انداز ہی کردیا تھا۔

ایک دن پھر عامر نے اسے جھڑک دیا۔

دوسرے دن شائستہ یونیورسٹی نہیں آئی۔ پھر مجھے یہ اندوہناک خبر ملی کہ شائستہ نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ یہ سب عامر کی وجہ سے ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے عامر سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ میں اسپتال جا کر شائستہ سے ملا تو اس کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی تھی۔ اس کے پاپا حسبِ معمول غیر ملکی دورے پر تھے۔ آنٹی اس کی وجہ سے بہت پریشان تھیں۔ میں نے سمجھا بجھا کر انہیں گھر بھیج دیا کہ کچھ دیر وہ آرام کرلیں۔ میں شائستہ کے پاس بیٹھا ہوں۔

ان کے جانے کے بعد میں پھٹ پڑا۔ میں نے شائستہ سے کہا۔ ”تم نے ایک چھوٹی سی بات کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی؟“

”یہ چھوٹی بات نہیں ہے احسن!“ شائستہ نے کہا۔ ”میں...... میں عامر...... کے بغیر...... نہیں رہ سکتی۔“ اس نے رک رک کر کہا۔

اس کے الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ جو اس نے میرے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔ میں نے غم سے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”شائستہ...... یہ تم...... کہہ رہی ہو...... تم......!“

”مجھے معاف کر دینا احسن! لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

”اور تم نے مجھ سے جو وعدے کیے تھے وہ سب......“

”وہ میری بھول تھی احسن! پلیز مجھے معاف کر دو۔ ہاں...... میں تمہیں اتنا بتا دوں کہ...... اگر عامر...... مجھے نہ ملا تو میں...... پھر جان دینے کی کوشش کروں گی۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”میں...... تمہیں مرنے...... نہیں...... دوں گا...... شائستہ!“ میں نے بہت مشکل سے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ ”عامر میرا دوست ہے...... میں...... اسے مجبور کر دوں گا...... تم فکر مت کرو...... میں نے تم سے محبت کی ہے اور...... تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم بھی مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔“

اس نے مجھ سے وعدہ کرلیا۔ پھر آنٹی کے آنے کے بعد میں وہاں سے لوٹ آیا۔

میں نے عامر سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ مجھ سے اکھڑ گیا۔ ”احسن! کیا تو پاگل ہو گیا ہے۔ میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کرلوں جو ذہنی طور پر بیمار ہے۔ خودکشی وہی لوگ کرتے ہیں جو ذہنی طور پر بیمار اور بزدل ہوتے ہیں۔ بس آئندہ مجھ سے اس قسم کی کوئی بات مت کرنا۔“

”شائستہ بہت اچھی لڑکی ہے عامر!“ میں نے کہا۔

”میں نے کب کہا کہ وہ بری ہے لیکن میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔“

شائستہ یونیورسٹی آنے لگی تھی لیکن عامر اس سے بات نہیں کرتا تھا۔

ایک روز شائستہ نے مجھ سے کہا۔ ”احسن! میں نے عامر کو راضی کرنے کا ایک حل نکال لیا ہے۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے تہ کیا ہوا ایک اخبار نکالا اور اس میں ایک اشتہار دکھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ پڑھو۔“

میں نے تجسس بھرے انداز میں اس سے اخبار لے لیا اور اشتہار پر نظر ڈالی۔ وہ پڑھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ کسی عامل بابا کا اشتہار تھا۔ آپ کے ہر مسئلے کا حل عامل بابا کے پاس موجود ہے۔ ملازمت کا حصول، اولاد، من پسند شادی۔ اب تک لاکھوں افراد عامل بابا سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔

”تم بھی کن چکروں میں پڑ گئی ہو شائستہ۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب فراڈ ہوتے ہیں۔“

”لیکن عامل بابا فراڈ نہیں ہیں۔“ اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ”میں ان کے پاس جا چکی ہوں۔ انہوں نے تو مجھ سے ایک پیسا بھی نہیں لیا۔ فراڈ تو وہ لوگ کرتے ہیں جو لوگوں کو لوٹتے ہیں۔“

”یہ سب فراڈ ہوتے ہیں شائستہ۔“ میں نے کہا۔ ”تم آئندہ وہاں مت جانا۔“

لیکن اس کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ اب اس نے یونیورسٹی آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر اس کے گھر پہنچ گیا۔ آنٹی بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ شائستہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے۔ وہ کمرا بند کر کے نہ جانے کیا کرتی رہتی ہے۔ کبھی ساری ساری رات کھڑے ہو کر کوئی وظیفہ پڑھتی ہے، کبھی تعویذ جلاتی ہے اور ساری رات کھلے آسمان کے نیچے گزار دیتی ہے۔

میں نے شائستہ سے ملنا چاہا لیکن اس نے مجھ سے

ملنے سے انکار کر دیا۔ پھر مجھے یہ خبر ملی کہ شائستہ پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے ہیں۔

شائستہ نے جس عامل بابا کا اشتہار مجھے دکھایا تھا۔ وہ ہر اتوار کو اخبار میں چھپتا تھا لیکن بہت دن سے نہیں چھپا تھا۔ میں نے یونیورسٹی کی لائبریری سے ایک پرانا اخبار نکال کر عامل بابا کا پتا نوٹ کیا اور اس پتے پر جا پہنچا۔

وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ بہروپیا وہاں سے اپنی دکان بڑھا چکا ہے۔ وہاں اس وقت بھی بہت پریشان حال لوگ موجود تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ عامل بابا ان سے ہزاروں روپے لے کر کھا گیا اور ان کا کام بھی نہیں ہوا۔

اب شائستہ کے پاگل پن کا سبب مجھے معلوم ہو گیا۔ اس نے بھی عامل بابا کو دل کھول کر پیسے دیے ہوں گے۔ ان کے اچانک غائب ہونے سے وہ مایوس ہو گئی تھی۔ پھر وہی مایوسی پاگل پن میں بدل گئی۔

میں شائستہ کے گھر پہنچا تو اس کی حالت دیکھ کر شدید صدمہ پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر چیخی۔ ”تم سب دھوکے باز ہو، سب فراڈیے ہو، میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

آنٹی نے مجھے وہاں سے ہٹا دیا اور بولیں۔ ”اگر کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو جائے تو اس پر دورہ پڑ جاتا ہے۔“

ان دنوں میرے فائنل سمیسٹر ہو رہے تھے۔ میں آخری پرچہ دے کر باہر نکلا ہی تھا کہ شائستہ کی ایک دوست نے مجھے اطلاع دی۔ ”احسن! کل رات شائستہ نے کلائی کی رگ کاٹ کر خودکشی کر لی۔“

میرا سر بری طرح چکرایا۔ زمین آسمان گھومنے لگے پھر میں دھڑام سے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ امی، ابو اور عامر میرے اردگرد موجود تھے۔ مجھے شدید صدمہ پہنچا تھا لیکن میں بہت سخت جان تھا۔ اتنی آسانی سے نہیں مر سکتا تھا جیسے شائستہ مر گئی تھی۔

میں نے عامر کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔

پھر میں گھر آ گیا اور کئی دن تک گھر سے باہر نہ نکلا۔

ایک دن عامر گھر آ گیا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں آ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”عامر، پلیز آج کے بعد میرے گھر مت آنا، مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہ کرنا ورنہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکوں گا۔ اب جاؤ یہاں سے۔“

”چلا جاؤں گا۔“ عامر نے غم سے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”بس تو میری آخری بات سن لے۔ شائستہ کو میں بھی پسند کرتا تھا۔ میں بھی پہلی ہی نظر میں اس کی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”عامر...... یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟“

”میری باتوں کو غور سے سننا احسن! شائستہ نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں مجھے بتا دیا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن اب وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ مجھے اس پر شدید غصہ بھی آیا اور تیرا خیال بھی آیا کہ تو میرے بارے میں کیا سوچے گا۔ میں نے شائستہ کو بری طرح دھتکار دیا۔ پھر تو نے درمیان میں پڑ کر ہماری مصالحت کرا دی۔ میں شائستہ کو یہی سمجھاتا تھا کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے کیونکہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے عامر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”یار اگر تو بھی مجھے ہی قصوروار سمجھتا ہے تو مجھے معاف کر دینا۔“ وہ اٹھ کر باہر جانے لگا۔

میں نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اس کے گلے لگ کر اس بری طرح رویا کہ عامر بھی گھبرا گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”عامر! معافی تو مجھے تجھ سے مانگنا چاہیے۔ تو واقعی میرا دوست ہے۔ مجھے معاف کر دے یار!“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

اس نے محبت سے مجھے پھر گلے لگا لیا اور بولا۔ ”دوست بھی کہہ رہا ہے اور معافی بھی مانگ رہا ہے۔“

پھر ہم دیر تک ساتھ رہے۔ عامر رخصت ہوتے وقت ایک مرتبہ پھر میرے گلے لگ گیا۔

شام کو مجھے عامر کے ایکسی ڈینٹ کی اطلاع ملی۔ میں بھاگا بھاگا اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ میرا دوست میرا سچا اور کھرا دوست مجھے اور اپنے پیاروں کو چھوڑ کر بہت دور جا چکا ہے۔

☆☆☆

آج نہ عامر ہے نہ شائستہ لیکن میں کتنی سخت جان ہوں کہ پھر بھی جیے جا رہا ہوں۔ یہ ضرور ہوا تھا کہ عامر کی موت کے بعد مہینوں میں اس کا غم بھلا نہیں پایا تھا۔

آج میں نے اخبار میں عامل بابا کا اشتہار دیکھا تو ایک بار پھر مجھے شائستہ اور عامر یاد آ گئے اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ دونوں جہاں بھی ہوں اللہ ان پر رحم کرے۔

آخری ملاقات

مدیرِ محترم
السلام علیکم
یہ میری ایک سہیلی کے والد کی روداد ہے، سبق آموز بھی ہے میں نے مختصر پیرائے میں اس لیے بیان کی ہے کہ قارئین سبق حاصل کریں۔

عظمیٰ شکور
(سرگودھا)

میرے والد منڈی میں آڑھتی تھے۔ مجھے شروع ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ سو میں پڑھائی کی منازل طے کرتا ہوا کالج تک پہنچ گیا مگر ایف اے سے آگے پڑھ نہ سکا، مجھے زبردستی نوکری پر بٹھا دیا گیا۔ دادا چاہتے تھے کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں تاکہ وہ اپنی زندگی میں ہی میرا سہرا دیکھ لیں اسی غرض سے انہوں نے ایک رشتہ دیکھا، جب کہ میری نسبت اپنی پھوپی زاد حریم سے طے تھی مگر دادا اس رشتے کے خلاف تھے اسی لیے انہوں نے اپنی مرضی سے حمید احمد کی پوتی سے میری بات پکی کرا دی اور والد کو حکم دیا کہ علی کی شادی نگینہ سے ہی ہو گی۔

میں اس خبر کو سن کر سکتے میں رہ گیا کیوں کہ میں حریم کو پسند کرتا تھا۔ خود حریم بھی مجھے پسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی لیکن دادا ابو ہمارے درمیان سماج کی دیوار بن گئے۔ صرف اس وجہ سے کہ پھوپا سے ان کی شان میں گستاخی ہو گئی تھی۔ اپنی انا کی خاطر انہوں نے یہ حکم صادر کر دیا اس حکم سے بغاوت کرنے پر میرا دل بار بار مجھے اکسا رہا تھا مگر جب والدین کا جھکاؤ حمید صاحب کی پوتی پر دیکھا تو سر جھکا دیا۔

سننے میں آیا کہ حریم کے لیے بھی یہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے کہلا بھیجا کہ علی آپ کی بہت مہربانی، بس ایک بار مجھ سے مل لیں۔ بس آخری بار میں آپ کو دیکھ لوں۔

میں اس کی خواہش پر مجبور ہو گیا اور پھوپی کے گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میری زندگی میں ایک انقلاب آنے والا ہے۔ میں ٹوٹے دل، شکستہ جذبوں اور مایوس حوصلوں کے ساتھ پھوپی کے گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی پھوپی نے منہ پھیر لیا اور آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ ”اپنے کمرے میں ہے۔“ میں اوپر پہنچا تو حریم روتے ہوئے بولی۔ ”کچھ کرو علی ورنہ میں مر جاؤں گی۔“

"میں خود بھی مجبور ہوں چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے بھرائے گلے سے جواب دیا۔ "اپنے نانا کا مزاج تم بھی جانتی ہو۔"

"یاد رکھو علی میں کبھی ہار نہیں مانتی، تمہیں یاد ہوگا بچپن میں جب میں کسی کھیل میں ہارنے لگتی تھی تو کھیل خراب کر دیتی تھی۔"

"اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری تو زبان بھی بند ہے۔"

وہ روئے چلی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے سیلاب مجھے ڈگمگا رہے تھے مگر میں مجبور تھا۔ اس لیے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑایا اسی دوران میں اس کے بھائی کمرے میں داخل ہوئے پہلے تو انہوں نے مجھے گالیوں سے نوازا پھر مجھ پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ میں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر دروازہ بند ملا۔ حریم نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ حریم کے بھائی نے چاقو میری ٹانگ پر مارا۔ خون کا فوارہ بہنے لگا۔ میرے خون میں انگلیاں ڈبو کر بولا۔ "اگر میں چاہوں تو تیرا گلا بھی کاٹ سکتا ہوں مگر نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ اس طرح تو تو ہر فکر سے آزاد ہو جائے گا۔ تیرے لیے یہی سزا کافی ہے کہ تو زندگی بھر اپنے زخموں کو دیکھتا رہے اور اپنی بزدلی پر روتا رہے۔"

میں لنگڑاتا ہوا سیڑھیوں سے گرتا پڑتا گلی میں نکلا مگر زیادہ دور جا نہ سکا اور درد کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر گیا۔ مگر اس وقت بھی میرے کانوں میں حریم کے الفاظ گونج رہے تھے۔ میں جب ہارنے لگتی ہوں تو کھیل خراب کر دیتی ہوں۔ اس بار بھی اس نے یہی کیا تھا۔

میری ممانی کا وہاں سے گزر ہوا۔ انہوں نے مجھے ان حالوں میں دیکھا تو ایک ریڑھی پر ڈال کر مجھے اسپتال پہنچایا۔

جب مجھے ہوش آیا تو والد کا آنسوؤں سے تر چہرہ نظر آیا۔ ساتھ ہی درد کی ایک ٹیس اٹھی اور میرے ہائے کہنے پر بسٹر نے مجھے پھر درد کا انجکشن لگا دیا۔

چاقو گھٹنے سے نیچے مارا گیا تھا۔ ایک دو نہیں کئی زخم آئے تھے۔ خون کافی بہہ چکا تھا اور ٹانگ نیلی پڑ رہی تھی۔ ڈاکٹرز آپریشن کی تیاری میں تھے۔

ڈاکٹرز نے والد صاحب سے سائن لے لیا تھا کہ جان بچانے کے لیے ٹانگ کاٹنی ضروری ہے کیونکہ دو نسیں کٹ گئی تھیں اور تب سرجری نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ میں تو ان سب واقعات سے بے خبر درد سے مر رہا تھا۔

مجھے وہ وقت اب بھی یاد ہے کہ جب میرے بیڈ پر درمیان میں ایک پردہ لگا دیا گیا تھا کہ میں اپنی ٹانگیں نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ میری کمر میں انجکشن لگا دیا گیا تھا۔ نیچے کا دھڑ سن ہو چکا تھا۔ میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اگلے دن پتا چلا کہ میری دنیا لٹ چکی ہے۔ میں آدھا ہو چکا ہوں میری ایک ٹانگ میرے جسم سے جدا کر دی گئی ہے۔ میری زبان سے بے ساختہ کراہ کی صورت الفاظ ادا ہوئے۔ "ہائے حریم یہ تم نے کون سا بدلا لیا۔ کیا اسے ہی محبت کہتے ہیں؟"

شدتِ جذبات سے میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ اس وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک مرد ہوں مگر کتنا بے بس ہوں بس یہ یاد رہا تھا۔

یہ تکلیف دہ وقت گزرا مجھ آدھے انسان کو اسپتال سے کچھ روز بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

زندگی کی چاہت ختم ہو چکی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ خود کو ختم کر لوں، خودکشی کر لوں مگر کیا کروں میرا نام تو نگینہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔

حمید احمد نے اپنی پوتی کا رشتہ مجھ سے نہ توڑا کہ وہ زبان دے چکے تھے اور اپنے کیے کے پابند تھے۔ میرے دل میں ان کی عزت اب اور بڑھ گئی تھی۔ مجھے جینا ہے نگینہ کے لیے۔ اسے کس بات کی سزا دوں کہ وہ میرے نام پر بیٹھی ہے۔

آرمی فاؤنڈیشن سے میں نے مصنوعی ٹانگ لگوالی تھی اور آفس بھی جوائن کر لیا تھا۔ یعنی کہ میں زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ گو کہ یہ بہت تکلیف دہ عمل تھا۔

میری شادی نگینہ سے ہو گئی۔ آج میں چھ بچوں کا باپ ہوں اور ماشاءاللہ سب بچوں کی شادیاں بھی کر چکا۔ شادی کے بعد میں نے اپنی تعلیم پوری کی میں نے ایم اے انگلش کیا۔ نگینہ نے پل پل میرا ساتھ دیا اور میری ہمت بندھائی تب ہی میں زندگی کے فرائض پورے کر پایا۔

حریم کی شادی جس شخص سے ہوئی اسے حریم نے اس بری طرح ذہنی خلجان بخشا کہ وہ پاگل ہو گیا اور اب پاگل خانے میں ہے۔ حریم اس کے بچے پال رہی ہے۔ وہ لندن میں مقیم ہے پر میں اسے یاد نہیں کرنا چاہتا۔ کبھی نہیں۔ شاید وہ اپنے کیے کی سزا پا رہی تھی۔

وقت نے میرے زخموں پر مرہم رکھا اور میں ایک ٹانگ کے سہارے ترقی کے زینے طے کرتا چلا گیا۔ اب میں ایک کامیاب انسان ہوں کیونکہ میں نے کسی کا برا نہیں چاہا تھا اسی لیے میری ہر سانس پر اللہ کا شکر ہے۔ زندگی کی شام آگئی ہے۔ میرے چہرے پر وقت نے جال بن دیے ہیں مگر اپنے فرائض خوش اسلوبی سے پورے کر کے میں مطمئن ہوں۔

فسادِ عشق

محترم و مکرم مدیر اعلیٰ
سلام مسنون
میں نے جو کچھ لکھا ہے سو فیصد سچ لکھا ہے لیکن کچھ مجبوریاں آڑے آرہی تھیں اس لیے نام اور مقامات بدل دیے ہیں۔ لوگ کس طرح دوسروں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہی کچھ میری آپ بیتی میں نظر آئیں گی مگر برائی کا انجام سو فیصد برا ہوتا ہے۔ یہ میں نے بھی جانا ہے اور میری آپ بیتی میں بھی نظر آجائے گا۔

علی
(کراچی)

نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے ارسلان کو ٹیوشن پڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ارسلان شہر کے ایک کروڑ پتی صنعت کار احسان علی آغا کا پوتا تھا۔ احسان صاحب تجارتی حلقوں میں آغا جی کے نام سے مشہور تھے۔ اکثر اخبارات میں ان کی تصویریں بھی لگتی تھیں۔

ارسلان... انتہائی سرکش اور بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا۔ وہ انگلش میں تو ٹھیک تھا لیکن سوشل اسٹڈیز جیسا آسان

مضمون اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ ماہانہ ٹیسٹ میں ہمیشہ سوشل اسٹڈی اور اردو میں فیل ہو جاتا تھا۔

میں نے کئی بار اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اساتذہ کی باتوں پر تو وہ توجہ ہی نہیں دیتا تھا بلکہ اکثر وہ اساتذہ کی تضحیک کر دیتا تھا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں دل کھول کر اس کی پٹائی کروں لیکن اس اسکول میں پٹائی کی اجازت نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ ہم بچوں کو ڈانٹ سکتے تھے۔ ان پر جرمانہ کر سکتے تھے لیکن مار نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ اسکول میں وزیروں، سفیروں، بیوروکریٹس اور جاگیرداروں کے بچے پڑھتے تھے۔

میں ہر ٹیسٹ کے بعد بچوں کی کارکردگی کی رپورٹ ڈاک کے ذریعے بچوں کے گھر بھیج دیا کرتا تھا۔

ایک دن میں کلاس لے رہا تھا کہ اسکول کے چپراسی احمد خان نے مجھ سے کہا۔ ”سر! آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔“

میں اسکول کی پرنسپل کے پاس پہنچا تو میڈم کے آفس میں بارعب شخصیت والے ایک صاحب پہلے سے بیٹھے تھے۔ میڈم نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر علی! یہ آغا جی ہیں۔ آپ یقیناً ان سے واقف ہوں گے۔“ پھر میڈم نے میرا تعارف کرایا۔ ”آغا جی! یہ ارسلان کے کلاس ٹیچر علی ہیں۔“ میں نے آغا جی کو سلام کیا اور کہا۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی سر۔“

”میں تو آپ کو ارسلان کی پروگریس کے بارے میں بتا ہی چکی ہوں۔“ میڈم نے کہا۔ ”لیکن علی صاحب اس کے کلاس ٹیچر ہیں اس لیے یہ تفصیل سے آپ کو ارسلان کے بارے میں بتائیں گے۔“

میں نے انہیں بتایا کہ ارسلان اسکول کے ڈسپلن کی پابندی نہیں کرتا۔ اکثر اس کا ہوم ورک مکمل نہیں ہوتا۔ ٹیچر کی باتوں کو اہمیت نہیں دیتا اور وہ سوشل اسٹڈیز اور اردو میں بہت کم زور ہے۔

”آپ اسے اردو پڑھاتے ہیں؟“ آغا جی نے پوچھا۔

”نہیں سر، میں اسے انگلش اور سوشل اسٹڈیز پڑھاتا ہوں۔“

”اوکے، میں اس کی ٹیوٹر سے بات کروں گا اور کوشش کروں گا کہ آیندہ آپ لوگوں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ کھڑے ہو گئے۔ ”مجھے اب اجازت دیں کوشش کروں گا کہ آیندہ پیرنٹس، ٹیچر میٹنگ میں بھی شریک ہو سکوں۔“ ان کے جانے کے بعد میں بھی پرنسپل کے آفس سے باہر نکل آیا۔

دوسرے دن آغا جی نے مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں اگر آج چار بجے تک مجھ سے ملاقات کر لیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

میں جانتا تھا کہ آغا گروپ آف انڈسٹریز کا ہیڈ آفس آئی آئی چندریگر روڈ کی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں ہے۔ میں اسکول کی چھٹی کے بعد آغا صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ انہوں نے بہت پرتپاک انداز میں میرا خیر مقدم کیا اور کسی تمہید کے بغیر بولے۔ ”علی صاحب! کیا آپ ارسلان کو ٹیوشن پڑھا سکتے ہیں؟“ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر وہ بولے۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ بات اسکول کے رولز کے خلاف ہے لیکن اس کی آپ فکر مت کریں۔“

”سوری سر!“ میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”میں اسکول کے قواعد و ضوابط کو نہیں توڑ سکتا۔“

”میں آپ کو اتنی ہی ٹیوشن فیس دوں گا جتنی آپ کی تنخواہ ہے۔“

”نو سر۔“ میں نے انکار کر دیا۔

”اگر آپ کو اسکول کی طرف سے اجازت مل جائے تو؟“

”جی ہاں اس صورت میں تو پھر انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔“

”تو پھر آپ کب سے آرہے ہیں۔“

”مجھے اسکول سے کل این او سی مل جائے تو میں کل آجاؤں گا۔“

”کل آپ کو اسکول کی طرف سے این او سی مل جائے گی۔ آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں میرا ڈرائیور کل شام کو پانچ بجے آپ کو گھر سے لے لے گا۔“

دوسرے دن واقعی اسکول سے مجھے این او سی مل گئی اور پانچ بجے آغا جی کا ڈرائیور بھی پہنچ گیا۔

آغا جی میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے۔ ”ارسلان لاڈ پیار میں بہت بگڑ گیا ہے۔ بیٹے کے انتقال کے بعد میں نے پوتے کو اپنی محبت کا مرکز بنا لیا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔ اب اسے سدھارنا آپ کا کام ہے۔ اگر سختی بھی کرنا پڑے تو کریں۔ میری طرف سے اجازت ہے بس کوئی ہڈی نہ ٹوٹے۔“

انہوں نے مجھے اپنے اسٹڈی روم میں بٹھا دیا اور بولے۔ ”میں ارسلان کو بلاتا ہوں۔“

ارسلان نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بہت بے دلی سے مجھے سلام کیا۔ آغا جی مجھے اور ارسلان کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

وہ بہت ضدی اور سرکش بچہ تھا۔ اسے پڑھاتے ہوئے مجھے دانتوں پسینا آگیا۔ میں نے کبھی سختی سے کبھی پیار سے بالآخر اسے رام کر ہی لیا۔ دو مہینے بعد وہ پڑھائی میں خاصا تیز ہو گیا۔ میں اسے سوشل اسٹڈیز اور اردو پڑھایا کرتا تھا۔

سالانہ امتحانات ہوئے تو ارسلان نے کلاس میں پہلی پوزیشن لی۔ مجھے اپنی محنت کا ثمر مل گیا۔ آغا جی بھی مجھ سے بہت خوش تھے ارسلان بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور میں امی، ابو کو لے کر لاہور منتقل ہو گیا۔ اکثر ارسلان سے ٹیلی فون پر رابطہ ہو جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہو گیا۔

☆☆☆

پھر وقت کا پہیا بہت تیز رفتاری سے گھوما۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سال بیت گئے۔ اس دوران میں پہلے امی اور پھر ابو مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔ میری شادی ہو چکی تھی۔ میری طرح میری بیوی نورین بھی لیکچرر تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتی تھی۔

زندگی بہت پرسکون گزر رہی تھی۔ گلبرگ میں میرا چھوٹا سا خوب صورت گھر تھا۔ دو خوب صورت بچے نومی اور شینی تھے۔ میرا گھر جنت کا نمونہ تھا۔

اس دن میں کلاس لے کر کامن روم میں پہنچا ہی تھا کہ ہمارے پیون احمد خان نے مجھے بتایا کہ آپ کا ٹیلی فون ہے۔ ٹیلی فون باہر لابی میں تھا۔ میں نے وہاں جا کر ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ ”ہیلو۔“

”پروفیسر احسن صاحب بول رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے انگریزی میں پوچھا گیا۔

”جی ہاں، بول رہا ہوں، آپ کون؟“ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

”سر، میں ارسلان بول رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کیسے ہو ارسلان؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں سر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے ایک معاملے میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کیا آپ فوراً مجھ سے مل سکتے ہیں؟“

”ایسا کیا مسئلہ آگیا ارسلان؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”فوری طور پر تو میں کراچی نہیں آسکتا۔“

”میں لاہور ہی میں ہوں سر۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”یہاں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“

”پھر تو میں آج ہی تم سے مل سکتا ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”تھینک یو سر۔“ اس نے ممنونیت سے کہا اور ہوٹل کا نام بتا کر بولا۔ ”میں آج شام پانچ بجے تک آپ کا انتظار کروں گا۔“

☆......☆

ارسلان میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ لڑکے کی بجائے ایک بھرپور مرد تھا۔ وہ بہت والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔

میں نے سر سے پاؤں تک اس وجیہہ و خوبرو نوجوان کو دیکھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر گھنی سیاہ مونچھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

میں نے اس سے کہا۔ ”گھر کے ہوتے ہوئے تم ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو؟ اپنا سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ گھر چلو۔“

”میں کل کسی وقت واپس چلا جاؤں گا۔“ ارسلان نے کہا۔ ”آیندہ آؤں گا تو آپ ہی کے گھر ٹھہروں گا۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”آپ کیا لیں گے چائے، کافی یا کولڈ ڈرنک؟“

”ان تکلفات میں مت پڑو۔“ میں نے کہا۔

”تکلف کیسا سر۔“ ارسلان مسکرایا۔ پھر اس نے روم سروس کو کافی اور دیگر لوازمات کا آرڈر دے دیا۔

”تم یہ بتاؤ کہ آغا جی کیسے ہیں؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر افسوس سے بولا۔ ”آپ شاید اخبار نہیں پڑھتے نہ ٹی وی دیکھتے ہیں؟ چھ مہینے پہلے ابو کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”وہاٹ؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس خبر سے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ آغا جی بہت بڑے بزنس مین تو تھے ہی ساتھ ہی وہ بہت بڑے انسان بھی تھے۔ میں ارسلان کو پڑھا کر فارغ ہوتا تو وہ اکثر میرے پاس ہی آجایا کرتے تھے۔ لوگ انہیں سخت گیر اور مغرور سمجھتے تھے لیکن مجھے وہ اپنے گھر کا ایک

فرد سمجھتے تھے۔

میں چند لمحے کے لیے بالکل گم صم ہو کر رہ گیا۔

اس خاموشی کو ارسلان نے توڑا۔ ”سر! میں اس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔ ان حالات میں آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

”کیسی مصیبت ارسلان؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”سر...... پرسوں میں نے رمشا سے کورٹ میرج کر لی ہے۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔ اس میں پریشانی کیسی؟“

رمشا کے ڈیڈی نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ وہ نہ صرف بہت بڑے اور قابل بیرسٹر ہیں بلکہ موجودہ حکومت کے ایم این اے بھی ہیں۔ انہوں نے پولیس اور دوسری خفیہ ایجنسیوں کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔

”رمشا کی عمر کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اس سال جولائی میں انیس سال کی ہو جائے گی۔ اس کا شناختی کارڈ بن چکا ہے۔“ ارسلان نے کہا۔

”تو پھر تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ تم کوئی ایرے غیرے تو ہو نہیں کہ پولیس تمہیں بھیڑ بکری کی طرح ہانکتی ہوئی لے جائے گی۔ تم ملک کے ایک ارب پتی بزنس مین ہو۔ اچھے سے اچھا وکیل کر سکتے ہو بلکہ قابل اور معروف وکیلوں کی ایک فوج کھڑی کر سکتے ہو۔“

”وہ تو میں کر لوں گا سر لیکن فی الحال تو بیرسٹر صاحب نے مجھ پر کورٹ تک پہنچنے کے دروازے بھی بند کر دیے ہیں۔“ ارسلان نے کہا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر انہوں نے مجھے ایک دفعہ پکڑ لیا تو پھر وہ رمشا ہی پر دباؤ ڈال کر اسے میرے خلاف کورٹ میں کھڑا کر دیں گے۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”آپ رمشا کو کچھ دن کے لیے یہاں چھپا لیں۔ میں آج رات کی فلائٹ سے کراچی جا رہا ہوں۔“

”رمشا کہاں ہے؟“

”وہ یہیں موجود ہے سر۔“ ارسلان نے ایک اور دھماکا کر دیا۔ پھر اس نے بلند آواز میں رمشا کو پکارا۔ ”رمشا یہاں آؤ۔ گھبراؤ مت! یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔“

دوسرے ہی لمحے ایک لڑکی عقبی کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کے حسن بلاخیز سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ متناسب قد و قامت، پُرکشش چہرہ، سرخ و سفید رنگت، چمک دار براؤن بال، وہ گویا حسن مجسم تھی۔ اتنی خوب صورت لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

”یہ میرے سر بھی ہیں اور بڑے بھائی بھی، یہ احسان سر ہمارے گھر کے ایک فرد کی طرح ہیں۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”سر! یہ رمشا ہے۔“

رمشا نے اپنی خوب صورت اور گھنی پلکیں جھپکتے ہوئے مجھے سلام کیا۔ اس کی آواز میں ایک نغمگی تھی۔ وہ نپے تلے قدم رکھتی ہوئی وہاں پہنچی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ادا سے اپنے سر کو جنبش دے کر پیشانی پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو ہٹایا اور مسکرا کر بولی۔ ”سر! ارسلان سے آپ کی تعریف تو بہت سنی تھی۔ آج دیکھ بھی لیا۔ میں سمجھتی تھی کہ آپ عمر میں ارسلان سے کافی بڑے ہوں گے لیکن آپ تو بالکل ینگ ہیں۔“

”اب میں اتنا بھی کم عمر نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”سر! مجھے تھوڑی دیر بعد کراچی کی فلائٹ پکڑنا ہے۔“ ارسلان نے کہا۔ ”رمشا میری امانت ہے۔ اس کا خیال رکھیے گا۔“

”اس کی فکر اب تم مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تم واپس کب تک آؤ گے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ ارسلان نے کہا۔ ”ممکن ہے میری واپسی ایک ہفتے بعد ہو جائے یا ممکن ہے مجھے مزید کچھ دن لگ جائیں۔“

”او کے!“ میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ”تمہاری واپسی تک رمشا کی حفاظت میری ذمے داری ہے۔“

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں رمشا کو اپنے گھر لے کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس پر نورین کو کسی قسم کا اعتراض ہوتا بس میں رمشا کو اپنے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔

”کیوں پریشان ہو گئے سر؟“ ارسلان نے کہا۔ ”اگر آپ کو یہ کام مشکل لگ رہا ہے تو رہنے دیں میں کسی اور......؟“

”یہ بات نہیں ہے ارسلان۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا پھر میں نے رمشا سے کہا۔ ”چلو۔“

رمشا لچکتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی وہ دراصل ہوٹل کا سویٹ تھا جس میں بیڈ روم کے ساتھ ایک ڈریسنگ روم بھی ہوتا ہے۔ وہ بڑا سا ایک سوٹ کیس کھینچتی ہوئی باہر آ گئی۔

سوٹ کیس میں نیچے کی طرف پہیے لگے ہوئے تھے۔ ارسلان نے رمشا سے وہ سوٹ کیس لے لیا اور ہمیں لفٹ تک چھوڑ گیا۔

میں ہوٹل سے باہر نکلا تو یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ رمشا کو کہاں لے جاؤں۔ وہ بے نیازی سے زیرِ لب گنگنا رہی تھی۔

”تم نے تو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”کھانا تو میں نے دوپہر کو بھی نہیں کھایا تھا۔“ رمشا نے مترنم آواز میں کہا۔ ”اس وقت شدید بھوک لگ رہی ہے۔“

بھوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی۔ میں نے گاڑی کا رخ لاہور کے ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ کی طرف موڑ دیا۔

کھانا کھاتے ہوئے مجھے اچانک اپنے ایک ساتھی ٹیچر کا خیال آیا۔ وہ انتہائی مخلص اور یاروں کا یار تھا۔ اسے درس و تدریس کا محض شوق تھا۔ وہ گجرات کے ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کی بیوی بچے گاؤں میں رہتے تھے۔ گلبرگ میں اس کا ایک بنگلا تھا۔ وہ یہاں اپنے دو تین ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔

”رمشا!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”اگر تم برا نہ مانو تو میں کچھ ذاتی نوعیت کے سوالات کر لوں؟“

”سر میں آپ کی کسی بات کا برا کیوں مانوں گی؟“ اس نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

”تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا؟“

میرے سوال سے وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خود پر قابو پا لیا اور بولی۔ ”ارسلان نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ارسلان سے بات کرنے کا مجھے موقع ہی کب ملا ہے۔“

”آپ نے کچھ کھایا نہیں؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”میں تم سے زیادہ ہی کھا گیا ہوں بے بی۔“ میں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

”بے بی؟“ وہ بھنویں اچکا کر بولی۔ ”میں آپ کو بے بی لگتی ہوں؟“

”میرے لیے تو بے بی ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ میری بات پر برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔ اس نے بہت ذہانت سے موضوع بدل دیا تھا۔ میں نے پھر ایک مرتبہ پوچھا۔ ”رمشا! تم نے بتایا نہیں کہ تمہاری اور ارسلان کی شادی کب ہوئی ہے؟“

اس نے پُرخیال انداز میں مجھے دیکھا۔ پھر سرد لہجے میں بولی۔ ”ابھی تک ہماری شادی نہیں ہوئی ہے۔“

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں رہ گیا۔ کوئی عام لڑکی ہوتی تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی لیکن وہ نہ صرف ایک معروف بیرسٹر کی بیٹی تھی بلکہ اس کے والد حکمران پارٹی کے ایم این اے بھی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اب تک رمشا کے اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا ہو گا۔ اچانک ہی مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو رمشا!“ میں نے کہا۔ ”ہمارا یہاں دیر تک بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“

وہ کم بخت اتنی حسین اور پُرکشش تھی کہ اسے ایک بار دیکھنے والا بھول ہی نہیں سکتا تھا۔

میں اسے گاڑی میں بٹھا کر سیدھا گلبرگ روانہ ہو گیا۔ ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اکبر اس وقت سو چکا ہو گا۔ میں نے اس کے بنگلے کے سامنے گاڑی روکی اور ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز سن کر آہنی گیٹ کی ذیلی کھڑکی کھلی اور اندر سے اس کے چوکیدار نے جھانکا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا اس لیے فوراً باہر آ گیا اور بولا۔

”صاب! چودھری صاحب تو سو گئے ہیں جی۔“

”وہ اگر سو گئے ہیں تو انہیں اٹھاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔“

”اچھا صاب! میں کرم داد سے کہتا ہوں۔“ کرم داد اکبر کا ملازم تھا۔ ”آپ گاڑی اندر تو لے آئیں۔“ چوکیدار نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ اکبر ابھی اٹھ کر آ جائے گا۔ میں پورچ میں پہنچ کر گاڑی سے اترا ہی تھا کہ اکبر دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل آیا۔ اس کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ اسے گہری نیند سے جگایا گیا ہے۔

”احسن! خیریت تو ہے...... تم اس وقت؟“

”سب خیریت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

رمشا ابھی تک گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اکبر

کی نظر اس پر پڑی تو وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ''یار! یہ لڑکی کون ہے؟''

''تم اندر تو چلو میں سب کچھ بتا دوں گا۔'' پھر میں نے رمشا کو گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا تو رمشا گاڑی سے اتری اور اشتعال انگیز چال چلتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔

اکبر ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

''یہ میری ایک عزیزہ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کچھ دن یہیں رہیں گی۔ تم ان کے لیے کمرے کا بندوبست کراؤ پھر اطمینان سے بات کریں گے۔''

اکبر نے اس وقت اپنے ملازم سے کہا کہ ان بی بی کو گیسٹ روم میں لے جاؤ اور گاڑی سے ان کا سوٹ کیس اتار کر ان کے کمرے میں پہنچا دو۔

رمشا کے جانے کے بعد اکبر نے مجھ سے پوچھا۔

''احسن! اب بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ تم اس خوب صورت اور کم سن لڑکی کو کہاں لیے گھوم رہے ہو اور کیوں؟''

میں نے اکبر کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ اسے بتا کر میرے ذہن سے بوجھ خاصا کم ہو گیا۔

اکبر اضطراری انداز میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''یہ تو بہت غلط ہوا۔ ہم اس لڑکی کو یہاں بھی نہیں رکھ سکتے۔ میں اسے ابھی اور اسی وقت گاؤں بھجوا رہا ہوں۔''

''ایسی کیا آفت آ گئی اکبر؟'' میں نے کہا۔

''تمہیں بیرسٹر مسعود احمد خان کے اثر رسوخ کا اندازہ نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ وہ حکمران پارٹی کا ایم این اے اور ملک کے چند بڑے وکلا میں اس کا شمار ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''تم شاید یہ نہیں جانتے کہ وہ جتنا معروف ہے اتنا ہی سخت گیر اور کم ظرف بھی ہے۔ اگر پولیس نے رمشا کو تمہاری تحویل سے برآمد کر لیا تو تمہاری عزت اور ملازمت تو جائے گی ہی تمہیں جیل کی ہوا بھی کھانا پڑے گی۔''

''لیکن اکبر وہ ارسلان......''

''ارسلان تو بہت اطمینان سے کہہ دے گا کہ رمشا میرے پاس نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ پولیس اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔'' اکبر نے کہا۔ ''ہاں اگر ارسلان نے کورٹ میرج کر لی ہوتی تو بات دوسری تھی۔ میں رمشا کو ابھی اور اسی وقت گاؤں بھیج رہا ہوں۔''

''لیکن تم اپنے گھر والوں سے کہو گے کیا؟''

''وہ بعد کا مسئلہ ہے۔'' اکبر نے کہا اور کرم داد کو آواز دی۔

''جی چودھری صاحب۔'' کرم داد چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

''کرم داد! جیپ نکالو اور اس لڑکی کو لے کر گاؤں روانہ ہو جاؤ۔ کوشش کرنا کہ گاڑی میں اسے کوئی نہ دیکھے۔ اسے علی خان کے حوالے کر دینا۔ میں اسے ٹیلی فون پر سمجھا دوں گا کہ اسے کیا کرنا ہے۔''

''جی چودھری صاحب۔'' کرم داد الٹے قدموں لوٹ گیا۔

روانگی سے پہلے اس نے رمشا کو بھی ہدایت کی کہ اپنا چہرہ چھپا کر رکھنا اور میرے آدمیوں سے تعاون کرنا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' رمشا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ارسلان نے مجھے احسن صاحب کے حوالے کیا تھا اور......''

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اکبر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب تک تمہارے باپ نے تمہارے اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا ہو گا اور پولیس تمہاری تلاش میں ہو گی۔ اب اگر تم ہماری بات نہیں مانو گی تو احسن صاحب خود تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔''

''تمہارے پاس ارسلان کا سیل نمبر ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ذرا اس سے میری بات کراؤ۔''

رمشا نے بیگ سے سیل فون نکالا اور ارسلان کا نمبر ملا لیا۔ اس نے دو تین دفعہ کوشش کی پھر تشویش ناک لہجے میں بولی۔ ''ارسلان کا سیل فون بند ہے۔'' اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ ''اب میں کیا کروں؟'' رمشا نے بے بسی سے کہا۔

''تم ارسلان کے ساتھ اپنی مرضی سے آئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' رمشا نے کہا۔ ''ارسلان مجھے میری مرضی کے بغیر کیسے لا سکتا ہے؟ ہمیں کراچی میں کورٹ میرج کرنے کا موقع نہیں ملا اس لیے ہم یہاں آ گئے۔''

''تو پھر ارسلان تمہیں چھوڑ کر کیوں گیا۔ کورٹ میرج تو یہاں بھی ہو سکتی ہے۔''

اچانک رمشا کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر دیکھا پھر بڑبڑائی۔ ''کوئی اجنبی نمبر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کال ریسیو کر لی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ارسلان تم کہاں ہو میں کب سے تمہیں کال کر رہی ہوں...... ہاں میں ان ہی کے ساتھ ہوں...... کیوں؟...... ہاں بات کرو۔'' اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کہا ''ہیلو۔ ہاں ارسلان بولو۔''

''سر! میں بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ......''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''رمشا نے مجھے بتا دیا ہے۔''

''اب بیرسٹر صاحب نے میرے خلاف رمشا کے اغوا کی رپورٹ درج کرا دی ہے، پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے۔''

''تو تم پولیس سے چھپ کیوں رہے ہو بے وقوف۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''تم نے تو اپنا کیس خود خراب کر لیا ہے۔ تم ابھی پولیس سے ملو اور پوچھو کہ اسے تمہاری تلاش کیوں ہے؟''

''تاکہ پولیس مجھے اغوا کے الزام میں بند کر دے۔'' ارسلان نے درشت لہجے کہا۔

''تو پھر میں اس لڑکی کا کیا کروں؟'' میں نے پھر کہا۔ ''پولیس تو اس کی تلاش میں یہاں بھی پہنچ جائے گی۔'' پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''میں اس لڑکی کو پولیس کے حوالے کر رہا ہوں پھر تم جانو اور پولیس جانے۔'' میں نے سیل فون رمشا کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''میں...... پولیس کے پاس نہیں جاؤں گی۔ ڈیڈی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' رمشا نے روتے ہوئے کہا۔

''تم پولیس کے پاس نہیں جاؤ گی تو پولیس تمہارے پاس آ جائے گی بی بی۔'' اکبر بھی جھنجلا گیا۔

''مجھے ایک دن کی مہلت دے دیں۔'' رمشا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''میں ارسلان سے ایک مرتبہ پھر بات کروں گی۔ اگر اسے پولیس نے پکڑ لیا تو آپ مجھے بھی پولیس کے حوالے کر دیں۔''

''تم عجیب بات کر رہی ہو۔'' اکبر نے کہا۔ ''تم اپنے ہونے والے شوہر کی گرفتاری کا انتظار کر رہی ہو؟''

''میری کچھ مجبوریاں ہیں۔'' رمشا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''پلیز مجھے ایک دن کی مہلت دے دیں۔''

''ایک دن کا مطلب ہے چوبیس گھنٹے؟'' میں نے کہا۔ ''اتنی دیر میں تو پولیس امریکا پہنچ سکتی ہے۔''

رمشا نے میرے طنزیہ لہجے کو محسوس کر لیا۔ وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''آپ یقین کریں پولیس کبھی آپ تک نہیں پہنچ سکے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اکبر نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''میں تمہیں اپنے گاؤں بھجوا رہا ہوں صرف چوبیس گھنٹے کے لیے پھر ہم تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔''

''آپ کا بہت شکریہ۔'' رمشا نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

رمشا کو روانہ کرنے کے بعد اکبر نے اپنے کارندے علی خان سے بات کی اور اسے ہدایت کی تھی کہ اس لڑکی کو گاؤں میں بھی مت رکھنا بلکہ زمینوں پر لے جا کر کہیں چھپا دینا اور دھیان رکھنا، وہ وہاں سے بھاگنے نہ پائے۔

اس چکر میں رات خاصی بیت چکی تھی۔ دو دفعہ میری بیوی کی کال آ چکی تھی۔ میں نے اسے مطمئن کر دیا تھا کہ میں اکبر کے ساتھ ہوں۔ ہم لوگ کچھ ضروری کام کر رہے ہیں۔ میں نے رمشا سے ارسلان کا وہ سیل نمبر بھی لے لیا تھا جس سے اس نے بات کی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب میں بھی چلوں۔'' میں نے اکبر سے کہا۔ ''صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔''

☆☆☆

میں گھر پہنچا تو نورین میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ میرے چہرے پر پریشانی دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے احسن سب خیریت تو ہے؟''

''ہاں سب خیریت ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ کچن کی طرف جانے لگی تو میں نے اس سے کہا۔ ''میں کھانا کھا چکا ہوں۔''

''آپ بتائیں تو سہی کیا پریشانی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' میں جبراً مسکرایا۔ ''بس آج تھکن کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔''

صبح حسبِ عادت میری آنکھ علی الصبح کھل گئی۔ میں معمول کے مطابق جوگنگ کرنے نکل گیا۔

یونیورسٹی جانے سے پہلے میں ناشتا کرتے ہوئے اخبار پر سرسری سی نظر ڈالتا تھا۔ میں نے سلائس کھاتے

ہوئے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ ایک سرخی پر میری نظریں جم کر رہ گئیں۔ میں نے اس خبر کو دوبارہ پڑھا۔

ممبر قومی اسمبلی بیرسٹر مسعود خان کی اکلوتی بیٹی کا اغوا۔ پولیس کا خیال ہے کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ پولیس رمشا کے کلاس فیلوز اور دوستوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

اس خبر میں کہیں ارسلان کا نام نہیں تھا۔ یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث تھی۔

میں یونیورسٹی پہنچا تو اکبر بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے بھی خبر پڑھ لی تھی۔ اس نے مجھے سرحد کا ایک کثیر الاشاعت اخبار دکھایا اور بولا۔ ''اس اخبار میں نہ صرف رمشا کی تصویر ہے... بلکہ اس میں ارسلان کا نام بھی ہے۔ اخبار کے رپورٹر نے خبر دی تھی کہ رمشا کو آخری بار ملک کے معروف صنعت کار ارسلان آغا کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ پولیس نے ان سے رابطے کی کوشش کی لیکن ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اغوا کے شبے میں پولیس نے تین لڑکوں کو حراست میں لے لیا ہے۔

میں اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ اکبر کلاس لینے چلا گیا۔

میں نے سیل فون پر ارسلان کا نمبر ملایا۔ مجھے اس پر شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس مصیبت میں ڈال کر تم کہاں چلے گئے؟''

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں کچھ دن میں واپس آؤں گا۔ رمشا کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''رمشا ابھی تک تو ٹھیک ہے۔ تم خود ہی اس سے بات کر لو لیکن پہلی فرصت میں لاہور پہنچو تم جانتے ہو کہ رمشا کے اغوا کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''لیکن آپ ٹینشن مت لیں۔ میں کچھ ضروری کاموں میں مصروف تھا۔ آج پولیس سے ملاقات کر کے اپنی پوزیشن صاف کر دوں گا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''بس آپ رمشا کا خیال رکھیے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس صورتِ حال سے کیسے نمٹوں؟ اکبر کلاس لے کر آیا تو میں نے اس سے بات کی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ تم خود کراچی چلے جاؤ۔ بھابی اور بچوں کو بھی لے جاؤ۔ ویسے بھی تمہاری سسرال تو کراچی میں ہی ہے۔ وہاں جا کر ارسلان سے ملو اور اسے بتا دو کہ اگر دو دن کے اندر اندر اس نے رمشا کو واپس نہ لیا تو ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔

مجھے اکبر کا مشورہ مناسب لگا۔ میرا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ کلاس سے فارغ ہو کر چھٹی کی درخواست لکھوں گا۔

میں کلاس سے فارغ ہو کر کافی روم میں پہنچا تو اکبر وہاں موجود تھا۔ وہ مجھے لے کر باہر لان میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے تاثرات تھے۔

''کیا ہوا اکبر! خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے یار!'' اکبر نے بتایا۔ ''ابھی ابھی علی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ رمشا وہاں سے فرار ہو گئی ہے۔''

''فرار ہو گئی ہے؟'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

''اپنے حواس میں رہو احسن۔'' اکبر نے کہا۔ ''اور آہستہ بولو۔ لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔''

''لیکن...... اب میں ارسلان سے کیا کہوں گا؟''

''جو حقیقت ہے۔ اسے بتا دینا۔'' اکبر نے کہا۔ ''میرے آدمی اسے تلاش کرنے کی کوشش تو کر رہے ہیں۔''

میں لان میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔

''حوصلہ رکھو احسن!'' اکبر نے کہا۔ ''تم تو ابھی سے ہمت ہار گئے۔''

''یار تم تو اس قسم کے واقعات کے عادی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے لیے تو یہ سب کچھ بہت تکلیف دہ ہے۔''

''بس دعا کرو کہ رمشا خیریت سے ہو اور وہ اس علاقے کے کسی ڈاکو کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''

میں نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اکبر کو دیکھا۔

''ڈاکو......!!''

''ہاں یار، ہماری جاگیر سے باہر درختوں کا ایک گھنا جنگل ہے۔ جہاں آج کل ڈاکوؤں کا راج ہے۔''

اکبر کی اس بات سے میں مزید خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے کراچی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں اب کراچی جا کر کرتا بھی کیا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے احسن۔'' اکبر نے کہا۔ ''ایسا کرو ابھی تم گھر جا کر آرام کرو۔''

میں گھر پہنچا تو حتی الامکان خود کو سنبھال چکا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی نورین چہک کر بولی۔ ''اوہو آج تو آپ جلدی آ گئے۔ کیا آپ کو معلوم تھا کہ آج مجھے شاپنگ کرنا ہے؟''

''شاپنگ!'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کس سلسلے میں؟''

''آپ کو بتایا تو تھا کہ شاہین کی شادی ہو رہی ہے۔'' نورین نے کہا۔ شاہین اس کی چھوٹی بہن تھی۔ ''آپ چھٹی لے لیں۔ ہم کل کراچی جائیں گے۔''

''شادی کب ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو۔'' نورین نے کہا۔ ''لیکن کم سے کم ہمیں ایک ہفتے پہلے تو جانا چاہیے؟''

''ایسا کرو تم چلی جاؤ، میں دو تین دن بعد آ جاؤں گا۔''

نورین میرے بغیر جانے پر راضی نہیں تھی۔ میں نے بہت مشکل سے اسے راضی کیا اور پہلی فرصت میں ان لوگوں کو کراچی روانہ کر دیا۔

اسے رخصت کرنے کے بعد میں ائرپورٹ سے سیدھا یونیورسٹی پہنچا تو اپنے کمرے میں ارسلان کو دیکھ کر شدید دھچکا لگا۔

وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور مسکرا کر بولا۔ ''سر آپ کو بہت ٹینشن تھی۔ لیجیے میں آ گیا۔ اب آپ کی ٹینشن ختم۔''

''ہاں۔'' میں نے غائب دماغی کی کیفیت میں کہا۔

''اب آپ کو ایک آخری کام اور کرنا ہوگا۔ ہم دونوں کی کورٹ میرج کا بندوبست کر دیں۔''

''تم چائے پیو گے؟'' میں نے کہا۔ مجھے اس کی باتوں سے وحشت ہو رہی تھی۔

''چائے نہیں کافی پیوں گا سر۔'' ارسلان کھڑا ہو کر بولا۔

میں نے پیون کو بلا کر کافی کے لیے کہا اور اس سے کہا کہ اکبر صاحب کو یہاں بھیج دینا۔

ہم کافی پی ہی رہے تھے کہ اکبر آ گیا۔ میں نے ارسلان سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے رمشا کو اکبر صاحب کے گاؤں بھجوا دیا تھا۔

''گڈ!'' ارسلان نے ہنس کر کہا۔ ''رمشا نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا تھا۔ اس بہانے وہ گاؤں بھی دیکھ لے گی۔''

''ارسلان صاحب...... بات یہ ہے کہ......''

''کیا بات ہے اکبر صاحب؟'' ارسلان نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''کیا رمشا وہاں خوش نہیں ہے؟''

''بات یہ ہے...... کہ...... رمشا وہاں سے فرار ہو گئی۔'' اکبر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہاٹ؟'' ارسلان چیخ پڑا۔ ''اسے تو گاؤں کے راستوں کا بھی علم نہیں ہوگا۔''

''لیکن اب وہ وہاں نہیں ہے۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' ارسلان نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں نے رمشا کو آپ کے حوالے کیا تھا سر۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے رمشا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ وہاں سے فرار ہو گئی ہے۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''آئی ڈونٹ نو۔'' ارسلان نے بلند آواز میں کہا۔ ''مجھے رمشا چاہیے ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' اکبر نے بھی درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ سے بات نہیں کر رہا ہوں۔'' ارسلان نے اسے جھڑک دیا۔ ''احسن صاحب!'' اس نے تمام تعلقات بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے نام سے مخاطب کیا۔ ''میں آپ کو صرف دو گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ رمشا کو میرے حوالے کر دیں۔''

''احمق لڑکے۔'' میں بھی بھنا گیا۔ ''رمشا میرے پاس نہیں ہے۔ ہاں ہمارے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے وہ دس منٹ میں مل جائے ممکن ہے وہ دو دن میں ملے......''

''اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کبھی نہ ملے۔'' ارسلان نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہ بھی ممکن ہے۔'' اکبر نے کہا۔

''میں صرف دو گھنٹے انتظار کروں گا۔ پھر پولیس میں رپورٹ درج کرا دوں گا۔''

''کس بات کی رپورٹ درج کراؤ گے؟'' اکبر نے پوچھا۔

''رمشا کے اغوا کی۔'' ارسلان نے سرد لہجے میں کہا۔

''کون رمشا؟'' اکبر نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''ہم کسی رمشا کو نہیں جانتے۔''

''وہ تو آپ پولیس کو بتائیے گا۔'' ارسلان نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تم رپورٹ کب درج کراؤ گے۔'' میں نے کہا۔

''میں ابھی رمشا کے باپ سے بات کرتا ہوں اور اسے بتاؤں گا کہ تم رمشا کو کراچی سے اغوا کر کے لائے تھے۔''

ارسلان چند لمحے تک خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ ''او کے آپ اپنے بارے میں سوچیں میں پولیس کے پاس جا رہا ہوں۔''

''شوق سے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

ارسلان پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یار اکبر!'' میں نے کہا۔ ''یہ کیا بیٹھے بٹھائے مصیبت گلے پڑ گئی۔ کیا میں کسی وکیل سے بات کروں؟''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''اگر وکیل کی ضرورت پڑی بھی تو میرے پاس کئی اچھے وکیل ہیں۔ اب تم سب کچھ بھول جاؤ۔ ہاں میں نے سنا ہے کہ بال بچے کراچی چلے گئے؟''

''ہاں یار، سالی کی شادی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر تم اپنے گھر جانے کی بجائے میرے گھر چلنا۔''

اس دن کسی کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا لیکن اکبر نے کہا تھا کہ آج یونیورسٹی سے جانا مت۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔

میں نے اس کے بعد کوئی کلاس بھی نہیں لی۔ بس اپنے کمرے میں بیٹھا وقت گزاری کے لیے کمپیوٹر پر مختلف چیزیں سرچ کرتا رہا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر میں اکبر کے ساتھ اس کے گھر آ گیا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن میرا دل کسی بھی بات میں نہیں لگ رہا تھا۔

''تم اتنے پریشان کیوں ہو احسن؟'' اکبر نے کہا۔ ''ارسلان نے محض دھمکی دی ہے۔ وہ تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرے گا تو خود بھی پھنسے گا۔ وہ پولیس سے کیا کہے گا کہ رمشا تم تک کیسے پہنچی؟''

''یار! وہ پیسے والا آدمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پیسے کے بل پر سب کچھ خرید سکتا ہے۔''

''تو پھر اسے خریدنے دو۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں بھی تو دیکھوں کہ اس کا پیسا کتنا کام آتا ہے۔''

اکبر نے زبردستی مجھے چائے پلائی حالانکہ میرا موڈ بالکل نہیں تھا۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے الجھن آمیز لہجے میں کال ریسیو کرلی۔

''احسن صاحب!'' دوسری طرف سے کوئی انتہائی مہذب انداز میں بولا۔

''جی بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں سب انسپکٹر وسیم بول رہا ہوں۔ مجھے فوری طور پر آپ سے ملاقات کرنا ہے کیا آپ پولیس اسٹیشن تک آنے کی زحمت کر سکتے ہیں۔''

''ایسی کیا بات ہے انسپکٹر صاحب!'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر اکبر چونک اٹھا۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے سر؟'' اس کا مہذب انداز برقرار تھا۔ پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ مصروف ہیں تو میں حاضر ہو جاؤں؟''

''نہیں انسپکٹر! آپ زحمت نہ کریں۔ میں پولیس اسٹیشن آ رہا ہوں۔'' میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''یہ انسپکٹر کیا کہہ رہا تھا؟'' اکبر نے پوچھا۔

''مجھے پولیس اسٹیشن بلا رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور وہ انسپکٹر نہیں بلکہ سب انسپکٹر ہے وسیم۔''

''چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔'' اکبر نے کہا۔

☆☆☆

ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو وہاں کئی پولیس افسر تھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے وسیم کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ کمرے میں سوائے ایک میز، دو تین کرسیوں اور ایک سائیڈ ریک کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میز پر کچھ فائلیں، ٹیلی فون سیٹ اور چائے کے خالی کپ رکھے ہوئے تھے۔

ابھی میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دروازے سے ایک سب انسپکٹر داخل ہوا۔ وہ خاصا کم عمر تھا۔ اس کی سرخ و سفید رنگت پر گھنی مونچھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اپنے کسرتی بدن اور چال ڈھال سے وہ پولیس سے زیادہ آرمی کا کوئی افسر لگ رہا تھا۔

اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''احسن صاحب!''

''جی ہاں، میں احسن ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ گھوم کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھا اور بولا۔ ''بے وقت زحمت کی معذرت چاہتا ہوں، احسن صاحب۔''

''اب تو میں آ ہی گیا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

اس کے مہذب لہجے سے میرا اعتماد بہت حد تک بحال ہو چکا تھا۔ ''فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟''

''احسن صاحب! بات بہت عجیب ہے آپ جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نفیس آدمی سے کہتے ہوئے بھی مجھے شرمندگی ہو رہی ہے لیکن......''

''زیادہ سسپنس پیدا مت کریں آفیسر۔'' میں نے کہا۔ ''جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالیں۔''

''آپ نے کبھی بیرسٹر مسعود خان کا نام سنا ہے؟''

''انہیں کون نہیں جانتا۔ وہ ملک کے مانے ہوئے قانون داں اور اب تو ایم این اے بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں وہی بیرسٹر صاحب!'' وسیم نے کہا۔ ''گزشتہ دنوں ان کی اکلوتی بیٹی اغوا ہو گئی تھی۔ انہیں شبہ ہے کہ اس کے اغوا میں آپ کا ہاتھ ہے۔''

''تو آپ نے محض شبے کی بنیاد پر احسن صاحب کو یہاں بلایا ہے؟'' اکبر نے درشت لہجے میں کہا۔

''پوچھ کچھ کرنا تو ہمارا فرض ہے سر۔'' وسیم کا لہجہ ابھی تک مہذب تھا۔ ''میں نے تو احسن صاحب سے کہا تھا کہ میں خود حاضر ہو جاتا ہوں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''احسن صاحب! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ لڑکی کہاں ہے؟''

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اکبر نے مجھے روک دیا اور بولا۔ ''آپ کی معلومات ادھوری ہیں۔ میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں کہ وہ لڑکی کہاں ہے؟''

پھر اکبر نے اسے بتایا کہ احسن کا ایک شاگرد ارسلان اس لڑکی کو کراچی سے لایا تھا۔ اس نے احسن کو بتایا کہ میں نے رمشا سے کورٹ میرج کرلی ہے اور کسی وجہ سے رمشا کو چند روز کے لیے چھپانا چاہتا ہوں۔

''میرے خیال میں اگر یہ بیان احسن صاحب دیں تو زیادہ مناسب ہے۔'' انسپکٹر کا لہجہ اچانک سرد ہو گیا۔

''میں نے لڑکی کو یہاں رکھنے سے صاف انکار کر دیا اور احسن سے معذرت کرلی۔ وہ کافی دیر تک اصرار کرتا رہا پھر مایوس ہو کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔''

''ارسلان کا بیان ہے کہ اس نے رمشا کو آپ کے حوالے کیا تھا۔''

''یہ ارسلان کا بیان کہاں سے آ گیا۔ رپورٹ تو بیرسٹر صاحب نے درج کرائی تھی؟'' اکبر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''دیکھیے آپ لوگ معزز اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔'' وسیم کے تیور بگڑ گئے۔ ''آپ لوگ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اس لیے میں آپ پر سختی کرنے سے گریز کر رہا ہوں ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' احسن نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''گرفتار کرو گے احسن صاحب کو! ان پر تشدد کرو گے؟''

''اگر انہوں نے سیدھی طرح نہ بتایا تو مجھے یہ سب کچھ کرنا ہو گا۔ دوسری بات یہ کہ سوال کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔ میں آپ کو یہ بتانے کا پابند نہیں ہوں کہ ارسلان کا بیان میرے پاس کہاں سے آیا؟''

''کیا آپ مجھے اریسٹ کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو شاید مجھے ایسا بھی کرنا پڑے۔'' وسیم کا لہجہ بھی درشت ہو گیا۔

اکبر نے جیب سے سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملا کر بولا۔ ''کرم داد حامد علی ہاشمی ایڈووکیٹ سے کہو کہ وہ ابھی فوراً پولیس اسٹیشن پہنچیں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے دوسرا نمبر ملایا اور بولا۔ ''آئی جی صاحب سے بات کراؤ۔ میں چودھری اظہر کا بیٹا چودھری اکبر بول رہا ہوں......سو گئے ہیں......تو پھر انہیں اٹھا دو۔ میں لائن پر ہوں۔''

''چودھری صاحب! اتنی جلدی نہ کریں۔'' وسیم نے کہا۔

احسن نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بولا۔ آئی جی صاحب! آپ کو اس وقت پریشان کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ ہاں خاص ہی سمجھیں......یہ سب انسپکٹر وسیم میرے ایک دوست کو کسی لڑکی کے اغوا کے شبے میں گرفتار کر رہے ہیں......نہیں! وہ کوئی پٹواری یا ریڑھی والا نہیں ہے بلکہ پنجاب یونیورسٹی کا ایک باعزت پروفیسر ہے......جی ہاں......پھر اس نے وسیم سے کہا۔ ''آئی جی صاحب سے بات کریں۔''

وسیم کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس نے ان کے ہاتھ سے سیل فون پکڑا اور بولا۔ ''یس سر! نو سر ابھی اریسٹ تو نہیں کیا ہے لیکن کیس بیرسٹر مسعود خان صاحب کی بیٹی کا ہے......او کے سر!'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سیل فون اکبر کو دے کر رومال سے اپنے چہرے کا پسینا خشک کرنے لگا۔ وہ چند لمحے تک کھوئے کھوئے سے انداز میں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ''آپ لوگ جا سکتے ہیں لیکن پلیز لاہور چھوڑنے سے پہلے مجھے اطلاع ضرور دیجیے گا۔''

''ایک منٹ۔'' اکبر نے کہا اور سیل فون پر کوئی نمبر

ڈائل کر کے بولا۔ ”مجھے بیرسٹر مسعود خان کا ٹیلی فون نمبر چاہیے۔۔۔۔۔ایک منٹ!“ اس نے وسیم کے سامنے رکھا ہوا رائٹنگ پیڈ اپنی طرف گھسیٹا اور جیب سے پین نکال کر بولا۔

”جی بتائیے۔“ اس نے پیڈ پر تین نمبر نوٹ کیے اور وہ کاغذ پیڈ میں سے پھاڑ کر پھر سیل فون نکالا۔

”یہ۔۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔کر رہے ہیں؟“ وسیم ہکلا کر بولا۔ ”بیرسٹر صاحب کو ٹیلی فون کیوں کر رہے ہیں؟“

”میں ان سے بھی تو معلوم کروں کہ آخر انہیں احسن پر کیوں شبہ ہوا۔ وہ تو احسن کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ نہ اس سے پہلے کبھی رمشا کی احسن سے ملاقات ہوئی ہے۔“

”آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں۔“ وسیم نے کہا۔

”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے سوال کرنے کا حق صرف آپ کو ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”دیکھیے، بیرسٹر صاحب نے براہِ راست مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے۔ آپ کے خلاف ارسلان نے رپورٹ درج کرائی ہے۔“

اس وقت وکیل کے سوٹ میں ملبوس ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وسیم جلدی سے بولا۔ ”آیے ہاشمی صاحب! آپ سے تو اب ملاقات ہی نہیں ہوتی ہے۔“

ایڈووکیٹ ہاشمی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اکبر سے بولا۔ ”جی سر! فرمائیے۔“

اکبر نے میری طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ میرے دوست احسن ہیں۔ کیس کی تفصیلات یہ ہی بتائیں گے۔“

میں نے شروع سے آخر تک اسے سب کچھ بتایا۔ صرف رمشا کو اکبر کے گاؤں بھیجنے کا واقعہ گول کر گیا۔

”وسیم صاحب!“ ہاشمی نے کہا۔ ”مجھے ایف آئی آر کی نقل مل سکتی ہے؟“ پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اب یہ مت کہیے گا کہ ایف آئی آر کی کاپی کورٹ سے ملے گی۔“

”قانون تو یہی ہے لیکن میں آپ کو ایف آئی آر دکھا ضرور سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔“ ہاشمی نے فراخ دلی سے کہا۔

وسیم نے ایف آئی آر کا رجسٹر منگوایا اور اسے ہاشمی کے سامنے رکھ دیا۔

ہاشمی نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا اپنی ڈائری میں کچھ پوائنٹ نوٹ بھی کیے اور رجسٹر وسیم کو واپس کر دیا۔

”ٹھیک ہے وسیم صاحب!“ ہاشمی نے کہا۔ ”آپ سے کورٹ میں ملاقات ہوگی۔“ پھر وہ ہم سے بولا۔ ”معاملے آپ لوگ گھر چلیں۔“

”میں ایک دفعہ پھر کہوں گا کہ لاہور چھوڑنے سے پہلے مجھے اطلاع ضرور دیجیے گا۔“

ہاشمی اپنی گاڑی میں آیا تھا۔ اکبر نے کہا۔ ”آپ ذرا بنگلے تک چلیں مجھے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔“

☆☆☆

”دیکھیے رپورٹ جس لڑکے نے درج کرائی ہے اس کا مغویہ سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ میں اپنے کسی کام سے لاہور آیا تھا تو میں نے رمشا کو احسن صاحب کے ساتھ دیکھا تھا۔ پھر میں نے یہ خبر سنی کہ رمشا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ میں نے فوراً پولیس کو انفارم کیا اور بیرسٹر صاحب کو بھی ٹیلی فون کر دیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ بیرسٹر مسعود اب تک لاہور پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں۔“ ہاشمی نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔“ ہاشمی نے کہا۔ ”میں اس سے کورٹ میں نمٹ لوں گا۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ میں ایک کیس میں اسے زک پہنچا چکا ہوں۔ آپ لوگ آرام سے سو جائیں اور بے فکر ہو جائیں۔ اب یہ میری ذمے داری ہے۔“

ہم لوگ پھر اکبر کے گھر آ گئے۔ اکبر نے اپنے ملازم کو کھانا لانے کو کہا۔ میں نے بھی صبح سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ شدید بھوک لگ رہی تھی۔ ایڈووکیٹ ہاشمی کی باتوں نے مجھے خاصی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔

ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے اس دوران میں اکبر نے اپنے آدمی علی خان سے رمشا کے بارے میں معلوم کیا تھا۔ جواب میں اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا تھا۔ اس کے کئی آدمی اردگرد کے علاقے میں رمشا کو تلاش کر رہے تھے لیکن اب تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

رات میں مجھے نہ جانے کس وقت نیند آئی۔ سوتے ہوئے مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے کانوں میں سائرن بج رہے ہوں۔ مانیٹرنگ کی آواز تیز ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اصل میں میرے سیل فون کی گھنٹی تھی۔ میں نے سیل فون اٹھاتے ہوئے اسکرین پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ کال سب انسپکٹر وسیم کی تھی۔ میں نے کال ریسیو کر کے ٹیلی فون

سیٹ کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو۔“ میں نے کہا۔

”پروفیسر صاحب۔“ وسیم نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آپ ابھی اور اسی وقت پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں۔“

”اب کیا آفت آ گئی؟“ میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ”اس وقت تو میں پولیس اسٹیشن نہیں آ سکتا۔ ہاں بعد میں کسی وقت وہاں کا چکر لگا لوں گا۔“

”میں آپ کو تفریحاً یہاں نہیں بلا رہا ہوں۔“ اس مرتبہ وسیم کا لہجہ بدلا بدلا سا تھا۔ ”دیکھیے میں آپ کو آدھا گھنٹا دے رہا ہوں۔ اگر آپ اس دوران میں پولیس اسٹیشن نہیں پہنچے تو مجبوراً مجھے پولیس کا روایتی طریقہ استعمال کرنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کس کی کال تھی؟“ اکبر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب انسپکٹر وسیم تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس نے فوری طور پر مجھے پولیس اسٹیشن طلب کیا ہے۔“

”فوری طور پر؟“ اکبر بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس اسٹیشن نہ پہنچا تو وہ مجھے اپنے طریقے سے لے جائے گا۔“

”اپنے طریقے سے لے جانے کا کیا مطلب ہے؟“ اکبر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”یہ تو وہی بتائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں ابھی ہاشمی سے بات کرتا ہوں۔“ وہ اپنے بیڈ روم میں گیا اور سیل فون لے آیا۔ اس نے ایڈووکیٹ ہاشمی کا نمبر ملایا اور بولا۔ ”ہاشمی صاحب! آپ فوراً میرے بنگلے پر پہنچیں۔۔۔۔۔ہاں ایمرجنسی ہی ہے۔“ اکبر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر اس نے دوبارہ کسی کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ”آئی جی صاحب سے بات کرائیں۔۔۔۔۔میٹنگ میں ہیں؟ ان سے کہیے گا کہ فارغ ہو کر چودھری اکبر سے بات کر لیں۔“ اس نے سلسلہ منقطع کیا اور پُرتفکر انداز میں کچھ سوچنے لگا۔

”یار اکبر۔“ اس نے کہا۔ ”میں پولیس اسٹیشن چلا جاتا ہوں معلوم تو کروں کہ وہ لوگ اب کیا چاہتے ہیں؟ وہ مجھے پھانسی پر تو نہیں لٹکا دیں گے۔“

”چلو پھر میں بھی چل رہا ہوں۔“ اکبر نے کہا اور سیل فون پر ہاشمی سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ اب وہ گھر کی بجائے پولیس اسٹیشن پہنچے۔

☆☆☆

صبح کا وقت تھا۔ پولیس اسٹیشن پر ویرانی چھائی ہوئی تھی بلکہ نحوست برس رہی تھی۔

سب انسپکٹر وسیم برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہماری طرف آیا۔

اکبر نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ ”اب کیا پرابلم ہے؟“

”پرابلم مجھے نہیں بلکہ ایس ایچ او صاحب کو ہے۔ وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہیں۔“

اکبر بغیر کچھ کہے، ایس ایچ او کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

ایس ایچ او اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال تقریباً اڑ چکے تھے۔ دوسرے پولیس والوں کی طرح اس کا جسم بھی بھدا اور بے ڈول تھا۔ ہمیں اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”پروفیسر احسن۔“

”آؤ جی، آپ کا تو بہت انتظار تھا۔ ان سے ملیں۔“ اس نے دائیں جانب رکھے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ صوفے پر خوش پوش سا ایک شخص بیٹھا تھا۔ ”یہ بیرسٹر مسعود خان کے سیکریٹری ہیں۔ شاہ نواز صاحب۔“

میں نے اس کی طرف دیکھ کر گردن ہلائی اور کہا۔ ”جی شاہ نواز صاحب، فرمایے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”میری نہیں سر آپ اپنی مدد کریں گے۔“ شاہ نواز نے کہا۔ ”بیرسٹر صاحب خود بھی یہاں آنے والے ہیں۔ آپ کے آتے ہی میں نے انہیں ٹیلی فون کر دیا تھا۔ وہ دس منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ رمشا بی بی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیں۔“

”وہاٹ ربش۔“ میں نے پھر کہا۔ ”کیا انسپکٹر صاحب نے آپ کو میرا بیان نہیں دکھایا۔ نہیں دکھایا تو اب دیکھ لیں۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا میں اپنے بیان میں بتا چکا ہوں۔“

اس وقت مجھے پولیس وین کے سائرن کی آواز سنائی دی اور باہر غیر معمولی بھاگ دوڑ اور چہل پہل کا احساس ہوا۔

”شاید خان صاحب آ چکے ہیں۔“ انسپکٹر نے کہا اور بمشکل تمام اپنے بے ڈول جسم کو کرسی کی قید سے آزاد کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹوپی بھی اپنے سر پر جما لی۔ شاہ نواز بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں اسی طرح بیٹھے رہے۔ ایس ایچ او، بیرسٹر صاحب کے استقبال کے لیے کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بیرسٹر مسعود کے ساتھ کمرے میں

داخل ہوا۔ بیرسٹر مسعود کو میں اس سے پہلے بھی مختلف ٹی وی پروگرام میں دیکھ چکا تھا۔ وہ گورا چٹا اور صحت مند آدمی تھا اور اپنی عمر سے دس بارہ سال کم لگتا تھا۔

ایس ایچ او اسے صوفے تک لے گیا اور اسے بیٹھنے کی درخواست کی۔

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں انسپکٹر۔'' مسعود خان نے کہا۔

''ملزم بھی موجود ہے سر۔'' ایس ایچ او نے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔

''پروفیسر صاحب!'' بیرسٹر نے کہا۔ ''پولیس نے آپ کے بارے میں جو تفتیش کی ہے اس کے مطابق ہوٹل کا وہ سوئٹ آپ کے نام سے بک ہوا ہے۔ ارسلان وہاں موجود ضرور تھا لیکن پھر رمشا کو آپ کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔'' بیرسٹر نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

''لیکن یہ بھی تو معلوم کریں کہ ارسلان وہاں کیوں موجود تھا؟'' میں نے کہا۔

''یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔'' مسعود خان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن رمشا کو تو آخری بار آپ کے ساتھ ہی دیکھا گیا ہے۔ پولیس کے پاس گواہ بھی موجود ہیں۔''

اس وقت ایڈووکیٹ ہاشمی کمرے میں داخل ہوا۔ ایس ایچ او نے چونک کر اسے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''پروفیسر احسن! تم پر رمشا مسعود کے اغوا کا الزام ہے اس لیے میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں۔'' ایس ایچ او کا لہجہ مضحکہ خیز تھا۔

''ایسے آپ پروفیسر صاحب کو گرفتار نہیں کر سکتے۔'' ہاشمی نے کہا۔

''میں تو آپ کی بیٹی کو جانتا تک نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''قتل اور اغوا وغیرہ کے کچھ محرکات ہوتے ہیں۔''

''یہ تمام باتیں اب کورٹ میں کرنا جی۔'' ایس ایچ او نے کہا۔ ''اغوا کا پرچا کٹ چکا ہے۔ واقعات اور شواہد آپ کے خلاف ہیں۔ لڑکی کو آخری بار آپ کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ آپ کو گرفتار تو کرنا ہی ہوگا۔''

اچانک اکبر کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون آن کر کے کان سے لگایا اور بولا۔ ''جی سر! میں نے آپ کو کال کی تھی لیکن آپ میٹنگ میں تھے۔'' پھر اس نے مختصراً صورتِ حال بتائی اور بولا۔ ''اب یہ لوگ پروفیسر احسن کو اریسٹ کر رہے ہیں...... جی ہاں موجود ہے...... ایک منٹ۔'' پھر وہ ایس ایچ او سے بولا۔ ''بھئی صاحب! آئی جی صاحب سے بات کریں گے۔''

ایس ایچ او سے پہلے بیرسٹر مسعود خان نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''آئی جی صاحب! میں بیرسٹر مسعود خان بول رہا ہوں...... وعلیکم السلام...... معاملہ میری بیٹی کے اغوا کا ہے...... آپ قانونی معاملات میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں؟ میں ابھی ہوم سیکریٹری اور چیف منسٹر سے بات کرتا ہوں...... اب تو آپ کو علم ہو گیا...... ملزمان کی پشت پناہی نہ کریں...... چلیے میں آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن معاملہ میری بیٹی کا ہے۔ آپ شام کو سی ایم ہاؤس میں مجھ سے ملیں۔'' اس نے انتہائی غصے میں سیل فون بند کیا اور اکبر کی طرف بڑھا دیا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''پروفیسر صاحب! میں پولیس سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ کو ہتھکڑی نہ لگائی جائے۔''

''حاکم خان!'' ایس ایچ او نے کسی کو آواز دی۔

فوراً ہی ایک دبلا پتلا اور لمبا سا ہیڈ کانسٹیبل کمرے میں آگیا۔

''پروفیسر صاحب کو لاک اپ کر دو۔'' اس نے یوں کہا جیسے پروفیسر صاحب کو چائے پلانے کا حکم دے رہا ہو۔ ''نہیں، ہتھکڑی نہیں لگانا ہے۔''

حاکم خان میری طرف بڑھا تو احسن کے اشارے پر میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔

وہاں رات بھر ''پوچھ گچھ'' سے گزرے ہوئے تین حوالاتی پہلے سے ہی موجود تھے۔ میں نے ان پر توجہ نہ دی اور پھٹی ہوئی میلی دری پر ایک طرف بیٹھ گیا۔

میں اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا۔ میرے یونیورسٹی کے ساتھی، میرے شاگرد اور جاننے والے سنتے تو میرے بارے میں کیا رائے قائم کرتے۔ میری بیوی میرے بارے میں کیا سوچتی؟

اس وقت مجھے حوالات کی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے ایڈووکیٹ ہاشمی اور اکبر نظر آیا۔ سنتری نے ہاشمی کے لیے لاک اپ کا دروازہ کھول دیا۔

اس نے اندر آکر پہلے تو اپنے بریف کیس سے وکالت نامہ نکالا اور مجھ سے دستخط کرانے کے بعد بولا۔ ''احسن صاحب! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں کل ہی آپ کی ضمانت کی کوشش کروں گا۔'' پھر وہ آہستہ سے بولا۔

''مجھے ایک مرتبہ پھر اس واقعے کی تفصیل بتا دیں۔''

میں نے اسے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔

''آپ ارسلان کو کیسے جانتے ہیں؟'' ہاشمی نے اپنا رائٹنگ پیڈ بریف کیس میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہ جانے وہ کون سی منحوس ساعت تھی ہاشمی صاحب جب ارسلان کے گھرانے سے میرے تعلق کی ابتدا ہوئی تھی۔'' میں نے اسے آغا جی اور ارسلان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

''ٹھیک ہے، میں بھی اپنے طور پر اس کیس کے شواہد اکٹھے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''پریشان مت ہونا احسن!'' باہر سے اکبر نے کہا۔ ''میں ہر قیمت پر تمہیں یہاں سے نکال لوں گا۔''

ہاشمی اور اکبر کے جانے کے بعد یہاں سناٹا چھا گیا۔ وہاں پہلے سے موجود حوالاتی کچھ دیر تو مجھے دیکھتے رہے پھر ان میں سے ایک اٹھ کر میرے پاس آگیا اور بولا۔

''سر!...... آپ...... یہاں کیسے آئے ہیں؟''

میں نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے پہلے میں نے کہاں دیکھا ہے؟

''سر، آپ تو شاید مجھے نہ پہچان سکیں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں ناں؟ میں آپ کا شاگرد رہ چکا ہوں۔''

''مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''سر! آپ کوشش کریں کہ رات ہونے سے پہلے ہی یہاں سے نکل جائیں۔''

''کیوں...... رات ہونے سے پہلے کیوں؟''

''پولیس والے ملزمان سے رات ہی کو تفتیش کرتے ہیں۔ وہ تفتیش صرف زبانی ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ تھرڈ ڈگری کا استعمال بھی خوب کھل کر کرتے ہیں۔ میں نے یہاں ایک رات گزاری ہے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ انہوں نے ساری رات مجھ پر تشدد کیا ہے۔''

میں لرز کر رہ گیا۔ میں نے پولیس کے تشدد کے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ مجھے رہ رہ کر ارسلان پر غصہ آرہا تھا کہ کم بخت نے بیٹھے بٹھائے مجھے اس ناگہانی میں مبتلا کر دیا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان سلاخوں کو توڑ کر نکل جاؤں۔ حوالات کی فضا میں اب میرا دم گھٹنے لگا تھا۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب حوالات کے باہر پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ گونجی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ پھر مجھے دروازے پر سنتری کا منحوس چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''قادر کو صاحب نے بلایا ہے۔''

دوسرے سنتری نے سلاخوں والا دروازہ کھول دیا اور پہلا سنتری ہتھکڑی لے کر اندر آگیا۔ اس نے ایک حوالاتی کو ہتھکڑی لگائی اور اسے ٹھڈے مارتا ہوا باہر لے گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد پھر وہی منحوس سنتری نمودار ہوا اور اپنے ساتھی سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی نہیں تھی۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''پروفیسر کو صاحب نے بلایا ہے۔''

میں لرزتے قدموں کے ساتھ اس کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جہاں صرف ایک کرسی تھی۔ ایک رسی سے قادر الٹا لٹکا ہوا تھا اور کمرے میں پانی کی بالٹیاں، بینچ، تختے اور ڈنڈے رکھے ہوئے تھے۔

سنتری مجھے وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے قادر کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ نیچے ڈھلکے ہوئے تھے لیکن وہ ہوش میں تھا۔ اسی وقت کمرے میں گینڈے کی طرح کا ایک شخص داخل ہوا۔ اس نے سینڈو کٹ بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے مدقوق سا ایک سپاہی بھی تھا۔

''اس نے کچھ بتایا؟'' اس نے قادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا جی!'' سپاہی نے کہا۔ ''اللہ یارا سے مار مار کر تھک گیا ہے۔''

''اسے نیچے اتارو۔'' گینڈے نے حکم دیا۔ ''پہلے میں اس پروفیسر سے نمٹ لوں۔'' پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں بھئی پروفیسر! تو لڑکی کو کہاں سے بھگا کر لایا تھا۔''

اس کے طرزِ تخاطب پر مجھے شدید توہین کا احساس ہوا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں کسی لڑکی کو بھگا کر نہیں لایا۔''

اس نے اچانک اٹھ کر میرے منہ پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ میں لڑکھڑا کر پیچھے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ مجھے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ شاید اس کے تھپڑ سے میرا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔

''دیکھو، میں ایک باعزت اور امن پسند شہری ہوں۔ تم میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتے۔''

''یہ بات تو لڑکی کو بھگانے سے پہلے سوچنے کی تھی

نا۔‘‘ وہ پھر میری طرف جھپٹا۔

اچانک سب انسپکٹر وسیم کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ’’پروفیسر صاحب کو صاحب نے بلایا ہے۔‘‘ اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اسے پانی میں تر کر کے مجھے دیا۔ میں نے اس سے اپنے ہونٹ صاف کر لیے۔

ایس ایچ او کے کمرے میں اکبر اور ہاشمی کے علاوہ بیرسٹر مسعود خان بھی موجود تھا۔

مجھے دیکھ کر اکبر بپھر کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ’’یہ کیا تم لوگوں نے احسن پر تشدد کیا ہے؟‘‘

’’ابھی ان پر تشدد نہیں ہوا ہے۔‘‘ وسیم نے کہا۔

’’آپ ادھر بیٹھیں پروفیسر صاحب!‘‘ ایس ایچ او نے کہا۔ ’’پروفیسر صاحب!‘‘ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنی زحمت اٹھانی پڑی۔ اصل مجرم پکڑا گیا ہے۔‘‘

میں نے چونک کر مسعود خان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

’’اصل مجرم!‘‘ ایس ایچ او نے کہا۔ ’’ارسلان ہے۔‘‘ پھر وہ مجھے تفصیل بتانے لگا۔

ارسلان کو رمشا سے محبت نہیں تھی۔ بلکہ وہ اپنے دادا کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ بیرسٹر نے آغا جی کو دھوکا دے کر ان کا کروڑوں روپیا ہتھیا لیا۔ اس صدمے سے انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گئے۔

بیرسٹر سے انتقام لینے کے لیے اس نے رمشا کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا اور اسے شادی کا جھانسا دے کر کراچی سے یہاں لے آیا۔ وہ کراچی واپس جا کر بیرسٹر صاحب سے کئی کروڑ روپے کا تاوان طلب کرنے والا تھا لیکن کسی وجہ سے اس کا پروگرام ایک دن کے لیے ملتوی ہو گیا لیکن وہ سیل فون پر رمشا سے مسلسل رابطے میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رمشا کو اکبر صاحب نے اپنے گاؤں روانہ کر دیا ہے۔ وہ کراچی سے سیدھا لاہور پہنچا اور یہاں سے ایک گاڑی کرائے پر لے کر اکبر صاحب کے گاؤں روانہ ہو گیا۔

رمشا پر کوئی خاص پہرہ تو تھا نہیں۔ وہ ارسلان کے کہنے پر وہاں سے نکل آئی۔ لاہور واپسی پر رمشا نے اس سے اصرار کیا کہ اب ہمیں شادی کر لینا چاہیے۔ ارسلان نے انکار کر دیا اور غصے میں یہ بھی بتا دیا کہ میں تم سے شادی نہیں کروں گا بلکہ تمہارے باپ سے انتقام لے رہا ہوں۔

رمشا نے اس کے منہ پر نہ صرف تھپڑ مارا بلکہ تھوک بھی دیا۔

ارسلان نے اشتعال میں آ کر اس کی گردن دبوچ لی اور اپنے خیال میں اسے مردہ سمجھ کر گاڑی سے باہر پھینک دیا اور لاہور آ گیا۔

ایک دوسری گاڑی والے نے رمشا کو اٹھایا اور اسپتال پہنچا دیا۔ اس وقت تک رمشا کو ہوش آ گیا۔ اس نے پولیس کے ایک انسپکٹر کے سامنے اپنا بیان قلم بند کرایا۔

بیرسٹر صاحب فوراً ہی اسپتال پہنچ گئے۔ رمشا اس وقت زندہ تھی لیکن اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ پھر اس نے بیرسٹر صاحب کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔

وہاں تھوڑی دیر تک ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی خوب صورت اور زندگی سے بھرپور لڑکی کا اتنا بھیانک انجام ہو گا۔

’’پروفیسر صاحب! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کی تذلیل ہوئی، ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔‘‘ پھر وہ ایس ایچ او مخاطب ہوا۔ ’’آفیسر! پروفیسر صاحب کا نام اس کیس سے خارج کر دو اب پرچا صرف اور صرف ارسلان کے نام کٹے گا۔‘‘

’’پروفیسر صاحب کو ایک دو دفعہ تو کورٹ میں پیش ہونا ہو گا سر۔‘‘ ایس ایچ او نے کہا۔ ’’لیکن اب ان کے خلاف کوئی کیس نہیں بنے گا۔ نہ جرم کا، نہ اعانت جرم کا! حالانکہ انہیں جب رمشا ملی تھی تو آپ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’بس ختم کرو۔‘‘ بیرسٹر صاحب نے کہا۔ پھر مجھ سے بولے۔ ’’پروفیسر صاحب! میں آپ سے ایک مرتبہ پھر معافی......‘‘

’’آپ مجھے کیوں بار بار شرمندہ کر رہے ہیں سر!‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ جا سکتے ہیں پروفیسر صاحب۔‘‘ ایس ایچ او نے کہا۔

بیرسٹر صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولے۔ ’’پروفیسر صاحب! اگر زندگی میں کبھی آپ کو میری ضرورت پڑے تو بلا جھجک میرے پاس آ جایے گا۔‘‘

میں پولیس اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو لیکن مجھے اپنی تذلیل یاد تھی اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں اس منحوس گھڑی کو کوستا رہوں گا جب میں نے ارسلان کو ٹیوشن پڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیسے کو تیسا

جناب معراج رسول
السلام علیکم
یہ واقعہ میرا اپنا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو جب زخم لگتا ہے تو اسے تکلیف نہیں ہوتی مگر جب خود پر گزرتی ہے تب احساس ہوتا ہے کہ درد کیسا ہوتا ہے۔ یہی سمجھانے کے لیے میں یہ واقعہ لکھ رہا ہوں۔

اکبر درانی
(لاہور)

بات صرف اتنی سی تھی کہ مجھے پانچ ہزار کی اشد ضرورت تھی۔ یہ پانچ ہزار میری عزت بچا سکتے تھے۔ میری ساکھ بچا سکتے تھے، لیکن آتے کہاں سے؟ کون دیتا مجھے؟ دوستوں سے ملنے کی تو توقع ہی نہیں تھی۔ کیونکہ میں بہت سے دوستوں سے قرض لے چکا تھا۔ اب تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ مجھے دور سے دیکھ کر وہ کترا جایا کرتے اور اگر دیکھ بھی لیتے تو دور ہی سے ہاتھ ہلا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ جاتے۔

رہ گئے رشتے دار تو وہ اس قابل ہی نہیں تھے کہ میری مدد کر سکتے۔ دو چار تھے بھی تو انہوں نے پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ”دیکھو میاں ویسے تو تمہارے لیے ہمارے دل اور گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں لیکن کبھی پیسے مانگنے مت آنا۔ تم تو جانتے ہو کہ رشتے داری بے غرض ہونی چاہیے۔“

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ رشتے دار ہی رشتے دار کے کام آتے ہیں۔“

”یہ تم نے غلط سن لیا تھا۔ ویسے بھی یہ بات آج کے دور کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آج اگر ایک دوسرے سے مل ہی لیں تو اس کو بھی غنیمت سمجھیں۔“

غرض یہ کہ اس قسم کے مکالمے تقریباً ہر رشتے دار بول چکا تھا۔ سوائے اختر سوداگر کے۔ وہ میرے پھوپا ہوتے تھے۔ اختر ان کا نام تھا اور سوداگران کا تخلص۔ وہ شاعر تھے، ادیب تھے، ناقد تھے اور ان سب کے باوجود پیسے والے بھی تھے۔

شہر میں ان کی کئی دکانیں اور مکانات تھے۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ تو کرایا آجاتا تھا اور اب سے پندرہ بیس سال پہلے اتنی رقم بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔

ان کو کبھی آزمانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن ان کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ ”جیسے انتہائی دریا دل انسان ہیں۔ ارے بھائی نہ جانے کتنے یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی مدد کیا کرتے ہیں۔ مجال ہے جو کسی ضرورت مند کو خالی ہاتھ جانے دیں۔“

”ارے بھائی فرشتہ صفت انسان ہیں۔ انکار کرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔“

اس کے بعد کئی واقعات سنائے جاتے۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اختر سوداگر واقعی اس دور کے حاتم طائی ہیں۔ تو مجھے اس برے وقت میں ان کا ہی خیال آگیا۔

بلکہ ایک بار انہوں نے کہا بھی تھا۔ ”دیکھو میاں! جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو بلا جھجک میرے پاس آجانا۔ شرمانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور تم تو ویسے بھی میرے رشتے دار ہو۔“

اس نازک موقع پر ان کے خیال نے بڑی تقویت دے دی تھی۔ میں سیدھے ان کے گھر پہنچ گیا۔ اختر سوداگر گھر پر نہیں تھے۔ البتہ پھوپی موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے چائے پلائی بسکٹ کھلائے اور جب میں نے پھوپا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا۔ ”ارے تمہارے پھوپا مغرب کے بعد گھر پر کہاں ہوتے ہیں۔“

”تو پھر کہاں ہوتے ہیں؟“

”محفل میں۔“ انہوں نے بتایا۔

”محفل! کس کی محفل!“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ارے بیٹا محفل ایک ریستوران کا نام ہے۔“ انہوں نے بتایا۔ ”غزالی روڈ پر ہے۔ یہاں سے قریب ہی ہے۔ مغرب کے بعد تمہارے پھوپا کے مزاج کے کچھ لوگ وہاں آجاتے ہیں اور رات گئے تک باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“

”میں سمجھ گیا پھوپی، ہمارے ہاں کی یہ ایک پرانی روایت ہے کہ دانش ور اور شاعر قسم کے لوگ ایسی ہی جگہ بیٹھتے ہیں۔“ میں پھوپی سے رخصت لے کر محفل کی طرف چل دیا۔ جہاں پھوپا موجود تھے۔

وہ سات آٹھ دانش ور تھے جو ایک کونے کو گھیرے ہوئے تھے۔ چائے چل رہی تھی اور ماحول دھواں دار ہو رہا تھا۔

پھوپا نے مجھے دور ہی سے پہچان لیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے اجازت لے کر میرے پاس آگئے۔

”کیا بات ہے بیٹے خیریت تو ہے نا۔“ انہوں نے بڑے تپاک سے پوچھا۔

”پھوپا میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”ہاں بیٹے ہاں، بزرگ اگر کام نہیں آئیں گے تو اور کون کام آئے گا۔“ انہوں نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”ابھی سنتا ہوں۔ پہلے پانچ منٹ میں ایک مسئلہ حل کرلوں۔ پھر تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔“

اچانک میرے سینے سے بوجھ جیسے اتر گیا۔ پھوپا تو پوری طرح میرا ساتھ دینے کو تیار تھے۔ وہ مجھے لے کر اس طرف آگئے جہاں ان کے ساتھی بیٹھے تھے۔

”بس دو منٹ بیٹھ جاؤ۔“ پھوپا نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

پھوپا اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوئے۔ ”اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں سوچتا ہوں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں ہوں۔ اس لیے سوچتا ہوں۔“

”لیکن اختر صاحب سوچ ہی تو انسان کو شعور دیتی ہے۔“ کسی نے کہا۔

”شعور ہی دیتی ہے نا، وجود تو نہیں دیتی۔“ پھوپا میز پر گھونسا مار کر بولے۔ ”ہمیں تو اسباب و عمل پر بھی غور کرنا ہو گا۔ مابعد الطبیاتی نظریات ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیتے۔ اس سلسلے میں آئن، اسٹائین کی تھیوری دھیان میں رکھنی چاہیے۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم چونکہ حرکت کر رہے ہیں اس لیے ہمارا وجود ہے۔ یہی زندگی کو دیکھنے کا ایک پہلو ہے۔ بات پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے کہ......“

وہ اور ان کے ساتھی جو کچھ بھی کہہ رہے تھے۔ وہ میرے سر سے گزر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بے تکا مسئلہ دس پندرہ منٹ میں حل ہو جائے گا لیکن وہ تو شیطان کی آنت کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔

اتنی دیر میں چائے آگئی۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی ہوئی تھی۔ میں نے اس خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھوپا کی طرف دیکھا۔ ”پھوپا......وہ......“

”ہاں ہاں بیٹے! میں سب سمجھ رہا ہوں فکر مت کرو۔ ابھی چلتا ہوں۔“ اس کے بعد وہ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”آپ شوپنہار اور برگساں وغیرہ کو چھوڑیں۔ ہمارے مشرق نے ایسے ایسے دیو قامت پیدا کیے ہیں کہ دوسرے ان کے سامنے چھوٹے لگتے ہیں۔ آپ امام غزالی اور ابن رشد وغیرہ کو پڑھیں۔ ابن رشد کو دیکھیں تو عقل و آگہی کا ایک نیا در کھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔“

”اختر صاحب! ہم تو ٹائم تھیوری پر بات کر رہے تھے۔“ کسی نے کہا۔

”ہاں اس کا تعلق نظریہ انسانیت اور حرکت سے ہے۔ دو جسم اگر دو مختلف سمت میں ایک جیسی رفتار سے حرکت کر رہے ہوں تو ان کے درمیان فاصلہ اور وقت کا تناسب ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“

اس چکر میں مزید پندرہ بیس منٹ گزر گئے لیکن ان کا مسئلہ کم بخت حل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایسی ایسی باتیں ہو رہی تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنی ہوں گی لیکن میرے ذہن پر تو وہ پانچ ہزار روپے سوار تھے جس کا علاج اس وقت صرف پھوپا کے پاس تھا اور پھوپا تو جانے کن چکروں میں الجھے ہوئے تھے۔

مزید بیس منٹ کے بعد میرے لیے بیٹھا رہنا مشکل ہو گیا۔ پھوپا اس وقت بتا رہے تھے۔ ”ڈارون نے جس وقت اپنی تھیوری آف اسپیس لکھی اس وقت انسان ٹیکنالوجی کے اس معیار پر نہیں تھا جتنا آج ہے۔ اس وقت کسی بھی میدان میں تحقیق کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔“

پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ اب مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ پھوپا ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکے تو میں نے ان سے کہا۔ ”پھوپا مجھے اجازت دیں میں کل پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں ضرور آنا۔“ پھوپا جلدی سے بولے۔ ”یاد سے آنا اور پریشان مت ہونا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کے بعد پھوپا پھر اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”فلسفہ یہ کہتا ہے۔“

وہ فلسفے کو دیکھتے رہے اور میں اٹھ کر چلا آیا۔

بہر حال مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ پھوپا سے میرا کام ہو جائے گا۔ وہ ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ ان کا رویہ تو یہی بتا رہا تھا۔

گھر واپس پہنچا تو وہی شخص دروازے پر کھڑا تھا جسے پانچ ہزار روپے واپس کرنے تھے۔ اس بار اس کے تیور بہت جارحانہ ہو رہے تھے۔ ”ہاں بھئی کیا ارادے ہیں تمہارے۔“ اس نے خون خوار انداز میں پوچھا۔

چونکہ مجھے پھوپا کی طرف سے آسرا ہو گیا تھا اس لیے میں نے بھی کڑے تیور سے جواب دیا۔ ”مرے کیوں جاتے ہو۔ کل آکر پیسے لے جانا۔“

جھیل کیسے مرتی ہے

جھیلیں جانوروں کی طرح ہیں جو پیدا ہوتی ہیں، پھلتی پھولتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔ کچھ جھیلیں تب مرجاتی ہیں جب ان کے پانی کا ماخذ ختم ہو جائے۔ جھیلیں ایک اور طرح سے بھی مرتی ہیں، اس عمل کو Eutrophication کہتے ہیں جس میں جھیلوں میں مٹی یا پھر مردہ پودے اور جانور بھر جاتے ہیں۔ یہ چیزیں رفتہ رفتہ جھیل کی گہرائی کم کر دیتی ہیں اور وہ ایک دلدل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر آخر کار مرجاتی ہیں۔

مرسلہ: راحت علی۔ کراچی

چونکہ اس کے لیے میرا یہ لہجہ بالکل بدلا ہوا اور پُراعتماد سا تھا۔ اس لیے اس نے بے یقینی کے انداز میں دریافت کیا۔ ”بھائی کل پیسے دے دو گے نا؟“

”کہہ دیا نا کل پیسے مل جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کل کس وقت آجاؤں؟“

”اسی وقت آجانا۔“ میں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے بھائی۔“ وہ بڑی نرم دلی اور خوش گواری کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

دوسری شام میں پھوپا کے گھر کی طرف نہیں گیا بلکہ سیدھے محفل ریستوران میں پہنچ گیا تھا۔ پھوپا وہاں موجود تھے اور کل کی طرح کچھ لوگوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر پھوپا لپک کر اٹھے۔ ”میاں بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ بس دو منٹ بیٹھ جاؤ میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا ساتھ گھر چلتے ہیں۔ اس کے بعد تم چلے جانا۔“

”پھوپا میں گھر نہیں جاسکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”میں جس کام کے لیے آیا ہوں وہ ہو جائے تو پھر واپس چلا جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کام بھی ہو جائے گا۔“ پھوپا مسکرا کر بولے۔ پھر ایک آدمی کی طرف اشارا کیا۔ ”یہ کاوش بدایونی ہیں۔ ان کو ذرا مسئلہ قضا و قدر سمجھا لوں تو پھر چلتا ہوں۔“

اب میں کیا کہہ سکتا تھا اس لیے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

پھوپا اس آدمی سے مخاطب ہوئے۔ ”دیکھیں کاوش صاحب! یہ مسئلہ قضا و قدر اتنا آسان نہیں ہے کہ آپ کو ایک ہی نشست میں سمجھا دیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہیڈی گر نے ایک بار پورے ایک مہینے تک اس معاملے پر بحث کی تھی۔ اصل دشواری وہاں سے شروع ہوتی ہے جب آپ کے لاشعور پر مذہب کی گرفت کمزور ہونے لگتی ہے۔“

”شعور کیسا اختر صاحب۔“ کاوش بدایونی نے کہا۔

”نہیں شعور نہیں، لاشعور۔“ پھوپا نے میز پر گھونسا مارا۔ ”ہم سب اپنے لاشعور کے محتاج ہوتے ہیں۔ آپ خود بتائیں کہ واقعات اور حالات کو سنسر کون کرتا ہے۔ یہی لاشعور۔ اس سلسلے میں بوعلی سینا کا واقعہ یاد رکھیں۔“

اس کے بعد ایک طویل گفتگو شعور اور لاشعور کی شروع ہو گئی۔ پھوپا اور کاوش صاحب کے علاوہ دوسرے بھی اس گفتگو میں حصہ لینے لگے تھے۔

درمیان میں ایک جگہ جب گفتگو ذرا سی دیر کے لیے رکی تو میں نے پھوپا سے کہا۔ ”پھوپا ذرا میری بات سن لیں۔“

”ہاں ہاں اس اہم گفتگو کے بعد تمہاری ہی بات سننی ہے۔“ پھوپا جلدی سے بولے۔ ”اور تم فکر مت کرو۔ میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے لیکن اس سے پہلے میں ذرا ان لوگوں کو یہ بتا دوں۔“

میں نے گردن ہلائی۔ انہوں نے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”کارلائل اس بارے میں درجنوں ثبوت دے گیا۔ اس کے علاوہ برٹین کے ایک فلاسفر کا خیال ہے کہ چیزیں وہ نہیں ہیں جو دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ایک طویل ترین عکس کا طویل ترین سلسلہ ہے۔“

اس کے بعد پھوپا اسی قسم کی باتیں کرنے لگے۔ دوسری طرف میری جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کم بخت قرض خواہ تو میرے دروازے پر دھرنا دیے ہوئے بیٹھا ہو گا۔

پھر جب مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں نے پھوپا کا بازو تھام لیا۔ ”پھوپا! آپ کو میری بات سننی ہے یا نہیں۔“

”کیوں نہیں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اس وقت کیا گفتگو چل رہی ہے۔ ہم اس مسئلے کو سلجھانے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ جب نظریہ ڈارون نے قائم کیا تھا یہی تو دیکھنا ہے کہ......“

اب معاملہ بالکل ہی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے پورے ماحول پر لعنت بھیجی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ پھوپا نے آوازیں بھی دی تھیں لیکن میں نہیں رکا تھا۔

اب تو جو ہو سو ہو، پھوپا کی باتیں ختم ہونے والی نہیں تھیں اور مجھے اتنا موقع نہیں مل سکتا تھا کہ میں ان سے کچھ کہہ سکتا اس لیے ان سے پیسے مانگنے کی اُمید بھی ختم ہو چکی تھی۔

میں ایک فیصلہ کر کے اپنے فلیٹ کی طرف آ گیا۔ کیوں کہ میں اس آدمی سے بھاگ کر کہاں جاسکتا تھا اس لیے میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے کس طرح اس سے ایک ہفتے کا وقت لیا۔ کیسے کیسے بہانے بنائے۔ پھر کس طرح اس کو بندوبست کر کے دیا۔

پھر بہت دنوں کے بعد مجھے پھوپا کی طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ بھی اس لیے کہ پھوپی نے کسی کام سے بلایا تھا۔

میں جب ان کے مکان کے دروازے پر پہنچا تھا تو اندر سے کسی کے کراہنے اور رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ بہت حیرت اور پریشانی کی بات تھی۔

میں نے جلدی سے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ اندر کی طرف کھل گیا۔ یعنی کسی نے اسے بند نہیں کیا تھا۔ میں گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

سامنے ہی ڈرائنگ روم تھا اور پھوپا اپنا پیٹ پکڑے قالین پر تڑپ رہے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

”کیا ہوا پھوپا، خیریت تو ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میرے پیٹ میں بہت تکلیف ہے۔“ پھوپا نے بہ مشکل جواب دیا۔ ”لے...... لے چلو مجھے ڈا...... ڈاکٹر کے پاس۔“

”کیا گھر میں کوئی نہیں؟“

”نہیں، اس وقت کوئی نہیں ہے۔“ پھوپا نے اس کرب کے عالم میں بتایا۔ ”جلدی...... پلیز۔“

”ایک منٹ ابھی لے چلتا ہوں۔“ میں نے اپنی جیب سے اپنا موبائل نکال لیا اور کوئی نمبر دبائے بغیر یوں ہی باتیں کرنے لگا۔ ”دیکھو! تم نے جن بچھوؤں کی باتیں کی تھیں کہ تمہیں پچاس پچاس گرام کے بچھو چاہئیں۔ تو اصل بات یہ ہے کہ اس وزن کے بچھو تھر میں ملتے ہیں۔ اب تم دام اتنے کم لگا رہے ہو اور وہ بھی سیاہ بچھوؤں کی بات کر رہے ہو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ سیاہ بچھو بہت نایاب ہوتے ہیں۔ ہاں ہاں سفید بچھوؤں میں وہ کوالٹی نہیں ہوتی جو سیاہ میں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے ڈنک ٹوٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ......“

”خدا کے لیے......“ پھوپا کراہے۔ ”میں مر...... مر...... رہا ہوں۔“

”ہاں پھوپا، بس ایک منٹ۔“ میں نے کہا اور پھر شروع ہو گیا۔ ”بہتر طریقہ تو یہی ہے کہ اس کی ٹانگیں دیکھو۔ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کتنے چمکدار ہیں۔ ان میں شائننگ ہے یا نہیں اور رنگ بھی دو طرح کے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک میں نیلا رنگ نمایاں ہوتا ہے اور دوسرے میں بھورا۔ براؤن۔ اب دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ اس کی کون سی ٹانگ براؤن اور کون سی نیلی ہے۔“

”ارے کم بخت۔“ پھوپا کراہے۔ ”مجھے لے چل۔“

”ایک منٹ پھوپا! یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ میرے کاروبار کا معاملہ ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر موبائل پر شروع ہو گیا۔ ”دیکھو کمپنی والے اس لیے بدک جاتے ہیں کہ ہم مال کچھ اور دکھاتے ہیں اور سپلائی کچھ اور کر دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ پہلی دفعہ تم نے سو سو گرام کے جو دو بچھو بھیجے تھے۔ ان میں سے پوائزن نکلے ہوئے تھے۔ اب مجھے کیا معلوم کہ کس طرح نکالے گئے۔ میں نے تو دھوکے میں لے لیا تھا۔ اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ سو گرام والوں پر ہاتھ نہ ڈالو۔ پچاس پچاس گرام کا سودا کرتے رہو۔ ہاں ایک بات اور وہ پارٹی جو میر پور خاص سے آئی تھی اس کو یہ کہنا کہ......“

”اکبر بیٹے خدا کے لیے میرے حال پر رحم کر۔“ پھوپا اب باقاعدہ رونے لگے تھے۔ ”میں مر جاؤں گا۔ تکلیف بڑھتی جارہی ہے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا پھوپا۔“ میں نے تسلی دی۔ ”آپ کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ بس ایک منٹ۔“ میں پھر موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر بچھوؤں کے ساتھ ساتھ مینڈک بھی پکڑ سکو تو اس میں بہت فائدہ ہو دیکھو مینڈکوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ سب سے قیمتی وہ ہوتے ہیں جو رات کے وقت کسی کنویں کے آس پاس ٹراتے رہتے ہیں اور دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کی آواز صرف بارشوں کے سیزن میں سنائی دیتی ہیں۔ تم بارشوں والے مینڈکوں پر دھیان رکھو۔“

”ارے کم بخت۔“ پھوپا اچانک پھٹ پڑے۔ ”میں مر رہا ہوں اور تو بچھوؤں اور مینڈکوں میں پڑا ہوا ہے۔“

”پھوپا! یہ میرا بزنس ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جس طرح آپ کے لیے کارلائل، بقراط، ہیڈ ماگر اور ڈارون وغیرہ اہم ہیں اسی طرح میرے لیے یہ بچھو اور مینڈک اہم ہیں کیونکہ ان سے میرا روزگار وابستہ ہے۔“

”سمجھ گیا، سمجھ گیا۔“ پھوپا تقریباً رو دیے تھے۔ ”تو مجھ سے اپنا...... اپنا...... بدلہ...... بدلہ......“ اس کے ساتھ ہی درد کی شدت سے پھوپا بے ہوش ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اتفاق سے گھر والے بھی واپس آ گئے اور پھوپا کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ پھوپی اور پھوپا سے اب میرے تعلقات کیسے ہوں گے۔ وہ اب میری صورت بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہیں اور خود مجھے بھی انہیں اپنی صورت دکھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔

پُراسرار حویلی

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں ایک بار پھر آپ کی محفل میں ایک سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس دنیا میں بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا مگر انہیں جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔

دانیہ صدیقی

(کراچی)

عباد شروع ہی سے گھومنے پھرنے اور نت نئے ایڈونچرز کا دلدادہ تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی چنانچہ وہ ہر سال کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنالیتا اور اکثر لاکھ منع کرنے کے باوجود مجھے بھی اپنے ساتھ زبردستی لے جاتا۔ وہ نہ صرف میرا بہترین دوست تھا بلکہ میرا سگا خالہ زاد بھائی بھی تھا۔ میرے خالو ایک بہت بڑے بزنس مین تھے اور ملک کے امراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے برعکس میرے والد ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھے۔ ان کی آمدنی سے ہمارا گزارہ تو نہایت آسانی سے ہوجاتا تھا بلکہ بچت بھی اچھی خاصی ہو جاتی تھی لیکن اس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ میں عباد کی طرح بے فکری سے خرچ کرسکوں اور ہر سال ملکوں ملکوں گھومتا پھروں۔

تعلیم سے فراغت پا کر میں اپنے والد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ عباد مجھے فون کرکے ملنے پر اصرار کرتا لیکن مجھے اپنے جھمیلوں سے فرصت نہیں ملتی تھی چنانچہ میں ہر بار مصروفیات کا بہانہ بنا کر ٹال جاتا۔ اس روز میں کام ختم کرکے اٹھ ہی رہا تھا کہ ایجنسی کے باہر عباد کی شاندار گاڑی رکتی دیکھی اور اگلے ہی لمحے عباد برآمد ہوتا نظر آیا۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

دو منٹ بعد وہ میرے سامنے بیٹھا اپنی ناراضگی کا اظہار کررہا تھا، ”یار، تو کہاں ہوتا ہے آج کل؟ اتنے فون کیے میسج بھیجے۔ ابھی بھی تیرے گھر سے آرہا ہوں۔ خالہ جان نے بتایا کہ اس وقت تو مجھے ایجنسی پر ملے گا تو میں فوراً یہاں آگیا کہ محترم یہاں سے بھی غائب نہ ہوجائیں پھر تو میں گلی گلی لاؤڈ اسپیکر پر اعلانِ گمشدہ کرتا پھرتا کہ حضرات اگر کسی کو زرافے کی طرح لمبا، برفانی ریچھ کی طرح گورا، گدھے کی طرح محنتی اور گیدڑ کی طرح۔۔۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کی بات کاٹی۔ ”بس بس، میں سمجھ گیا کہ آج آپ کا میٹر پوری طرح گھوما ہوا ہے۔ اب آپ مجھے گھر تو جانے نہیں دیں گے اس لیے پہلے پیٹ پوجا کا بندوبست کرتے ہیں پھر میں تفصیل سے آپ کے شکوے سنوں گا۔“

میں نے فون ملا کر قریبی ریسٹورنٹ سے پیزا کا آرڈر دے دیا۔ اس دوران میں عباد مجھے مسلسل خشمگیں نظروں سے گھورتا رہا۔ فون رکھ کر میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا اور مسکینیت سے بولا، ”جی بھائی جان، آپ کچھ فرما رہے تھے؟“ کیونکہ عباد مجھ سے عمر میں چار سال بڑا تھا اس لیے ازراہِ مذاق میں اسے اکثر بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ مجھ سے ناراض ہوتا تو میں اسے بھائی جان کہہ کر منالیتا، وہ ہمیشہ ہنس پڑتا اور معاملہ رفع دفع ہوجاتا۔

اس بار بھی یہی ہوا اور عباد کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، ”بکواس نہ کر، تو اوّل درجے کا بے وفا اور دھوکے باز ہے۔ ایسی بھی کیا مصروفیات ہیں تیری کہ یوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا ہے۔“ اس سے پہلے کہ میں اس کے سامنے

اپنی مصروفیات کی فہرست رکھتا، فون بج اٹھا اور ابھی میں فون پر ہی مصروف تھا کہ پیزا بھی آن پہنچا۔

کھانے کے دوران میں عباد نے مجھے بتایا کہ تین دن بعد وہ شمالی علاقہ جات کی سیاحت پر روانہ ہورہا ہے۔ میں نے خوشدلی سے اس کے فیصلے کی تائید کی۔ ”اس بار تو تم نے بڑا اچھا فیصلہ کیا، ہم دنیا جہاں میں گھومتے پھرتے ہیں لیکن اپنے ہی ملک کی خوبصورتی کو نظر انداز کردیتے ہیں جبکہ دنیا بھر سے سیاح یہاں آکر قدرت کی صناعی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کیا نہیں ہے ہمارے ملک میں، برف پوش پہاڑ، سرسبز وادیاں، شفاف جھیلیں لیکن تف ہے ہم پر کہ ہم مغربی ممالک میں جاکر ہزاروں ڈالرز خرچ کرتے ہیں لیکن اپنے ہی ملک کو نظر انداز کردیتے ہیں جبکہ اس سے ہم کتنا زرِ مبادلہ پاکستان کو۔۔۔“

میں ابھی جوشِ خطابت میں مزید بولتا لیکن عباد نے اطمینان سے میرے سر پر بم پھوڑتے ہوئے کہا ”تو بھی چل رہا ہے میرے ساتھ!“ اور میں سب بھول کر حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”عباد یار، میری مصروفیات دیکھ پھر تین ماہ بعد نازش (میری چھوٹی بہن) کی شادی بھی ہے۔ ہزاروں کام پڑے ہیں اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ منہ اٹھا کر چل پڑوں۔“

عباد نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید بولنے سے منع کیا۔ ”یار، میں تجھے زندگی بھر کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کی بات نہیں کررہا ہوں۔ صرف پانچ دن کا پلان ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے ہم تیسرے دن ہی واپس آجائیں۔“

یہ سن کر میں حیرانگی سے بولا۔ ”ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی ہے کہ صرف تین دن میں واپسی بھی ہورہی ہے، کیا خالو جان کے کاروبار کے سلسلے میں وہاں جانا ہے؟“ لیکن وہ عباد ہی کیا جو سیدھے منہ کوئی بات بتادے۔ میرے بے انتہا اصرار کے باوجود اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا البتہ میرے سختی سے انکار کرنے کے باوجود اس نے آنے جانے، رہائش اور کھانے پینے کا خرچ اپنے ذمے لیا۔ میں عباد کی مہم جو طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا بلکہ فطرتاً خود بھی مہم جو واقع ہوا تھا۔ میری اور عباد کی گہری دوستی میں زیادہ ہاتھ بھی اسی مشترکہ فطرت کا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ عباد ضرور کسی نئی مہم کی تلاش میں وہاں جارہا ہے اور مجھے وہاں جاکر کوئی سرپرائز دے گا چنانچہ میں نے بھی مزید انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور

اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

حسب پروگرام تیسرے دن ہم لوگ پہلی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچے۔ عباد نے پہلے سے تمام بندوبست کر رکھے تھے۔ ائر پورٹ پر ہی خالو جان کا ڈرائیور ان کی جدید لینڈ کروزر لیے ہمارا منتظر تھا۔ کار میں سوار ہو کر ہم وہاں سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ اوائل بہار کے دن تھے چنانچہ موسم بے حد سہانا تھا۔ اسلام آباد کو تیزی سے کراس کرتے ہوئے ہم لوگ پہلے مری پہنچے پھر وہاں سے بھوربن کی جانب رواں دواں ہو گئے۔ خالو جان کی گاڑی کا جدید اور طاقتور انجن تیز رفتاری سے ہمیں کسی جہاز کی طرح اڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس دوران میں عباد بالکل سنجیدہ میں تھا۔ ایک دو بار میں نے اسے موسم کے حوالے سے چھیڑنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے گہری سوچ میں مستغرق پا کر اپنا ارادہ بدل دیا۔

جب ہم ایبٹ آباد پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی چنانچہ ہم نے وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا جس کی بکنگ عباد نے پہلے ہی کروا رکھی تھی۔ مسلسل سفر نے ہم دونوں کو بری طرح تھکا مارا تھا چنانچہ ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اگلی صبح عباد نے مجھے بیدار کیا اور سفر پر روانہ ہونے کی نوید سنائی۔

روانہ ہونے سے قبل عباد نے مجھ سے کہا کہ میں گاڑی میں جا کر بیٹھوں، وہ ایک کال کر کے آ رہا ہے۔ مجھے عباد کا رویہ کچھ عجیب سا لگا لیکن میں کچھ کہے بغیر گاڑی میں جا کر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ یہ میری عباد سے ناراضگی کا اظہار تھا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر بے ساختہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد جب عباد کال سے فارغ ہو کر اور ہوٹل کی ادائیگی وغیرہ کر کے باہر نکلا تو مجھے اس طرح آگے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا پھر کچھ کہے بغیر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

اب ہم تیزی سے مانسہرہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے تک تو ہم دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے پھر پہل عباد کی جانب سے ہوئی۔ اس نے تھوڑا سا آگے بڑھ کر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اور میرا غصہ ہوا ہو گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ہم ہنس بول رہے تھے۔ اسی دوران میں عباد کا سیل فون بج اٹھا، اس نے کال ریسیو کی اور خاموشی سے ہوں ہاں کرتا رہا جیسے وہ نہیں چاہتا ہو کہ مجھ تک اس کال کرنے والے کی گفتگو پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کال کرنے والے کو دو گھنٹے بعد فون کرنے کا کہہ کر کال کاٹ دی۔

میں کچھ دیر تک تو انتظار کرتا رہا کہ شاید عباد خود ہی کچھ بتائے گا کیونکہ اتنا تو مجھے علم تھا کہ اتنی دور ہم سیاحت کی غرض سے ہرگز نہیں آئے تھے اور ضرور ان فون کالز کا اس سارے سلسلے میں کوئی تعلق تھا لیکن عباد کی پُراسرار خاموشی مجھے الجھا رہی تھی۔ جب ہماری گاڑی مانسہرہ کراس کر رہی تھی تو مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا: ”ڈرائیور، گاڑی روکو! میں یہیں اتروں گا۔“

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو میں عباد کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اتر گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرف کو چل پڑا۔ عباد میرے پیچھے گاڑی سے کودا اور مجھے آوازیں لگاتا میرے پیچھے دوڑا۔ بڑی مشکلوں سے میں اس وعدے پر دوبارہ گاڑی میں بیٹھنے پر آمادہ ہوا کہ وہ مجھے مزید اندھیرے میں رکھے بغیر اس سفر کے مقصد اور تفاصیل سے آگاہ کرے گا۔

گاڑی ایک مرتبہ پھر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ عباد نے ہانپنے کی شاندار اداکاری کرتے ہوئے پانی کی ٹھنڈی بوتل اپنے منہ سے لگالی اور غٹ غٹ کر کے آدھی بوتل خالی کر دی پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یار ماننا پڑے گا، تو پچھلے جنم میں ضرور کوئی فلمی ہیروئین رہا ہوگا جو بات بات پر منہ پھلائے اپنے ہیرو سے روٹھ کر جنگل، بیابانوں میں نکل جاتی ہے پھر ہیرو بیچارہ رک جاؤ جانے والی رک جا گاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔“ میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر سرد نظروں سے اسے گھورتا رہا، گویا اس کے پاس اب کوئی راہ فرار نہ تھی۔

عباد نے میری نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”یار، میرا مقصد تجھے ناراض کرنا نہیں تھا۔ دراصل میں یہ چاہتا تھا کہ ایک بار ہم اس جگہ پہنچ جائیں پھر میں تمہیں وہ آسیبی حویلی دکھا کر ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا لیکن....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ آسیبی حویلی کا ذکر سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے اور جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ یعنی میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اس مرتبہ عباد کی ایڈونچر پسند طبیعت نے اسے کچھ نیا کرنے پر اکسایا تھا اور میں کیونکہ اس کا ہم مزاج تھا اس لیے وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لایا تھا۔

”کون سی حویلی کی بات کر رہے ہو؟ کہاں ہے وہ حویلی“ میں ایک دم متجسس ہو گیا۔ مجھے شروع ہی سے ایسی باتوں میں بڑی دلچسپی رہی ہے چنانچہ عباد کی زبانی اس حویلی کا قصہ جاننے کو میں بے چین ہو گیا۔ عباد میری بے تابی کو محسوس کر کے ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔ ”بس جانِ من، ہم وہیں جا رہے ہیں۔ وہ حویلی بالاکوٹ سے آگے کسی جنگل میں واقع ہے۔ اُمید تو یہی ہے کہ شام سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ تم اس ایڈونچر کے لیے تیار تو ہو نا؟ ڈر تو نہیں لگ رہا؟“ عباد نے مسکراتے ہوئے چوٹ کیا۔

میں نے اس کی شرارت کو نظرانداز کر دیا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس حویلی کے بارے میں کچھ تو بتاؤ۔“

عباد نے فلاسک میں سے کافی نکالی، ایک کپ میری طرف بڑھایا اور دوسرا خود تھامتے ہوئے گویا ہوا، ”اس حویلی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل یہ حویلی ایک انگریز نے تعمیر کروائی تھی۔ اس انگریز کا نام تھا ’آئیون رچرڈ‘ وہ یہاں پر اپنی بیوی اور چار بیٹیوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ دراصل وہ جب یہاں گھومنے پھرنے آیا تو اسے انگلینڈ کے مقابلے میں یہاں کی آب و ہوا اور موسم بہت پسند آیا اسی لیے یہیں کا ہو رہا۔ اس نے انگریز سرکار کی اجازت سے بڑے شوق سے اپنے خاندان کے لیے حویلی تعمیر کروائی اور اس میں رہنے لگا۔ اس کو یہاں رہتے ہوئے پانچ سال کا عرصہ بیت چکا تھا کہ ایک رات انہونی ہو گئی۔ آدھی رات کو نجانے کیسے حویلی میں شدید آگ بھڑک اٹھی۔ گاؤں والوں کو خبر ہونے تک جھلستی آگ میں آئیون رچرڈز کی بیوی اور چاروں بیٹیاں جھلس کر ہلاک ہو گئیں۔“

آئیون ان دنوں کچھ ضروری کاغذات بنوانے کے سلسلے میں انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ جب اسے یہ اندوہناک اطلاع ملی تو اس کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ واپس آیا تو بیوی بچوں کی سوختہ لاشیں دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا۔ اسے دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کرایا گیا مگر وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسی جلی ہوئی حویلی میں بیٹھا کبھی روتا، کبھی ہنستا اور اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک صبح گاؤں والوں نے دیکھا کہ اس کی لاش کھڑکی سے جھول رہی ہے۔ ان کے مطابق اس نے اپنے گلے میں رسی باندھ کر خودکشی کر لی تھی۔

آئیون کی موت کے بعد بھی لوگ کئی دنوں تک اس حویلی سے آئیون کے ہنسنے اور رونے کی آوازیں سنتے رہے۔ کبھی کبھی اس سے آئیون کی بیوی اور بیٹیوں کی درد میں ڈوبی چیخیں بھی بلند ہوتیں اور لوگوں کے ذہنوں میں حویلی جلنے کا واقعہ پھر سے تازہ ہو جاتا۔ یہاں تک کہ کئی لوگوں نے مخصوص راتوں میں حویلی کو اونچے اونچے شعلوں میں بھی گھرا ہوا دیکھا مگر جب وہ پانی کی بالٹیاں لیے ادھر پہنچے تو دور دور تک آگ کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ وہی مخصوص پُراسرار خاموشی اور سناٹے نے حویلی کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

”اس واقعے کو گزرے ڈیڑھ صدی کا عرصہ بیت گیا ہے مگر آج بھی وہ حویلی بدروحوں اور شیاطین کا مسکن سمجھی جاتی ہے جہاں یکے بعد دیگرے کئی ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جس کی وجہ سے بستی والوں نے وہاں کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ پورا علاقہ ہی آسیب زدہ کہلاتا ہے اور انسان تو انسان چرند پرند بھی وہاں کا رخ نہیں کرتے۔“

عباد کی کہانی ختم ہو چکی تھی مگر اس کہانی کے زیرِاثر میں ابھی تک سحر زدہ سا بیٹھا تھا۔ ”یہ سب تو ناقابلِ یقین اور فضول سی فلمی کہانی لگتی ہے، اگر تم مجھے اس وقت وہاں نہ لے جا رہے ہوتے تو میں کبھی تمہاری بات پر یقین کر کے اتنی دور آنے کو تیار نہ ہوتا۔“ میں نے سچائی سے اعتراف کیا۔ عباد نے فاتحانہ نظروں سے میری جانب دیکھا اور بولا۔ ”تم گویا تم مانتے ہو نا کہ اس طرح تمہیں اندھیرے میں رکھ کر میں نے بھلائی کی ورنہ تم تو اس شاندار ایڈونچر سے محروم ہی رہ جاتے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے پوچھا۔ ”اس دور افتادہ آسیب زدہ حویلی کے بارے میں تمہیں کہاں سے پتا چلا؟“

عباد ایک آنکھ میچتے ہوئے بولا۔ کراچی میں اپنے ایک دوست کی زبانی اس حویلی کا قصہ معلوم ہوا تھا۔ پہلے تو میں اس کا مذاق اڑاتا رہا لیکن جب اس نے مجھے اس کی تصویریں دکھائیں اور گواہی کے طور پر اپنے دوست کو پیش کیا تو مجھے یقین ہونے لگا۔ میں مزید شواہد جمع کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا کہ مجھے اپنے مالی بابا کا خیال آیا جن کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلایا اور حویلی کے بارے میں پوچھا تو ان کا رنگ خوف سے پیلا پڑ

گیا مگر میرے اصرار پر انہوں نے مجھے اٹکتے اٹکتے بتایا کہ اس حویلی کے جلنے کے کچھ عرصے کے بعد گاؤں والوں پر طرح طرح کی مشکلات آنے لگی تھیں۔ ان کے مویشی کسی نامعلوم بیماری کا شکار ہو کر مرنے لگے، بستی میں یکے بعد دیگرے نابینا بچوں کی پیدائش ہونے لگی۔ حویلی سے اکثر پُراسرار طور پر رونے دھونے کی آوازیں بلند ہوتی تھیں اور جس رات یہ منحوس آوازیں آتی تھیں اس کے اگلے ہی روز یا تو کوئی مر جاتا تھا یا گاؤں پر کوئی ناگہانی آفت ٹوٹ پڑتی تھی۔ جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو گاؤں کے بزرگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ گاؤں خالی کر کے کسی اور جگہ پر جا کر بسا جائے تاکہ مزید پریشانیوں سے بچ جائیں۔

اس کے بعد ہنگامی بنیادوں پر گاؤں خالی کر کے تمام لوگ وہاں سے کوچ کر گئے۔ تب سے وہ جگہ ویران پڑی ہے۔ کوئی وہاں نہیں آتا جاتا۔ آج بھی اس حویلی اور اس کی نحوست کا ذکر آتے ہی لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور فوراً موضوع بدل دیتے ہیں کیونکہ بقول ان کے اس حویلی کے ذکر سے بھی اس کی نحوست ان پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

عباد نے ایک انگڑائی لی اور مزاحیہ لہجے میں بولا، ”اسی لیے میرے دوست آج تک یہ حویلی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور کوئی اس کا راز نہیں جانتا لیکن ہم بھی کسی بھوت سے کم ہیں کیا، حویلی کے اندر بھی جائیں گے اور وہاں رہنے والی مسز رچرڈ اور ان کی بیٹیوں سے بالمشافہ ملاقات بھی کریں گے بلکہ ہو سکے تو ان کا گانا بھی سنیں گے۔ سنا ہے، مسز رچرڈ پیانو بڑا اچھا بجاتی تھیں۔“

میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”جب اس حویلی کے بارے میں ایسی کہانیاں پھیلی ہیں۔ لوگ نحوست کہتے ہیں تو ہماری رہبری کون کرے گا؟ ہم وہاں تک پہنچیں گے کیسے؟ تم تو اپنے اس دوست کو بھی ساتھ نہیں لائے۔“

عباد نے اطمینان سے پاؤں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ سارا انتظام ہو گیا ہے۔ میرے دوست نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔ مالی بابا بھی راضی نہ ہوئے البتہ انہوں نے اپنے ہی گاؤں کے ایک لڑکے سے میری بات کروائی جو گائیڈ کا کام کرتا ہے۔ میں نے بھاری رقم کے عوض اسے تیار کر لیا ہے کہ وہ ہمیں اس حویلی تک پہنچا دے۔ اس کے بعد وہ الٹے قدموں واپس لوٹ جائے گا۔ اس وقت وہ گائیڈ بالاکوٹ کے ایک ہوٹل میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ایبٹ آباد کے ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنے سے قبل میں نے اسے ہی فون کیا تھا۔ اب ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں بالاکوٹ پہنچ جائیں گے پھر وہاں تازہ دم ہو کر اس کے ہمراہ آگے روانہ ہوں گے۔“

باقی سفر ہمارا آسیبی حویلی اور آئیون رچرڈ کے ذکر میں گزرا۔ اور ہم دوپہر ڈھلنے تک بالاکوٹ پہنچ چکے تھے۔ یہاں پہنچ کر عباد نے حسن نامی اس گائیڈ سے رابطہ کیا جس کی ہمراہی میں ہمیں اس حویلی تک جانا تھا۔ اس کی بتائی ہوئی نشانیوں اور لوگوں سے پوچھتے پاچھتے ہم ایک مقامی ہوٹل تک پہنچ گئے جہاں حسن نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا۔ وہ کھانے کا آرڈر پہلے ہی دے چکا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم دونوں کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی چنانچہ جب ویٹر نے ہمارے سامنے کھانا چنا تو ہم حویلی کا قصہ بھول کر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

ڈٹ کر کھانے کے بعد حسن نے الائچی والا قہوہ منگوایا اور ہم لوگ دھیرے دھیرے اس کی چسکیاں لیتے ہوئے حسن سے اس حویلی کے بارے میں معلومات لیتے رہے۔ اس کے مطابق ہماری مطلوبہ حویلی بالاکوٹ سے کافی دور پارس کے جنگل میں واقع تھی۔ وہاں دور دور تک کسی انسان کا گزر نہیں گویا وہاں پہنچتے ہی ہمارا اس دنیا سے رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو جاتا کیونکہ وہاں گھنے جنگل میں موبائل کے سگنل تو دور کی بات کھانے پینے کو بھی کچھ میسر نہ تھا۔ ایک طرح سے وہ ہمیں متنبہ کر رہا تھا لیکن ہم اس مہم کے لیے اتنے بے تاب تھے کہ وہاں اپنے رسک پر جانے کو تیار تھے۔ خاص طور پر مجھے جیسے جیسے اس حویلی کے بارے میں پتا چلتا جا رہا تھا میں مزید بے چین ہوتا جا رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح جلد از جلد اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور حویلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور اس کی پُراسراریت کو محسوس کروں۔

حسن نے ہمیں مشورہ دیا کہ آج کا دن ہم بالاکوٹ گھومیں پھریں اور رات کسی ہوٹل میں گزار لیں۔ وہ اگلے روز صبح سویرے ہمیں لینے آ جائے گا کیونکہ اس وقت اگر ہم روانہ ہوتے تو راستے میں ہی رات پڑ جاتی اور اندھیرے میں دشوار گزار راستوں پر سفر کرنا ہمیں مہنگا بھی پڑ سکتا تھا۔ ہم نے حسن کی بات مان لی اور اس نے ہمارے لیے ایک معیاری ہوٹل میں کمرا بک کروا دیا۔

ہم نے کچھ دیر آرام کیا پھر بالاکوٹ کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے نکل پڑے۔ سب سے پہلے ہم نے حویلی کے قیام کے لیے مقامی بازار سے کھانے کی اشیاء اور پانی کی بوتلیں وافر مقدار میں خریدیں۔ اس کے علاوہ ہم نے چند ضروری اشیاء کی بھی خریداری کی جیسے دو عدد طاقتور ٹارچ، ایک مضبوط رسی، ایک تیز دھار چاقو، دو عدد سلیپنگ بیگز، ماچس اور کچھ درد کش دوائیاں بھی احتیاطاً خرید کر ساتھ رکھ لیں۔ اس کے بعد ہم نے سارا وقت سیر و تفریح اور کھانے پینے میں گزارا۔ رات کو ہم جلدی سونے کے لیے لیٹ گئے تاکہ آنے والے دن کے لیے پوری طرح فریش ہو جائیں۔

اگلے دن حسن نے ہمیں صبح چھ بجے ہوٹل کا دروازہ بجا کر نیند سے بیدار کیا۔ یہ بالاکوٹ کی آلودگی سے پاک اور مفرح ہواؤں کا اثر تھا کہ الارم بجتا رہا اور ہم دونوں بے خبر پڑے سوتے رہے۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی تازگی کے احساس نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ایسا احساس ہمیں اپنی شہری زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ قصہ مختصر اس کے ایک گھنٹے بعد ہم حسن کے ہمراہ لینڈ کروزر میں سوار منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ ڈرائیور کو عباد نے حسن کے مشورے سے واپس بھیج دیا تھا کیونکہ اسے دشوار گزار راستوں پر گاڑی چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا اور اب ڈرائیونگ سیٹ حسن نے سنبھال رکھی تھی۔

ساڑھے تین گھنٹے کے طویل اور صبر آزما سفر کے بعد حسن نے نوید سنائی کہ اب ہم اس حویلی کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اس نے ایک بار پھر ہمیں یاد دہانی کروائی کہ وہ ہمیں حویلی سے کچھ دور چھوڑ کر واپس ہو جائے گا۔ جہاں تک واپسی کا تعلق تھا تو حسن نے ہمیں راستے میں ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ یہاں پر پہنچ کر ہم اسے کال کریں گے تو وہ پارس میں رہنے والے اپنے ایک گائیڈ دوست کو بھیج دے گا لیکن اس کو بھی یہاں پہنچتے پہنچتے کم از کم ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔

موبائل کے سگنل واقعی اس علاقے سے آگے آتے آتے معدوم ہو کر بالکل ختم ہو گئے تھے۔ اب ہماری گاڑی گھنے جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر گامزن تھی۔ حسن نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ کچھ بھی ہو ہم رات کو اس علاقے میں سفر سے گریز کریں ورنہ گہری کھائیوں میں گر کر ہم اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں کھنڈر نظر آنے لگے۔ ہم دونوں حیرت سے ان ٹوٹے پھوٹے مکانات اور ویران بستی کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ حسن نے گاڑی روک دی۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔ ”بس صاحب، میرا وعدہ آپ دونوں کو یہاں پہنچانے تک کا ہی تھا۔ یہ اسی گاؤں کے کھنڈر ہیں جس کے رہنے والے ان بدروحوں کے خوف سے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تھے۔ آپ بھی دیکھیں گے کہ یہاں پر آپ کو اپنے اور ان درختوں کے سوا دور دور تک کسی ذی روح کا وجود نہیں ملے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں پر ویرانی بڑھتی ہی چلی گئی ہے۔ اب تو دن کے وقت بھی یہاں وحشت اور مردنی سی چھائی رہتی ہے۔ آپ بس یہاں سے ناک کی سیدھ میں چلے جائیں۔ دس منٹ بعد ہی آپ کو درختوں کا ایک گھنا جھنڈ نظر آئے گا۔ اس کے بیچ میں وہ منحوس حویلی واقع ہے۔“

اس کے بعد ہم بھی حسن کے ساتھ گاڑی سے اتر آئے۔ اس نے ہم دونوں سے پُرجوش مصافحہ کیا اور ایک مرتبہ پھر حویلی کے آسیب سے متنبہ کر کے واپس ہو گیا۔ ہم اسے دور تک جاتا دیکھتے رہے۔ آخرکار وہ چلتے چلتے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں سے آگے اس کا گائیڈ دوست اسی مقام پر گاڑی لیے اس کا منتظر تھا جہاں واپسی پر پہنچنے کی ہدایت حسن نے ہمیں کی تھی۔

میں نے کھنڈر پر نظر دوڑاتے ہوئے ایک لمبی سی سانس لی اور عباد سے پوچھا، ”اب؟“

جواباً عباد نے مسکراتے ہوئے مجھے چھیڑا۔ ”ڈر لگ رہا ہے تو حسن کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا!“

میں نے ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل اس کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔ ”چل بکواس نہ کر، ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ دیسی چڑیلیں تو بہت دیکھی ہیں اب انگریزی بولنے والی چڑیلوں سے بھی ملاقات ہو جائے تو کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہیں مجھے تیرے جیسے بھوت کے لیے کوئی بدیسی بدروح بھابی بھی مل جائے!“

ہم دونوں ایسے ہی ہنسی مذاق کرتے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ عباد نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم حسن کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے۔ ہم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ درختوں کا گھرا جھنڈ نظر آ گیا۔ میں نے اور عباد نے ایک دوسرے کی طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔

ہمارے جسموں میں لہو کی گردش تیز ہو گئی تھی اور دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ عباد نے گاڑی کی رفتار بالکل دھیمی کردی تھی۔ گاڑی کے بھاری ٹائروں تلے آکر چٹخ کر جانے والی سوکھی شاخوں اور پتوں کی آوازیں ہمیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ایسے میں تیز ہوا ان درختوں سے ٹکراتی تو ایسی آواز آتی جیسے بہت ساری عورتیں مل کر بین کر رہی ہوں۔

ہم دونوں اس پُراسرار ماحول کے زیر اثر بالکل خاموش ہو گئے تھے جبکہ گاڑی ست روی سے آگے بڑھتی جارہی تھی کہ اچانک مجھے ایک گھنے درخت کی آڑ سے کسی مکان کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے بے تابی سے عباد کو ہاتھ کے اشارے سے اس طرف گاڑی موڑنے کو کہا اور کچھ سیکنڈز بعد ہی ہم ایک انگریزی طرز پر تعمیر کردہ قدیم حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔

میں نے تیزی سے ڈیش بورڈ کھولا اور اس میں سے اپنا ڈیجیٹل کیمرا نکال کر گاڑی سے چھلانگ لگادی۔ عباد بھی تیزی سے گاڑی بند کرکے اتر گیا۔ ہم نے دیکھا کہ حویلی مکمل طور پر جلی ہوئی تھی مگر اپنے مضبوط فن تعمیر کے باعث ابھی تک ویسی ہی شان و شوکت سے کھڑی تھی جیسے اپنے پرانے وقتوں میں رہی ہوگی۔ اس پر جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اور بیلیں اگ آئی تھیں۔ کھڑکیوں کے پٹ زنگ آلودہ ہو کر جھول رہے تھے اور ان میں لگے شیشے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اس کی چھت پر کالے رنگ کے پتھر سے بنی ہوئی بڑی سی صلیب بھی مکمل طور پر کائی زدہ ہو گئی تھی۔ غرض وہ حویلی وقت کے ہاتھوں عبرت کا نشان بنی ہمارے سامنے کھڑی تھی جسے کبھی اس کے مالک نے بڑے پیار سے بنوایا ہوگا اور اس کے مکینوں نے چاؤ سے اس کی تزئین و آرائش کی ہوگی۔

میں ہر اینگل سے اس حویلی کی تصویریں کھینچنے لگا جبکہ عباد بڑبڑانے لگا۔ ”سو فیصد، بالکل سو فیصد یہ وہی حویلی ہے جس کی تصویریں میں نے اپنے دوست کے پاس دیکھی تھیں۔“

میں نے کیمرے کا لینس صلیب پر زوم کیا اور کلک کا بٹن دبا کر عباد کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”کیا ہم اندر بھی جائیں گے یا تمہارے اس بزدل دوست کی طرح باہر سے تصویریں کھینچ کر واپسی کی راہ لیں گے؟“

عباد نے چونک کر میری جانب دیکھا اور فوراً بولا۔ ”یاسر، میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ اتنا لمبا سفر طے کرکے ان بدیسی بدروحوں سے دو دو ہاتھ کیے بغیر واپس لوٹ جاؤں بلکہ اگر ہو سکا تو ان میں سے کسی کو اپنی بھابی بنا کر ساتھ بھی لے جاؤں گا۔“

ہم نے مزید ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر حویلی کے اندر قدم رکھ دیا۔ بڑی سی چوکھٹ تو موجود تھی لیکن اس میں سے لکڑی کا بھاری دروازہ شاید جل کر الگ ہو گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ہمیں کچھ کھلبلی کا احساس ہوا اور اگلے ہی لمحے دو موٹے موٹے چوہے ہمارے سامنے سے بھاگے۔ عباد اپنے ماتھے سے فرضی پسینا پونچھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”چلو، کسی ذی روح کی غیر موجودگی کی بات تو یہاں پہنچتے ہی غلط ثابت ہو گئی۔ آگے آگے دیکھو، کیا پتا تھوڑی دیر میں کسی کونے سے مسز آئیون بھی ایپرن سے ہاتھ پونچھتی نمودار ہو جائیں اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اپنے ہاتھوں کی مزیدار کافی پلاتے ہوئے ان کلموہوں کو صلواتیں سنا رہی ہوں جنھوں نے ان کی حویلی کی مارکیٹ ڈاؤن کرنے کے لیے اسے آسیب زدہ مشہور کردیا ہے اور پر سے انہیں بدروح کہہ کہہ کر ان کی انگریزوں والی ایگو بھی ہرٹ کر رہے ہیں۔ کہنا ہی ہے تو spirit کہہ لو یا بہت بہت evil spirit بول دو۔ یہ کیا جاہلوں کی طرح بدروح اور چڑیل کے القاب دے رکھے ہیں کہ وہ بیچاری اپنی ساتھیوں سے منہ چھپائے چھپائے گھومتی رہیں اور نہ صرف.....“

”بس کرو عباد!“ میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے اسے ٹوکا، ”سب سے پہلے تو کوئی کمرا تلاش کرو جہاں رات گزارنے کا کوئی آسرا ہو سکے۔“ پھر ہم دونوں آہستہ آہستہ پوری حویلی چھاننے لگے۔ جگہ جگہ دیواروں پر مکڑیوں کے لمبے لمبے جالے لٹکے ہوئے تھے۔ دیمک نے دیواروں کو کھا کر اندر سے کھوکھلا کردیا تھا۔ وسیع و عریض کمروں کے اندر جا بجا جلا ہوا دیمک زدہ فرنیچر پڑا تھا۔ چھت کی لکڑیوں پر جا بجا چمگادڑوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ میں نے چلتے چلتے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو وہ دو بجنے کا اعلان کر رہی تھی یعنی سورج ابھی آسمان پر ہی موجود تھا لیکن حویلی میں اندھیرا اندھیرا سا چھایا ہوا تھا اور ماحول پر ایک گہرا سکوت سا طاری تھا۔

نیچے کا جائزہ لینے کے بعد ہم اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ عباد مجھ سے دو سیڑھیاں اوپر تھا تب مجھے اپنے پیچھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ میں رک گیا اور پلٹ کر دیکھا لیکن میرے پیچھے کوئی موجود نہ تھا۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی، یوں لگ رہا تھا جیسے کئی نادیدہ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہوں اور چھپ چھپ کر میرا پیچھا کر رہی ہوں۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر پلٹا۔ میرے پیچھے عباد کچھ حیرت زدہ سا کھڑا تھا، ”کیا ہوا یاسر؟ کیا دیکھ رہے تھے؟“ اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا اور مسکرا کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپر کا منظر بھی نیچے سے جدا نہ تھا۔ ہر جگہ ویرانیت برس رہی تھی۔ خالی پڑے وسیع و عریض کمرے اور جلی ہوئی دیواریں اپنے مکینوں کی دردناک اموات پر نوحہ کناں نظر آتی تھیں۔ ایک کمرے کے کونے میں رکھا جلا ہوا پنگوڑا رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر قدرتی طور پر ہم دونوں کو آئیون کی بیوی اور معصوم بچیوں کی اذیت ناک موت یاد تو آگئی اور ہم افسردہ ہو گئے۔

میں نے عباد سے کہا۔ ”یار، کچھ بھی سہی لیکن آئیون کا خاندان جس قسم کی موت سے دوچار ہوا ہے۔ یہ جلے ہوئے درودیوار اور یہ اسٹیل کا چرمرایا ہوا پنگوڑا اس کی دلیل ہیں۔ یہ سب دیکھ کر تو میرا دل اداس ہو گیا ہے۔“

عباد بھی افسردگی سے بولا، ”اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی موت کی بددعا تو ہم اپنے دشمنوں کو بھی نہیں دیتے پھر یہ تو معصوم جانیں تھیں۔“ ہم بوجھل دلوں کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئے۔

ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگے تو اچانک مجھے ویسا ہی احساس دوبارہ ہوا جیسے کوئی ہمیں چھپ کر دیکھ رہا ہو اور اس احساس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے کسی نے دھیرے سے میرے داہنے کان کو کھینچا ہو۔ مجھے بچے کی قلقاری کی آواز سنائی دی جیسے وہ اپنی کسی شرارت سے لطف اندوز ہوا ہو۔ میں نے فوراً عباد کی طرف دیکھا مگر وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا جیسے اسے کوئی آواز نہ آئی ہو۔ میں نے بھی اسے اپنا وہم جان کر سر کو جھٹکا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا عباد کے پیچھے حویلی سے باہر آگیا۔ باہر آ کر ہم نے سب سے پہلے تو گاڑی میں بیٹھ کر پیٹ پوجا کی پھر حویلی میں واپس جا کر جلدی جلدی اوپری منزل پر واقع ایک کمرے کو جو نسبتاً بہتر حالت میں تھا اس کی صفائی کرنے لگے تاکہ رات کو وہاں سو سکیں۔

شام چھ بجے تک ہم کمرے کی صفائی کرکے اپنا سامان اوپر پہنچا چکے تھے۔ اب ہر طرف اندھیرا اپھیل چکا تھا اس لیے ہم نے کمرے میں موم بتیاں روشن کردیں۔ ماحول اچانک ہی سرد ہو گیا تھا۔ ہم نے جلدی جلدی سامان میں احتیاطاً ساتھ رکھ کر لائی گئیں لیدر۔ جیکٹس نکال کر پہن لیں لیکن سردی ہڈیوں میں سوراخ کیے دے رہی تھی۔ عباد اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ ”موسم میں اچانک تبدیلی تو پہاڑی علاقوں کی خصوصیت ہے لیکن اتنی سنگین نوعیت کی تبدیلی تو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔“

میں نے اس کی بات پر صرف اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا کیونکہ مجھے یہ تبدیلی قدرتی نہیں بلکہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

حویلی کے اندر وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اتنی خاموشی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز صاف سن رہے تھے۔ دن میں جو تھوڑی بہت کھلبلی چوہوں کی بھاگ دوڑ اور چمگادڑوں کی موجودگی سے ہو رہی تھی وہ بھی اب پُراسرار طور پر دم توڑ چکی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا سارا ماحول سوگ میں ڈوب گیا ہو۔ اپنی دن بھر کی مصروفیات کے باعث اب ہم تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ہم دونوں جیکٹس پہنے اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں خاموشی سے دبکے پڑے تھے۔ فرش پر رکھی جلتی ہوئی موم بتیاں دیواروں پر عجیب و غریب سائے بنا رہی تھیں۔ کچھ ماحول کا بھی اثر تھا کہ رگ و پے میں رہ رہ کر خوف کی سرد لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

میں نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو وہ نو بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ کچھ سوچ کر میں ٹھٹھرتا ہوا اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر نکلا اور بائیں ہاتھ پر واقع کھڑکی سے باہر جھانکا جہاں نیچے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، چاند کی آخری تاریخیں چل رہی تھیں شاید اسی لیے ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ مجھے دیکھ کر عباد بھی سلیپنگ بیگ سے نکل آیا۔ اس نے فلاسک میں بچ جانے والی کافی ہم دونوں کے لیے نکالی اور ہم وہیں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر کافی پینے لگے۔

کافی پیتے پیتے نجانے عباد کو کیا خیال آیا کہ اس نے کافی کا کپ ایک طرف رکھ دیا اور ٹارچ اٹھا کر باہر جانے لگا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا اندھیرے میں حویلی explore کرنے کا الگ ہی مزہ ہوگا اور سیٹی بجاتا باہر نکل گیا۔

میں چاہنے کے باوجود بھی اس کے پیچھے نہ جاسکا۔ مجھے اپنے ساتھ سیڑھیوں پر ہونے والے واقعات یاد آگئے تھے۔ کچھ دیر تک تو عباد کی سیٹی کی آواز حویلی میں گونجتی رہی پھر اچانک سناٹا چھا گیا۔ میں ایک منٹ تک تو صبر کرتا رہا پھر دوسری ٹارچ اٹھا کر عباد کو آوازیں دیتا باہر لپکا۔

باہر نکلتے ہی میرا سب سے پہلے سامنا ایک بڑی سی تصویر سے ہوا جو دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ تصویر ہم دونوں کو دن میں نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے ٹارچ کا رخ تصویر کی طرف کیا تو میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تصویر یقیناً آئیون رچرڈ اور اس کی فیملی کی تھی۔ تصویر میں ایک کرخت صورت انگریز اپنی بیوی اور تین بیٹیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی بیوی ایک نومولود کو تھامے کھڑی تھی جو ان کی چوتھی بیٹی ہوگی۔ ان لوگوں نے قدیم وکٹورین زمانے کے پہناوے پہن رکھے تھے۔ اس عورت اور بچیوں کے چہروں پر ایک دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں تصویر سے اور تھوڑا قریب ہوا تو اس کے ایک جانب کونے پر لکھی ہوئی عبارت پر میری نظر پڑی۔ وہ انگریزی میں تھی جس کا ترجمہ تھا ’آنٹ ایوی کی جانب سے ننھی اینجیلا اور اس کی ممی کے لیے تحفہ‘ نیچے تاریخ بھی درج تھی ’پندرہ جون سن اٹھارہ سو چھیانوے‘ یہ تصویر جلنے سے کیسے محفوظ رہ گئی اور ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی ویسی کی ویسی ہی کیسے ہے؟ ہمیں یہ پہلے کیوں نظر نہیں آئی؟ یہ سارے سوالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے اور میں تصویر کو حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات لیے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میرے داہنے جانب روشنی سی چمکی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو عباد ٹارچ تھامے میرے نزدیک آگیا۔ ”یاسر میں نے تمہیں کمرے سے نکال کر ڈرانے کا پلان بنایا تھا۔ اس چکر میں ٹارچ بھی بند کرلی تھی لیکن تم تو کمرے سے باہر آکر اس دیوار کے سامنے پچھلے پانچ منٹ سے بت بنے کھڑے ہو۔ آخر کیا نظر آگیا تمہیں اس جلی ہوئی دیوار میں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹارچ کی روشنی دیوار پر پھینکی۔ میں نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اگلے ہی لمحے میں حیرت کی شدت سے گنگ ہوگیا۔

دیوار پر کسی تصویر کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ عباد میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر میں ہونقوں کی طرح کبھی دیوار کو اور کبھی اسے دیکھ رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میرے منہ سے یہ جملہ نکلا۔ ”ع۔۔۔ع عباد اسی دیوار پر میں نے ابھی ابھی آئیون اور اس کی فیملی کی بڑی سی تصویر ٹنگی دیکھی تھی۔“

عباد نے ایک مرتبہ پھر دیوار پر اچھی طرح ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ وہاں واقعی کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورا اور میرا ماتھا چھوتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ ہم لوگ دوپہر سے پوری حویلی میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ پہلے تو کوئی تصویر نظر نہیں آئی اور بالفرض اگر تصویر تھی بھی تو ایک سیکنڈ میں کہاں غائب ہوگئی؟“

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ مجھے یقین تھا کہ دو منٹ پہلے میں نے پورے ہوش و حواس میں اسی دیوار پر تصویر دیکھی تھی بلکہ اس پر لکھی عبارت بھی پڑھی تھی پھر وہ اچانک کہاں چلی گئی۔

عباد نے میری یہ حالت دیکھی تو نرمی سے مجھے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا اور پانی پلایا۔ میں بالکل خاموش تھا۔ اس واقعے کے بعد میرے ذہن میں دوپہر میں ہونے والے واقعات بھی تازہ ہوگئے تھے۔ عباد نے جو مجھے یوں چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو میرے نزدیک آکر بیٹھ گیا۔ ”یاسر کیا تم مجھے تفصیل سے بتاؤ گے کہ تم نے اس دیوار پر کیا دیکھا تھا؟“

میں نے اٹکتے اٹکتے اسے نہ صرف تصویر کے بارے میں بتایا بلکہ دوپہر والے واقعات بھی اس کے گوش گزار کردیے۔ وہ سنجیدگی سے سنتا رہا لیکن میں جیسے ہی خاموش ہوا اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ساتھ ہی وہ مجھے ڈرپوک اور احمق جیسے القابات سے بھی نوازتا رہا۔ میرے لاکھ یقین دلانے کے باوجود بھی وہ میری باتوں کو سچ ماننے پر تیار نہ تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ میں اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ایک گہری سانس لے کر باسکٹ سے رات کا کھانا کھانے اٹھ گیا جو سینڈوچز اور بسکٹس پر مشتمل تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی وہ مجھے لگاتار چھیڑتا رہا۔

رات کا کھانا کھا کر کچھ دیر تک تو ہم اچانک بڑھ جانے والی سردی پر گفتگو کرتے رہے پھر یاسر نے اپنے آئی پوڈ پر گانے لگا دیے۔ ہم پھر سے اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں گھس گئے تھے۔ گانے سنتے سنتے مجھ پر ہلکی سی غنودگی طاری ہونے لگی۔ عباد بھی نیم غنودگی میں تھا۔ تبھی اچانک گانے کے بیچ میں ایک درد میں ڈوبی نسوانی کراہ بلند ہوئی۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، عباد کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ اس نے جھپٹ کر آئی پوڈ اٹھایا اور اسی گانے کو شروع سے چلایا۔ ہم دونوں کے کان پوری طرح گانے کے بولوں پر لگے ہوئے تھے۔ گانا دو منٹ بعد ختم ہوگیا لیکن کوئی آواز نہ آئی۔ عباد نے تیزی سے گانے کو دوبارہ پلے کیا لیکن اس مرتبہ بھی نتیجہ صفر رہا۔ میں نے اور عباد نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس بار شک کی کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم دونوں نے بیک وقت وہ درد بھری کراہ سنی تھی۔ عباد نے آئی پوڈ کا بغور جائزہ لینا شروع کردیا۔ وہ اس کے فنکشنز پر غور کر رہا تھا۔

میں اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا کہ اس نے آئی پوڈ سے نظریں ہٹا کر حیرت سے میری جانب دیکھا۔ ”یار، ابھی تو نے میرے بال کھینچے تھے نا؟“

میں نے اسے ناراضگی سے دیکھا۔ ”کیا میں پاگل ہوگیا ہوں جو ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کروں گا۔“ میرے جواب پر عباد نے پیچھے پلٹ کر کمرے سے باہر دیکھا جہاں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سر کھجاتا ہوا بولا۔ ”یاسر، مجھے ابھی ابھی یوں لگا جیسے کسی نے میرے بال اپنی مٹھی میں پکڑ کر زور سے کھینچے ہیں مگر یہاں تو تمہارے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے۔ پھر کس نے؟“ اس نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا اور آنکھیں پھاڑ کر میرے پیچھے کسی کو دیکھنے لگا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں غصے سے بولا۔ ”یار تو یہ پاگلوں والا برتاؤ کیوں کر رہا ہے؟“

مگر وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے پھرتی سے آگے بڑھ کر میرے پیچھے دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ ”میں نے ابھی ابھی یہاں ایک چھوٹی سی بچی کو کھڑے دیکھا تھا۔ اس کے بال سنہری تھے۔ اس نے نظر کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور اس کے ماتھے پر شاید کوئی چوٹ بھی لگی ہوئی تھی، کک کہاں چلی گئی؟“

میں اپنی جگہ پر بھونچکا کھڑا عباد کے منہ سے اس بچی کا حلیہ سن رہا تھا۔ سنہری بال، نظر کا چشمہ اور ماتھے پر گہرا سرخ پیدائشی نشان۔ اس بچی کو تو میں نے سب کے ہمراہ اس تصویر میں مسکراتا ہوا دیکھا تھا۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی، گویا کھیل شروع ہوچکا تھا۔ لوگوں کی اس حویلی کے بارے میں کی گئی باتیں افواہیں نہیں تھیں بلکہ ایک سو ایک فیصد درست تھیں۔ اس حویلی میں اب مزید رکنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔

عباد کو ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا اور وہ سارے کمرے میں اس بچی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا جو اچانک اس کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہوگئی تھی۔ میں جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگا تو عباد نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ”کہاں جارہے ہو تم؟“

میں نے سلیپنگ بیگ اپنے کندھے پر لادتے ہوئے اسے گھورا۔ ”کیا تمہیں اب بھی اس حویلی کے آسیب زدہ ہونے کے بارے میں شک ہے؟ اپنا سامان اٹھاؤ اور جتنی جلدی ہوسکے یہاں سے نکل چلو ورنہ اس بیابان میں تو دور دور تک ہماری لاشوں کا کفن دفن کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔“

عباد کو جیسے میری بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا سامان سمیٹا۔ پھر ہم ٹارچ جلا کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہاں تک ٹارچ کی روشنی جاتی تھی بس وہیں تک نظر آتا تھا اس کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا، بے تحاشا اندھیرا! گویا ہم کسی قبر میں اتر گئے ہوں۔

ہم دونوں کے دل تیز تیز دھڑک رہے تھے اور کان آوازوں پر لگے ہوئے تھے لیکن پوری حویلی پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ کسی پتے تک کے کھڑکنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہم ہمت کر کے ایک ایک قدم اٹھاتے سیڑھیوں کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ سناٹے کو توڑتی کچھ دیر پہلے عباد کے لگائے جانے والے قہقہے کی آواز حویلی میں گونجی۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے دو دو فٹ اونچے اچھل پڑے۔ اب حویلی میں میری آواز گونج رہی تھی۔ میں عباد کو تصویر اور اپنے کان کھینچے جانے کا قصہ سنا رہا تھا۔ ہم دم سادھے یہ آوازیں سن رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہماری آوازیں ریکارڈ کر کے بڑے بڑے اسپیکرز پر چلا دیا ہو۔ میری بات ختم ہوتے ہی دوبارہ سے عباد کا قہقہہ گونجا جو اس وقت بہت ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

میں نے عباد کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔ خود میری بھی حالت خراب ہوچکی تھی اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ عباد کا قہقہہ بڑھتے بڑھتے اب کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھ سے سامان گر چکا تھا اور ہم اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے بے ساختہ آگے کو جھک گئے تھے۔ آہستہ آہستہ

اس کی آواز گھٹنے لگی پھر ایک درد میں ڈوبی کراہ ابھری اور اس کے ساتھ ہی پہلے کی طرح سناٹا چھا گیا۔ میں نے اپنے کانوں پر سے ہاتھ ہٹائے اور ڈرتے ڈرتے نیچے گری ہوئی ٹارچ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سامنے ہی سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ عباد بھی اب اپنی ٹارچ تھامے خالی خالی نگاہوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہم پر جو کچھ بیتا تھا وہ ہمارے دل بند کردینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ایسے ایڈونچر پر سو بار لعنت بھیجی اور سامان اٹھائے بغیر تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ عباد نے بھی میری تقلید کی تھی۔ نیچے اتر کر ہم دونوں بھاگتے ہوئے حویلی سے باہر جانے والے راستے کی طرف گھومے لیکن ٹارچ کی روشنی میں نظر آنے والے منظر نے ہماری جان ہی نکال دی اور ہم شدید خوف کے عالم میں چیخ پڑے۔

جب ہم حویلی پہنچے تھے تو اس کی کوئی کھڑکی یا دروازہ سلامت نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کے اندر آنے جانے کے راستے پر بھی کوئی دروازہ نہ تھا صرف اس کی موجودگی کے مٹے مٹے سے آثار نظر آئے تھے لیکن اب اسی جگہ پر ایک دیو ہیکل سا لکڑی کا دروازہ نصب تھا۔ جو نہ صرف بند تھا بلکہ اس پر ایک بڑا سا تالا بھی تھا جو ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ ہم دونوں نے دیوانوں کی طرح دروازہ پیٹ ڈالا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر مدد کے لیے چلّاتے رہے لیکن اس جنگل میں تھا کون جو ہماری مدد کو آتا۔

دروازے کی طرف سے مایوس ہو کر ہم لوگ کھلی ہوئی کھڑکیوں کی طرف بھاگے اور یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ عباد تیزی سے ایک کھڑکی پر چڑھا تاکہ باہر کود جائے۔ میں اس کے پیچھے تھا مگر وہ باہر کودنے کی بجائے کھڑکی سے نیچے ٹارچ کی روشنی میں آنکھیں پھاڑے کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا اور میں بے اختیار چلّایا، ”تو خود کودے گا یا میں تجھے دھکا دے دوں؟“ جواب میں عباد اتری ہوئی شکل کے ساتھ واپس گھر کے اندر کود گیا۔ میں نے کچھ نہ سمجھنے والی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تو خود دیکھ لے!“

میں نے فوراً اپنی ٹارچ تھامی اور کھڑکی سے آگے ہو کر جیسے ہی باہر جھانکا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

گھر کے چاروں طرف دور دور تک اندھی کھائی نمودار ہو گئی تھی۔ اتنی گہری کہ اگر ہم بے دھیانی میں اس میں کود جاتے تو ہماری ہڈیوں کا سرمہ بن جاتا۔ آس پاس ہماری گاڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی اور کیا پتا اس ہولناک کھائی نے اسے بھی نگل لیا ہو۔ میں وہیں فرش پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عباد اب چھوٹے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ خود میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔ یہ ایڈونچر ہم دونوں کو بہت مہنگا پڑا تھا۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ لوگوں کے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود ہم اپنی بہادری کے زعم میں یہاں تک چلے آئے۔ اپنا دردناک انجام سوچ کر میں بھی بے اختیار رونے لگا۔

حویلی میں ہر طرف وہی نحوست بھرا سناٹا چھایا تھا۔ ہم دونوں بھی اب رو رو کر تھک چکے تھے اور بے دم ہو کر ایک کونے پر دیوار سے ٹیک لگائے کسی معجزے کے منتظر تھے جو ہمیں اس آسیب زدہ حویلی سے باہر نکال لے جاتا پھر ہم مرتے دم تک حویلی تو کیا اس علاقے کا بھی رخ نہ کرتے لیکن فی الحال ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں جب کافی دیر تک ایک پہلو پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو داہنا پہلو بدلا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے کولہے پر چبھن کا احساس ہوا۔ میں نے وہاں ہاتھ مارا تو اپنی پینٹ کی جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا، میں نے فوراً وہ چیز نکالی، وہ میرا ڈیجیٹل کیمرا تھا جسے میں نے تیزی سے سامان سمیٹتے ہوئے اپنی جیب میں اڑس لیا تھا۔

مجھے بچپن ہی سے فوٹو گرافی کا شوق تھا۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے پچھلے سال میری سالگرہ کے موقع پر امی ابو نے مجھے یہ ڈیجیٹل کیمرا تحفے میں دیا تھا تاکہ میں اپنا شوق جاری رکھ سکوں۔ اس وقت وہ کیمرا دیکھ کر امی اور ابو کے شفیق چہرے میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے اور میں کیمرے کو سینے سے لگائے سسک اٹھا۔ مجھے اس طرح روتا دیکھ کر عباد رینگ کر میرے نزدیک آگیا اور میرا ہاتھ دبا کر تسلی دینے لگا۔ میں نے کیمرا آن کیا اور ایک ایک کر کے اس میں محفوظ تصویریں دیکھنے لگا۔ اس میں میری سالگرہ کی تصویریں، نازش کی منگنی کی تصویریں اور دو ماہ پہلے خاندان کے ساتھ منائی جانے والی پکنک کی تصویریں بھی محفوظ تھیں۔ عباد بھی میرے ساتھ تصویریں دیکھنے لگا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم اس خوفناک حویلی سے اڑ کر واپس اپنی دنیا میں پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارے گھر والے ہیں، دوست ہیں۔ جہاں

کوئی تاریکی اور خوف نہیں بس چاروں طرف خوشیوں کے رنگ بکھرے ہیں۔

تصویریں دیکھتے دیکھتے ہم کئی بار آبدیدہ ہوئے۔ آگے بڑھتے بڑھتے ہم وہاں پہنچے جب ہم اس سفر کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ ائرپورٹ کی تصاویر، راستے میں پڑنے والے خوبصورت مناظر، ایبٹ آباد کا ریسٹ ہاؤس، بالاکوٹ کا سفر اور وہاں کھانا کھا کر قہوے کے کپ تھامے ہماری بے فکری ہنسی پھر تصویریں آگے بڑھیں حویلی کا سفر، حسن کی ہمارے ساتھ بات چیت، وہ مقام جہاں ہم واپسی پر پہنچ کر اسے فون کرتے۔ گھنا جنگل، کھنڈر اور پھر اسی منحوس حویلی کی تصاویر جہاں اس وقت ہم بیٹھے اپنی موت کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ عباد نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کیمرے پر سے نگاہیں ہٹالیں البتہ میں تصویریں دیکھتا رہا۔

میں تصویریں تیزی سے آگے بڑھاتا جا رہا تھا کہ ایک تصویر ایسی گزری جو مجھے کچھ غیر معمولی سی لگی۔ میں چونک کر واپس پیچھے جانے لگا، اس مرتبہ میں نے رفتار دھیمی رکھی تھی۔ یہ حویلی کے بیرونی مناظر کی تصویریں تھیں۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں، خالی چوکھٹیں، چھت پر لگی بڑی سی صلیب یہاں پہنچ کر میں اچھل پڑا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ صلیب پر زوم سیٹ کر کے میں عباد کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور کیمرا آٹومیٹک موڈ پر سیٹ کر دیا تھا پھر وہ تصویر دیکھے بغیر میں عباد کے ساتھ حویلی کے اندر چل پڑا تھا۔ اس تصویر میں صلیب کے بالکل نیچے کھڑکی کے پاس ایک آدمی کی لاش جھول رہی تھی جس کے گلے میں پڑا پھندا صاف نظر آرہا تھا۔ کیمرے کا رزلٹ بہترین تھا اس لیے چہرے کے نقوش واضح تھے۔ وہ آئیون کی لاش تھی جس نے اس حویلی میں خودکشی کی تھی۔ اسی آدمی کو میں نے اس قدیم تصویر میں بھی دیکھا تھا۔

میں نے عباد کو ایک ہاتھ سے جھنجوڑ ڈالا اور کیمرا اس کے سامنے کر دیا۔ یہ تصویر دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی خوف سے پھیل گئیں اور وہ ہکلایا۔ ”یاسر، یہ س۔۔ سب کک کیا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا کیونکہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ ہمیں یہ لاش پہلے کیوں نہیں نظر آئی تھی۔ اس کی وجہ بہت سادہ تھی کہ وہ وہاں تھی ہی نہیں کیونکہ گاؤں والوں نے اسے اتار کر دفن کر دیا تھا۔ یہ تصویر اسی پُراسرار آسیبی ڈرامے کی ایک کڑی تھی جو آج شب ہمارے ساتھ کھیلا جا رہا تھا۔

خراسان

تاریخ کے مطابق افغانستان میں حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت یعنی 12 ہجری میں اسلام کا نور پھیلنا شروع ہوا۔ حضرت احنف بن قیس کی امارت میں مجاہدینِ اسلام ایران کے بادشاہ کسریٰ ”یزدگرد“ کے تعاقب میں ہرات پہنچے۔ اس کے بعد بلخ میں اسے آخری شکست دی۔ علاقہ خلافتِ اسلامیہ میں شامل ہو گیا۔ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے دور یعنی 30 ہجری میں حضرت عبداللہ بن عامر کی امارت میں کابل اور نیشاپور کے علاقے فتح ہوئے اور کابل شاہی کے نام سے کابل میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہوئی قرونِ وسطیٰ سے لے کر انیسویں صدی تک اس پورے علاقے کو ”خراسان“ کہا جاتا تھا۔ خراسان کے چند اہم مراکز کابل، بلخ، ہرات اور غزنی آج بھی افغانستان کے معروف صوبے ہیں۔

اقتباس: شیخ اسامہ از انور غازی

ایک ٹھنڈی سانس لے کر میں نے کیمرا آف کر دیا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے گویا اجالا ہونے میں ابھی بھی چار، ساڑھے چار گھنٹے باقی تھے جبکہ حویلی میں گزرنے والا ایک ایک لمحہ پہاڑ تھا۔ عباد کی ساری شوخیاں ہوا ہو چکی تھیں اور وہ مایوسی سے ایک طرف سر ڈالے پڑا تھا۔ میں بیٹھا ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر گھما رہا تھا کہ اچانک اوپری منزل پر قدموں کی چاپ ابھری۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی فرش پر اپنے پاؤں گھسیٹ کر چل رہا ہو۔ ہم دونوں خوفزدہ نظروں سے سیڑھیوں کی جانب دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ جو کوئی بھی تھا۔ نیچے آنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرتا۔ دو منٹ کے بعد قدموں کی چاپ آنی تو بند ہو گئی لیکن پیانو کی آواز نے ہمارا خون خشک کر دیا۔ کوئی بڑی مہارت سے پیانو پر پہلی برتھ ڈے کی دھن بجا رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم اس سے ضرور محظوظ ہوتے مگر ابھی تو ہماری گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

حویلی کے اندر ہمیں کہیں بھی پیانو یا اس کی باقیات

نظر نہیں آئی تھیں لیکن مسز آئیون کے بارے میں سنا تھا کہ وہ پیانو بہت اچھا بجاتی تھیں اور اس کو سننے کی خواہش تو عباد نے بھی یہاں آتے ہوئے کی تھی چنانچہ اب ہم رات کے اس پہر نادیدہ پیانو کی آوازیں سن رہے تھے جس کو بجانے والی ہستی بھی ڈیڑھ سو سال پہلے ناگہانی موت کا شکار ہوگئی تھی۔ حویلی میں ابھی پیانو کی گونج باقی تھی کہ عباد نے کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کی نگاہوں کی تقلید میں دیکھا تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

سیڑھیوں پر سے ایک چھوٹا سا وجود اتر رہا تھا۔ وہ شاید کوئی چھوٹی بچی تھی جس نے قدیم طرز کا پھولدار فراک پہن رکھا تھا اور ایک ایک کر کے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک آسیب زدہ حویلی میں آدھی رات کو، گھپ اندھیرے میں، نادیدہ پیانو کی گونج میں آپ کے سامنے ایک چھوٹی بچی کھڑی ہو جسے مرے ہوئے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ بیت چکا ہو تو آپ کا کیا حشر ہوگا۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس بچی کو اپنی طرف بڑھتا دیکھتے رہے۔ ہمارے نزدیک پہنچ کر وہ رک گئی اور اپنے ننھے ہاتھ پھیلا کر اپنی باریک سی آواز میں کچھ منمنائی۔ میرے کان اس وقت خوف کی شدت سے سائیں سائیں کر رہے تھے اور دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ عباد کی حالت بھی غیر تھی۔

جب بچی کو اس کی بات کا جواب نہ ملا تو وہ تھوڑی اونچی آواز میں بولی۔ ہماری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں دہشت کے مارے سلب ہو چکی تھیں اور زبان تالو سے لگی تھی۔ اب اس ننھی بچی کے چہرے پر غصے کے تاثرات نظر آئے اور وہ اپنے سر کو جھٹکتی ہوئی چیخ کر بولی where is my birthday present?

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ وہ ہم سے اپنے سالگرہ کے گفٹ کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ہم دونوں ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتے رہے تو اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی اور وہ چیخ چیخ کر where is my birthday present? کی گردان کرنے لگی۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں اپنا سوال دہرائے جا رہی تھی، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے آواز بھر کر ٹیپ چلا دیا ہو۔ عباد اور میں اب خوف سے باقاعدہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بچی کی گردان جاری تھی اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کے نقوش بگڑنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شدید آگ میں جھلستی جا رہی ہو۔ پہلے اس کے پیر جھلسے ہوئے نظر آئے، پھر اس کے ہاتھ، گردن اور چہرہ آگ کی زد پر آئے۔ اب وہ بچی کربناک انداز میں چیخ رہی تھی، اس کے بال بھی چڑ چڑ کر کے جل رہے تھے۔ اس کی چیخیں اب آہوں اور سسکیوں میں تبدیل ہو گئی تھیں پھر یہ بھی دھیمی ہوتی ہوئی دم توڑ گئیں اور ایک منٹ بعد ہمارے سامنے اس بچی کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔

پیانو پر ایک حزنیہ سی دھن بج رہی تھی اور ہم کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کی تصویر بنے اپنی آنکھوں کے سامنے یہ تماشا ہوتا دیکھ رہے تھے پھر ایک دھماکا سا ہوا جیسے کوئی شیشے کا بنا ہوا بھاری فانوس فرش پر گر کر ٹوٹا ہو اور ہمارے سامنے سے بچی کی لاش غائب ہو گئی۔ پیانو کی آواز بھی تھم گئی۔ ڈراما اختتام پذیر ہو گیا تھا اور اب ہر طرف وہی موت کی سی خاموشی رقصاں تھی۔

عباد اٹھ کر دیوانہ وار کھڑکی کی طرف بھاگا۔ میں اس کا ارادہ بھانپ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر کودتا، میں نے اسے جا لیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر جکڑ کر اسے واپس اندر کھینچنے لگا۔ عباد جنونیوں کی طرح ہاتھ پیر چلا کر خود کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ چلا چلا کر مجھے اپنی گرفت سے آزاد کرنے کی التجائیں کر رہا تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے کھینچ کر اندر گرا لیا اور ایک طرف بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اب عباد فرش پر بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اب ہم دونوں اپنی قسمت پر آنسو بہا رہے تھے۔ ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم اس دنیا میں زیادہ دیر کے مہمان نہیں ہیں۔ یا تو یکے بعد دیگرے پیش آنے والے ہولناک مناظر سے ہماری حرکتِ قلب بند ہو جائے گی یا اس حویلی کی بدروحیں ہماری جان لے لیں گی پھر ہم بھی انہی کے ساتھ اس حویلی میں بدروح بن کر گھوما کریں گے۔ ہم اپنے بچکانہ ایڈونچر کا مزہ بہت اچھی طرح چکھ رہے تھے جو شاید ہماری زندگیوں کا آخری ایڈونچر ثابت ہونے والا تھا۔

جب رو رو کر کچھ دل ہلکا ہوا تو میں نے ٹائم دیکھا۔ اس وقت ڈیڑھ بجے کا عمل تھا، گویا صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے باقی تھے لیکن ہم اگر اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر اجالے کے انتظار میں بیٹھے رہتے تو صبح تک زندہ بچ

پانا مشکل تھا کیونکہ آثار یہی لگ رہے تھے کہ اس چوہے بلی کے کھیل میں جیت طاقتور حریف کی ہوگی اور اس وقت تو ہم پوری طرح بے بسی کی تصویر بنے انہی کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ سوچ کر میں اپنی ٹارچ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور عباد سے بولا۔ ”تمہیں یاد ہے، ہم نے بالاکوٹ سے جو سامان خریدا تھا اس میں ایک عدد رسی بھی شامل تھی اور ہم اسے اپنے ساتھ حویلی کے اندر بھی لے کر آئے تھے۔“

عباد نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہاں، وہ میرے ہاتھ میں ہی تھی لیکن جب ہم ان آوازوں سے خوفزدہ ہو کر نیچے بھاگے تو وہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر وہیں سیڑھیوں کے قریب گر گئی تھی۔“

میں نے پلٹ کر ٹارچ کی روشنی اوپر پھینکی۔ وہاں پھیلے تاریک سناٹے میں کوئی نظر نہ آیا۔ میں نے ہمت کر کے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو عباد نے لپک کر میرا بازو تھام لیا۔ ”تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ اس وقت اوپر جا کر کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے؟“

میں اس سے بازو چھڑاتا ہوا بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے شاید وہ تم ہی تھے جو کھڑکی سے باہر کود کر اپنی جان دینے کو تیار تھے جبکہ میں تو جان بچانے کی غرض سے اوپر جا رہا ہوں کیونکہ اگر ہم یونہی صبح ہونے کے انتظار میں بیٹھے رہے تو صبح ہونے سے پہلے ہی ان آسیبی طاقتوں کے ہاتھوں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“

عباد لاجواب سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”پلان کیا ہے؟“

میں نے ایمانداری سے جواب دیا۔ ”فی الحال تو میرے پاس کوئی پلان نہیں ہے۔ ابھی تو میں رسی لینے اوپر جا رہا ہوں، آگے اللہ مالک ہے۔“

عباد بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ ہم دونوں سہمے سہمے سے دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے اوپر پہنچ گئے۔ اوپر سب ویسا ہی تھا جیسا ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ تھوڑا سا آگے بڑھے تو ایک طرف فرش پر ہمارے سلیپنگ بیگز اور دیگر سامان بکھرے نظر آئے۔ ایک مرتبہ پھر ہمارے ذہنوں میں تمام واقعات تازہ ہو گئے اور ہم دہشت سے تھرا اٹھے۔ عباد نے آگے بڑھ کر جلدی سے رسی اٹھائی اور میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے رسی لے کر غور سے دیکھا۔ وہ اچھی خاصی لمبی اور مضبوط رسی تھی جس کی مدد سے بھاری اشیا بھی کھینچی جا سکتی تھیں۔

میں نے وہ رسی اپنے کندھے پر لٹکا لی پھر ہم نے سامان میں سے بچ جانے والی موم بتیاں نکال لیں۔ اس کے بعد میرے ذہن میں نجانے کیا آیا کہ میں واپس نیچے جانے کی بجائے آہستہ آہستہ اسی کمرے کی جانب بڑھنے لگا جس میں ہم نے قیام کیا تھا۔ عباد بھی خاموشی سے میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

اسی وقت حویلی میں آہستہ آہستہ سرگوشیوں کی آوازیں گردش کرنے لگیں جن کے بیچ دبی دبی ہنسی کی آواز بھی واضح تھی۔ بے اختیار ہمارے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی اور ہم تقریباً بھاگتے ہوئے اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔ سرگوشیوں کی آوازیں اب باقاعدہ باتوں کی آواز میں ڈھل گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس وقت ہمارے آس پاس کئی نادیدہ لوگ آپس میں بات چیت میں مصروف ہوں۔ یہ ایک رگوں میں خون جما دینے والا احساس تھا۔ ہمارے دل کسی بھی لمحے سینوں کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے کو تھے۔ ایسے میں بھاگتے بھاگتے عباد کو ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میں فوراً پلٹ کر اس کی طرف بھاگا۔

میں نے اوندھے منہ گرے ہوئے عباد کو جھک کر سیدھا کیا تو چکرا کر رہ گیا۔ عباد کی آنکھیں بند تھیں اور اس کی ناک سے خون جاری تھا۔ میں نے گھبرا کر اس کے گال تھپتھپائے اور اس کو آوازیں دیں، صد شکر اس نے کراہتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میرے منہ سے پچھلے کچھ گھنٹوں میں پہلا اطمینان بھرا سانس خارج ہوا اور میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

اس اثنا میں ٹارچ کی اچٹتی سی روشنی میں میری نظر کچھ فاصلے پر کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ میں نے گھبرا کر ٹارچ کا رخ دوبارہ اسی جانب کر دیا۔ وہ ہماری ہی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ جس چیز نے میرے اوسان خطا کر دیے وہ یہ تھی کہ وہ آدمی ہماری طرح فرش پر دونوں پیر جما کر کھڑے ہونے کی بجائے فرش سے کچھ اوپر ہوا میں معلق تھا۔ خوف سے مغلوب ہو کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ لمحے بعد آنکھیں کھولیں تو وہاں کوئی نہیں تھا۔

میں عباد کو سہارا دیے تیزی سے اسی کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ کمرے کے اندر پہنچ کر میں نے نیم بے ہوش سے عباد کو فرش پر لٹایا اور جلدی جلدی موم بتیاں روشن کر دیں۔ میں نے روشنی میں عباد کے زخموں کا جائزہ لیا تو وہ زیادہ گہرے نہیں تھے۔ اس کی ناک سے خون نکلنا بھی اب بند ہو

چکا تھا۔ وہ اب کچھ کچھ ہوش میں تھا اور اس ساری کارروائی کے دوران میں خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اب باتوں کی آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں اور ہر طرف پھر سے خاموشی سی طاری ہو گئی تھی۔

عباد کی جانب سے بے فکر ہو کر میں یہاں سے نکلنے کی تراکیب پر غور کرنے لگا۔ عباد نے دھیرے سے میرا ہاتھ دبایا اور کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ کر کھڑکی کی جانب لپکا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ باہر مجھے ہماری گاڑی کھڑی نظر آئی اور کسی کھائی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اس کا مطلب وہ اندھی کھائی آسیبی طاقتوں کی ایک چال تھی۔ درحقیقت باہر کا منظر وہی تھا جس طرح ہم چھوڑ کر اندر آئے تھے اور شام کو اسی کھڑکی سے جائزہ بھی لیا تھا۔

میں عباد کو یہ خوشخبری سنا کر تیزی سے رسی کے بل کھولنے لگا۔ عباد کے زرد پڑتے چہرے پر بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میرے ساتھ کوئی بھاری شے تلاش کرنے لگا جو ہمارا وزن سہہ سکے۔ کمرے میں ہمیں ایسی کوئی چیز نہ مل سکی جس کی مدد سے ہم خود کو باندھ کر نیچے اتر سکیں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں تیزی سے عباد کی طرف مڑا اور جلدی جلدی اس کی کمر کے گرد رسی باندھنے لگا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر بول پڑا۔ ”یہ تو کیا کر رہا ہے؟“ میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اسے پلان سے آگاہ کیا۔ جس کے مطابق میں عباد کو رسی کا سہارا دے کر بحفاظت نیچے اتار دیتا پھر وہ فوراً گاڑی میں رکھے پیٹرول سے بھرے ہوئے تین اضافی کین نکال کر باری باری رسی سے باندھے گا اور میں انہیں اوپر کھینچوں گا۔ جب وہ تینوں اوپر آجائیں گے تو میں رسی ان سے باندھ کر نیچے اتر جاؤں گا۔ یہ بہت رسکی تھا اور نوے فیصد امکانات تھے کہ اس طرح نیچے اترتے ہوئے میں اپنی ہڈیاں بھی تڑوا سکتا تھا لیکن اس نازک صورت حال میں مجھے اس سے بہتر کوئی اور ترکیب نہیں سوجھی تھی۔

میں اپنی جان پر کھیل کر اس منحوس جگہ سے نکلنے کو تیار تھا مگر عباد نے سختی سے میرے پلان کو رد کر دیا۔ وہ قطعی اس بات پر راضی نہیں تھا کہ مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر حویلی سے باہر چلا جائے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے دلائل اور اپنی دوستی کی قسمیں دے کر اسے نیم رضامند کیا۔ ویسے بھی کچھ ہی دیر بعد سورج طلوع ہونے والا تھا پھر ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جہنم سے نکل جاتے۔ عباد مجھ سے لپٹ گیا اور ہم دونوں پھر سے آبدیدہ ہو گئے۔ آخر میں نے ہی اسے بڑی مشکلوں سے خود سے الگ کیا اور مسکرا کر بولا۔ ”بس پندرہ منٹ کی بات ہے بھائی جان، پھر ہم دونوں گاڑی میں زن کر کے نکل جائیں گے۔“ عباد کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور وہ انشاء اللہ کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

دس منٹ بعد میں اپنی پوری طاقت سے رسی کو تھامے ہوئے دھیرے دھیرے چھوڑ رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ابھی عباد آدھے راستے میں ہی تھا کہ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی اترتی محسوس ہوئی۔ میری چھٹی حس پوری قوت سے خطرے کا الارم بجانے لگی تھی۔ میں نے ہمت کر کے کن انکھیوں سے دیکھا تو ..... مجھے اپنے بائیں جانب ذرا سے فاصلے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے بے اختیار گردن موڑ کر اس جانب دیکھا تو میرے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی اور ایک لمحے کو رسی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر رسی دوبارہ تھام لی تھی ورنہ اتنی بلندی سے گر کر عباد میری وجہ سے مارا جاتا۔ وہ چلا چلا کر مجھ سے چیخنے کی وجہ پوچھنے لگا لیکن میں دونوں ہاتھوں سے رسی تھامے سن کھڑا تھا کیونکہ گردن موڑنے پر جو منظر مجھے نظر آیا تھا وہ اچھے اچھوں کا پتہ پانی کر دینے کو کافی تھا۔

میں نے خود سے چند قدم کے فاصلے پر آئیون کو دیوار کی طرف رخ کیے کھڑا پایا تھا لیکن اس کی گردن پوری طرح میری جانب مڑی ہوئی تھی یعنی اس کا دھڑ تو دیوار کی جانب تھا لیکن وہ الو کی طرح اپنی پوری گردن میری طرف گھمائے مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں میں کپکپاہٹ دوڑ گئی تھی۔ میں پوری جان سے لرز رہا تھا۔ رسی میرے بے جان ہاتھوں سے آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ عباد بھی کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی بھی اپنے بائیں جانب آئیون کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا بلکہ اب تو وہ رفتہ رفتہ میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

دہشت کے عالم میں مجھے اپنے ہوش وحواس جاتے محسوس ہونے لگے اور رسی ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھوں سے تیزی سے پھسلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ رسی مکمل طور پر میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی اور میں بے ہوش ہو کر گرتا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے رسی ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی ہو اور اسے دوسری طرف سے کھینچا جا رہا ہو۔ میں نے حواس مجتمع کر کے نیچے جھانکا تو عباد کامیابی سے نیچے اتر گیا تھا اور رسی کھینچ کر مجھے مطلع کر رہا تھا۔ خوشی کی ایک لہر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور میں نے نئے سرے سے تہیہ کر لیا کہ اس حویلی سے باہر نکل کر ہی دم لوں گا۔

میں نے پلٹ کر دوبارہ دیوار کی جانب دیکھا تو وہاں سے وہ گھناؤنا وجود غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے نیچے جھانکا تو عباد کو تیزی سے پیٹرول کے کین گاڑی سے نکال کر باہر رکھتے پایا۔ میری بے قراری اب بڑھتی جا رہی تھی اور اس منحوس حویلی میں اکیلے پن کا احساس مارے ڈال رہا تھا۔ عباد پھرتی سے ایک کین اٹھا کر حویلی کے قریب لایا اور رسی سے باندھ کر جھٹکے دینے لگا۔ میں تیزی سے اسے اوپر کھینچنے لگا۔ وہ کین اچھا خاصا وزنی تھا یعنی اس طرح کے دو اور کین مجھے آسانی سے آدھے راستے تک تو پہنچا ہی دیں گے۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ طمانیت کا احساس ہوا۔

تھوڑی دیر میں دو کین اوپر آچکے تھے۔ میں تیسرے کین کے لیے رسی لٹکائے تیار کھڑا تھا مگر عباد اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اسے آواز لگائی مگر میری آواز جنگل میں گونج کر رہ گئی۔ عباد کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ مجھے پہلے کچھ جھنجلاہٹ سی ہوئی پھر تشویش نے آگھیرا۔ میں اسے دیوانہ وار آوازیں دینے لگا۔ میں کھڑکی سے آدھا باہر لٹکا ہوا تھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عباد کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا۔ مجھے اندازہ بھی نہ ہوا کہ کب میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میرے اعصاب جواب دے چکے تھے چنانچہ میں چکرا کر فرش پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

میں نجانے کتنی دیر تک ہوش سے بیگانہ اس حویلی میں تنہا پڑا رہا پھر مجھے ہوش آیا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تھوڑی دیر تک ترمرے سے ناچتے رہے اور سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا شاید گرتے ہوئے میرے سر پر چوٹ لگی تھی کیونکہ پیچھے کی جانب بالوں کے بیچ ایک بڑا سا گومڑ بھی ابھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک تو مجھے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میں اس ویران کھنڈر میں کیا کر رہا تھا پھر مجھے آہستہ آہستہ سب یاد آنے لگا اور میں بمشکل اپنی ہمت مجتمع کر کے کھڑا ہوا اور کھڑکی سے جھانک کر ایک مرتبہ پھر عباد کو زور سے آواز دی۔ آواز لگانے سے میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحے کو اندھیرا سا چھا گیا اور سر کے پچھلے حصے میں شدید ٹیس اٹھی۔ میں عباد کو آواز دینے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھام کر واپس فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پھر ایک خیال کے تحت میں اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیٹرول کے کینز کی جانب بڑھا۔ اس وقت میں اپنی زندگی کا سب سے بھیانک قدم اٹھانے والا تھا جس میں میرے بچنے کے چانسز پانچ فیصد سے بھی کم تھے لیکن اب میں ایک لمحہ بھی مزید اس آسیب زدہ حویلی میں نہیں گزارنا چاہتا تھا چاہے اس کی قیمت میری موت ہی کیوں نہ ہو۔ مجھ پر ایک جنون سا سوار تھا اور میں ایک سنگین فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے موم بتیاں بجھائیں اور پیٹرول کا کین اٹھا کر کمرے میں پیٹرول چھڑکنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد میں کمرے سے نکلا اور باہر سیڑھیوں پر پیٹرول ڈالا پھر دوسرا کین اٹھا کر میں نے نچلی منزل پر جہاں تک ممکن تھا پیٹرول پھینک دیا۔ میں اس وقت تمام ڈر اور خوف سے عاری ہو چکا تھا۔ اچانک میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ اگر میں پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوار نہ تھام لیتا تو پیچھے جا گرتا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا کوئی چیز برق رفتاری سے اڑتی ہوئی میرے سینے میں گھس گئی۔ میں درد سے دہرا ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچا تو وہ لکڑی کا ایک نوکدار ٹکڑا تھا جو میری پسلیوں میں گڑ گیا تھا۔ میرے ہاتھ خون سے چپچپے ہو رہے تھے۔

بمشکل اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے میں سیڑھیوں سے اوپر پہنچا اور جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی سلگائی اور سیڑھیوں پر پھینک دی۔ ایک جھماکا سا ہوا اور آگ بھڑک اٹھی۔ آگ کی تیز روشنی میں میری نظر سیڑھیوں سے نیچے ہوتی ہوئی جل کر اکڑ جانے والی لاشوں پر پڑی۔ چار لاشیں چھوٹے بچوں کی تھی جبکہ ایک شاید ان کی ماں کی تھی۔ چھوٹی چاروں لاشیں بڑی لاش سے لپٹی ہوئی تھیں اور ماں نے ان کے گرد اپنے بازو حمائل کیے ہوئے تھے۔ ممتا مرتے دم تک اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر ایک لمحے کو میں دل گرفتہ ہو گیا پھر اگلے ہی لمحے میں اپنا سینہ تھامے، تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے کی جانب چل پڑا۔ آگ نے حویلی روشن کر دی تھی اور اب رفتہ رفتہ اوپر کا رخ کر رہی تھی۔ درد کی شدت اور لگاتار خون بہنے کی وجہ سے بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا لیکن میں گرتا پڑتا کمرے تک پہنچ ہی گیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کھڑکی پر قدم جما کر اس کی چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا اور نیچے کودنے کے لیے خود کو تولنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ نیچے گر کر میں زندہ نہ بچتا اور بالفرض بچ بھی جاتا تو اپاہج بن کر ساری زندگی گزارتا لیکن اس وقت میری سوچنے سمجھنے کی طاقتیں سلب ہو چکی تھیں اور میرے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دوں۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ بالکل وہی جگہ تھی جس جگہ پر آئیون نے گلے میں رسی باندھ کر خودکشی کی تھی اور جس کی تصویر میرے کیمرے میں بھی محفوظ تھی۔ آخر اس نے رسی کس چیز سے باندھی ہوگی جس نے اس کا بوجھ برداشت کیا ہوگا کیونکہ لوگوں کے مطابق اس کی لاش کو صبح اتارا گیا تھا۔ وہ رات بھر آخر کس چیز سے لٹکتا رہا ہوگا۔ آگ نہایت تیزی سے پھیل رہی تھی اور میرے پاس بالکل وقت نہ تھا کہ کیمرا نکال کر اس تصویر پر غور کرتا۔ میں نے کھڑکی کے آس پاس ٹٹولا تو کچھ نظر نہ آیا۔ ہو سکتا ہے وہ چیز بھی استدادِ زمانہ کا شکار ہو گئی ہو، میں نے مایوسی سے اپنے دل میں سوچا۔

اسی لمحے میری نظر حویلی کی بیرونی دیواروں پر اگ آنے والی جنگلی بیلوں پر پڑی اور مجھے حیرت ہوئی کہ یہ خیال میرے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔ میں نے ذرا سا ہاتھ آگے بڑھا کر ایک بیل تھامی۔ وہ خاصی مضبوط بیل تھی اور بل کھاتی کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں بیل سے لٹکتا، کسی نے مجھے پکڑ کر کھڑکی سے اندر کھینچ لیا۔ میں اس اچانک افتاد کے لیے قطعی تیار نہ تھا چنانچہ بوکھلا کر فرش پر گر پڑا۔ سر پر اسی جگہ پر لگنے والی دوسری چوٹ نے مجھے ادھ مرا سا کر دیا۔

کچھ دیر کے لیے تو میں اپنی بینائی سے مکمل طور پر محروم ہو گیا اور اپنے دفاع میں وہیں پڑے پڑے ہوا میں ہاتھ پیر چلاتا رہا۔ میرے منہ سے بھی عجیب سی غوں غاں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے زور زور سے اپنی آنکھیں بھینچیں اور دو تین بار انہیں مسلا تو مجھے کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طاقتیں مجھے اتنی آسانی سے حویلی سے باہر نہیں نکلنے دیں گی۔ ایک بار پھر میں اپنے جسم کی پوری طاقت بروئے کار لا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے آگ کی تپش اپنے چہرے پر لگتی صاف محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں تک پہنچنے والی تھی۔

میں زور زور سے آیت الکرسی پڑھتا ہوا کھڑکی کی جانب بڑھا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اچک کر بیل تھام لی اور اپنے وجود کا بوجھ اس پر منتقل کرتا ہوا بندر کی طرح لٹک گیا۔ میں نے نیچے زمین کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت میں صرف ایک بیل کے سہارے خاصی بلندی پر لٹک رہا تھا۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نیچے سرکنے لگا۔ آگ کی وجہ سے ہر طرف کالا کالا سا دھواں پھیل گیا تھا جو یقیناً دور دور تک نظر آ رہا تھا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے میں نے یہ چال چلی تھی جو کسی حد تک کامیاب ہوئی تھی اس کا پتا مجھے کچھ دیر میں چل جانا تھا۔

میں نے سر اونچا کر کے اوپر دیکھا تو جس کھڑکی سے میں دو منٹ پہلے ہی باہر نکلا تھا اب وہاں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے نیچے اترنے کی رفتار تیز کر دی کیونکہ آگ کسی بھی وقت بیرونی دیواروں تک پہنچ کر بیلوں کو بھی جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ میرے سر اور سینے میں اٹھنے والی ٹیسیں اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں اور میں کئی مرتبہ چکرا کر نیچے گرتے گرتے بچا تھا۔ دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگتا میں گرتا پڑتا نیچے اترتا جا رہا تھا۔ زمین سے چار فٹ کی اونچائی پر وہ بیل بھی ختم ہو گئی، میں نے بے چارگی کے عالم میں آس پاس دوسری بیلوں پر نظر ڈالی مگر وہ کافی دور دور تھیں۔

کوئی چارہ نہ پا کر میں نے مجبوراً چھلانگ لگا دی اور دھپ کی آواز سے زمین پر گر پڑا۔ میرے ٹخنے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی لیکن اس کو نظرانداز کرتا میں اٹھ کھڑا ہوا اور لنگڑاتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔ میری نظریں عباد کو تلاش کر رہی تھیں۔ اگنیشن میں پہلے سے لگی چابی گھمائی اور انجن ایک ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس جلائیں اور ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھایا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور میں عباد کو تلاش کرنے نکل پڑا۔

مجھے زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ عباد وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر جھاڑیوں میں بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور چہرے پر گھسیٹے جانے کے نشانات تھے اور اس کے کپڑے ادھڑے ہوئے تھے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ اس دوران میں وہ کچھ ہوش میں آ چکا تھا اور ہلکے ہلکے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں تیزی سے گاڑی چلاتا درختوں کے جھنڈ سے نکل آیا۔ پیچھے وہ منحوس حویلی پوری طرح آگ میں گھر چکی تھی اور دھواں اتنا شدید تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح گاڑی دوڑا کر اس حویلی سے جتنی دور ممکن ہو سکے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب میرے لیے مزید ہوش میں رہنا ممکن نہ رہا تھا چنانچہ میں نے اپنے چکراتے ہوئے سر کو تھامتے ہوئے بریک پر پاؤں رکھ دیا اور گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

میں کسی اندھیرے غار میں چلا جا رہا تھا۔ میرے آس پاس گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے غار کے دہانے پر دور سے ہلکی سی روشنی آتی نظر آئی۔ میں بھاگتا ہوا اس روشنی کے قریب جانے لگا۔ جیسے جیسے میں قریب ہوتا گیا روشنی کا حجم بڑھتا گیا۔ اب میں غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ کوئی مجھے لگاتار آوازیں دے رہا تھا۔ میری آنکھیں تیز روشنی سے چندھیا رہی تھیں۔ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھے باہر نکل آیا۔ کسی نے بہت قریب سے میرا نام پکارا، ”یاسر“ میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ اسی لمحے مجھے دوسری جانب سے دوبارہ وہی آواز آئی۔ کوئی بڑے پیار سے میرا نام پکار رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹائے اور غور سے آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ اب مجھے ٹوں ٹوں کی عجیب سی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس کے پس منظر میں مجھے کچھ اور آوازیں سنائی دیں۔ ”دعا کریں خالہ امی، یاسر کو جلد سے جلد ہوش آ جائے۔ نہیں نہیں میرے یاسر کو کچھ نہیں ہو سکتا! میں اپنی جان دے دوں گی اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔ اللہ بہتر کرے گا۔۔۔ رات بھر سجدے میں رہی ہیں یہ۔ انشاء اللہ۔۔۔ سلامتی۔۔ ہائے میرا بچہ۔۔۔ دعائیں“ اچانک ساری آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا تو خلا میں لڑھکتا نیچے ہی نیچے جانے لگا۔ میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ بلند ہوئی اور میں خود کو بچانے کے لیے فضا میں ہاتھ پیر چلانے لگا۔ مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا اور خود بخود میرے منہ سے لایعنی الفاظ نکلنے لگے، ”خون! خون! حویلی۔۔۔ بچاؤ!“

ایک جھٹکا سا لگا اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سامنے بہت سارے فکرمند چہرے تھے اور میں ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں تو جنگل میں تھا اور میری گاڑی میں عباد بھی بے ہوش پڑا تھا پھر یہ کون سی جگہ تھی اور یہ لوگ کون تھے؟ میں تیزی سے اٹھنے لگا تو میری کراہ نکل گئی۔ مجھے عباد کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی، ”لیٹا رہ یار!“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ تو میرے سامنے کھڑا تھا پھر وہ حویلی اور جنگل سب کیا تھا۔

رفتہ رفتہ ساری شکلیں میری پہچان میں آنے لگیں۔ امی، ابو، نازش، چھوٹی خالہ، خالو جان اور عباد۔ ان لوگوں کو دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میں تو ہمت ہار بیٹھا تھا لیکن اللہ کو مجھ پر رحم آ گیا تھا اور میں پھر سے اپنے پیاروں کے درمیان تھا۔ اس کے بعد میں تیزی سے روبصحت ہو کر گھر آ گیا۔

میں سخت تجسس میں بھی مبتلا تھا کہ آخر میری بے ہوشی کے بعد کیا واقعات ظہور پذیر ہوئے اور ہمیں کس نے وہاں سے نکالا تھا۔ میرے ڈسچارج ہونے کے بعد عباد نے مجھے تفصیل سے تمام واقعات سنائے۔ اس نے بتایا کہ اس منحوس رات کو وہ جلدی جلدی پیٹرول کے کینز گاڑی سے اتار کر رسی سے باندھتا جا رہا تھا۔ جب وہ تیسرا کین اٹھانے لگا تو اس کو اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس کے پلٹنے سے پہلے ہی ایک بھیڑیا اس پر حملہ آور ہو گیا اور اسے تیزی سے گھسیٹتا ہوا لے جانے لگا۔ عباد اپنے بچاؤ میں ہاتھ پیر مار رہا تھا کہ گھاس میں پڑے ایک بڑے سے پتھر سے اس کا سر ٹکرا گیا اور وہ بیہوش ہو گیا (مقامی لوگوں نے بعد میں بتایا کہ اس جنگل میں بھیڑیے اور گیدڑ جیسے جانور ناپید ہیں) جس وقت میں اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال رہا تھا تو وہ کچھ کچھ ہوش میں آ چکا تھا۔ میں اپنے ہی خون میں لت پت اندھا دھند گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک میں نے زوردار آواز کے ساتھ بریکس لگا دیں اور ایک طرف کو گر پڑا۔ عباد بھی بے دم سا سیٹ پر پڑا تھا۔ اس وقت تک سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ہماری گاڑی جنگل میں تین چار گھنٹے تک کھڑی رہی، ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا تھا جس کے باعث آنکھیں کھلی رکھنا اور سانس لینا تک دشوار ہو رہا تھا۔

ایسے میں ہماری گاڑی کے آس پاس تین چار گاڑیاں آ کر رکیں جن میں سے افتاں و خیزاں سے ابو اور خالو جان اترے۔ ان کے پیچھے پیچھے پولیس اہلکار بھی تھے۔ دراصل جب ہم نے بالا کوٹ سے حویلی کی طرف روانہ ہوتے وقت ڈرائیور کو پیچھے چھوڑا تھا تو اس نے موقع پا کر فوراً خالو جان کو فون کر کے ہمارے ایڈوینچر سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ سب سن کر خالو جان کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور انہوں نے فوراً اسلام آباد فون کر کے اپنے ایک ڈی ایس پی دوست کو معاملات سے آگاہ کیا۔ پھر میرے ابو کے ہمراہ خود بھی اسلام آباد پہنچ گئے۔ اس وقت تک ہم دونوں حویلی پہنچ چکے تھے۔

قصہ مختصر یہ دونوں بھی پولیس کے ہمراہ آندھی طوفان کی رفتار سے بالا کوٹ پہنچے۔ وہاں ڈرائیور کی نشاندہی کرنے پر حسن کو گرفتار کر کے اس سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس وقت تک رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ یہ لوگ اسی وقت روانہ ہونے لگے۔ حسن نے دشوار گزار اور خطرناک کھائیوں والے راستے پر سفر کرنے سے سختی سے منع کر دیا اور انہیں بھی مشورہ دیا کہ تین چار گھنٹے رک کر صبح کا انتظار کر لیا جائے لیکن ہم دونوں کے والد سے صبر نہ ہو سکا چنانچہ حسن کے منع کرنے کے باوجود وہ دونوں ہماری محبت میں اسی وقت نکل کھڑے ہوئے۔ مجبوراً پولیس والے بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے یہ لوگ سست رفتاری سے حویلی کی جانب بڑھتے رہے۔ ابھی یہ لوگ کافی دور ہی تھے کہ انہیں اس جانب سے آسمان پر دھوئیں کے بادل بنتے نظر آئے جسے دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو ہم دونوں کسی مشکل میں گرفتار ہیں۔

بہر حال دشوار گزار رستوں پر حتی الامکان تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے یہ لوگ جنگل میں دھوئیں کے رخ پر ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم دونوں تک پہنچ ہی گئے۔ جہاں گاڑی میں ہم دونوں نیم جان سے پڑے تھے۔ اس کے بعد تمام کارروائیاں نہایت تیزی سے عمل میں آئیں اور ہم دونوں آخر کار اپنی تمام تر بیوقوفیوں اور اندھے ایڈوینچر کا شکار ہونے کے باوجود اپنے والدین کی دعاؤں سے بچ گئے۔ عباد تو دو دن تک اسپتال میں رہ کر ڈسچارج ہو گیا جبکہ میں گہرے زخموں اور شدید ذہنی دباؤ کے نتیجے میں پانچ روز تک بے ہوش پڑا رہا۔ ڈاکٹرز نے میرے ہوش میں آنے اور جلدری کور ہونے کی زیادہ امید ظاہر نہیں کی تھی مگر حیرت انگیز طور پر ہوش میں آنے کے بعد میں سب کی دعاؤں سے ٹھیک ہو گیا۔

آج اس واقعے کو گزرے تقریباً چار سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ میں اور عباد اب بھی گھومنے پھرنے کے لیے اپنی فیملیز کے ہمراہ جاتے رہتے ہیں لیکن ہم نے ایسے کسی ایڈوینچر سے توبہ کر لی ہے اور جہاں تک اس آسیب زدہ حویلی کا تعلق ہے تو اس روز کے بعد سے ہم کبھی وہاں پلٹ کر نہیں گئے۔ اس حویلی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس طرح کا ایڈوینچر کرنا یقیناً ہماری بدترین غلطی تھی، جس کے نتیجے میں ہم اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھوتے رہ گئے تھے۔ آپ لوگوں سے بھی گزارش ہے کہ اس طرح کے معاملات میں دخل اندازی کرنا بھاری بھی ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ آپ لوگوں کی قسمت بھی ہماری طرح یاوری کرے کیونکہ یہ سارے قدرت کے کھیل ہیں اور قدرت ہی ان کے بھید جانے!

عذرا رسول صاحبہ

سلامِ مسنون

اس پُرآشوب دور میں ایک اکیلی عورت کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی میری ماں نے مجھے کیسی دلدل میں جھوک دیا تھا اسے یاد کرتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس واقعے کو میں نے کہانی کے انداز میں لکھا ہے مگر نام اور مقامات بدل دیے ہیں تاکہ کوئی میرے خاندان پر انگلی نہ اٹھائے۔

شاہینہ شانی

(فیصل آباد)

زندگی کا ساتھی اگر اچانک ساتھ چھوڑ جائے تو عورت پر کیا گزرتی ہے یہ میں نے اس وقت جانا جب اچانک ہی ساجد دنیا سے چلے گئے۔ وہ اچھے بھلے تھے کوئی بیماری بھی نہیں تھی۔ رات کا کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے کہ ایک بار کھانسے اور ذرا سا جھکے تو پھر سیدھے ہی نہیں ہوئے، صوفے سے گرتے چلے گئے۔ میں اور میرا دیور اسد بھی وہیں موجود تھے۔ میں پریشان ہو کر ان کی طرف بھاگی اور انہیں اٹھانے کی کوشش کی۔ ”ساجد کیا ہوا؟“

اسد بھی آگیا، اس نے میری مدد کی اور ہم نے ساجد کو صوفے پر سیدھا کیا، ہم ان کو دیکھنے لگے۔ اسد نے ساجد کی نبض چیک کی اور پھر بدحواس ہوگیا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے چیخنا شروع کردیا۔ ’’اسد کیا ہوا ساجد کو، بولتا کیوں نہیں ہے؟‘‘

’’بھابی بھائی کی نبض نہیں مل رہی ہے۔‘‘ اسد نے بہ مشکل کہا اور باہر کی طرف لپکا۔ وہ گاڑی نکال رہا تھا۔ گھر میں، میں اور بس اسد ہی تھے۔ میرے ساس سسر محلے میں ہونے والی ایک ناگہانی وفات میں گئے ہوئے تھے اور وہ بے خبر تھے کہ خود ان کا بیٹا ناگہانی موت کا شکار ہوگیا ہے۔ بچے اپنے کمرے میں تھے۔ احد، سرمد اور عفت اتنے چھوٹے تھے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اسد نے گاڑی نکالی اور ساجد کو اس میں ڈالا، اس دوران میں، میں نے روتے ہوئے اپنی پڑوسن عمارہ باجی کو بتایا اور ان سے کہا کہ وہ ہمارے آجائیں بچے اکیلے ہیں۔ رونے دھونے کے باوجود مجھے بچوں کا ہوش تھا۔ امی ابو کو بتانے کا وقت نہیں تھا اس لیے ہم روانہ ہوگئے میں پچھلی نشست پر ساجد کا سر گود میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھے۔ میں لرزتے ہاتھوں سے بار بار ان کی نبض دیکھ رہی تھی مگر مجھے اوّل تو دیکھنا ہی نہیں آتی تھی اور اتنے لرزے میں نبض کا پتا بھی کہاں چلتا؟ پھر بھی میں کوشش کرتی رہی ان کے ہاتھ پاؤں سہلاتی رہی۔ اسد نزدیکی اسپتال پہنچا یہاں ایمرجنسی کی سہولت تھی۔ ساجد کو فوری طور پر اسٹریچر پر ڈال کر اندر لے گئے۔ عملے نے مجھے اور اسد کو آئی سی یو میں جانے سے روک دیا تھا۔ ساجد کو لے جانے والا ڈاکٹر ان کی حالت دیکھ کر فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ دس بارہ منٹ بعد باہر آیا اور اس نے ہم سے پوچھا۔ ’’پیشنٹ آپ کا کون ہے؟‘‘

’’میرے بھائی ہیں اور یہ میری بھابی ہیں۔‘‘ اسد نے تعارف کرایا تو وہ اسد کو ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے اسے کچھ بتایا تو اسد کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور پھر اس نے رونا شروع کیا تو مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ اب تک میں خود کو سنبھالے ہوئے تھی کہ شاید ساجد بے ہوش ہیں اور وہ اسپتال پہنچ کر ٹھیک ہوجائیں گے مگر جب میری اُمید ختم ہوئی تو میرا حوصلہ بھی ختم ہوگیا اور میں بے ہوش ہوگئی۔ مجھے ہوش آیا تو میں اور ساجد دونوں گھر آگئے تھے۔ دو گھنٹے پہلے جو گھر خالی سا تھا اب بھر گیا تھا مگر مجھے تو اب خالی لگ رہا تھا۔ رونے اور ساجد کو پکارنے کی آوازیں مجھے جیسے دور سے آتی لگ رہی تھیں۔ میں پھر بے ہوش ہوگئی۔ اگلی بار ہوش میں آئی تو صبح ہوچکی تھی اور ساجد کو ان کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جانے کی تیاری مکمل ہوچکی تھی۔ ان کے جانے کے بعد بھی ماحول ماتمی رہا۔ بلکہ کئی دن جاری رہا کیونکہ ساجد نہ صرف اپنے ماں باپ کے چہیتے تھے بلکہ ان کے تمام بہن بھائی ان سے بہت پیار کرتے تھے اور میرے لیے تو وہ شوہر اور میرے بچوں کے باپ ہی نہیں محبوب بھی تھے کیونکہ انہوں نے مجھے وہ چاہت اور اعتماد دیا تھا جو بہت کم شوہر اپنی بیویوں کو دیتے ہیں۔ اس لیے دکھ بہت زیادہ تھا اور صبر نہیں آرہا تھا۔

میں سات سال کے احد، پانچ سال کے سرمد اور دو سال کی عفت کو سمیٹے ہمہ وقت روتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ موت کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی ممکنہ طور پر کھانسی سے پھیپھڑوں اور دل کو جھٹکا لگا اور ان کا فنکشن رک گیا۔ اگر اس وقت انہیں مصنوعی تنفس دینے کے ساتھ سینے پر دباؤ ڈالا جاتا تو امکان تھا کہ ان کی سانس اور دل پھر سے چل جاتا مگر یہ عمل نہیں کیا گیا اس وجہ سے دماغ کو نقصان ہوا کیونکہ اسے خون اور آکسیجن نہیں ملی تھی۔ اس سے موت حتمی ہوگئی۔ میں ان باتوں کو نہیں سمجھی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ ساجد کا وقت آگیا تھا۔ وہ بس اتنی ہی عمر لکھوا کر لائے تھے۔ وہ اڑتیس برس کے پورے بھی نہیں ہوئے تھے۔ دس سال پہلے جب ہماری شادی ہوئی تو وہ بہت نوجوان سے لگتے تھے بالکل کالج بوائے، ان کے مقابلے میں، میں ذرا بھاری جسم کی تھی اور بائیس کی ہوکر چوبیس پچیس کی لگتی تھی۔ میں کھانے پینے کی شوقین تھی اس لیے وزن بڑھ گیا تھا۔

مگر شادی کے بعد معاملہ الٹا ہوگیا۔ بچوں کی پیدائش اور ذمے داریاں بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرا جسم ہلکا ہوتا گیا اور ساجد کا چھریرا جسم بھرتا چلا گیا۔ دس سال بعد وہ کسی قدر اوور ویٹ ہوگئے تھے۔ پھر چہرے سے بھی عمر جھلکنے لگی تھی مگر وہ کمزور نہیں تھے۔ صحت بہت اچھی تھی اور وہ صبح سے رات گئے تک مصروف ہی رہتے تھے۔ وہ ایک کمپنی میں سول انجینئر تھے اور عام طور سے سات بجے گھر آتے تھے۔ کمپنی دور تھی اس لیے نکلنا بھی صبح سویرے ہوتا تھا۔ پھر گھر آکر بچوں اور دوسروں کے ساتھ لگ جاتے۔ گیارہ بجے کے بعد ہم میاں بیوی کا وقت ہوتا تھا ایک گھنٹا مجھے ملتا تھا اور سوتے سوتے بھی بارہ ساڑھے بارہ بج جاتے تھے۔ صبح ساڑھے چھ بجے پھر اٹھ جاتے تھے۔ چھ گھنٹے کی نیند ان کے لیے کافی

ہوتی تھی۔ چھٹی کے دن مصروفیات بڑھ جاتی تھیں اور سارے ہفتے کے کام نمٹانے کے ساتھ آنے جانے والوں اور پھر یار دوستوں سے بھی ملنا جلنا ہوتا تھا، کبھی کہیں دعوت ہوتی تو وہاں جانا پڑتا تھا۔ میں نے ان کو بہت کم سکون اور آرام سے بیٹھے دیکھا۔

جب کوئی اپنا اچانک چلا جاتا ہے تو اس کی یادیں بہت دن تک ذہن اور مصروفیات پر حاوی رہتی ہیں مگر دنیا ایسی چیز ہے کہ انسان کو رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔ احد اور سرمد اسکول جاتے تھے اور ان کا دوسرا ٹرم چل رہا تھا۔ میں نے ان کو پانچویں دن سے اسکول بھیجنا شروع کردیا۔ ساجد کے چھ بہن بھائی تھے۔ تین بھائی اور تین بہنیں۔ ساجد کے بعد امجد ہے وہ شادی شدہ اور الگ رہتا ہے پھر تین بہنیں، نازیہ، شازیہ اور فوزیہ ہیں۔ وہ تینوں بھی شادی شدہ ہیں اور اسد سب سے چھوٹا ہے اس نے ایم بی اے کیا تھا اور اس کی حال ہی میں نوکری لگی تھی۔ میرے سسر ریٹائر آرمی آفیسر ہیں۔ اسلام آباد کی آرمی آفیسر کالونی میں یہ گھر انہوں نے اپنی ساری جمع پونجی سے بنوایا تھا۔ مگر ریٹائر ہوکر بھی وہ گھر نہیں بیٹھے تھے۔ وہ شراکت میں ایک سیکیورٹی ایجنسی چلا رہے تھے اور ماشاءاللہ اچھا کما رہے تھے۔ میرا میکہ پنڈی میں ہے۔ دو دن تو گھر والے رہے پھر وہ بھی چلے گئے اور بس امی رہ گئیں۔ وہ اکثر میری ساس کے پاس رہتی تھیں۔ میں بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرکے دروازے تک چھوڑ کر آرہی تھی کہ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے میں نے امی اور اپنی ساس کو گفتگو کرتے سنا وہ میرے بارے میں ہی بات کر رہی تھیں۔ میری ساس کہہ رہی تھیں۔ ’’بیٹے کا دکھ اپنی جگہ مگر مجھے شانی کی فکر ہے۔ وہ ابھی جوان ہے۔‘‘

’’عورت کے لیے پہاڑ سی جوانی کاٹنا مشکل ہوتا ہے۔‘‘ امی نے ان کی تائید کی اور پھر انہوں نے مجھے دیکھا تو چپ ہوگئیں۔ مگر اسی رات امی نے مجھ سے کہا۔ ’’شانی تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟‘‘

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ’’مجھے کیا سوچنا ہے؟‘‘

’’دیکھ تیرے آگے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ ابھی بتیس کی بھی نہیں ہوئی ہے۔‘‘

’’تو؟‘‘

’’عورت کو مرد کے سہارے......‘‘

’’امی۔‘‘ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ’’مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میرے شوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہے اور میرے تین بچے ہیں مجھے اپنے نہیں ان کے بارے میں سوچنا ہے۔‘‘

’’ان کو بھی تو باپ کی ضرورت ہوگی۔‘‘

’’باپ کی ضرورت صرف باپ پوری کرسکتا ہے اور اللہ نہ کرے وہ لاوارث تو نہیں ہیں ان کے دادا دادی ہیں چچا ہیں۔‘‘

امی نے محسوس کیا کہ شاید میں ابھی راضی نہیں ہوں اس لیے وہ اس وقت خاموش ہوگئیں۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے۔ میرے سسرال میں چالیسویں وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ صرف سوئم تک سوگ منایا جاتا تھا۔ اس میں بھی کوئی رسم نہیں۔ سب گھر والے اور رشتے دار مل کر قرآن پڑھ کر ایصالِ ثواب کرتے تھے اور کھانا غریبوں کو کھلایا جاتا۔ چوتھے دن تک پھر وہی زندگی کے معمولات شروع ہوگئے تھے۔ البتہ مجھے عدت پوری کرنی تھی۔ ساجد اپنی زندگی میں یہ کرتے تھے کہ کچن کا خرچ امی کے حوالے کرتے تھے اور وہی سب دیکھتی تھیں۔ کھانا میں اور امی مل کر بناتے تھے۔ ڈشز سب کی پسند سے باری باری بنتی تھیں۔ اس کے بعد وہ مجھے جیب خرچ دیتے تھے اور بچوں کی فیسیں اور دوسرے اخراجات پورے کرتے تھے۔ دینا دلانا بھی بہت کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ اچھی تھی مگر اخراجات زیادہ تھے اس لیے وہ زیادہ بچت نہیں کرپاتے تھے۔ اس لیے جب میرے سسر نے ان کا اکاؤنٹ چیک کیا تو اس میں نوّے ہزار کی رقم تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے راولپنڈی کے نزدیک دو ایکڑ زرعی زمین لے کر ٹھیکے پر دی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی کار تھی اور یہی ساجد کی کل وراثت تھی جو وہ میرے اور بچوں کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ میرے سسر نے مجھ سے پوچھا۔

’’بیٹا ان چیزوں کا کیا کرنا ہے؟‘‘

’’ابو آپ جو مناسب سمجھیں۔‘‘

’’پھر بھی تمہاری کوئی رائے ہوگی۔‘‘

’’ابو میرا اور میرے بچوں کا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ ہمارے بڑے ہیں، جیسا چاہیں کریں۔ آپ یقیناً میرے لیے اچھا ہی کریں گے۔‘‘

میرے سسر نے یہ کیا کہ زمین میرے نام کردی۔ اکاؤنٹ کی رقم میرے نام سے اکاؤنٹ کھول کر اس میں

ڈال دی اور کیونکہ مجھے ڈرائیو نہیں آتی تھی اس لیے کار فروخت کر کے اس کی قیمت بھی میرے اکاؤنٹ میں ڈال دی۔ جب انہوں نے یہ سب کرلیا تو مجھے علم ہوا تھا۔ سسر نے مجھے بلا کر سب چیزیں میرے حوالے کیں اور زمین کے ٹرانسفر کے حوالے سے بعض کاغذات پر میرے سائن لیے۔

میں نے ان سے کہا۔ ”ابو اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”تھی بیٹا، یہ میرے پاس تمہاری اور بچوں کی امانت ہے۔ جہاں تک خرچ کا تعلق ہے تو وہ اب میری ذمے داری ہے۔ ہر مہینے میں تمہارے اکاؤنٹ میں اخراجات کی رقم ڈال دوں گا۔ تم اپنی مرضی سے نکالتی رہنا۔“

میں آبدیدہ ہوگئی۔ ”ساجد کے بعد ابو آپ کا اور گھر والوں کا ہی تو سہارا ہے۔“

انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”تم فکر مت کرو جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اور بچوں کو کوئی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔“

میں نے سکون محسوس کیا تھا کیونکہ کئی دن سے مجھے یہی سوال پریشان کر رہا تھا کہ اب اخراجات کا کیا ہوگا۔ ساجد کی تنخواہ تو نہیں آتی۔ ان کے فنڈز کے کچھ پیسے ملے تھے۔ اس طرح زمین کے ٹھیکے سے رقم آتی مگر ابو نے کہا کہ میں یہ ساری رقم جمع کر کے رکھوں، مستقبل میں بچوں کے حوالے سے کام آئے گی۔ مجھے بھی سب سے زیادہ فکر بچوں کی تعلیم کے حوالے سے تھی۔ ساجد نے انہیں بہت اچھے اسکول میں داخل کرایا تھا مگر دونوں بچوں کی فیس ہی دس ہزار کے قریب جاتی تھی اور دوسرے اخراجات الگ تھے۔ ساجد کے بعد میں سوچ رہی تھی کہ اب ان کی فیسیں کون ادا کرے گا۔ لیکن سسر نے میری یہ ٹینشن دور کردی تھی۔

احد سمجھدار تھا اور وہ اسکول سے آنے کے بعد میرے ساتھ لگا رہتا کہ میں اکیلا پن محسوس نہ کروں۔ شام کو وہ کھیلنے کے لیے باہر بہت کم جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سرمد ذرا لاابالی تھا۔ اس نے چند دن تو باپ کی کمی محسوس کی مگر پھر اپنے آپ میں مگن ہوگیا۔ عفت باپ کے سب سے زیادہ قریب تھی اور جب ساجد دفتر سے آتے تو وہ تقریباً ان کے ساتھ لگی رہتی۔ رات کو سوتی بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ وہ بہت دن روتی بلکتی رہی۔ خاص طور سے رات کو ضرور باپ کو یاد کرتی تھی۔ میں اسے سلاتی مگر وہ بہت مشکل سے سوتی تھی۔ بہرحال وہ بھی عادی ہوگئی۔ میری عدت مکمل ہوتے ہوتے زندگی معمول پر آگئی تھی۔ مگر یہ میرا خیال تھا کہ زندگی معمول پر آگئی ہے۔ عدت ختم ہونے پر میرے گھر والے آئے تھے اور انہوں نے اصرار کیا کہ کچھ دن چل کر میں میکے میں رہوں۔ اتفاق سے بچوں کی سرمائی چھٹیاں آنے والی تھیں اس لیے میں مان گئی۔

چھٹیوں میں بچوں کو لے کر میں امی کے گھر آئی۔ میرے دو بڑے بھائی ہیں جو امی ابو کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ گھر اپنا ہے اور اس کے اوپر نیچے تین پورشن ہیں۔ میرے بعد دو بہنیں ہیں اور وہ بھی شادی شدہ ہیں۔ میری آمد پر بہنیں بھی رہنے آئی تھیں اور پہلی رات ہی امی، بہنوں اور بھابیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کا سوال تھا کہ میں کب تک یونہی تنہا زندگی گزارتی رہوں گی۔ میرا خیال تھا کہ یہ سوال بس ایسے ہی کیا گیا ہے مگر کچھ دیر میں مجھے پتا چل گیا کہ خاص طور سے پوچھا گیا اور انہیں اس کا جواب بھی چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں ہے، میرے سسر دیکھ بھال کر رہے ہیں۔“

”دیکھو بیٹا ابھی سسر ہیں۔“ امی نے کہا۔ ”اللہ انہیں لمبی عمر دے مگر جب وہ نہیں رہیں گے تب کون کرے گا؟“

یہ سوال میرے ذہن میں بھی کئی بار آیا تھا مگر جب امی اور دوسروں نے زور دے کر پوچھا تو میں بھی سوچ میں پڑ گئی۔ واقعی جب سسر نہیں ہوں گے تو کون میرے بچوں کا اس طرح کرے گا؟ امجد الگ مزاج کا تھا اور اس نے ساجد کے بعد بہ مشکل ہی ہمیں پوچھا تھا۔ اسد اچھا لڑکا تھا مگر اس کی شادی ہو جاتی تو وہ اپنے بیوی بچوں کو دیکھتا یا مجھے اور میرے بچوں کو دیکھتا۔ میری بہنیں چھوٹی تھیں اور ان سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی مگر بھابیوں میں شمع بھابی سے میری بنتی بھی تھی اور بے تکلفی بھی تھی۔ ہم آپس میں بہت سی باتیں شیئر کر لیتے تھے۔ جب سونے کے لیے اٹھ گئے تو شمع بھابی نے مجھ سے کہا۔ ”شانی تم ابھی جوان ہو، بتیس سال کی نہیں ہوئی ہو۔“

”میں جانتی ہوں بھابی۔“

”تب اپنی زندگی کے بارے میں سوچو۔“ انہوں نے ترغیب دینے کے انداز میں کہا۔ ”زندگی پر تمہارا ابھی حق ہے۔ جوان عورت کے لیے جو شوہر کے ساتھ رہ چکی ہو اکیلے رہنا بہت بڑا عذاب ہے۔“

”میں یہ بھی جانتی ہوں۔“

”تب دوسری شادی کا سوچو۔“

”بھابی یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے بچے ہیں اور میں ان پر سوتیلے باپ کا سایہ نہیں ڈالنا چاہتی۔“

”ضروری نہیں ہے کہ ہر سوتیلا باپ ظالم ہو۔ دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔“

شمع بھابی کی باتیں ٹھیک تھیں مگر نہ جانے کیوں میرا دل اس پر ایک فیصد بھی راضی نہیں تھا۔ اگرچہ بھابی کا انداز ناصحانہ تھا مگر امی اور بہنوں کا انداز بہت دباؤ ڈالنے والا تھا۔ نگہت بھابی بڑی تھیں مگر کسی کے معاملے میں زیادہ دخل نہیں دیتی تھیں اور مشورہ بھی اس وقت دیتیں جب ان سے مانگا جاتا۔ میں ایک ہفتہ امی کے گھر رکی اور اس دوران میں مجھ پر بھرپور دباؤ ڈالا جاتا رہا تھا۔ ایک ہفتے بعد جب میں واپس سسرال آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا اور فیصلہ کیا کہ اب امی کے گھر رکنے نہیں جاؤں گی۔ بس جاؤں گی اور آجاؤں گی۔

☆☆☆

میں نے اپنے برابر میں سوئے فیصل کو دیکھا۔ آج میری دوسری شادی یا سہاگ رات کی پہلی صبح تھی۔ فیصل تقریباً میری عمر کا تھا یعنی بتیس تینتیس برس کا۔ مناسب شکل وصورت کے ساتھ وہ پڑھا لکھا اور مہذب نظر آنے والا شخص تھا۔ بہ ظاہر اس میں کوئی کمی یا برائی نہیں تھی مگر جب وہ رات میرے پاس آیا تو مجھے ذرا بھی جذبات محسوس نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس مجھے لگا جیسے میں اندر سے برف ہوگئی ہوں۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کرلی تھی اس لیے وہ جلدی سوگیا۔ اس نے مجھ سے زیادہ بات نہیں کی۔ اس کے سونے کے بعد بھی میں بہت دیر جاگتی رہی اور اپنے بچوں کے بارے میں سوچتی رہی جو مجھ سے دور تھے۔ وہ اپنے دادا دادی کے پاس تھے اور جیسے میں انہیں یاد کر رہی تھی یقیناً اسی طرح وہ بھی مجھے یاد کر رہے ہوں گے۔ میں چپکے چپکے آنسو بہانے لگی اور انہی بہتے آنسوؤں کے درمیان کب سوگئی مجھے پتا نہیں چلا۔

میرا خیال تھا کہ میرا انداز دوسروں کو سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میری امی ان عورتوں میں سے ہیں جو ایک بات کی ٹھان لیں تو اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتی ہیں۔ گھر پر ان کی حکومت ہے اور ابو کے ساتھ بھائی اور بھابیاں بھی امی کی بات پر عمل کرتی ہیں۔ اگر امی ایک فیصلہ کرلیں تو پھر کسی میں ان سے اختلاف کی جرأت نہیں ہوتی ہے اس لیے جب انہوں نے فیصلہ کیا کہ میری دوسری شادی کریں گی تو سب سے پہلے انہوں نے ابو اور بھائیوں کو اپنا ہمنوا بنالیا کیونکہ اس کے بعد میں گئی تو ابو اور بھائیوں نے بھی امی والی بات کی۔ میں نے ان کو بھی وہی جواب دیا کہ میں اپنے بچوں پر سوتیلے باپ کا سایہ نہیں ڈالنا چاہتی۔ کئی مہینے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اچانک امی اور میرے دوسرے گھر والوں نے پینترا بدلا اور ایک دن امی ابو اور میرے بڑے بھائی میرے سسرال آئے۔ میں بھی کہ ملنے آئے ہیں۔ مگر جب انہوں نے میرے سسر اور ساس سے میری دوسری شادی کا ذکر چھیڑا تو میں سمجھ گئی کہ بات اب میرے سسرال تک آئے گی۔ میرے سسر نے کہا۔

”میں خود بھی اس بات کا قائل ہوں کہ بیوہ کی جلد از جلد دوبارہ شادی کر دی جائے مگر اصل مسئلہ تو شاہینہ کا ہے۔“

”شاہینہ کی فکر مت کریں۔“ امی نے اچانک کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ ”اسے ہم منالیں گے بس آپ لوگ اسے بہکانا بند کردیں۔“

اس الزام پر نہ صرف میرے سسرال والے بلکہ میں بھی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”امی کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ تو میرے ماں باپ کی طرح میرا خیال رکھ رہے ہیں۔“

”اگر ماں باپ کی طرح خیال رکھ رہے ہوتے تو تمہیں شادی پر قائل کرتے۔ یوں سکون سے نہ بیٹھے ہوتے۔“

میرے سسر نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”بہن آپ الزام لگا رہی ہیں۔“

”یہ الزام نہیں ہے اگر خدانخواستہ آپ کی بیٹی بیوہ ہو جائے تو کیا آپ اس کی دوسری شادی کی فکر نہیں کریں گے۔ عورت کا سہارا کون ہوتا ہے اس کا شوہر نا۔ شانی کو سہارے کی ضرورت نہیں ہے کیا؟“

امی نے اس انداز سے کہا کہ بے چارے وہ لوگ لاجواب ہو گئے۔ میری ساس نے صرف اتنا کہا۔ ”بہن شاہینہ آپ کی بیٹی ہے اور اگر آپ سمجھتی ہیں کہ ہم اس کا بھلا نہیں چاہتے تو آپ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہیں۔“

”میں نے یہی سوچا ہے۔“ امی بولیں۔ ”میں اسے یہاں سے لے جاؤں گی۔“

”میں نہیں جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

میرے سسر نے کہا۔ ”بہن آپ نے ایک بات کر دی ہے تو ایک بات ہم بھی کر دیں۔ شاہینہ کی دوسری شادی

کی صورت میں ہم بچے نہیں دیں گے۔ یہ ہمارا خون ہیں اور ان پر ہمارا حق ہے۔"

"بچے آپ شوق سے رکھیں۔" امی نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ واقعی آپ کا حق ہے۔"

"نہیں۔" اس بار میں تڑپ گئی۔ "میں اپنے بچے نہیں چھوڑ سکتی۔"

"شانی تم جذباتی باتیں کر رہی ہو۔" امی نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم آنے والے کل کا سوچو، ابھی احد اور سرمد کو بڑا ہونے میں بہت وقت پڑا ہے۔ انہیں پڑھنا ہے تب کہیں جا کر وہ تمہارا سہارا بننے کے لائق ہوں گے۔"

"بچوں کا مسئلہ نہیں ہے۔" سسر بولے۔ "یہ ہر صورت ہماری ذمّے داری ہیں اور شانی بیٹا ہم بچوں کو تم سے الگ نہیں کر سکتے مگر تم خود سوچو یہ ہمارا خون ہیں ہم کیسے برداشت کریں کہ یہ کسی غیر کے رحم وکرم پر رہیں۔"

"فی الحال ہم شانی اور بچوں کو لے جاتے ہیں جب کوئی مناسب رشتہ مل جائے گا تو....."

"بچے یہاں سے نہیں جائیں گے۔" اس بار میری ساس نے بھی ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آپ شوق سے اپنی بیٹی کو لے جائیں۔"

"میں کہیں نہیں جارہی۔ یہ میرا اور میرے بچوں کا گھر ہے یہاں سے مجھے نہ کوئی نکال سکتا ہے اور نہ ہی لے جا سکتا ہے۔" میں برہمی سے بولی اور پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا اور بچوں کو سمیٹ کر دھواں دھار روتی رہی۔

امی اور دوسروں نے دروازہ بجایا مگر میں نے کھولا نہیں۔ امی، ابو اور بھائی چلے گئے تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ امی اتنی آسانی سے میری جان نہیں چھوڑیں گی۔ ان کی وجہ سے میری ساس کا موڈ خراب ہوا تھا اس لیے میں نے سسر سے بات کی اور ان سے کہا۔ "ابو میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتی، میں اپنے بچوں کے ساتھ آپ کے سائے میں پُرسکون ہوں، خدا کے لیے مجھے بے سکون نہ کریں۔"

"بیٹا میں کیا کر سکتا ہوں۔ دیکھا جائے تو اب تمہارے والی وارث تمہارے گھر والے ہیں۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لیکن تمہارے حوالے سے کوئی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ جنگ مجھے خود لڑنی ہے۔ میں ہمت کرنے لگی۔ مگر آنے والے چند ہفتوں میں حالات بہت ہی خراب ہو گئے۔ میرے گھر والوں نے ان مشترکہ واقف کاروں کو ملوث کرلیا جن کے توسط سے میرا ساجد سے رشتہ ہوا تھا۔ یوں ایک عدالت بیٹھی اور اس میں فیصلہ ہوا کہ مجھے میرے گھر والوں کو واپس کر دیا جائے۔ میرے سسرال والوں نے کہا کہ اگر میری دوسری شادی ہوتی ہے تو اس صورت میں وہ بچے حاصل کر لیں گے اور اگر میں سسرال چھوڑ کر میکے جاتی ہوں تو صرف عفت کو لے جا سکتی ہوں۔ احد اور سرمد دادا دادی کے پاس رہیں گے۔ میرے گھر والے فوراً مان گئے۔ میں تیار نہیں تھی مگر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس لیے میں عفت کو لیے روتی چیختی ہوئی میکے آگئی۔ اس وقت بھی میرا خیال تھا کہ شادی سے انکار کا حق تو میرے پاس تھا۔ مگر میں بھول گئی تھی کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو حاصل حقوق بس نام نہاد ہی ہیں۔ وہ ساری عمر دوسروں کے کیے فیصلوں کے سامنے سر جھکاتی رہتی ہے اور مجھے بھی یہی کرنا پڑا تھا۔ فیصلہ میرے گھر والوں نے کیا اور شادی مجھے کرنا پڑی تھی۔

فیصل کا رشتہ اخبار میں آیا تھا اس نے لکھا تھا کہ اسے کسی بیوہ یا طلاق یافتہ سے بھی شادی قبول ہے۔ احسان بھائی نے اس بارے میں امی کو بتایا تو امی خوش ہو گئیں۔ انہوں نے فوری طور پر فیصل سے بات کی۔ بات چیت سے وہ معقول لگا تو اسے گھر بلا لیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایم بی اے ہے۔ سب اس سے ملے اور وہ سب کو اچھا لگا۔ اس نے اپنے بارے میں صاف گوئی سے بتا دیا کہ اس کی ایک شادی ناکام ہو چکی تھی اور اس کی ایک بچی بھی تھی جو ماں کے پاس تھی۔ اس نے میرے گھر والوں سے کہا۔ "کیونکہ میں ایک بار کا شادی شدہ رہ چکا ہوں اس لیے مجھے بہتر یہی لگا کہ کسی ایسی عورت سے شادی کروں جو بیوہ یا مطلقہ ہو۔"

میرے گھر والے اس کی سوچ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وہ بہت نرم لہجے میں اور ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا۔ دو تین ملاقاتوں میں اس نے میرے گھر والوں کو گرویدا کرلیا۔ وہ کسی آئل مل میں مینیجر تھا اور بھائیوں نے اس کی تصدیق کر لی تھی کہ وہ چال چلن کا بھی ٹھیک تھا۔ رشتے دار نہیں تھے۔ بس دور کے ایک چچا تھے جن کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی تھی تو طلاق کے بعد انہوں نے بھی اس سے تعلق توڑ لیا تھا۔ امی نے مجھ سے کہا کہ میں اس سے ایک بار مل لوں مگر میں نے انکار کر دیا۔ "مجھے نہ کسی سے ملنا ہے نہ شادی کرنی ہے۔"

"مت ملو۔" امی تنگ کر بولیں۔ "لیکن تمہاری شادی ضرور ہوگی اور اگر ہمیں اطمینان ہو گیا تو فیصل سے ہی ہوگی۔"

"امی اللہ کے واسطے۔" میں رو دی تھی۔ "آپ کیوں مجھے تباہ کرنا چاہ رہی ہیں میں پہلے ہی مر مر کر جی رہی ہوں اپنے بچوں کے بغیر۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" وہ بے رحمی سے بولیں۔ "کچھ عرصے بعد جب تم شوہر کے ساتھ خوش ہو گی تو سب بھول جاؤ گی۔ عورت کے لیے شوہر کا ساتھ بہت ضروری ہے۔"

مگر میں اپنے بچوں کو کیسے بھول سکتی تھی۔ پھر وہی ہوا جو امی نے کہا تھا۔ میں فیصل سے نہیں ملی مگر اس نے تصویریں دیکھ کر مجھے پسند کرلیا اور گھر والوں نے اس سے رشتہ طے کر دیا۔ میں روتی رہ گئی اور ایک ہفتے بعد تقریباً زبردستی میرا نکاح فیصل سے کر دیا گیا۔ زبردستی یوں کہ امی نے کہا کہ اگر میں نے اس رشتے سے انکار کیا تو وہ مجھے واپس سسرال بھیج دیں گی اور اس کے بعد ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ مرتے دم تک میرا منہ نہیں دیکھیں گی اور نہ ہی میں ان سے ملنے آسکوں گی۔ امی کی دھمکیوں کے ساتھ بہنوں اور بھائیوں نے اپنے طریقے سے دباؤ ڈالا اور میں نے سر تسلیم خم کر ہاں کر دی۔ نکاح کے بعد طے پایا کہ رخصتی سادگی سے ہوگی لیکن فیصل مناسب انداز میں ولیمہ کرے گا۔ پہلے مجھ سے احد اور سرمد چھنے تھے۔ اب شادی ہوئی تو امی نے عفت کو اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ مشکل سے پونے تین سال کی تھی اور میرے بغیر ایک منٹ نہیں رہتی تھی۔ لڑکیاں رخصتی کے وقت میکہ بچھڑنے پر روتی ہیں اور میں سارے راستے اپنے بچوں کے بچھڑنے پر روتی رہی۔ مجھے اُمید تھی کہ میرے برابر میں بیٹھا فیصل شاید دل جوئی کرے گا اور مجھے چپ کرائے گا مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی اور گھر پہنچ کر بھی اس نے صرف ازدواجی وظیفہ ادا کیا اور سو گیا۔ میرے اندر ایک آس تھی کہ شاید وہ مجھے بچے ساتھ رکھنے کو کہے تو میں کم سے کم عفت کو ساتھ رکھ سکوں گی تو اس کے رویے نے یہ آس بھی توڑ دی۔

روزِ اوّل سے فیصل کا رویہ میرے ساتھ اتنا نارمل سا تھا جیسے میں نہ جانے کب سے اس کے ساتھ زندگی گزارتی آئی ہوں۔ حد یہ کہ وہ ازدواجی تعلقات میں بھی پُرجوش نہیں تھا۔ اسے بھی بس ذمّے داری کی طرح لیتا تھا۔ ٹھیک ہے وہ پہلے بھی ایک شادی کر چکا تھا مگر نئی شادی کا جوش کس مرد کو نہیں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا رویہ جذبات سے عاری ہوتا تھا۔ اس کی رہائش اچھے علاقے میں تھی۔ یہ چھوٹا دو بیڈ رومز کا فلیٹ تھا مگر اسلام آباد کے اچھے علاقے میں تھا۔ اس کے پاس گاڑی بھی تھی۔ یہ چند سال پرانی کرولا تھی مگر اس نے یوں رکھی ہوئی تھی کہ بالکل نئی جیسی لگتی تھی۔ اس کی الماری بہترین ملبوسات سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے پاس ڈھیروں پرفیوم اور قیمتی گھڑیاں تھیں۔ اس نے مہنگا اسمارٹ فون رکھا ہوا تھا۔ اپنے انداز سے وہ بہت کھاتا پیتا لگ رہا تھا۔ میں نے شادی کے اگلے دن اس سے کہا۔ "مجھے امی کے گھر لے چلیں۔"

"کیوں؟" اس نے ناگواری سے کہا۔ "ابھی تمہیں یہاں آئے ہوئے پندرہ گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔"

"وہ مجھے عفت یاد آرہی ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "آج مجھے فرصت نہیں ہے ولیمے کے انتظامات بھی دیکھنے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا اور میں آنسو بہانے لگی مگر کچھ دیر بعد کال بیل بجی اور میں نے دروازہ کھولا تو سامنے احسان بھائی، نگہت بھابی کے ساتھ عفت کو دیکھ کر مجھے شادی مرگ ہو گیا تھا میں نے جھپٹ کر اسے گود میں لیا اور بے تحاشہ چومنے لگی۔ وہ بھی مجھ سے لپٹی جارہی تھی اور مجھے لگا کہ اس کے نرم ونازک رخساروں پر رو رو کر لکیریں سی پڑ گئی ہیں۔ وہ لوگ ناشتے کا سامان لے کر آئے تھے اور نگہت بھابی نے ڈھکے چھپے انداز میں پوچھا کہ رات ٹھیک سے گزری تو میں نے سر ہلا دیا۔ وہ فیصل کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو میں نے بتایا کہ وہ ولیمے کا انتظام کرنے گیا ہے تو احسان بھائی نے بتایا کہ اس نے اب تک ولیمے کا تو بتایا ہی نہیں ہے۔ وہ لوگ خاصی دیر بیٹھے کہ شاید فیصل آجائے اور وہ اس سے ملاقات کر کے جائیں۔ مگر وہ نہیں آیا بلکہ وہ سارا دن نہیں آیا۔ وہ رات گئے آیا اور جب میں نے اس سے ولیمے کا پوچھا تو اس نے کہا۔

"میں نے کر دیا ہے۔"

میں حیران رہ گئی۔ "کر دیا ہے مگر کب اور کہاں؟"

"بھئی ایک ہوٹل میں غریبوں کو کھانا کھلا دیا سمجھ لو ولیمہ ہو گیا۔"

"ولیمہ ایسے کہاں ہوتا ہے اس میں تو قریبی جاننے والوں کو بلایا جاتا ہے۔"

"یہ سب فضول کی رسومات ہیں۔"

''یہ رسومات نہیں ہمارے نبی ﷺ کی سنت ہے۔'' میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ''بے شک آپ لوگوں کو جمع کر کے شربت پلادیں لیکن ولیمہ لازمی ہے۔''

''اچھا اچھا، اب تو کر دیا ہے۔ سمجھ لو وہی میرے عزیز دوست تھے۔'' اس نے کہا اور واش روم میں چلا گیا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرے گھر والوں نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے اور انہوں نے مجھے کسی گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کا رویہ سامنے آنے لگا۔ وہ بہ ظاہر بہت ٹھنڈے دماغ کا تھا اور نرم لہجے میں بات کرتا تھا مگر مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک طنز سا آجاتا تھا۔ وہ میرے حوالے سے بہت کم بات کرتا تھا مگر جب کرتا اس میں کوئی نہ کوئی طعنے والی بات ہوتی تھی۔ میں خود بھی اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ بس کام کی بات ہوتی تھی۔ دوسرے دن مجھے پتا چل گیا تھا کہ اس کے کچن میں کھانا پکانے کے لیے کچھ نہیں تھا بس چائے کافی کے لوازمات تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے سودا لادیں میں گھر میں کھانا بناؤں گی۔''

''کیا ضرورت ہے جب باہر سے سب مل جاتا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''تینوں ٹائم کا باہر سے آجائے گا۔''

''مجھے باہر کے کھانے پسند نہیں ہیں۔''

''تب تم لے آؤ سودا۔'' اس نے یوں کہا کہ پھر میری اس سے پیسے مانگنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جواب واضح تھا کہ وہ مجھے سودا لاکر نہیں دے گا۔ شادی کے وقت وہ صرف ایک جوڑا لایا تھا جس میں، میں رخصت ہو کر اس کے گھر آئی، یہ بھی زیادہ قیمت کا نہیں تھا اور اس کے علاوہ اس نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا میرا جو زیور تھا میں اسی میں سے ایک سیٹ پہن کر آگئی تھی۔ نہ جانے میری چھٹی حس تھی یا کوئی اور چیز کہ میں نے اپنا سارا زیور امی کے پاس ہی رکھوایا کہ بعد میں لے جاؤں گی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد فیصل نے مجھ سے کہا۔ ''چلو کہیں ہنی مون منانے چلتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''شمالی علاقے چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک ہفتے کی چھٹی لے لیتا ہوں۔''

میں بے دلی سے تیار ہو گئی۔ درحقیقت میرا دل ایک فیصد بھی راضی نہیں تھا۔ میں صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ کب اس کا موڈ اچھا ہو اور میں اس سے کہہ سکوں کہ میں عفت کو پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ مگر ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا۔ شادی کے بعد وہ صرف ایک بار مجھے امی کے گھر لے گیا تھا اور وہ بھی اتنا اچانک کہ میں احد اور سرمد کو بلوا بھی نہیں سکی تھی۔ صرف عفت سے ملی جو پہلے ہی مجھ سے دو بار مل چکی تھی۔ وہ میری جدائی میں اتنی کمزور اور پیلی ہو گئی تھی کہ میں اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ باقی گھر والوں سے تو میں کہہ نہیں سکتی تھی مگر امی سے ضرور کہا۔ ''آپ نے ماں ہوتے ہوئے مجھ پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے مجھے میرے بچوں سے جدا کر دیا۔''

امی کو بھی اب احساس ہو رہا تھا وہ بولیں۔ ''تم فیصل سے بات کرو کہ وہ کم سے کم عفت کو ساتھ رکھ لے۔''

''وہ اس موضوع پر آتا ہی نہیں ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''آپ نے مجھے گڑھے میں دھکیل دیا ہے پتا نہیں میرا کیا انجام ہو۔''

''فیصل اچھا آدمی ہے۔''

''ابھی تک تو کوئی اچھائی سامنے نہیں آئی ہے۔''

فیصل صرف ڈیڑھ گھنٹا رکا اور کھانے سے منع کر کے مجھے لے کر نکل آیا اس نے گھر والوں سے کہا کہ وہ مجھے آج ہوٹل ڈنر کرانے لے جا رہا ہے مگر اس کی بجائے وہ مجھے فلیٹ پر چھوڑ کر نکل گیا اور اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ میں کھاؤں گی کیا کیونکہ گھر میں تو کچھ تھا نہیں۔ وہ رات گئے آیا اور آتے ہی کروٹ لے کر سو گیا۔ کچھ دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے تھے اور مجھے اس کے کھلے منہ سے عجیب سی بو آئی لیکن اس وقت میں سمجھی نہیں تھی۔ وہ سو گیا مگر مجھے بھوک سے نیند نہیں آرہی تھی۔ صبح تک جاگتی سوتی رہی۔ وہ دس بجے اٹھا اور آرام سے گیارہ بجے تک ناشتا لے کر آیا تب میں نے کچھ کھایا اور میری جان میں جان آئی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ناشتے میں کچھ لے آتا اور جو بچ جاتا وہی میرا دن کا کھانا ہوتا اور رات کو وہ دفتر سے آتے ہوئے لیتا آتا تھا۔ کوئی آجاتا تو میں بس اسے چائے کافی پیش کر سکتی تھی اس کے علاوہ اور کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔

دو دن بعد بہ قول اس کے ہم ہنی مون پر روانہ ہوئے لیکن وہ چند گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہوٹل کی بجائے کسی محکمے کے خستہ حال ریسٹ ہاؤس پہنچا تھا۔ یہاں چند کمرے تھے اور فرنیچر جیسے پاکستان بننے سے پہلے کا تھا۔ ایک عجیب سا چوکیدار تھا جو سارے کام کرتا تھا۔ جگہ ویران تھی اور یہاں فیملی والا ماحول بھی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہر کمرے میں

ایک مرد اور ایک عورت تھے۔ جو بہ ظاہر آپس میں میاں بیوی بھی نہیں تھے۔ کمرے اس طرح کے تھے کہ اندر ہونے والی باتیں اور آوازیں باہر تک صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر فیصل سے پوچھا۔ ''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہیں؟''

''کیوں کیا برائی ہے یہاں؟''

''یہاں کا ماحول دیکھ رہے ہیں۔''

''ہمیں ماحول سے کیا ہم تو انجوائے کرنے آئے ہیں۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس اجاڑ سے مقام پر انجوائے کرنے والی کیا بات ہے۔ ریسٹ ہاؤس جس پہاڑی پر تھا اس کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا اور ایسی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن پر کانٹے تھے۔ راستہ نہایت خراب تھا۔ پہلی رات آس پاس سے جس قسم کی آوازیں آئیں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عیاشی اور فحاشی کا اڈہ ہے۔ صبح ہوتے ہی میں نے فیصل سے کہا۔ ''مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے۔ میں یہاں اور ایک منٹ بھی نہیں رک سکتی۔''

''ابھی ہم نہیں جا سکتے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''پلیز فیصل۔'' اس کا رویہ دیکھ کر میں منت سماجت پر اتر آئی۔ ''یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے میں ایک شریف عورت ہوں اس قسم کے ماحول میں نہیں رہ سکتی۔''

''بس ایک دن کی بات اور ہے کل صبح ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔'' اس نے نسبتاً نرمی سے کہا تو میں چپ ہو گئی۔ یہ سارا دن ہم کمرے میں رہے اور دن میں سکون رہا کیونکہ عیاشی کے لیے آنے والے رخصت ہو گئے تھے۔ یہ جاننے کے بعد کہ یہاں کیا ہوتا ہے میرے لیے بیڈ پر بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے اس جگہ سے گھن آرہی تھی۔ شام ہوتے ہی وہاں نئے لوگ آگئے اور فیصل بھی کہیں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جلد آجائے گا مگر اسے گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی اور پھر شور شرابا ہوا۔ لوگ اونچی آواز میں بات کر رہے تھے اور ان میں فیصل کی آواز بھی شامل تھی۔ میں گھبرا کر باہر آئی تو دیکھا کہ فیصل کو تین افراد نے گھیر رکھا تھا اور وہ اس سے جھگڑ رہے تھے۔

''فیصل یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''تم اندر جاؤ۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ مگر اس کے کہنے کی وجہ سے نہیں بلکہ میں ان تین افراد کے گھورنے کی وجہ سے جلدی سے کمرے میں آگئی جو مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائیں گے۔ مجھے ان کے انداز سے بہت خوف آیا تھا۔ کچھ دیر بعد فیصل گھبرایا ہوا اندر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ''سنو میں ایک چکر میں پھنس گیا ہوں۔''

''کیسا چکر؟''

''مجھے ان لوگوں کی رقم دینی ہے۔''

''کیوں دینی ہے؟''

''کچھ پرانا معاملہ ہے۔''

''کیا یہ آپ کے پیچھے آئے ہیں؟''

''پتا نہیں مگر یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ اگر انہیں رقم نہ دی تو یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' فیصل نے کہا تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''میرے پاس رقم نہیں ہے تم اپنا گولڈ کا سیٹ دے دو۔''

''وہ میں نہیں دے سکتی۔'' میں نے انکار کیا۔

''شاہینہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں میری جان اور تمہاری عزت دونوں خطرے میں ہیں۔ ان کا منہ بند کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔''

یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ مجھے ان کی وہ نظریں یاد آئیں جن سے انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ''ٹھیک ہے آپ دے دیں مگر......''

اس سے آگے اس نے سنا ہی نہیں اور لپک کر میرا سیٹ اتارنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کہہ رہا تھا۔ ''تھینک یو شانی، میں جلد تمہیں اس سے بھی اچھا سیٹ بنوا دوں گا۔''

لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے بدلے وہ مجھے ایمی ٹیشنل سیٹ بھی نہیں دلائے گا۔ اس کے باوجود میں اسے نہ روک سکی اس نے میرے بدن سے سیٹ اتار لیا اور لے کر باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد خوش خوش واپس آیا۔ ''شکر ہے میری جان چھوٹ گئی۔''

''لیکن یہ چکر کیا ہے آپ نے ان لوگوں سے قرض لیا تھا؟''

''نہیں بزنس کا چکر تھا۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا۔ ''میں ان لوگوں میں پھنس گیا۔''

نہ جانے کیوں مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ کوئی اور چکر ہے۔ میرا سیٹ جو امی نے سستے وقت میں بنوایا تھا۔ ساڑھے تین تولے کا تھا اور اس وقت اس کی مالیت کم سے کم بھی ڈیڑھ لاکھ یا ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ رات میں سو رہی تھی کہ اچانک میری

آنکھ کھلی اور میں نے دیکھا کہ فیصل کمرے میں نہیں تھا۔ میں گھبرا کر اٹھی کیونکہ واش روم کی لائٹ بند تھی۔ دروازہ اندر سے لاک تھا اور فیصل چابی لے گیا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ باہر کوئی نہیں تھا اور نہ کوئی آواز آ رہی تھی۔ اچانک مجھے ہنسی کی آواز آئی اور مجھے لگا کہ فیصل ہنسا ہو۔ میں باہر نکلی تو مجھے راہداری کے آخری کمرے سے آوازیں سنائی دیں۔ میں دبے قدموں کمرے تک آئی اور کان لگا کر سنتی رہی۔ چند منٹ بعد میں واپس جا رہی تھی تو مجھے لگا جیسے زمین میرے قدموں تلے ڈول رہی ہو۔ کمرے میں فیصل ان ہی لوگوں کے ساتھ تھا جن سے اس کا جھگڑا ہو رہا تھا اور وہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور ان کی آوازوں سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہیں۔ پہلی بار مجھے پتا چلا کہ فیصل شراب پیتا ہے۔ وہ کمرے میں آیا تو مجھے جاگتے دیکھ کر ٹھٹکا۔

''تم جاگ رہی ہو؟''

''ہاں آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

''وہ میرا دل گھبرا رہا تھا اس لیے باہر چلا گیا تھا۔'' اس نے سنبھل کر کہا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے بتا دوں کہ وہ اصل میں کہاں تھا؟ مگر میں چپ رہی۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس نے میرا سیٹ ہتھیانے کے لیے یہ ڈراما ترتیب دیا تھا۔ مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا کہ میں نے بنا سوچے سمجھے اس کی باتوں میں آ کر اپنا قیمتی سیٹ اس کے حوالے کر دیا۔ اگلی صبح جب ہم روانہ ہونے لگے تو میں نے اس سے کہا۔

''میرے چچا زاد بھائی ایس پی ہیں۔ ہم ان سے بات کرتے ہیں۔ آپ کو ان لوگوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے کہا نا کہ میں تمہیں سیٹ بنا دوں گا۔''

''کب تک؟''

''جلد، ابھی میرا ہاتھ تنگ ہے۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے میں ایک دو مہینے دیکھتی ہوں اس کے بعد میں سلام بھائی سے بات کروں گی۔''

اس منحوس ریسٹ ہاؤس سے نکلنے کے بعد ہم ایک اور ہوٹل میں دو دن رہے اور یہ ذرا ڈھنگ کا ہوٹل تھا۔ یہاں فیصل نے کھل کر خرچا کیا اور مجھے یقین تھا کہ یہ میرے سیٹ سے حاصل کی ہوئی رقم تھی جو یوں اڑائی جا رہی تھی۔ مگر یہ ساری رقم اس نے خود پر خرچ کی۔ اپنے لیے فر اور لیدر سے بنی غیر ملکی جیکٹ لی، قریبی باڑا مارکیٹ سے اسمگل ہو کر آیا تیس انچ کا ایل سی ڈی ٹی وی لیا۔ جب میں نے پوچھا کہ اس کے پاس تو رقم نہیں تھی پھر یہ خریداری کیسے ہو رہی ہے تو اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ''یہ تو نہیں کہا تھا کہ بالکل خالی ہاتھ ہوں اور ویسے بھی یہ چیزیں یہاں سے بہت سستی ملتی ہیں۔ میں تو اس قسم کی ساری شاپنگ اسی جگہ سے کرتا ہوں۔ تفریح بھی ہو جاتی ہے۔''

تفریح اس کی ہوئی تھی، میں تو لٹ کر آ گئی تھی۔ واپس آتے ہی وہ اپنی جون میں آ گیا اور اس کا رویہ پہلے جیسا ہو گیا۔ دو دن بعد بہ مشکل وہ مجھے امی کے گھر لے کر گیا تو امی نے فوراً سیٹ کی کمی محسوس کر لی۔ انہوں نے موقع پاتے ہی مجھ سے پوچھا۔ ''شانی تیرا سیٹ کہاں ہے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ سیٹ کے ساتھ کیا ہوا اور یہ بھی بتایا کہ مجھے فیصل پر شبہ ہے۔ امی حیران رہ گئیں۔ ''وہ ایسا آدمی تو لگتا نہیں ہے۔''

''مجھے لگتا ہے اس کے حوالے سے آپ لوگوں کی آنکھ پر پٹی بندھ گئی ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''کیا اس نے شادی کے حوالے سے کوئی ایک بھی نارمل کام کیا ہے۔ بس ایک جوڑا لے آیا۔ ولیمہ اس نے نہیں کیا اور آپ یقین کریں شادی کے بعد سے اس نے مجھے ایک چیز بھی لا کر نہیں دی ہے میں سب چیزیں پرانی استعمال کر رہی ہوں۔ حد یہ کہ گھر میں سودا تک لا کر نہیں دیتا۔ تینوں وقت کا باہر سے آتا ہے۔''

یہ سن کر امی کو غصہ آ گیا۔ ''آنے دو اسے میں پوچھتی ہوں۔''

رات کو وہ جب مجھے لینے آیا تو امی نے اسے پکڑا اور تب اس نے انتہائی رکھائی سے کہا۔ ''یہ میرا اور شاہینہ کا معاملہ ہے اس میں کوئی تیسرا دخل نہ دے۔''

امی اس کے لہجے اور انداز پر ششدر رہ گئیں۔ ''یہ تم کس طرح سے بات کر رہے ہو؟''

''جس طرح کی بات کی جائے گی اسی طرح جواب دوں گا۔ میں آپ کا داماد ہوں۔ آپ نے اپنی بیٹی کے لیے مجھے خریدا نہیں ہے۔''

اس بار ابو اور بھائی بھی بگڑ گئے۔ انہوں نے دخل دیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''چلو بہت شوق تھا تمہیں اپنے گھر آنے کا اور میری بے عزتی کرانے کا۔''

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر میں اس کے ساتھ جانے پر مجبور تھی۔ بہر حال وہ میرا شوہر تھا۔ راستے میں اس کا موڈ انتہائی خراب رہا اور گھر آتے ہی وہ مجھ پر برس پڑا۔ ''اتنی سی بات تم سے نہیں چھپائی گئی، فوراً جا کر اپنے گھر والوں کو لگا دی اور وہ کون ہوتے ہیں مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟''

''آپ بھول رہے ہیں انہوں نے ہی آپ کو چنا ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''تو انہوں نے مجھے اپنا غلام نہیں بنا لیا۔''

''آپ نے میرا سیٹ لے لیا۔ وہ میری نہیں میرے بچوں کی امانت ہے میرے پاس۔''

''تمہاری ہر چیز پر میرا بھی حق ہے۔'' اس نے انگلی اٹھا کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو میرے اندر جیسے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ تو کیا اب اس کی نظر میرے باقی زیور، زمین اور بینک اکاؤنٹ پر تھی۔ حالانکہ میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میری ملکیت میں زمین اور کیش بھی ہے لیکن ہو سکتا ہے کسی طریقے سے اس تک یہ بات پہنچ گئی ہو۔ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند دن بعد میں نے اس سے کہا۔

''میں اپنی بچی کو پاس رکھنا چاہتی ہوں۔''

اس نے انکار کر دیا۔ ''میں کسی غیر کے بچے نہیں پال سکتا۔''

''وہ صرف ایک بچی ہے اور اس کے لیے میں آپ سے کچھ نہیں مانگ رہی۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے معلوم ہے تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔ لیکن تم نے ایک سیٹ کی خاطر مجھے ذلیل کیا ہے۔''

''وہ سیٹ آپ نے دھوکے سے لیا ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ جس دن ان لوگوں سے آپ کا جھگڑا ہوا اسی رات آپ چپکے سے ان کے پاس گئے اور وہاں پینے پلانے کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ایک سیٹ لے کر وہ آپ کے پھر سے دوست بن گئے؟''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر دانت پیس کر بولا۔ ''تم میری جاسوسی کر رہی تھیں۔''

''میں صرف پریشان ہو کر باہر آئی تھی۔''

''بکواس کرتی ہو تم میری جاسوسی کر رہی تھیں۔'' اس نے اچانک مجھے تھپڑ مارا۔ ''تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟''

میں ششدر رہ گئی تھی۔ ''آپ نے مجھے مارا ہے۔''

''ہاں بیوی ہو بیوی بن کر رہو۔'' اس نے کہا اور تنتناتا ہوا گھر سے چلا گیا۔ میں رو دی تھی۔ میں ساجد کے ساتھ دس سال رہی اور مارنا تو درکنار انہوں نے مجھے کبھی جھڑکا بھی نہیں تھا انہیں مجھ پر یا کسی بات پر غصہ آ جاتا تو بس خاموش ہو جاتے اور اسی سے پتا چلتا کہ وہ غصے میں ہیں۔ میرے اندر نفرت کی لہر سی اٹھی تھی۔ فیصل سے میری شادی جبر کا نتیجہ تھی اور شادی کے بعد اس کا رویہ نہایت روکھا اور سرد تھا جیسے اسے مجھ سے کوئی دل چسپی نہ ہو۔ اس نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ الٹا مجھ سے میرا سونے کا سیٹ لے گیا اور اب وہ تشدد پر اتر آیا تھا۔ اس نے عفت کو بھی رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے لگا کہ اس شخص کے ساتھ میرا گزارا ممکن نہیں ہے۔ حسبِ معمول اس نے نہ تو مجھے امی کے گھر کھانے دیا اور نہ ہی اس وقت گھر میں کچھ کھانے کے لیے تھا۔ وہ رات گئے واپس آیا تو خالی ہاتھ تھا میں نے دل پر جبر کر کے اس سے کہا۔

''مجھے بھوک لگی ہے اور گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟'' اس نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''میرے پاس کوئی خزانہ نہیں ہے۔''

''میں آپ سے کھانے کا کہہ رہی ہوں کوئی شاپنگ کی فرمائش نہیں کر رہی ہوں۔'' میں نے تنگ کر کہا۔

''تمہارا خاصا بینک بیلنس ہے اور سنا ہے زمینوں کی آمدنی بھی آتی ہے۔ تم سامان لے آؤ اور گھر میں بنا لیا کرو۔''

''آپ ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ اس گھر میں اپنے زیور کا سیٹ لا کر میں نے آخری غلطی کی ہے اور اب میں یہاں ایک روپیا بھی نہیں لاؤں گی۔ ویسے بھی وہ میرے بچوں کے ہیں۔''

''تب بھوکی رہو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں خاموش رہوں گی میں ابھی ان لوگوں کو بلاتی ہوں جو مجھے یہاں دھکیلنے کے ذمے دار ہیں۔''

میں نے اپنا موبائل نکالا اور امی کو کال کرنے جارہی تھی کہ اس نے اچانک جھپٹ کر مجھ سے موبائل لیا اور دیوار پر دے مارا۔ پھر اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا اور گالی دیتے ہوئے غرا کر بولا ''...... تو کیا سمجھتی ہے کہ میری شکایت کرے گی تو وہ میرا کچھ بگاڑ لیں گے۔ ابھی تم لوگوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ میں کیا ہوں؟'' اس نے کہتے ہوئے اچانک اپنے سر سے میرے ماتھے پر ٹکر ماری تو میرا سر چکرایا اور میں بے ہوش ہو گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ ایسی کوئی حرکت کرے گا۔ میں مدافعت بھی نہیں کرسکی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ یہ اصل میں لکڑی کا تخت تھا جس پر بدبودار فوم کا گدا بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر میلا سا رنگ تھا اور ایک پیلا بلب کمرے کی بدرونقی میں مزید اضافہ کررہا تھا۔ میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں گھبرا کر اٹھی کیونکہ اپنے گھر میں نہیں تھی۔ پتا نہیں فیصل مجھے کہاں لے آیا تھا۔ میں نے کمرے کا واحد دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند نکلا تھا۔ میں نے دروازہ پیٹا۔

''کھولو مجھے کہاں بند کیا ہے فیصل ...... کمینے ...... ذلیل شخص ...... مجھے کہاں لے آیا ہے؟''

کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے پھر دروازہ پیٹا اور اس وقت تک پیٹتی رہی جب تک باہر سے ایک کرخت آواز نہیں آئی۔ ''شور مت کر آرام سے بیٹھ جا۔''

''دروازہ کھولو۔'' میں چلائی۔ ''مجھے کیوں بند کیا ہے؟''

''دروازہ کھل گیا تو پچھتائے گی پھر دروازہ بند نہیں ہوگا کھلا رہے گا۔'' اس نے اس لہجے میں کہا کہ میں سہم گئی تھی۔ پتا نہیں میں کہاں تھی اور یہ شخص کون تھا۔ میں بستر پر سمٹ کر چپکے سے رونے لگی۔ میری آواز بھی بند ہوگئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرا جسم خوف سے سرد ہو رہا تھا۔ پتا نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے اپنے پیٹ کی اینٹھن سے اندازہ ہوا تھا کہ میں خاصی دیر بے ہوش رہی تھی مگر جب حواس بحال ہوئے تو مارے خوف کے میری بھوک مر گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس ذلیل شخص نے کہیں مجھے فروخت تو نہیں کردیا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے ہمارا ملک جرائم پیشہ افراد کی جنت بن گیا ہے کیونکہ یہاں کوئی شخص کیسا ہی جرم کیوں نہ کرلے اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ وہ گرفتار بھی ہوتا ہے تو چھوٹ جاتا ہے۔ اگر میں غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھ آگئی تھی تو میرے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ جان سے زیادہ مجھے اپنی عزت آبرو کی فکر تھی۔ میں نے گھبرا کر خود کو دیکھا۔ میرا لباس ٹھیک تھا اور جسمانی طور پر بھی خود کو ٹھیک محسوس کررہی تھی۔ یعنی کسی نے مجھے چھوا نہیں تھا۔ اچانک دروازہ کھلا تو میں سوچوں سے اچھل پڑی تھی۔ خوف نے مجھے لرزا دیا تھا، مگر پھر فیصل کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی اور میں اس کی طرف لپکی۔ میں نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کہاں لے آئے ہو مجھے؟''

اس نے بے رحمی سے مجھے واپس دھکیل دیا اور بولا۔ ''ایسی جگہ جہاں کا کسی کو خیال بھی نہیں آسکتا۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں آنے والا ہمیشہ کے لیے بھی غائب ہو جاتا ہے۔''

میں لرز اٹھی۔ ''کیوں لائے ہو؟''

''تاکہ تم شرافت سے میری بات مان لو۔''

''کون سی بات؟''

''میں کچھ کاغذات دوں گا ان پر سائن کردو۔'' وہ بولا۔ ''دوسرے تم اپنے بینک اکاؤنٹ کی رقم میرے بتائے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرو گی۔''

''کسی صورت نہیں۔'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''وہ سب میرے بچوں کا ہے۔''

''تم نے شاید غور نہیں کیا ہے کہ تم کہاں ہو اور یہاں کس قسم کے لوگ موجود ہیں؟'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ ایسے درندے ہیں جو گوشت تو کھاتے ہی ہیں ساتھ میں ہڈیاں بھی چبا جاتے ہیں۔''

میں اسے گھورنے لگی۔ ''تم گھٹیا تو ہو ہی لیکن ساتھ ہی بے غیرت بھی ہو اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں تمہاری بیوی اور عزت ہوں۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا اور ہاتھ سے مال کا اشارہ کیا۔ ''اصل اہمیت اس کی ہے۔''

''اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟''

''تو تمہارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے اگر میرے ساتھ کچھ ہوا تو میرے گھر والے خاموش بیٹھ جائیں گے؟''

''ہاں۔'' وہ مزے سے بولا۔ ''کیونکہ میں ان کو بتاؤں گا کہ تم گھر سے بھاگ گئی ہو اور گھر سے قیمتی اشیا اور رقم بھی لے گئی ہو جس کی میں ایف آئی آر بھی کراؤں گا۔''

''بچو گے تم بھی نہیں۔''

''اگر بات مجھ تک آئی تو میں روپوش ہو جاؤں گا۔''

''اپنی جاب اور فلیٹ چھوڑ کر؟''

''فلیٹ کرائے کا ہے اور ایسی جاب مجھے دس مل سکتی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے کا وقت ہے کیونکہ میں اس معاملے کو زیادہ دیر نہیں کھینچ سکتا۔ یاد رکھنا اگر دیر ہوگئی تو نقصان تمہارا زیادہ ہوگا۔ یقیناً تمہارے لیے اپنی جان اور عزت مال سے بڑھ کر ہوگی۔ میں مجبور ہو جاؤں گا کہ تمہارا سودا ان لوگوں سے کرلوں۔''

یہ سن کر میرے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی۔ میں اس کی طرف لپکی لیکن وہ کمرے سے نکل گیا اور دروازہ دوبارہ بند ہوگیا۔ میں نے دروازہ پیٹا مگر جب جواب نہیں ملا تو واپس بیڈ پر بیٹھ کر اپنے مقدر کو رونے لگی۔ ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ میری زندگی کیا سے کیا ہوگئی تھی؟ دوسرا مرد میری زندگی میں آگیا تھا اور یہ میری زندگی کا سب سے بھیانک دور تھا۔ نہ جانے کب دروازہ کھلا اور ایک شاپر آکر اندر گرا اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹھ کر شاپر دیکھا تو اس میں پانی کی ایک لیٹر بوتل اور ایک برگر تھا۔ میں نے بے تابی سے پانی پیا اور پھر برگر کھایا۔ کھا پی کر ذرا حواس ٹھکانے آئے تو میں سوچنے لگی کہ فیصل کا اصل روپ یہی تھا۔ میرے گھر والوں کی عجلت نے مجھے پھنسا دیا اور اب پتا نہیں یہاں سے نکل سکتی تھی یا نہیں۔ فیصل اگر مجھ سے زمین کی ملکیت کے کاغذات پر سائن لے لیتا اور کسی طریقے سے بینک میں موجود رقم بھی حاصل کرلیتا تب بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا۔ خوش قسمتی سے میرے اکاؤنٹ کی چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ امی کے پاس تھے۔ اگر وہ میں ساتھ لائی ہوتی تو فیصل کا کام آسان ہو جاتا۔ وہ مجھ سے چیک سائن کرا لیتا یا اے ٹی ایم کی پن لے لیتا اور رقم حاصل کرلیتا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر فیصل رقم نکلوانے کے لیے مجھے بینک لے جائے تو ممکن ہے میں وہاں سے مدد حاصل کرکے اس کے چنگل سے نکل جاؤں۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ مجھے بینک کیوں لے جاتا؟

اس کمرے میں وقت کا پتا نہیں چل رہا تھا کہ دن ہے یا رات اور کتنا وقت گزر گیا ہے؟ میرے پیروں میں کچھ نہیں تھا اور دوپٹا بھی غائب تھا۔ میں بستر پر سمٹ کر لیٹ گئی اور پھر کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ اسے نیند نہیں کہہ سکتے تھے یہ غنودگی سی تھی جو کبھی میرے ذہن پر چھا جاتی اور کبھی میں چونک کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ پیٹ میں بڑھتی اینٹھن سے مجھے اندازہ ہوا کہ بہت وقت گزر گیا ہے اور میں نے جو کھایا تھا وہ ہضم ہوگیا ہے۔ ویسے بھی وہ عام سا برگر تھا جس سے ایک بچے کا پیٹ بھی نہیں بھرتا ہے۔ پانی کی بوتل میں بہت احتیاط سے استعمال کررہی تھی کہ واش روم کا مسئلہ نہ ہو۔ اصل میں مجھے دروازہ بجاتے ہوئے خوف آرہا تھا کہ پتا نہیں باہر جو لوگ ہیں اور فیصل نے خوفناک انداز میں ان کا تعارف کرایا تھا وہ میری آواز سن کر نہ بھڑک جائیں۔ اگر دروازے کے اندر کوئی کنڈی ہوتی تو میں وہ لگا لیتی مگر اس میں کوئی کنڈی بھی نہیں تھی۔

پھر کسی وقت دروازہ کھلا اور اسی طرح ایک شاپر اندر گرا اور دروازہ بند ہوگیا۔ اس بار بھی ایک بوتل پانی اور ایک برگر تھا میں نے برگر کھایا اور پیاس کے باوجود پانی نہیں پیا کیونکہ اب مجھے دباؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں بہت دیر برداشت کرتی رہی پھر پانی پی لیا اس کے بعد پیٹ کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہونے لگا تھا۔ میں ہمت کرنے لگی کہ دروازہ بجاؤں اور ان لوگوں سے کہوں کہ مجھے واش روم جانا ہے۔ ساتھ ہی ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں بہت کوشش کے بعد دروازے تک آئی۔ مگر اس سے پہلے کہ دروازہ بجاتی اچانک وہ کھلا اور میں بھڑک کر پیچھے ہٹی تھی۔ فیصل نمودار ہوا۔ مجھے دروازے کے سامنے پاکر وہ ذرا حیران ہوا۔ ''تم یہاں کھڑی ہو؟''

''مجھے واش روم جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا اور مجھے باہر لے آیا یہ کوئی بڑا امکان تھا کیونکہ وہ مجھے اندر ہی اندر کئی کمروں سے گزار کر ایک چھوٹے صحن میں لایا جہاں لائن سے کئی لیٹرین تھے اور وہاں گندگی کا جو عالم تھا اس سے مجھے وہاں رہنے والوں کی فطرت کا اندازہ ہوگیا۔ بہ مشکل میں وہاں گئی اور جلدی سے واپس آگئی۔ بدبو سے ابکائی آرہی تھی۔ فیصل مجھے اسی کمرے میں لایا۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔ ''کیا خیال ہے میں کاغذات لاؤں؟''

''فیصل خدا کے لیے میرے پاس وہ امانت ہیں میں قیامت کے دن ساجد کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

''جو مرضی ہو منہ دکھا دینا۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔ ''مجھے ہاں یا نہیں جواب دو میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر تم انکار کرتی ہو تو میں اسی وقت تمہیں ان لوگوں کے حوالے کر

دوں گا اور جا کر ایف آئی آر کٹوا دوں گا۔ اس خیال میں بھی مت رہنا کہ تم چھوٹ جاؤ گی یا بچ جاؤ گی یہ چند دن میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

"نہیں پلیز۔" میں رونے لگی۔

"تو تم تیار ہو؟"

"ہاں ...... ہاں۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "میں تیار ہوں۔ لاؤ کہاں سائن کرانے ہیں۔"

فیصل ایک فائل لے آیا جس میں حلف نامہ تھا کہ میں نے اپنی ملکیت میں موجود زرعی زمین کا مختار کار اسے بنا دیا ہے۔ اس نے جہاں جہاں کہا میں سائن کرتی گئی اور پھر اس نے میرے انگوٹھے کے نشانات بھی لگوائے۔ یہ کام کرا کے وہ خوش نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ "اب مجھے ساتھ لے چلو۔"

"بس چند گھنٹے اور صبر کرلو۔"

چند گھنٹے میں میرے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "سنو اگر تمہیں بینک اکاؤنٹ کی رقم چاہیے تو مجھے لے چلو۔"

اس کے چہرے پر لالچ آگئی۔ "کیسے؟ چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ تو ہے نہیں تمہارے؟"

"وہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بینک جا کر کہوں گی کہ میری دونوں چیزیں گم گئی ہیں اور مجھے فوری رقم کی ضرورت ہے تو وہ مجھ سے کچھ پیپرز پر سائن لے کر رقم کسی اور اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر کے اسی وقت نکال دیں گے۔"

فیصل نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔"

"یوں سمجھ لو کہ میں تمہیں اپنی آزادی کی قیمت دے رہی ہوں اس کے بعد تم مجھے طلاق دو گے۔"

"اگر تم بینک جا کر مکر گئیں تو؟"

"تو تم مجھے طلاق نہیں دینا مگر میں تمہارے ساتھ اب ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رہ سکتی۔"

وہ مان گیا مگر ساتھ ہی مجھے دھمکی دی۔ "یہ مت سمجھنا کہ اگر تم نے کوئی حرکت کی تو تم بچ جاؤ گی۔ تم سمجھ گئی ہو گی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ فیصل مجھے وہاں سے نکال لایا مگر اس نے یہ چالاکی کی کہ اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تاکہ میں دیکھ نہ سکوں کہ وہ مجھے کہاں لایا تھا۔ راستے میں اس نے پٹی کھول دی۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے اور ابھی بینک کا ٹائم تھا۔ وہ مجھے میرے بینک تک لایا۔ کیونکہ میرے پاس دوپٹا اور پیروں میں پہننے کو کچھ نہیں تھا اس لیے اس نے بادل ناخواستہ راستے سے میرے لیے دوپٹا اور سینڈل لیے۔ ہم بینک میں داخل ہوئے اور اندر آتے ہی میں تیزی سے بینک منیجر حامد علی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ وہ ساجد کا دوست تھا اور مجھے پہچانتا تھا۔ غالباً فیصل کے گمان میں نہیں تھا کہ میں ایسی کوئی حرکت کروں گی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ مجھے یوں آتے دیکھ کر حیران ہوا۔ "بھابی آپ......"

"حامد بھائی پلیز اپنے گارڈز سے کہیں اس شخص کو پکڑ لیں یہ مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لایا۔"

یہ سنتے ہی حامد بھائی نے اپنی میز کے ساتھ لگا ہوا ایک بٹن دبایا تو باہر الارم بجنے لگا اور گارڈز نے فوری دروازے بند کر دیے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے حامد بھائی کے کہنے پر فیصل کو گھیر لیا۔ وہ ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا کہ اسے کیوں پکڑا ہے۔ میں حامد بھائی کے ساتھ باہر آئی تو اس نے مجھے دیکھا۔ "شاہینہ یہ سب کیا ہے تم نے کچھ کیا ہے؟"

"حامد بھائی یہ میرا نام نہاد شوہر ہے اور اس وقت یہاں میرے اکاؤنٹ سے رقم نکلوانے آیا ہے۔ اس کے پاس ایک فائل ہے جس میں اس نے زبردستی مجھ سے زمین کے مختار نامے پر سائن کرائے اور انگوٹھے کے نشانات لگوائے ہیں۔"

"اس کی تلاشی لو۔" حامد بھائی نے گارڈز سے کہا اور انہوں نے اس کی تلاشی لی تو سچ اس کے پاس سے ایک پستول نکل آیا تھا۔ پستول نکلتے ہی وہاں سنسنی پھیل گئی تھی اور حامد بھائی نے فوری طور پر پولیس کو کال کر دی۔ پولیس کے آنے سے پہلے انہوں نے فیصل کی کار میں موجود فائل منگوالی اور اسے دیکھ کر انہوں نے اسی وقت اسے پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ایک گھنٹے سے بھی پہلے فیصل کو ہتھکڑیاں لگ گئی تھیں اور پولیس اسے گرفتار کر کے لے گئی۔ میں نے اس کے خلاف زبردستی رقم نکلوانے کی رپورٹ کرائی جو حامد بھائی کے دباؤ پر پولیس نے اسی وقت لکھی۔ فیصل پر مسلح ڈکیتی کا الزام لگا تھا۔ جس وقت پولیس اسے لے جا رہی تھی ابو اور احسان بھائی بینک پہنچ گئے۔ وہ مجھے وہاں سے لے کر نکلے اور راستے میں، میں نے جب انہیں فیصل کے کرتوت بتائے تو وہ دنگ رہ گئے اور احسان بھائی تو اتنے بھڑ گئے کہ انہوں نے اسی

وقت سلام بھائی کو کال کر کے ساری روداد سنائی اور انہوں نے کہا کہ اب وہ اس معاملے کو خود دیکھیں۔ ابو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

"ہمیں معاف کرنا میری بچی، تمہاری ماں کی ضد پر ہم نے تمہیں سچ مچ جہنم میں دھکیل دیا۔"

"ابو میرے اور میرے بچوں کے ساتھ ظلم ہوا میں ساجد کے گھر خوش تھی اگر امی زبردستی نہ کرتیں تو میں اس کرب اور اذیت سے نہ گزرتی۔ اب بھی مجھے امی کا خوف ہے۔"

"تم فکر مت کرو اس عورت کو تو میں ٹھیک کروں گا۔" ابو کو غصہ آ گیا۔ "اس کی جلد بازی نے آج یہ دن دکھایا ہے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور سیٹ کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ چند گھنٹے پہلے میں کیسے خوفناک ماحول میں تھی اور مجھے علم نہیں تھا کہ فیصل مسلح بھی ہے ورنہ شاید میں اتنی ہمت نہ کر پاتی۔ پتا نہیں وہ کیسے میری باتوں میں آ گیا اور مجھے بینک لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ شاید اس کی عقل پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی اس نے سوچا کہ زمین کے ساتھ رقم ہتھیانے کا موقع بھی آ رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھا لے۔ پتا نہیں اس نے میرے بارے میں کیا سوچا تھا؟ گھر آ کر ابو اور بھائیوں نے میٹنگ کی۔ سلام بھائی بھی آ گئے تھے۔ ان سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ فیصل کے خلاف اغوا اور حبس بے جا کا کیس کیا جائے مگر اس جگہ کا ذکر نہ کیا جائے صرف یہ کہا جائے کہ اس نے مجھے کسی جگہ تنہا قید کیا تھا تاکہ میری بدنامی نہ ہو۔ سلام بھائی کی وجہ سے پولیس کو گڑبڑ کا موقع نہیں ملا ورنہ جب فیصل کو گرفتار کر رہے تھے تب بھی حامد بھائی کے زور دینے پر اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوائی تھی ورنہ شاید پولیس اس سے مک مکا کر لیتی۔

فیصل کے خلاف عدالت میں کیس چلنا شروع ہوئے اور میں نے اسی بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے طلاق لے لی۔ میرا حق مہر صرف دس ہزار تھا۔ سونے کے سیٹ کے بارے میں وہ مکر گیا تھا اور میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ بہر حال اس سے میری جان چھوٹ گئی۔ چند مہینے بعد اسے مسلح ڈکیتی اور دوسرے الزامات میں سات سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ جس دن میں نے سزا کا سنا میرے اندر ایک ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ روز اول سے اس شخص کے خلاف میرے اندر ناپسندیدگی تھی۔ میں نے بہت مجبوری کے عالم میں اسے برداشت کیا اور چھٹکارا ملنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس سے زیادہ خوشی مجھے اپنے بچوں کے ملنے کی تھی۔ امی کے گھر آنے کے بعد عفت مجھ سے یوں چمٹی کہ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں چھوڑتی تھی۔

پھر میرے سسر اور ساس کی طرف سے مجھے پیغام آیا کہ اگر میں واپس آنا چاہوں تو انہیں بہت خوشی ہو گی۔ میں نے امی کی بجائے ابو سے بات کی اور انہوں نے اجازت دی تو میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ امی نے سنا تو حسبِ معمول مخالفت کی مگر اب ان کی ایک نہیں چلی تھی۔ سب میرے ساتھ تھے اور میں واپس اپنے سسرال آ گئی۔ آج میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش ہوں اور فیصل کے ساتھ گزارے چند دن بھیانک خواب سمجھ کر فراموش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

ہمارے معاشرے میں عورتوں اور خاص طور سے بیواؤں کو جو حقوق ہمارے مذہب نے دیے ہیں وہ لوگوں نے سلب کر لیے ہیں۔ بیوہ کی شادی اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ اسے مشورہ دیا جا سکتا ہے اور رشتہ تجویز کیا جا سکتا ہے لیکن کنواری لڑکی کی طرح اپنی مرضی اس پر ٹھونسی نہیں جا سکتی ہے کیونکہ وہ تجربے کار اور ہوشیار ہو چکی ہوتی ہے وہی فیصلہ کرتی ہے کہ اسے شادی کرنی چاہیے یا نہیں۔ بہت ساری عورتیں ہوتی ہیں جو فطری تقاضوں کی وجہ سے پھر شادی کرنا چاہتی ہیں مگر شرم کی وجہ سے وہ کہہ نہیں سکتیں اور ان کے لواحقین بھی توجہ نہیں دیتے ہیں ایسا ہمارے ہاں بہت زیادہ ہوتا ہے اگر عورت ذرا زیادہ عمر میں بیوہ ہو جائے تو فرض کر لیا جاتا ہے کہ اب اسے شادی کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری طرف چند ایک کیس میرے جیسے بھی ہوتے ہیں جن میں عجلت اور مشورے کے بغیر غلط فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ بھگتنا عورت کو پڑتا ہے اور اگر اس کے چھوٹے بچے ہوں تو اس کے لیے اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ ٹھیک ہے اکیلی عورت کے لیے معاشرے میں رہنا آسان نہیں ہے مگر اسے یوں آنکھ بند کر کے دوسری شادی کے نام پر کسی اجنبی کے حوالے کر دینا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں کہوں گی کہ اس معاملے میں بیوہ کی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت دیں۔ اسے اس کا وہ حق دیں تو دین فطرت نے ہمیں دیا ہے۔ ورنہ تمام عورتیں میری جتنی خوش قسمت نہیں ہوتی ہیں جو فیصل جیسے آدمی کے چنگل میں آنے کے بعد بچ بھی جائیں۔

غمِ دل

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
جو لوگ ظاہری چمک دمک کے پیچھے بھاگتے ہیں ان کا وہی انجام ہوتا ہے جو میں نے رجو کا دیکھا۔ وہ گاؤں کی ایک سیدھی سادی مٹیار تھی مگر دماغ میں بھرے خناس نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری یہ آپ بیتی ہر گاؤں گوٹھ تک پہنچ جائے تاکہ پھر کوئی رجو اپنے پیروں پر کلہاڑی نہ مار بیٹھے۔

رشدی سید
(لاہور)

افق پر سونا پگھل رہا تھا۔ کچے راستے پر سفر کرتے کرتے میرا اور موٹر سائیکل کا حلیہ خراب ہو چکا تھا۔ میں اس گاؤں کی حدود میں داخل ہو رہا تھا جو میری منزل تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ مکان زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا جہاں رحمو نے میرے قیام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں آپ سے اپنا تعارف کرا دوں تو بہتر ہوگا۔ میرا نام رشدی ہے اور میں ایک خاصی معروف ایڈورٹائزنگ کمپنی میں آرٹ ڈائریکٹر ہوں۔ آسودہ حال طبقے کے درمیان مشینی سی

زندگی گزارنے کے باوجود اپنے اندر کے اس آرٹسٹ کو نہیں مار سکا جو بڑا احساس اور فطری خوب صورتیوں کا متلاشی رہتا ہے۔ کافی عرصے سے شہر کی ہنگامہ خیز اور گھٹن آمیز فضا میں رہتے رہتے دل میں ایک عجیب سی خواہش مچلنے لگی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بہت دور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں چوڑی چکلی سڑکیں، ان پر جھلملاتی رنگین کاریں اور مصنوعی مسکراہٹوں کے بوجھ تلے دبے کاغذی پھولوں جیسے میک اپ زدہ چہرے نہ ہوں، جہاں یہ بلند و بالا عمارتیں نہ ہوں جن کے دامن میں ہزاروں بے گھر انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح فٹ پاتھوں پر پڑے رہتے ہیں۔ جہاں یہ وسیع و عریض کارخانے نہ ہوں جن کی چمنیاں چوبیس گھنٹے دھواں اگلتی ہیں اور پھر بھی بازار سے گھی، چینی اور کپڑا غائب رہتا ہے۔ شاید آپ مجھے سنکی سمجھیں بہرحال حقیقت یہ ہے کہ میں انتہا پسندی کے ساتھ سوچتا ہوں اور جب تصنع اور تضاد کی اس دنیا میں سچائی اور آسودگی کا نور پھیلانے کا مجھے کوئی واضح طریقہ نہیں سوجھتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی ساری بدحالی کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ شاید یہ احساس اس لیے ہوتا ہو کہ میں انفرادی طور پر آج تک کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ خیر تو میں بتا رہا تھا کہ روح کی اس بے چینی نے ذہن کو کچھ ایسا تہ و بالا کیا کہ میں نے چند دن شہر کی فضا سے باہر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا ارادہ اپنے ملازم رحمو کے گاؤں میں قیام کا تھا جو بقول اس کے پریوں کے دیس سے بھی زیادہ خوب صورت جگہ تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے متعلق ایسے ایسے خوب صورت مناظر کا تسلسل باندھتا تھا کہ میں بے اختیار برش، کینوس اور رنگوں کی دنیا میں کھو جاتا لیکن اب مجھے اپنی تصویروں میں تشنگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے رحمو کو مناسب رقم، روزمرہ ضروریات کی کچھ چیزیں اور مصوری کا سامان دے کر گاؤں بھیج دیا کہ میرے رہنے کے لیے چند دن کے واسطے کسی مکان کا انتظام کرے اور مجھے اطلاع دے۔

کل رحمو کا خط مجھے ملا تھا۔ لکھا تھا.....! ”خدا بخش ڈاکیے سے یہ خط لکھوا کر بھیج رہا ہوں۔ میں نے آپ کے لیے بہت اچھے مکان کا انتظام کر لیا ہے۔ جب آپ گاؤں میں داخل ہوں تو کھیتوں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر کسی سے پوچھ لیں کہ چودھری نواز کا کنواں کس طرف ہے۔ اس کنویں کے قریب ہی آپ کو بغیر پلاستر کا ایک پکا مکان نظر آئے گا بس سیدھے اسی طرف آ جائیں۔“

رحمو جاتے وقت مجھے اپنے گاؤں کی ایک ایک تفصیل اور سچویشن سے آگاہ کر کے گیا تھا بلکہ پینسل سے نقشے بنا کر بھی سمجھا گیا تھا۔ یہ رحمو بھی باوجود ان پڑھ ہونے کے اس قدر جدت پسند اور دلچسپ آدمی ہے کہ اس کے کردار پر کئی کتابیں تصنیف ہو سکتی ہیں لیکن اس وقت میں آپ کو اپنی کہانی سنانے جا رہا ہوں۔ ہاں تو جیسے ہی مجھے رحمو کا خط ملا میں نے ضرورت کا بقیہ سامان باندھا اور فلیٹ کو تالا لگا کر موٹر سائیکل سنبھالی اور روانہ ہو گیا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا جگہ جگہ ٹولیوں میں بٹے کسان پسینے میں شرابور کام میں مصروف تھے۔ کہیں کہیں کھڑی فصلوں کے درمیان اوڑھنیاں (چھینٹ کے دیہاتی ڈوپٹے) بھی ہوا کے دوش پر لہراتی نظر آ رہی تھیں۔ ایک جگہ منڈیر پر ایک نوجوان بیٹھا ستا رہا تھا۔ دھوپ میں کام کرنے سے اس کا مضبوط جسم تانبے کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل روک کر دیہاتی لب و لہجے میں چودھری کے کنویں کا راستہ پوچھا۔ اس لب و لہجے پر میں نے رحمو کی مدد سے بڑی محنت کے بعد عبور حاصل کیا تھا۔ اس نوجوان نے بائیں طرف جانے والی ایک اور تنگ اور ناہموار پگڈنڈی کی طرف اشارہ کیا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر کچے راستے پر ہچکولے کھانے لگی۔ جلد ہی میں چودھری نواز کے کنویں پر پہنچ گیا جس پر ایک بڑا سا رہٹ چوں چوں کی مخصوص آواز کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ دیہاتی ماحول کے اس پہلے ”پلانٹ“ کو دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ رحمو ایک مختصر سے پختہ اینٹوں اور بغیر پلاستر کے مکان کے سامنے تقریباً دو فٹ اونچی پگڑی سر پر رکھے کھڑا تھا اور بلاضرورت مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بھینگی آنکھوں کا فوکس مجھ پر تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ رہا بلکہ کنویں پر پانی بھرنے والی ایک نوخیز اور صحت مند سی لڑکی کو دیکھ رہا ہے۔ موٹر سائیکل کی آواز سن کر جب اس کی آنکھوں کا زاویہ لڑکی کی طرف ہو گیا تو میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ حسبِ عادت پہلے تو اس کی آنکھیں پھیلیں پھر منہ کھل گیا۔ اس کے بعد وہ احمقانہ انداز میں ہنستا ہوا میری طرف بڑھا۔

”آپ آ گئے۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گے۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔“

حالانکہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ محض اس کم سن چھوکری کو گھورنے کے لیے وہاں کھڑا تھا لیکن فی الوقت میں نے اس

کے جملے کے خلوص پر کوئی تعرض نہ کیا۔ اس نے ایک مستعد ملازم کی طرح موٹر سائیکل میرے ہاتھ سے لی اور اسے کھڑا کرنے کے لیے دیوار کے سائے میں لے جانے لگا۔ میں مکان میں داخل ہو گیا۔ پہلا کمرا رحمو نے اپنے اور میرے مشترکہ ذوق کے مطابق سجایا تھا۔ میں نے فلیٹ ہیٹ اور تاریک چشمہ اتار کر تپائی پر رکھ دیا اور بائیں جانب کی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کچھ دور وہی نوخیز لڑکی پانی سے بھری گاگر کو کولہے پر ٹکائے رحمو کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔ ”ارے رحمے! تیرا صاحب تو بہت امیر آدمی دکھائی دیتا ہے۔“

”ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ شہر میں اس کا بہت بڑا بنگلا ہے۔“ اس نے میرے فلیٹ کو بنگلے میں تبدیل کر دیا۔ وہ حسبِ ضرورت میری اوقات گھٹاتا بڑھاتا رہتا تھا۔

جب وہ اندر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیوں بھئی کچھ کھانے وغیرہ کا بھی انتظام کیا ہے؟“

یہ سن کر اس نے اپنی پگڑی بالکل اسی اسٹائل سے اتاری جس طرح میں فلیٹ ہیٹ اتارتا ہوں پھر اسے احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ کر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون سا بڑا کام ہے صاحب! آپ ذرا غسل کیجیے میں ابھی چٹکی بجاتے ہی کھانا تیار کرتا ہوں۔“

اس نے مجھے غسل خانہ دکھایا جہاں تقریباً میرے آدھے قد کے برابر بالٹی بھری رکھی تھی اور اس میں ڈالڈا کے ڈبے سے بنا ہوا ڈونگا بھی موجود تھا۔ ایک طرف طاقچے میں صابن کی ٹکیہ رکھی تھی جس کی پیکنگ کھولنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

میرے غسل کرنے کے کوئی سوا گھنٹے بعد رحمو کھانا تیار کر سکا۔ کھانا کھاتے ہی ایسی غنودگی طاری ہوئی کہ بستر پر گر کر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ اگلے روز میں نے گاؤں میں سورج طلوع ہونے کا منظر دیکھا۔ صبح کاذب کے وقت ہی رہٹ کی چوں چوں نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔ ورزش سے فارغ ہو کر نہا دھو کر باہر نکلا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ دیہات کی صبح شہر کی صبح سے بہت مختلف اور خوب صورت ہوتی ہے۔ یہاں کی فضا میں ٹھہراؤ، سکون اور ایک خاموش سا فطری نظم و نسق تھا جس میں رہٹ کی آواز نغمگی پیدا کر رہی تھی۔ سورج کی کندنی کرنیں جب رہٹ سے گرتی ہوئی پانی کی موٹی سی دھار پر پڑتی تھیں تو ایک بڑی سی بھٹی کا تصور ذہن میں آتا تھا جہاں سونا پگھلایا جا رہا ہو۔ شہر میں صبح کا احساس ایک خفیف سے شور، مشینوں کی دھیمی دھیمی گڑگڑاہٹ، کاروں کے چیختے ہوئے ہارن اور بسوں کی بھاگ دوڑ سے ہوتا ہے جہاں صبح ہی صبح کثافت سے بھرپور دھواں پھیپھڑوں میں پہنچنا شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں گریس ملے ہوئے مکھن اور کارخانوں میں تیار شدہ ڈبل روٹی سے ناشتا کر کے لوگ ایک مضطرب اور بے چین ہجوم کی صورت میں اعصاب زدہ سی حالت کے ساتھ کام پر روانہ ہو جاتے ہیں لیکن یہاں دیہات کی صبح میں کتنی تازگی تھی اور میں سوچ رہا تھا کاش شہروں کی زہریلی فضاؤں کے جراثیم یہاں تک نہ پہنچ سکیں۔

اس خوب صورت صبح کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے بعد میں نے رحمو کا تیار کردہ ناشتا کیا۔ ناشتے میں روٹیاں، مکھن، بھنا ہوا گوشت اور دودھ تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں گاؤں میں گھومنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ کچے اور نیم پختہ مکانوں کو میں قدرے متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ ایک ملتجیانہ سی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”بابو جی! ایک خط لکھ دو گے؟“ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ٹخنوں سے اونچی تہمد، خاصی لمبی قمیص اور پگڑی پہنے ایک بوڑھا لیکن مضبوط اعضا کا دیہاتی مجسم سوال بنا کھڑا تھا۔

”ضرور لکھ دوں گا چاچا۔“ میں نے کہا۔

”ادھر آ جاؤ بابو۔ یہ پرلا گھر میرا ہے۔ پیپل کی چھاؤں میں بیٹھ کر لکھ دو۔“ بوڑھے نے ممنونیت آمیز لہجے میں کہا۔ مجھے ساتھ لے کر وہ ایک نیم پختہ مکان کی طرف بڑھا اور پہلے خود اندر داخل ہو کر میرے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا سامنے ہی ایک چھپر دار برآمدے میں گلابی کپڑوں میں ملبوس ایک عورت یا لڑکی دروازے کی طرف پشت کیے چولہے پر جھکی پھونکیں مار کر آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ٹھٹکا۔ بوڑھا فوراً بولا۔ ”آ جاؤ بابو۔ آ جاؤ۔“

میں سمجھ گیا کہ یہ پردہ دار دیہاتی نہیں ہیں۔ سر جھکا کر میں آگے بڑھ گیا۔ لمبے چوڑے کچے صحن میں پیپل کا ایک درخت کھڑا تھا جس کی چھاؤں میں چار پائیاں پڑی تھیں۔ ذرا ہٹ کر دو بیل اور ایک بھینس بندھی ہوئی تھی۔ میں بوڑھے کے ساتھ ایک بے ہنگم سی چار پائی پر جا بیٹھا اور اس نے خط لکھوانا شروع کر دیا۔ خط وہ اپنے کسی بھائی کو لکھوا رہا تھا جس نے اپنے کاروبار کے سلسلے میں اس سے دو سو روپے منگوائے تھے اور اس کے پاس فی الحال دو سو روپے نہیں تھے وہ خط لکھ کر پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر ایسی ہی شدید ضرورت ہو تو وہ بھینس بیچ کر پیسوں کا انتظام کرے۔ میں نے آسان ترین الفاظ میں خط لکھ دیا جسے سن کر بوڑھا کافی خوش ہوا۔ میں اٹھ کر چلنے لگا تو وہ بڑے معصوم خلوص کے ساتھ بولا۔ ”ایک گلاس لسی ہی پیتے جاؤ، بابو۔“

”شکریہ چاچا۔ میں لسی نہیں پیتا ہوں۔“ میں نے تکلف کیا۔

اس نے قدرے تامل سے کہا۔ ”اچھا تو پھر دودھ ہی پیتے جاؤ۔ رات کا کڑھا ہوا ہے۔“ اس کے لہجے میں التجا کا ایسا وزن تھا کہ میں انکار نہ کر سکا اور یہ سوچتے ہوئے بیٹھ گیا کہ دیہاتیوں میں ابھی خلوص کی کچھ دولت باقی ہے۔ میں نے اس بوڑھے کو ایک پوسٹ کارڈ پر محض چند سطریں لکھ کر دی تھیں اور اب اسے گوارا نہیں تھا کہ میں اس کے گھر سے کچھ کھائے پیے بغیر چلا جاؤں۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں پکارا۔ ”لالی بیٹی! ایک گلاس دودھ کا لے آنا۔ شکر ڈال کر۔ ولایتی شکر۔“ تب مجھے معلوم ہوا کہ چولہے پر جھکی ہوئی گلابی کپڑوں والی وہ لڑکی اس کی بیٹی لالی تھی اور جب وہ دودھ سے لبالب پیتل کا بھاری گلاس لیے قدرے لجاجت سے چلتی ہوئی مجھ تک آئی تو ایک لمحے کے لیے میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ عورتوں کے معاملے میں، میں اتنا ندیدہ نہیں لیکن میرے مبہوت ہونے کی وجہ اس لڑکی کے خدوخال میں رچی ہوئی نزاکت تھی۔ میں نے بہت سی خوب صورت دیہاتی لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن ہمیشہ ان کے حسن میں ایک بے عنوان سی کرختگی محسوس کی تھی لیکن یہ لڑکی......؟ اس کی چال میں شاخِ گل جیسی لچک تھی اور رنگت چاندنی کی طرح شفاف۔ گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے وقت میری نظر اس کی گلابی ہتھیلیوں پر پڑی جنہیں صرف دیکھنے ہی سے احساس ہوتا تھا کہ ان میں پھولوں جیسی ملائمت ہے۔ چولہے پر جھکی رہنے سے اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے رخساروں پر سرخی چھلک آئی تھی اور معصومانہ انداز میں نیم وا ہونٹ گویا دہک رہے تھے میں جو کہ غازے کی تہوں میں مدفون رخسار، لپ اسٹک سے پینٹ کیے ہوئے ہونٹ اور کاجل سے آراستہ آنکھیں دیکھنے کا عادی تھا۔ بلاشبہ فطری سادگی سے معمور اس حسن کے نظارے سے مبہوت سا رہ گیا تھا لیکن میری یہ کیفیت ایک لمحے سے بھی کم مدت کے لیے رہی جسے بوڑھا محسوس نہیں کر سکا۔ دودھ کے چند گھونٹ بھر کر میں نے پوچھا۔ ”چاچی نظر نہیں آئیں؟“

بوڑھے نے چاچی کے معنی سمجھتے ہوئے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”اس بھاگوان کو اللہ کو پیاری ہوئے سترہ سال گزر گئے ہیں۔ لالی کو دو برس کی چھوڑ کر مری تھی۔ بس جب سے اکیلے ہی اس بچی کی پرورش کی ہے۔“

کچھ دیر اور بیٹھنے کے بعد میں چلا آیا۔

دن ڈھل گیا۔ شام آئی لیکن نہ جانے کیوں دو غزالی آنکھیں کنول بن کر خیالوں کی لہروں پر ہلکورے لیتی رہیں۔ دو آنکھیں جن میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ یہ آنکھیں آج دو سال بعد مجھے پھر نظر آ گئیں اور کوئی نادیدہ قوت میرے دل کے زخموں کو کھرچ رہی تھی۔ کتنی مشابہ تھیں یہ نغمہ کی آنکھوں سے جنہوں نے میرا صبر و قرار اور زندگی کی امنگ چھین لی تھی اور میں وقت کی راہ میں اس شکستہ حال مسافر کی طرح کھڑا رہ گیا تھا جو منزل پر پہنچ کر لٹ گیا ہو۔ میں نے بارہا چاہا ہے کہ نغمہ کے تصور کو بھی اپنی مصروفیات کے انبار تلے دفن کر دوں لیکن میں آج تک اس کی یاد سے دامن نہیں چھڑا سکا۔ اس نے مجھے زندگی کے ایک نئے فلسفے سے روشناس کرایا تھا۔

تقریباً ڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔ میں سرکاری عمارتوں کے ایک بڑے انجینئر صاحب کے پاس ”خفیہ“ طور پر ملازم تھا۔ خفیہ طور پر اس لیے کہ انجینئر صاحب بڑے آدمی بن جانے کے بعد کافی کاہل ہو گئے تھے۔ دولت کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن مزید دولت کمانے کے مواقع بھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ خود مستقل مزاجی سے عمارتوں کے نقشوں پر کام نہیں کر سکتے تھے انہوں نے پانچ سو روپے ماہور پر مجھے ملازم رکھ چھوڑا تھا۔ نقشوں کے بارے میں وہ مجھے ہدایات دیتے اور میں ان کی کوٹھی کے ایک نفیس کمرے میں بیٹھ کر نقشے بنایا کرتا۔ نام ان کا چلتا تھا اور کام میرا۔ میری گزر بسر اچھی طرح ہو جاتی تھی کیونکہ میں فالتو وقت میں تصاویر وغیرہ بنا کر بھی کچھ کما لیتا تھا۔ شام کے چار بجے تک میں کام کرتا اس کے بعد وہیں سے تفریح کے لیے نکل کھڑا ہوتا اور کسی بارونق ہوٹل میں بیٹھ کر زندگی کی بے کیفی پر غور کیا کرتا۔ انہی بے کیف دنوں میں نغمہ سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ انجینئر صاحب کی لڑکی تھی بلا کی ذہین۔ فلسفہ پڑھتی تھی لیکن صورت سے قطعاً فلسفی نہیں لگتی تھی۔ ایک روز وہ غیر متوقع طور پر میرے آفس میں آ گئی تھی۔ میرے کہنے سے پہلے ہی وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور خاصی بے تکلفی سے اپنا وینٹی بیگ صوفے پر پھینک کر دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔

''سنا ہے آپ بہت اچھے آرٹسٹ ہیں اور یہاں ملازمت کرنے سے پہلے تصویریں بنایا کرتے تھے؟''

''تصویریں تو میں ضرور بناتا تھا اور اب بھی بناتا ہوں لیکن اچھا آرٹسٹ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''دراصل میں نے اپنی ایک بڑی سی پورٹریٹ بنوانی ہے۔ اس لیے آئی ہوں۔''

''پورٹریٹ تو ضرور بن جائے گی لیکن چونکہ یہ آفیشل ورک نہیں ہے اس لیے اس کا علیحدہ معاوضہ ہوگا۔'' ان دنوں میں کچھ زیادہ ہی کاروباری تھا۔

''کیا معاوضہ ہوگا؟''

''پانچ سو روپے۔''

اس نے بلاتامل صوفے پر سے وینٹی بیگ اٹھایا۔ پانچ سو کا نوٹ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ساتھ ہی کیمرے سے بنی ہوئی ایک پورٹریٹ بھی۔

میں نے دونوں چیزیں دراز میں رکھ لیں تو وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''کب تک تیار ہو جائے گی؟''

''پندرہ دن میں۔'' اور اس کے بعد وہ چلی گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا تھا جو آیا اور گزر گیا۔

دو دن بعد کا ذکر ہے۔ میں آفس سے نکل رہا تھا کہ کمپاؤنڈ میں نغمہ کو کار کا دروازہ کھولتے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ بولی۔ ''کدھر؟'' اس کے سوال میں بڑا اختصار تھا۔

''گھر۔'' میں نے بھی اسی اختصار کے ساتھ جواب دیا۔

''کہاں ہے آپ کا گھر؟'' میں قریب پہنچا تو اس نے پوچھا۔

''رحمان بلڈنگ میں رہتا ہوں۔'' میں نے رحمان بلڈنگ میں تین کمروں کا ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا جس میں ایک کمرے کو بطور اسٹوڈیو استعمال کرتا تھا۔

''آئیے! میں آپ کو وہیں ڈراپ کردوں گی۔'' اس نے مدعو کیا اور میں نے قطعاً تکلف نہیں کیا۔ میں کچھ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی کتنے کم وقت میں وہ آقا و غلام کا فرق مٹا کر میرے برابر آ بیٹھی تھی۔

''میری پورٹریٹ کا کام شروع کیا آپ نے؟''

''جی ہاں! اسکیچ تو بنا لیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا میں آج اسے دیکھ سکتی ہوں؟''

''جی نہیں میں تصویر مکمل ہونے سے پہلے نہیں دکھایا کرتا۔''

''اوہ!'' اس نے بچوں کی طرح معصومانہ انداز میں ہونٹ ترچھے کرکے کہا اور مسکرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

رحمان بلڈنگ پر جب کار رکی تو وہ میرے ساتھ ہی اتر آئی۔

''کون سے فلور پر ہے آپ کا دولت خانہ؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر کرائے کے تین کمروں والے فلیٹ کو دولت خانہ کہتے ہیں تو وہ تیسری منزل پر ہے اور یہ تو آپ جانتی ہی ہوں گی کہ اس بلڈنگ میں لفٹ نہیں ہے۔''

وہ دھیرے سے ہنسی اور زینہ طے کرنے لگی۔

فلیٹ میں داخل ہو کر وہ بڑے تجسس سے ایک ایک چیز کو دیکھنے لگی۔ اس نے شیلف میں قرینے سے لگی ہوئی کتابوں کو دیکھا، صاف اور بے شکن بستر کو دیکھا۔ میز کی چمکتی ہوئی سطح پر انگلیاں پھیریں اور دوسری میز پر ترتیب سے رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھا اور قدرے مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔ ''آپ کا کمرا کسی آرٹسٹ کا کمرا تو معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں تو ہر چیز میں ایک گمبھیر اور سنجیدہ ترتیب پوشیدہ ہے جب کہ آرٹسٹ لوگ بڑے لاابالی قسم کے ہوتے ہیں۔''

مجھے اس کی بات پر بڑی ہنسی آئی۔

''تو آپ کا خیال تھا کہ ایک آرٹسٹ کے کمرے میں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی چیزیں، شکن آلود بستر اور فرش پر سگریٹوں کے ادھ جلے ٹکڑے موجود ہونا ضروری ہیں؟ مس نغمہ، میں صحیح معنوں میں آرٹسٹ ہوں اور ہر چیز میں ایک خاص قرینہ اور نفاست پسند کرتا ہوں۔ ہر کام وقت پر کرتا ہوں اور جو آرٹسٹ ایسا نہیں کرتے وہ دراصل اپنی بہت سی کمزوریوں پر لاابالی پن کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ لاابالی پن کوئی قابلِ تعریف صفت نہیں یہ تو محض ذمہ داریوں سے فرار کا نام ہے۔''

وہ خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے شیلف سے کتابیں نکال نکال کر دیکھتی رہی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ''آپ کا ادبی ذوق بھی خاصا اچھا ہے۔''

اب میرے خاموش رہنے کی باری تھی۔ اس کی توجہ کتابوں سے ہٹی تو میں نے پوچھا۔ ''اسٹوڈیو دیکھیں گی آپ؟''

''ضرور اسٹوڈیو دیکھنے کے لیے ہی تو آئی تھی میں۔''

اس نے چونک کر کہا۔

میں اسے دوسرے کمرے میں لایا اور تصویریں دکھانے لگا۔ بڑے اشتیاق سے وہ تصویریں دیکھتی رہی کچھ تصویروں کی اس نے تعریف بھی کی۔ آخر میں وہ ایزل پر لگے ہوئے پردے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''اس کے نیچے کون سی تصویر ہے؟''

''وہ آپ کی پورٹریٹ کا خاکہ ہے۔ ایک ہفتے بعد آپ اسے مکمل حالت میں دیکھ سکیں گی۔''

اس کے بعد ہم پھر اسی کمرے میں آگئے۔ میں نے اس کے لیے کافی تیار کی اور کافی پیتے وقت ہم نے دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں کیں۔

یہ نغمہ سے میری پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔

چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ لکھتی لکھاتی بھی ہے۔ میں نے مختلف رسائل میں شائع ہونے والے اس کے کئی افسانے پڑھے۔ وہ سب ایک مخصوص اقتصادی نظریے کے گرد گھومتے تھے تقریباً سب ہی افسانوں میں غریبوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ کہیں کہیں تو اس نے انتہائی نچلے طبقے کے شب و روز کی اتنی عمدہ عکاسی کی تھی کہ میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اپنے افسانوں میں دولت کی مساوی تقسیم کی طلب گار نظر آتی تھی۔ اس کے اس نظریے کو پڑھ کر میں بہت ہنسا اور سوچنے لگا کہ کسی دن اس موضوع پر اس سے بات کروں گا۔

ایک دن جب وہ میرے آفس میں کھڑکی کے قریب کھڑی تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے تو میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ مشرقی افق سے سیاہ گھٹائیں امڈی آرہی تھیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ نغمہ نے بارش کا اندازہ کرنے کے لیے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالا اور چند ننھی ننھی شفاف بوندیں اس کی گلابی ہتھیلی پر اس طرح جم گئیں جیسے گلاب کی پتی پر شبنم! باہر باغیچے میں مالی پودوں کے ارد گرد کی مٹی پھاوڑے سے نرم کر رہا تھا مالی کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میں نغمہ سے اس کے افسانوں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''نغمہ! اگر میں تمہارے افسانوں پر تھوڑی سی تنقید کروں تو تم برا تو نہیں مانو گی۔'' میں نے کہا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''آپ بڑی روایتی سی باتیں کرتے ہیں۔ جو کچھ کہنا ہوا کرے وہ بلاتمہید اور بلاجھجک کہہ دیا کریں۔''

''تم آرام دہ گرم کمرے میں نفیس میز پر لیمپ رکھ کر گھنٹوں سوچ کر اور کئی پیالیاں کافی کی پی کر افسانے کا ایک پیراگراف لکھتی ہو لیکن کیا تم جانتی ہو کہ جب تم ہیٹر کی حرارت میں ڈوبے ہوئے اپنے کمرے میں بیٹھی کسی غریب کی کہانی لکھ رہی ہوتی ہو تو اس وقت کتنے ہی غریب باہر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے مزدوری کرنے جا رہے ہوتے ہیں۔ تم جو اپنے افسانوں میں دولت کی مساوی تقسیم کی طلب گار نظر آتی ہو، کبھی اپنی معاشرتی سطح سے نیچے آکر ان مزدوروں کے ساتھ ٹھنڈی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کا تصور کرسکتی ہو۔ تم جو دولت مندوں کے بنگلوں اور کاروں سے تنفر کا اظہار کرتی ہو، خود کار سے اتر کر چند قدم بھی پیدل نہیں چل سکتیں۔''

میں خاموش ہوا تو نہ جانے کیوں وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ''میں اپنی سطح سے نیچے گرنے کی بجائے دوسروں کو اپنی سطح تک لانے کی کوشش کیوں نہ کروں؟ اگر میں اپنی زندگی میں ایک انسان کو بھی اپنی سطح تک لے آئی تو سمجھوں گی کہ میں اپنے نظریے سے مخلص تھی۔ اسی طرح اگر ہر دولت مند انسان ایک نچلے درجے کے انسان کو اپنی سطح تک لے آئے تو یہ عمل ایک Chain کی صورت اختیار کر جائے گا اور شمع سے شمع جلنے کا یہ عمل اتنی خوب صورتی سے واقع ہوگا کہ غربت کا سارا اندھیرا دور ہو جائے گا۔''

میں مسکرا دیا۔ ''ہاں باتیں تو بڑی خوب صورت ہیں لیکن ناقابلِ عمل۔''

''اسے قابلِ عمل بنوانا ہی تو اصل مشن ہے۔ میں نے اس مقصد کے لیے خیر دین چپراسی کی لڑکی کا انتخاب کیا ہوا ہے اگر وہ ہمارے خرچ پر ایم اے نہ کر لیتی تو اس کا رشتہ کبھی ایک ڈاکٹر سے طے نہ ہو سکتا تھا اور اگر اسے ہمارے گھرانے کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو اب تک وہ کسی نتھو خیرے کی بیوی بن کر چولہا جھوک رہی ہوتی اور اپنے گندے سندے بچوں کو دھما دھم پیٹا کرتی۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ میں نے مستقبل میں تشکیل پانے والے ایک صحت مند خاندان کی بنیاد رکھی ہے اور درحقیقت ایک لڑکی کو نہیں بلکہ ایک کنبے کو جہالت اور غربت کے اندھیروں سے بچایا ہے پھر بھی میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں اپنے نظریے کے معاملے میں بالکل درست ہوں لیکن جہاں تک یہ تمہاری تضاد والی بات ہے یعنی یہ تحریر اور شخصیت میں تضاد کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں، میں تمہیں اس سے بھی دلچسپ چیز دکھاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گرم شال کو ذرا احتیاط سے اپنے جسم پر

لپیٹ کر پھوار میں ہی باہر نکل گئی اور میں اسے روکتا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کی شال میں چند رسالے بھی پناہ گزیں تھے اور اس کی کلائیوں اور گردن پر پھوار کے قطرے لرز رہے تھے اور ستواں ناک سرد ہوا کے حملے سے سرخ ہو رہی تھی۔

''اسے پڑھو۔'' اس نے ایک رسالہ کھول کر ایک افسانے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے خاص تنقیدی نظر سے افسانہ پڑھا۔ وہ فرزند علی نامی کسی آدمی کا لکھا ہوا تھا اور اس میں ''اونچی سوسائٹی'' کے اس مخصوص طبقے کی زندگی کی عکاسی کی تھی جو اپنی عیاشیوں اور بے راہ روی سے پہچانا جاتا ہے۔ تحریر بڑی دلچسپ، بھرپور اور مکمل تھی۔ اس کے بعد نغمہ نے اسی افسانہ نگار کا ایک اور افسانہ میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ چند نائٹ کلبوں کا ذکر تھا جسموں کے مہذبانہ بیوپار کی کچھ تفصیل تھی اور یہ تفصیل اتنی حقیقی تھی کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ لکھنے والے کی ان گوشوں سے کسی قسم کی وابستگی ضرور رہی ہے۔ میں نے افسانہ پڑھ لیا تو نغمہ نے پوچھا۔ ''یہ افسانے لکھنے والے کے بارے میں تمہارا خیال کیا ہے؟''

''میرے خیال میں تو یہ کوئی نہایت حساس امیر زادہ ہے جو اپنے اندر چھپے ہوئے انسانی احساسات اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے طبقاتی تقاضوں کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ ان خفیہ گوشوں میں جھانکتا ہے تو ان سے تنفر بھی محسوس کرتا ہے لیکن طبقاتی تقاضے ایک سیلاب بن کر اسے تنکے کی طرح بہائے لیے جاتے ہیں۔''

نغمہ میری رائے سن کر دیر تک ہنستی رہی۔

''تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ افسانہ نگار ایک پنواڑی کا نکھٹو اور نکما فرزند ہے جس نے اتفاق سے چودہ جماعتیں پڑھ لی ہیں۔ اس رسالے کے ایڈیٹر نے مجھے اس سے ملوایا بھی تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس سوسائٹی کو اٹینڈ کرنے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا وہ اس کی کتنی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ جن کلبوں کی وہ اتنے موزوں الفاظ میں منظر کشی کرتا ہے ان میں ایک مرتبہ جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی تحریر میں اتنا کامیاب ضرور ہے کہ تم جیسا آدمی بھی اس کے بارے میں اندازے کی غلطی کا شکار ہو گیا۔ دراصل کسی قسم کا احساس محرومیت ہی آدمی کے جذبۂ تخلیق کو ابھارتا ہے۔ یہ افسانہ نگار اونچی سوسائٹی سے بہت دور ہے لیکن اس ان دیکھی دنیا کی کتنی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ میں نے کبھی غربت کے چار دن بھی بسر نہیں کیے لیکن غریبوں کی زندگی پر ایسی کہانیاں لکھتی ہوں جنہیں پڑھ کر حساس لوگوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اگر تم غور کرو تو محسوس ہوگا کہ بدصورت فنکار کی تخلیق میں بڑا حسن ہوتا ہے۔ غریب فن کار کی تخلیق میں سکوں کی جھنکار محسوس ہوتی ہے۔ جس فنکار کو زندگی میں محبت بھرا ایک جملہ بھی نصیب نہ ہو سکا ہو اس کی تخلیق میں رومان ہی رومان ہوتا ہے۔ کسی قسم کا احساسِ محرومیت بعض اوقات انسان کو بہت بڑا فنکار بنا دیتا ہے۔''

نغمہ نے اپنے دلائل کا انبار ختم کر کے گہری سانس لی۔

''مجھے تم سے اتفاق نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کسی چیز کے بارے میں کاملیت کے ساتھ کچھ لکھنے کے لیے اس سے کچھ نہ کچھ وابستگی ضروری ہے ورنہ تحریر میں حقیقی حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔ شفیق الرحمٰن کی تحریروں میں کتنی رعنائی اور حسن ہے اور وہ بذاتِ خود بھی...''

وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''ایسی مثالیں آٹے میں نمک کے برابر ہیں ورنہ تخلیقی درد تو احساسِ محرومیت ہی سے پیدا ہوتا ہے۔'' وہ مجھے قائل کر دینے پر تلی ہوئی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس شعلے کا روپ نہ دھار لے جو ہر چیز کو اپنے آتشیں دامن میں سمیٹ کر راکھ کر دینے کے لیے بے تاب ہوتا ہے چنانچہ میں خاموش ہو گیا کیوں کہ مجھے شعلوں سے نہیں شبنم سے محبت ہے۔

☆......☆

نغمہ کا شبنمی روپ رفتہ رفتہ میری زندگی سے اس طرح وابستہ ہو گیا جیسے میں خزاں کی ہواؤں میں بھٹکتا ہوا برگ تنہا ہوں جسے شبنم کے چند قطرے ہر رات نئی زندگی عطا کر دیتے ہیں اور شبنم کی خنک آغوش سے نکل کر وہ ویرانی اور بربادی کے جبڑے میں پہنچ جاتا ہے۔ نغمہ کی قربت میں گزرنے والے لمحات بڑے راحت آمیز، خنک اور زندگی بخش ہوتے۔ اور اس سے دور رہ کر وہی احساس خزاں تنہائی اور یاسیت روح پر بوجھ بن جاتی۔ تب میں سوچتا کہ یہ کیسا انوکھا سرور ہے جو میرے رگ رگ میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ یہ کیسا نشہ ہے جو میرے جسم میں زندگی کی حرارت بن کر تیرنے لگا ہے؟ مجھے یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ چند قیمتی کاغذوں کے عوض خریدے ہوئے جسموں سے چند سانسیں چرا کر جسم کی تشنگی تو مٹ جاتی ہے لیکن روح کی تشنگی اور بھی بڑھ جاتی ہے اور یہ روح کی پیاس ہی تھی جس کی خاطر میں نغمہ کے شبنمی روپ کی طلب محسوس کرنے لگا تھا۔

کچھ دن بعد میں نے اس کی پورٹریٹ بنا دی اور ساتھ ہی اس کا دیا ہوا چیک بھی لوٹا دیا۔

''یہ کیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دراصل جس وقت تم نے مجھے تصویر بنانے کے لیے کہا تھا اس وقت میں نے اپنے اور تمہارے درمیان گاہک اور تاجر کے اصولوں کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی اور اس دیوار کو آقا اور ملازم کے فرق نے کچھ اور اونچا کر دیا تھا لیکن اب...... اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دیوار کو گر جانا چاہیے تاکہ ہم ایک دوسرے کے قریب آ کر ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔''

وہ مسکرائی۔ بڑی غیر واضح سی مسکراہٹ تھی۔ خدشات اور سوچوں میں ڈوبی ہوئی۔ اس مسکراہٹ سے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں میں سراب کا تعاقب تو نہیں کر رہا؟ میں جس پھول سے اپنی زندگی کی زلفیں آراستہ کرنا چاہتا ہوں وہ کسی گلدستے کی زینت بننے کے لیے تو منتخب نہیں ہو چکا؟ اس احساس کے ساتھ ہی جمیل کا تصور میرے ذہن میں رینگ آیا۔

جمیل اکثر نغمہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ وہ نغمہ کا دور کا رشتے دار تھا مگر اپنی لمبی سی مرسڈیز میں بیٹھ کر اس نے یہ دوری بڑی جلدی عبور کر لی تھی وہ مشینوں کے پرزوں کے ایک بہت بڑے امپورٹر کا اکلوتا لڑکا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تو واپسی پر نغمہ کی امی اسے برآمدے تک چھوڑنے آتی تھیں۔

اس دن جمیل ہی کے متعلق سوچتے سوچتے میں کچھ دل شکستہ سا اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ نغمہ اندر آئی۔ وہ گلابی ساڑی میں ملبوس تھی۔ ہمسفری اسٹائل کا اونچا سا بالوں کا جوڑا۔ کانوں میں ہیرے کے خوب صورت آویزے۔ تروتازہ صبیح رنگت اور معصومانہ انداز میں نیم وا دہکتے ہوئے سے ہونٹ۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کی پتلی سی کمر میں ایک لمحے کے لیے بڑا پیارا خم پیدا ہوا۔ پھر میرے حواس پر اس کے جسم سے اڑتی ہوئی مدھم مدھم خوشبو چھا گئی۔

میں کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکائے اَدھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اس کی مسکراتی ہوئی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میرے دل میں ابال سا اٹھنے لگا لیکن میں بدستور ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بھی خاموش تھی اور اس کی گہری گہری آنکھوں کی تہ میں دھواں دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ ایک طویل مگر جامد لمحے کی بات ہے اور اسی طویل جامد لمحے میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ سب کچھ جو اظہار کے لیے میرے سینے میں تڑپ رہا تھا۔ وہ سب کچھ نغمہ پر عیاں ہو گیا ہے۔ اس نے میری بے تابیوں کی ساری کہانی سن لی ہے۔ میری خاموشی، میری زبان بن گئی تھی۔

''نغمہ۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''ہوں۔'' وہ گویا کہیں دور سے خواب کے سے عالم میں بولی۔

''نغمہ میں تم سے......'' میں اٹھ کر قریب آ گیا۔ اس نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے اٹھ کر میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

''مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو رشدی۔'' اس کی آواز گہرے خمار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ''مگر بہتر ہے کہ تم کچھ نہ کہو اور مجھے اس ابدی لمحے سے لطف اندوز ہونے دو۔'' وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر صرف اتنا کہہ سکی۔ ''رشدی......رشدی......''

جب خاموشی زبان بن جائے تو جذبے لفظوں کے محتاج نہیں رہتے اور ہم نے بھی ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر سب کچھ کہہ دیا تھا۔ یہ سوچ کر میرے احساسات کی دنیا میں کلیاں سی چٹک اٹھی تھیں کہ محبت کی جس آگ میں، میں جل رہا تھا اس کی تپش نغمہ تک بھی پہنچ چکی تھی۔

☆......☆

میں اس طرح مطمئن تھا جیسے برسوں کے صبر آزما سفر کے بعد منزل سامنے آ گئی ہو۔ زندگی کا یہ دور مسرتوں سے معمور تھا۔ وقت کا ہر لمحہ خوشیوں کے چمن میں نیا شگوفہ کھلنے کا پیغام لاتا اور دبے پاؤں گزر جاتا۔ ہم زندگی کے دامن سے چرائے ہوئے لمحے ریستورانوں، پارکوں اور سنیماؤں میں گزارتے اور محبت کی تمام تر شدتوں سے اپنے محسوسات کی دنیا سجایا کرتے۔

وقت کسی کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھتا کہ وہاں آرزوؤں کی کیسی کیسی حسین بستیاں آباد ہیں۔ وقت ایک عفریت کی طرح اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ وقت نے چند ناپائیدار لمحوں کی خوشیوں کا مجھ سے ایسا انتقام لیا ہے کہ میں آج تک درد کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔

نغمہ کا رشتہ جمیل سے طے ہو گیا اور شادی کی تاریخ کا تعین کر کے دونوں گھرانے شادی کے انتظامات میں مصروف ہو گئے اور جب نغمہ نے بڑے اطمینان سے یہ خبر

مجھے سنائی تو میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا جہاں اضطراب، پچھتاوے یا رنج کی کوئی لہر نہ تھی۔ وہ کسی ایسے سمندر کی طرح پُرسکون تھی جس کی تہ میں طوفان مچل رہے ہوں یا پھر جس پر سے طوفان گزر چکا ہو۔

''کیا تم والدین کے اس فیصلے پر خوش ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں خوش ہوں نہ مغموم۔ میں حالات سے ہر طرح سمجھوتا کرنے کی عادی ہوں اور پھر جمیل سے شادی کرنے کا تو میرا شروع سے ہی ارادہ تھا۔''

''کیا؟'' میں حیرت، غصے اور رنج کے ملے جلے جذبات سے چیخ اٹھا۔ ''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی۔ کیا تم اب تک میرے جذبات سے کھیلتی رہی ہو؟''

وہ ہاتھ اٹھا کر بڑے پُرسکون اور باوقار لہجے میں بولی۔ ''سکون سے میری بات سنو! مجھے تم سے محبت ہے اور اس دن سے ہے جس دن میں نے تمہیں پورٹریٹ بنانے کے لیے دی تھی۔ تم میرا آئیڈیل ہو لیکن میں تم سے صرف محبت کر سکتی ہوں شادی نہیں۔ اگر میں نے تم سے شادی کرلی تو کچھ عرصہ بعد میرا آئیڈیل اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے گا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تازندگی کرتی رہوں گی لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم جسمانی طور پر ہمیشہ اتنے ہی دور رہیں جتنے اب تک رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو رشدی! آج میں زمانے بھر کی مخالفت مول لے کر اور اپنے والدین کو چھوڑ کر جوش جذبات میں تم سے شادی کرلوں لیکن جب مجھے تمہارے چھوٹے سے فلیٹ میں رہ کر اپنے ہاتھوں سے ہر کام کرنا پڑے گا تو بچپن سے ناز و نعم میں پرورش پانے والی نغمہ اپنے آئیڈیل سے بےزار ہو جائے گی۔ جس دن ہماری شادی ہوگی اسی دن میرا آئیڈیل اور تمہاری محبوبہ مر جائے گی۔ اس دن میاں بیوی جنم لیں گے۔ آخر تم مرد شادی کو ہی محبت کی معراج کیوں سمجھتے ہو؟ یاد رکھو جسمانی اتصال سے وہ جذبہ ہمیشہ کے لیے سو جاتا ہے جو ابتدا میں ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ کیوں نہ ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے سے دور رہ کر ان جذبات کو ہمیشہ زندہ رکھیں۔ ہم جب بھی ملیں ہماری محبت روزِ اوّل کی طرح جوان ہو۔ جذباتی بن کر نہ سوچو کیونکہ جذبات زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔ کچھ عرصے بعد جب جذبات کا یہ ابال بیٹھ جائے گا تو تمہیں محسوس ہوگا کہ میری باتوں میں کتنی حقیقت تھی۔''

''اس حقیقت کو میں شاید کبھی محسوس نہ کرسکوں۔ میں تو ان انسانوں میں سے ہوں جن کے لیے جذبات ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ اگر انسان کی زندگی سے جذبات نکال دیے جائیں تو گوشت پوست کے ایک بے مصرف ڈھیر کے سوا جسم کچھ بھی نہیں بچتا۔ نغمہ میں نے بڑے خواب دیکھے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہاری محبت میں کم از کم اتنی صداقت ضرور ہوگی کہ ان آسائشوں کو جن سے تمہیں اب تک سیر ہو جانا چاہیے تھا میری خاطر تج سکو گی۔ میں کتنا ہی معمولی آدمی سہی لیکن تمہیں دنیا سے پیارا ہوں گا۔ تم میرے چھوٹے سے فلیٹ کو اپنی چاہت کے خوب صورت پھولوں سے سجاؤ گی۔ میں کام سے واپس آیا کروں گا تو تم اپنے ہونٹوں پر ایک لازوال مسکراہٹ لیے مجھے اپنی منتظر ملو گی۔ میرے وسائل کی کمی نے اگر تمہیں کوئی تکلیف بھی دی تو تم خندہ پیشانی سے اسے سہہ کر اپنی چھوٹی سی جنت میں پھول کھلاتی رہو گی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی بے حوصلہ، آسائشوں کی بھوکی اور دولت کی پجارن ہو۔'' یہ کہتے کہتے میری آواز بھرا گئی۔

''یہ سب افسانوی باتیں ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہارے الزامات میں سے کوئی درست بھی ہو لیکن یہ یقین رکھو کہ زندگی کے کسی موڑ پر جب تم مجھ سے ٹکراؤ گے تو اپنی محبت کے چراغ میرے دل میں روشن پاؤ گے۔ اس روشنی کو میں کبھی ختم نہ ہونے دوں گی رشدی، کبھی ختم نہ ہونے دوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میرے ذہن میں سوچوں کی تیز و تند آندھیاں سنسناتی رہیں۔ درد و کرب کی اندھی گہرائیوں میں ڈوب کر میں نے بڑی تلخی سے اپنے دل کو یقین دلایا کہ نغمہ نہایت خودغرض، بے وفا اور مادیت پرست لڑکی ہے۔

☆......☆

شادی سے چند دن پہلے نغمہ میرے فلیٹ پر آئی۔

میں پتلون اور قمیص میں ہی پلنگ پر لیٹا تھا صبح سے ہلکے ہلکے بخار نے آلیا تھا اور سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کرسی گھسیٹ کر پلنگ کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔ ''آج آفس نہیں آئے تم؟'' اس کے لہجے میں مغموم گمبھیر سنجیدگی تھی جیسے اس کی آواز آنسوؤں کی نمی سے ڈھل کر نکلی ہو۔

''طبیعت خراب ہے اس لیے نہیں آسکا۔''

اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''بخار ہے۔'' تپش محسوس کر کے اس نے کہا اور پھر دھیرے دھیرے اپنی مخروطی انگلیوں سے سر دبانے لگی۔ انگلیاں میری پیشانی پر

رینگ رہی تھیں اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے خنک خنک سرور آمیز لہریں پیشانی کے راستے جسم میں اتر رہی ہیں کائنات کی گردش تھم گئی ہے اور اپنائیت سے بھرپور یہ لمحے امر ہو کر رہ گئے ہیں۔

کچھ دیر بعد وہ قدرے جھک کر بولی۔ ''رشدی! میری شادی ہو جائے تو تم مجھے ہرجائی سمجھ کر بھلانے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی کسی قسم کے رنج و غم کو دل میں جگہ دینا۔ شاید چند دنوں تک درد کا احساس تمہیں ستائے لیکن خدارا بزدلوں کی طرح بار میں جا کر شرابوں میں سکون تلاش نہ کرنا بلکہ انہی معمولات کے ساتھ ہنس ہنس کر زندگی کا ساتھ نبھانا۔ مجھے گھٹیا پن سے نفرت ہے اور غموں سے بھاگنا گھٹیا پن اور بزدلی ہے، تم تو آرٹسٹ ہو تمہارا دامن ہر احساس کے لیے وسیع ہونا چاہیے۔''

میں اب تک چپ تھا۔ پتھر کی طرح ساکت! لیکن نغمہ کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ دل کی گہرائیوں سے جھرنا پھوٹ پڑا۔ آنسو پلکوں کے بندھن توڑ کر امڈ آئے۔ میں نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے بھیگے چہرے پر رکھ لیا۔

''نغمی! بس مجھے آج رو لینے دو۔ صرف آج دل میں مچلتے ہوئے اس سیلاب کو بہہ جانے دو، اس کے بعد ان آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آئیں گے۔''

نغمہ نے جھک کر میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ ہولے ہولے سسکیاں لے رہی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا غم اس کا بھی غم ہے اور اس کے آنسو میرے آنسو ہیں۔ اس احساس نے گویا دل میں شبنم کی وہی مانوس سی ٹھنڈک پھیلا دی اور دکھ کے بگولے تہ نشین ہونے لگے۔

میں دیر تک اس کے ریشم جیسے بالوں سے کھیلتا رہا اور وہ بار بار میرے گریبان کے بٹن کھولتی اور بند کرتی رہی۔

جب نغمہ چلی گئی تو میں بالکل پُرسکون تھا۔

وہ چند دن بھی گزر گئے اور نغمہ جمیل کی شریکِ حیات بن کر چلی گئی۔ میں فیصلہ نہ کرسکا کہ تقدیر کے اس مذاق پر قہقہے لگاؤں یا آنسو بہاؤں۔ زندگی میں ایک عجیب سا خلا محسوس ہونے لگا تھا۔ نغمہ پرائی کیا ہوئی تخیلات کی دنیا ہی اجڑ کر رہ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو لاکھ سمجھایا کہ اسے بھول جاؤں لیکن وہ میری زندگی کا ایسا ناگزیر حصہ بن چکی تھی جس کے بغیر میں ادھورا تھا۔ میرا دل دنیا کے ہر کام اور ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ عجب تھکی تھکی سی زندگی تھی جیسے کوئی اپاہج سکون کی تلاش میں وقت کی راہ پر گھسٹ رہا ہو۔

آفس جاتا تو وہاں پھیلی ہوئی مخصوص بھینی بھینی خوشبو گویا نغمہ کی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ یہاں کے در و دیوار میں اس کی خوب صورت انگلیوں کا لمس اور زلفوں کی مہک رچ بس گئی تھی اور اس مہک کا احساس جب حقائق سے ٹکرا کر بکھر جاتا تو میں پاگل ہونے لگتا تھا۔ نغمہ کا تصور گو کہ اب محض خواب ہو کر رہ گیا تھا لیکن مجھے اس مقام تک لے جا رہا تھا جہاں سے دیوانگی کی حدیں شروع ہوتی ہیں اور نغمہ نے مجھے اسی دیوانگی سے بچنے کی تلقین کی تھی۔

بیس پچیس دن بعد میں نے انجینئر صاحب کی ملازمت چھوڑ دی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ میں نے اچھا نہیں کیا کیوں کہ اب میرے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ جن رسالوں کے ٹائٹل میں بنایا کرتا تھا اب ان کا دوسرے آرٹسٹوں سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ میں فی الوقت سائن بورڈز وغیرہ کا کام شروع کردوں اور کسی بہتر کام کی تلاش جاری رکھوں مگر میرے پاس کوئی ایسی دکان نہیں تھی جس کا محل وقوع سائن بورڈز کے کام کے لیے موزوں ہو اور فلیٹ میں یہ کام نہیں چل سکتا۔ غرض یہ کہ پریشانیوں کا نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ جان پہچان کے آدمیوں کا تھوڑا بہت کام کر دینے اور کچھ تصویروں کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی تھی اسی سے گزر بسر ہو رہی تھی لیکن اس آمدنی میں میری سفید پوشی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ میں ایک سستے سے ہوٹل میں کھانا کھانے لگا تھا۔ صابن، بلیڈ اور روزمرہ کے استعمال کی دوسری چیزیں بھی کم سے کم قیمت والی استعمال کرنا شروع کر دی تھیں اور زیادہ کرائے والا وہ فلیٹ چھوڑ کر ایک معمولی کرائے کے کمرے میں اٹھ آیا تھا۔

ایسی ہی تنگ دستی میں تقریباً آٹھ ماہ گزر گئے۔ گردشِ روزگار نے مجھے بہت سی چیزیں بھلا دی تھیں لیکن نغمہ کی یاد اب بھی ایک کسک، ایک مستقل خلش بن کر دل میں سمائے ہوئے تھی۔

ایک دن میں ہوٹل سے کھانا کھا کر واپس آرہا تھا کہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر نغمہ مل گئی۔ وہ ایک جنرل اسٹور سے نکلی تھی اور سامنے ہی فٹ پاتھ سے لگی ایک لمبی سی کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی چال میں بڑا شاہانہ وقار اور تمکنت تھی جیسے بھرے دربار میں کوئی ملکہ اپنے تخت کی طرف جا رہی ہو۔ اس کے عقب میں باوردی ڈرائیور بڑے

بڑے پیکٹ ہاتھوں میں اٹھائے چل رہا تھا۔

نغمہ نے مجھے دیکھا اور میں نے نغمہ کو۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گر پڑی اور میں اس طرح اسے اٹھانے کے لیے جھکا جیسے کسی آذر کے ہاتھوں سے برسوں کی محنت سے بنایا ہوا بت گر گیا ہو اس وقت مجھے اپنے حلیے، لباس، بکھرے بالوں اور بڑھے ہوئے شیو کا خیال آیا اور میں نے سوچا کاش نغمہ مجھے نہ دیکھتی لیکن اس نے دیکھ لیا تھا اور میری طرف بڑھ آئی تھی۔

''رشدی!'' اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، غم تھا اور سیکڑوں سوال تھے۔ ''آؤ میرے ساتھ آؤ۔'' اس کے لہجے میں ایک مضبوط گرفت تھی جس نے مجھے اس کے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا۔

ڈرائیور نے پیکٹ کھڑکی کے راستے اگلی سیٹ پر رکھے اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔ نغمہ نے مجھے اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ وہ کتنی حوصلہ مند تھی۔ پہلے دن اس نے اپنے اور میرے درمیان آقا زادی اور ملازم کا تفریق مٹا دیا تھا اور آج مغائرت کی کتنی وسیع خلیج عبور کر کے ایک بار پھر میرے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ صدیوں کی مسافت کے بعد میں آج پھر ان مہکتی زلفوں کی چھاؤں میں پہنچ چکا تھا جو کبھی میرے شانوں پر پریشان ہو کر سرمئی شام میں بھی رنگینیاں بکھیر دیتی تھیں اور ان لمحوں میں زندگی سے بھرپور مہکتے اجالے رقص کرنے لگتے تھے۔ کتنی رعنائی اور لطافت تھی اس وقت ان زلفوں کی مہک میں۔ لیکن آج میں کیوں اتنا پژمردہ ہو گیا ہوں جیسے کسی اَن دیکھی قوت نے زندگی کی ساری دلکشی نچوڑ لی ہو اور میرے اردگرد مجروح تمنائیں سسک رہی ہوں جسم گویا روح سے خالی ہو چکا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ سفر کتنی دیر میں ختم ہوا۔ چند لمحوں میں...... یا چند صدیوں میں...... بہرحال نغمہ کی انگلیوں کا لمس اپنے بازو پر محسوس کر کے میں ہوش میں آسکا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے سیمنٹ کی پختہ روش طے کر کے ایک خوب صورت کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہو رہی تھی۔ چند سیڑھیاں طے کر کے وہ بائیں ہاتھ کے ایک کمرے میں داخل ہو گئی یک لخت محسوس ہونے والی خنک ہوا نے مجھے بتایا کہ کمرا ایئر کنڈیشنڈ ہے۔

مجھے ایک کوچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود بھی بیٹھ گئی۔ چند لمحے بڑا بوجھل سناٹا طاری رہا۔ ایسا سناٹا جو اعصاب کو چٹخا دے۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''یہ تم نے کیا حالت بنالی ہے رشدی؟''

''بے کاری بہت جان لیوا عذاب ہے نغمہ۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔''

''پاپا کے ہاں ملازمت کیوں چھوڑ دی تھی؟''

''وہاں کے ذرّے ذرّے سے تمہاری یاد وابستہ تھی۔ اگر میں چند دن اور وہاں رہتا تو شاید تمہیں بھلانے کے لیے مجھے شراب کا ہی سہارا لینا پڑتا جس سے تمہیں نفرت ہے۔''

''آج کل بے کار ہو؟''

میں خاموش رہا اور اس خاموشی میں ہی نغمہ کے سوال کا جواب تھا۔

''اب سوچو رشدی! اگر اس وقت ہم میاں بیوی ہوتے اور ہماری زندگی میں ایسا ہی موڑ آتا تو ہم دونوں حالات کی تلخی سے کتنے بے زار ہو جاتے۔ وہ تخیلی محبت چڑچڑے پن کی کثافتوں میں دفن ہو کر رہ جاتی لیکن آج میں تمہارے یوں مل جانے پر کتنی خوش ہوں اور اپنے اندر کتنی توانائی محسوس کر رہی ہوں کیونکہ اس وقت میں تمہارے کسی کام آسکتی ہوں۔ بیکاری واقعی جان لیوا عذاب ہے جس نے تمہاری ان خوب صورت آنکھوں سے زندگی کی شوخ چمک چھین لی ہے۔ تمہارے رخسار دھنس گئے ہیں اور تنے ہوئے کندھے یوں جھک گئے ہیں جیسے کسی نے ان پر منوں وزن لاد دیا ہو لیکن میں تمہیں پھر سے پہلا سا رشدی بنا سکتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے اس نے چیک بک نکالی اور ایک چیک لکھنے لگی۔ میں نے جھک کر دیکھا وہ پچاس ہزار کا چیک میرے نام لکھ رہی تھی چیک کاٹ کر اس نے میری طرف بڑھایا۔

''کیا یونہی ذلیل کرنے کے لیے مجھے یہاں لائی تھیں نغمہ۔'' مجھے اپنی آواز گلے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔

''کیا احمقانہ بات کرتے ہو رشدی؟ میری ہر چیز تمہاری اپنی ہے۔ روپیا تو محض مادی چیز ہے اگر اس کے بل بوتے پر میں تمہیں یعنی اپنے محبوب کو بدحالی سے نجات دلا سکتی ہوں تو اس میں تاخیر کیوں کروں؟ اگر یہ بے حساب روپیا جو میرے اکاؤنٹ میں جمع ہے سارے کا سارا تمہاری ایک الجھن بھی دور کر سکے تو اس کا اس سے بہتر کیا مصرف ہو گا۔ تمہیں وقت کی ایسی ناگہانی گرفت سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی تو میں نے جمیل سے شادی کی ہے ورنہ کیا مجھ میں اپنے والدین کو چھوڑنے اور خاندان سے بغاوت کرنے کی ہمت نہیں تھی؟ میرے اچھے آرٹسٹ۔ دل سے سوچنے کی بجائے دماغ سے سوچو۔''

چیک میری جیب میں ٹھونس کر وہ مزید بولی۔ ''میں تمہارے فلیٹ پر گئی تھی وہاں سے معلوم ہوا کہ تم فلیٹ چھوڑ چکے ہو۔ خیر میں تمہارے لیے شہر کے کسی موزوں علاقے میں ایسا بنگلا کرائے پر لینے کی کوشش کروں گی جس کے ایک حصے میں تم معیاری اسٹوڈیو بھی بنا سکو۔''

میں کچھ نہ بولا۔ اس کی باتیں مجھے شدید کشمکش میں مبتلا کیے دے رہی تھیں لیکن وہ میری سوچوں سے بے نیاز یہ سب کچھ کہے جا رہی تھی۔

جب میں نغمہ سے رخصت ہو کر آیا تو میں ایک واضح فیصلہ کر چکا تھا۔ اسی رات میں اپنا مختصر سا ضروری سامان باندھے ہنگاموں کے شہر کراچی کو چھوڑ کر لاہور جانے کے لیے اسٹیشن کی طرف گامزن تھا۔

سرمئی شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ جب ٹرین پلیٹ فارم کی حدود سے نکلی۔ کراچی کی بلند و بالا عمارتوں کی چوٹیاں دھیرے دھیرے نگاہوں کے افق پر ڈوب رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس شہر سے وابستہ یادیں شام کے سرمئی پردے پر ستاروں کی طرح جھلملاتی ہوئی ابھر آتی تھیں۔ ٹرین کا بے حس فولادی انجن مجھے ایک نئی سمت لے جا رہا تھا اور میں بار بار سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کب تک دو بے چین آنکھیں شہر کی وسیع و عریض سڑکوں پر میری تلاش میں بھٹکیں گی اور مجھے کہیں نہ پا کر شاید نم آلود ہو جائیں۔ ان آنکھوں میں چاہتوں کا شباب دھیرے دھیرے ڈھل جائے گا اور ایک دن وہاں فقط ارمانوں کی راکھ بکھری رہ جائے گی۔

شام کا دھندلکا بڑھتا گیا۔ ٹرین کراچی سے دور ہوتی گئی اور تب میں نے جیب سے وہ پچاس ہزار کا چیک نکال کر پھاڑ دیا اور دوسرے ہی لمحے کھڑکی سے باہر سنسناتی ہوا میں اس کے پرزے کسی مفلس کی آرزوؤں کی طرح بکھر گئے۔ نہ جانے کیوں میری پلکوں پر بڑی دیر سے مچلتے ہوئے دو آنسو چہرے پر نمی کی دو لکیریں چھوڑتے ہوئے فرش پر گرے اور لوگوں کے جوتوں سے جڑی ہوئی دھول میں مل گئے۔

☆......☆

لاہور میں میرا ایک سابقہ کلاس فیلو ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ میرا بڑا بے تکلف دوست تھا۔ ایم اے کرتے ہی وہ اپنے باپ کی قائم کی ہوئی اس کمپنی کا انتظام سنبھالنے لاہور چلا گیا تھا۔ میری اس سے خط و کتابت تا حال برقرار تھی اور وہ کئی مرتبہ مجھے لاہور آنے کے لیے لکھ چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے اتنے عرصے بعد یوں اچانک دیکھ کر کتنا حیران ہو گا۔

میں آسانی سے اس کے تحریر کردہ پتے پر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹے سے خوب صورت بنگلے کے گیٹ پر اس کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ باہر سے ہی میں نے دیکھا۔ کمپاؤنڈ میں نیلے رنگ کی ایک چمچاتی کار کھڑی تھی جس سے ٹیک لگائے اکرم کھڑا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔

جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور پھر مجھے پہچان کر اپنے قیمتی سوٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بہت تگڑا اور صاحب توند ہو گیا تھا۔ پہلے ہی ریلے میں سوٹ کیس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ مجھے گرمجوشی سے بھینچتے ہوئے بولا۔

''خاں بھائی! بڑے ڈاؤن نظر آ رہے ہو۔ تمہاری صحت اور اسمارٹ نس کو کیا ہوا؟''

''خدا کے بندے پہلے کہیں آرام سے بیٹھنے کا بندوبست کرو پھر سب کچھ بتاتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر اکرم کے کمرے میں بیٹھا اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا مگر اس کہانی میں نغمہ کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ میں اسے صرف اپنی بے روزگاری کا پس منظر بتا رہا تھا۔

سب کچھ سن چکنے کے بعد اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''خان بھائی! تمہاری آٹھ ماہ سے یہ حالت ہے اور تم نے ایک مرتبہ بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ بڑے ہی فضول آدمی ہو یار تم بھی۔ خیر تم بڑے اچھے موقع پر آئے میری فرم میں میڈیا مینیجر کی جگہ خالی ہے میں اخبار میں اشتہار بھی دے چکا ہوں اور آج پہلی شفٹ میں تقریباً تیس آدمیوں کا انٹرویو کیا تھا لیکن ایک آدمی بھی مجھے مختی معلوم نہیں ہوا۔ تم بہت اچھے موقع پر آئے۔ میں تو بڑی الجھن میں پھنسا ہوا تھا خان بھائی۔''

''اپنا دیا ہوا لقب تم اب بھی نہیں بھولے۔ اب مجھے خان بھائی نہ کہا کرو صرف رشدی کہا کرو۔ رشدی۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں میرے لیے تم اب بھی وہی خان بھائی ہو جس نے سنیما پر مجھے غنڈے کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔“

میں ہنس پڑا۔ اسے چار سال پہلے کا واقعہ اب تک یاد تھا۔

ان دنوں اکرم نیا نیا یونیورسٹی میں آیا تھا اور مجھ سے اس کی رسمی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ ایسا ہٹا کٹا نہیں تھا۔ اکہرے بدن کا کم گو سا لڑکا تھا۔ ایک دن میں اور میرا ایک دوست کلیم پکچر دیکھنے گئے تو دیکھا کہ سنیما کی بکنگ کی کھڑکی کے قریب کوئی جھگڑا ہو رہا ہے اور لوگ سہمے ہوئے سے ایک طرف کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میں جلدی سے آگے بڑھا تو دیکھا ایک دھاکڑ قسم کے غنڈے نے چاقو نکال رکھا تھا اور وہ اکرم کو خوف زدہ کرنے یا شاید مار ہی دینے کے ارادے سے وار کرنے والا تھا۔ میں نے لپک کر اسے پیچھے سے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا اور ٹانگ پھنسا کر پختہ فرش پر دے مارا۔ اس کے ہاتھ سے چاقو نکل گیا اور میں نے اسے گھٹنوں کے نیچے دبا کر اس کی کنپٹی پر تابڑ توڑ کئی گھونسے رسید کیے۔ وہ اتفاق سے مضبوطی سے میری گرفت میں آ گیا تھا۔ اس کی گردن کہنی سے دباتے ہوئے میں نے کلیم سے کہا کہ وہ کسی پولیس مین کو تلاش کر کے لائے۔ پولیس کا نام سنتے ہی وہ بدمعاش میری گرفت سے مچھلی کی طرح تڑپ کر نکلا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر ہم اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

اس دن کے بعد سے اکرم کی دوستی میرے ساتھ بڑی مضبوط ہو گئی۔ ذات کے لحاظ سے ہم دونوں پٹھان تھے شاید اسی لیے وہ مجھے خان بھائی کہہ کر پکارنے لگا تھا۔

اگلے دن اکرم مجھے دفتر لے گیا اور چارج دے دیا۔ مجھے بیک وقت دو کام کرنے تھے۔ میڈیا منیجر کا بھی اور آرٹ ڈائریکٹر کا بھی۔

خوش حالی کے دن پھر پلٹ آئے میں نے ایک اچھا فلیٹ بھی کرائے پر لے لیا اور موٹر سائیکل خرید لی۔ اس کے علاوہ میں نے ایک ملازم بھی رکھا۔ رحمو! وہ گاؤں کا ایک کڑیل جوان تھا اور میں نے رفتہ رفتہ اسے اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

اور اسی رحمو کے گاؤں میں آج مجھے لالی نظر آئی تھی۔

یہ نغمہ کا دوسرا روپ تھا۔ وہی بڑی بڑی گہری اور مسکراتی آنکھیں، وہی دہکتے ہوئے پتلے پتلے معصومانہ انداز میں نیم وا رہنے والے ہونٹ اور ویسی ہی چمپئی رنگت۔ بس فرق یہ تھا کہ نغمہ شہر میں رہنے والی گریجویٹ ادیبہ تھی اور لالی گاؤں کی ان پڑھ الھڑ سی لڑکی۔

لالی کو دیکھ کر وقت کی راکھ میں دبی چنگاریاں سلگ اٹھی تھیں اور وہ میٹھی سی خفتہ کسک، وہ ہلکی سی خلش، زخم بن کر مہک اٹھی تھی۔ دل کی وادی میں لالی، نغمہ کی بازگشت بن کر رہ گئی۔ نغمہ جسے میں اپنا نہ سکا حالانکہ ہماری راہ میں نہ تو ظالم سماج جیسی کوئی چیز حائل ہوئی تھی اور نہ ہی ہم دونوں میں سے کوئی بے وفا تھا اس کے باوجود وہ میری نہ ہو سکی اس لیے کہ ہمارے درمیان اس کے انوکھے فلسفے کی اونچی دیوار حائل تھی۔

اگلے دن میں دوپہر کے وقت اپنی رہائش کے عقبی دروازے پر درخت کی چھاؤں میں کھڑا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ لالی آتی دکھائی دی۔ وہ شاید اپنے باپ کے لیے کھانا لے کر کھیتوں کی طرف جا رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے مجھے دیکھا اور ایک خاص ادا سے مسکرا کر سلام کے لیے ہاتھ پیشانی تک لے گئی تو اس کی گوری گوری کلائیوں میں چوڑیاں کھنک اٹھیں۔ میرے لیے اس کا یہ سلام قطعی غیر متوقع تھا اس لیے میں بوکھلاہٹ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔ پگڈنڈی کا موڑ مڑتے وقت اس نے ایک بار گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور... پھر گیہوں کی لمبی لمبی بالیوں کے پیچھے گم ہو گئی۔ عین اسی وقت میرے پیچھے کسی نے بڑی طویل ٹھنڈی سانس لی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ رحمو کھڑا تھا بڑے تشویش آمیز انداز میں ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیوں صاحب! کیا یہ چھوکری آپ کو پہلے سے جانتی ہے؟“

”کچھ زیادہ لمبی واقفیت تو نہیں۔ کل میں نے اس کے باپ کو خط لکھ کر دیا تھا۔“

”اوہ صرف اتنی سی بات پر اس نے آپ کو اتنے خاص انداز سے سلام کیا۔“

”تو تجھے کیوں تشویش ہو رہی ہے احمق؟“

”صاحب جی! تم نہیں جانتے دراصل اگر کوئی لڑکا خود کسی لڑکی سے سلام دعا شروع کرتا ہے تو وہ سلام دعا لڑکی کو مہنگی پڑتی ہے اور اگر کوئی لڑکی سلام دعا شروع کرے تو یہ لڑکے کو مہنگی پڑتی ہے۔“

”اچھا اپنا یہ احمقانہ فلسفہ اپنے پاس ہی رکھ اور جا کر میرے لیے چائے بنا۔“

وہ اس طرح بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا جیسے کسی بدروح کو بھگانے کے لیے عمل پڑھ رہا ہو۔ میں درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد لالی واپس آتی دکھائی دی۔ وہ کھانا دے کر خالی ہاتھ واپس آ رہی تھی۔ میرے قریب پہنچی تو میں غیر ارادی طور پر مسکرا دیا۔ جواباً وہ بھی خفیف سا مسکرائی اور تقریباً رک کر جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ ”بابو! کیا تم ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے آئے ہو؟“

”نہیں! کچھ دنوں بعد واپس چلا جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”یعنی مہمان ہو؟“

”یہی سمجھ لو۔“

وہ ایک لمحے کے لیے رک کر آگے بڑھی اور رفتہ رفتہ میری نظر سے اوجھل ہو گئی۔

اس دن کے بعد اکثر ایسا ہونے لگا کہ میں لالی کے انتظار میں پیڑ سے ٹیک لگائے کھڑا رہتا اور جب وہ گزرتی تو میری مسکراہٹ اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتی اور وہ مسکرا کر دھیرے دھیرے رکتے رکتے رک جاتی اور پوچھتی۔ ”کیا حال ہے بابو؟“

کئی دن کی اس مزاج پرسی کے بعد رفتہ رفتہ حال چال سے حالِ دل کی منزلیں آ گئیں۔ ایک دن میں نے اسے گھر میں آنے کی دعوت دی جسے اس نے سہمی سہمی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قبول کر لیا۔ اس دن وہ کافی دیر تک چارپائی پر بیٹھی انگلیوں پر آنچل لپیٹ لپیٹ کر کھولتی اور کھول کھول کر لپیٹتی رہی۔ بار بار اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو جاتیں اور رخسار دہکنے لگتے۔ گیلی پلکیں جھک جھک جاتیں۔

میں نے رحمو سے کریم کافی بنوا کر اسے پلائی جو اسے پسند آئی اس کے بعد میں نے ٹرانسسٹر کھول دیا۔ لاہور سے کوئی پنجابی گانا آ رہا تھا وہ بڑی محویت سے سننے لگی۔ پھر اس نے کہا۔ ”بابو! سنا ہے کہ شہر میں ہر گھر میں ریڈیو ہوتا ہے؟“

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ شہر میں ریڈیو زیادہ ضرور ہوتے ہیں مگر ہر گھر میں نہیں۔ بعض گھروں میں تو دو وقت کی روٹی کے لیے آٹا بھی نہیں ہوتا۔“

اس سے اگلے دن کی ملاقات میں اسے گھر آنے میں کوئی جھجک یا حجاب محسوس نہیں ہوا۔ رخساروں پر شفق کی جگمگاہٹ اب بار بار نہیں ابھر رہی تھی اور وہ انگلیوں پر آنچل بھی نہیں لپیٹ رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک مختلف باتیں کرنے کے بعد اس نے میرا ہاتھ تھام کر بڑی حسرت سے کہا۔ ”بابو! تم یہاں چند دن کے مہمان ہو اس کے بعد تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور شہر جا کر مجھے بھول جاؤ گے۔ ہیں نا؟“

”نہیں لالی، میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہارے والد تمہاری شادی مجھ سے کر دیں تو میں کبھی شہر نہ جاؤں۔ میں گاؤں کی سادہ فضا میں رہنا چاہتا ہوں۔ میں یہیں کچھ زمین خرید کر کھیتی باڑی کیا کروں گا اور ہم دونوں بڑی سادگی سے زندگی بسر کریں گے۔ میں شہروں سے اکتا گیا ہوں۔“

اس کے گالوں پر شعلوں کا سا عکس لہرایا پھر وہ بولی۔ ”تمہیں مجھ سے شادی کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی مگر...... مگر میں گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں چاہتی ہوں کہ شہر میں ہمارا چھوٹا سا خوب صورت گھر ہو۔ ہمارے پاس پہننے کے لیے بہت سارے کپڑے ہوں اور ہم چوڑی چوڑی چمکتی سڑکوں پر سیر کے لیے نکلا کریں۔ شہر کی زندگی کتنی اچھی ہوتی ہے وہاں سیر و تفریح کے لیے کتنی ساری جگہیں ہوتی ہیں۔ ہمارے گاؤں کے ماسٹر کرامت کا لڑکا شہر سے دو سال بعد لوٹ کر آیا ہے۔ وہ شہر کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کرتا ہے کہ میرا دل مچل اٹھتا ہے۔ دو سال میں اس کی تو کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ دھوتی چھوڑ کر تم جیسی پتلونیں پہننے لگا ہے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”لالی تم نہیں جانتیں۔ شہر کی زندگی بڑی گھناؤنی ہوتی ہے۔ وہاں دس دس منزلہ اونچی عمارتوں کے دامن میں بوسیدہ جھونپڑیاں بھی ہوتی ہیں جن کے مکین اندھیروں میں بستے ہیں اور دلدل کے کیڑوں کی طرح غلاظت میں رینگ رینگ کر عمر گزار دیتے ہیں۔ صاف ستھری جگہوں تک پہنچنے کے لیے انہیں کوئی راہ نہیں ملتی۔ وہاں غاصب بستے ہیں۔ غاصب! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں شہروں سے اکتایا ہوا ہوں۔ مجھے گاؤں کی زندگی بڑی انوکھی نئی بھرپور اور دلچسپ لگتی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ بس گاؤں میں رہ کر کھیتی باڑی کیا کروں، اپنے قوتِ بازو سے روزی پیدا کروں اور تم جیسی پیاری اور بھولی بھالی بیوی کے ساتھ زندگی گزار دوں۔“

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر بڑے پیار سے میرے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بازو تو بہت مضبوط ہیں بابو مگر تم کھیتی باڑی نہیں کر سکو گے۔ یہ انہی کا کام ہے جو پیدا ہی اس ماحول میں ہوئے ہوں‘ تم بس تصویریں ہی بنایا کرو۔ یہ کتنا اچھا اور صاف ستھرا کام ہے۔“

”خیر...... یہ تو بعد کی بحث ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہوں۔“

”تم بابا سے بات کرو۔ ویسے میرے لیے کئی پیغام آ چکے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ بابا تمہیں زیادہ پسند کریں گے۔“

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو......؟“

”تو پھر ہم دونوں راتوں رات یہاں سے نکل چلیں گے اور شہر جا کر شادی کرلیں گے۔“

”مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو تمہارے والد کی رضامندی سے تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ محسوس کروں۔ تم خود سوچو تمہارے والد کی برسوں کی بنی ہوئی عزت ہمارے اس اقدام سے خاک میں مل جائے گی۔ آج جو لوگ اسے سلام کر کے گزرتے ہیں کل اس کی طرف اشارہ کر کے ہنسیں گے۔ پھر اس کے زخمی اور دکھی دل سے میرے اور تمہارے لیے کیسی بددعائیں نکلیں گی۔ میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا لالی۔“

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔“ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ کافی دیر بعد وہ بولی۔ ”ہمارے گاؤں کے چودھری کا لڑکا بری طرح مجھ پر مرتا ہے۔ اس نے بھی رشتے کا پیغام بھیجا ہے مگر بابا بڑی کشمکش میں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ چودھری جیسے دولت مند لوگوں کو ہم غریبوں کی خوب صورتی میں چند دن کے لیے کشش محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باپ نے بھی چار شادیاں کی تھیں اور ان میں سے تین پہلی بیویاں اب نوکرانیوں کی زندگی گزار رہی ہیں۔ اب اگر بابا انکار کرتے ہیں تو ڈر ہے کہ چودھری زبردستی پر نہ اتر آئے۔“

اف میرے خدایا! میں نے سوچا بلندی اور پستی کا عفریت یہاں بھی موجود ہے۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ گاؤں کی اس فضا میں سادگی اور مساوات کے دیوتا کا راج ہے مگر تفرقات کا راکشش چودھری کے روپ میں یہاں بھی موجود تھا۔

”مجھے آج رات سوچنے دو۔ شاید کوئی راہ نکل آئے۔“ میں نے لالی سے کہا، کچھ دیر بعد وہ چلی گئی تو میں نے رحمو کو بلایا جو آج کل بڑا اتشویش زدہ اور کھویا کھویا رہتا تھا۔

”چودھری کا لڑکا کس قسم کا آدمی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ تو گویا منتظر تھا۔ فوراً پھٹ پڑا۔ ”صاحب! وہ لالی کا عاشق نمبر ون ہے، سب کو معلوم ہے کہ لالی پر چھوٹے چودھری کی نظر ہے۔ اس لیے کوئی اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ بیسیوں تو غنڈے پالے ہوئے ہیں جو اس کے اشارے پر گاؤں میں ہنگامہ مچا سکتے ہیں۔ وہ ابھی تو لالی کو شریفانہ طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اگر لالی کے باپ نے انکار کر دیا تو لالی اٹھوا لی جائے گی اور وہ روتا پھرے گا۔ کل جب تم درخت کے نیچے کھڑے لالی کو خدا حافظ کہہ رہے تھے تو میں نے دیکھا تھا کہ چودھری کے ایک آدمی نے تم دونوں کو دیکھ لیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اب تک چودھری کو خبر مل چکی ہوگی اسی لیے میں ذرا فکرمند تھا۔“

”ارے رحمو! تو واقعی بہت بزدل ہوگیا ہے۔ وہ تیری چاقو بازی اور لاٹھی بازی کے کارناموں والی باتیں بس ڈینگیں ہی تھیں کیا۔“

”بزدل کہہ کر میری انسلٹ نہ کرو صاحب جی۔ میں لڑائی جھگڑے سے نہیں ڈرتا لیکن تم چھوٹے چودھری سے واقف نہیں ہو۔ میرا بچپن اس کے ساتھ گزرا ہے۔ میں کافی حد تک اس کی فطرت جانتا ہوں۔ اس کے باپ نے اسے پڑھنے کے لیے شہر بھیجا تھا مگر وہاں اس پر ایک لڑکی کے اغوا کا کیس چل گیا تھا۔ اس کا باپ دولت کے بل بوتے پر اسے چھڑا تو لایا تھا مگر کالج سے اسے بدکرداری کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چھٹی مل گئی تھی۔ لڑکیوں کے لیے اس نے بڑے بڑے کسب کیے ہیں۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔ میں بھی اسکول سے لے کر کالج تک باکسنگ کا چیمپئن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ باکسنگ سے میری انگلیاں بھدی، سخت اور موٹی ہو چکی ہیں مگر اس کے باوجود میں مصور ہوں۔ میری شخصیت سوائے چہرے کے خدوخال کے اور کسی لحاظ سے بھی آرٹسٹک نہیں لگتی۔ کالج کے زمانے میں، میں اپنے حریف کا چہرہ لہولہان کرنے کے بعد گھر آ کر اس کی خون میں ڈوبی ہوئی تصویر بنایا کرتا تھا۔ مجھے اس میں بڑا لطف آتا تھا۔

”یہاں باکسنگ نہیں چلے گی صاحب! یہاں لاٹھیاں اور بندوقیں چلتی ہیں۔“

”تجھے شرم نہیں آتی احمق۔ اپنے باس کی ہمت بندھانے کی بجائے اس کا مورال تباہ کر رہا ہے۔“

”آئی ایم سوری صاحب!“ رحمو نے اٹینشن ہو کر سیلیوٹ مارا اور مارچ پاسٹ کرتا ہوا باورچی خانے کی طرف چل دیا۔

اگلے دن میں پیڑ کے نیچے کھڑا لالی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کھانا لے کر کھیتوں کی طرف جا چکی تھی اور اب اسے واپس آنا تھا۔ واپسی میں وہ میرے پاس ٹھہر جایا کرتی تھی۔ ہمیں کفر توڑ تنہائیاں میسر آتی تھیں مگر میں نے ان تنہائیوں سے انتہا کی حد تک کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تو اس لذت اور تسکین کا متلاشی تھا جو محبوب کو آنکھوں میں بسا کر پوجنے میں ہے، اسے چھونے میں نہیں۔ یہ لذت نغمہ کی جدائی کے بعد مجھ سے چھن گئی تھی۔ پھر میں نے بارہا جسم خریدے اور جسموں کے نشیب و فراز کی تمام تر گہرائیوں میں ڈوب کر وہ تسکین وہ لذت محسوس کرنے کی کوشش کی جو محبوب کی صرف ایک جھلک دیکھنے میں پنہاں ہے مگر وہ لذت مجھے کبھی نہ ملی۔ میں نے محسوس کیا کہ جسموں سے چرائے ہوئے چند لمحوں میں انسان جسم کی پیاس تو بجھا لیتا ہے مگر روح کی پیاس بڑھتی ہی جاتی ہے اور روح کی تسکین تو جذبوں میں ہے جسموں میں نہیں۔ نامطمئن جسمانی چاہتوں سے اب میں اکتایا ہوا تھا اور اس وقت تک ان وادیوں کی طرف پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ جب تک لالی کو شادی کی رسومات سے گزر کر ہمیشہ کے لیے نہ اپنا لوں تاکہ اس کے چھن جانے، دور چلے جانے اور میرے پھر بے چین رہ جانے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

میرے خیالات کا تسلسل لالی کو دیکھ کر ٹوٹا۔ وہ قریب آ چکی تھی مگر اس کا چہرہ فق اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور قریب آ کر وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے پیچھے چھوٹا چودھری دو آدمیوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ میں آج رکوں گی نہیں۔ تم بھی کہیں چھپ جاؤ۔ ان کے ارادے اچھے معلوم نہیں ہوتے۔“

”اچھا تم چلتی رہو۔ میں ذرا دیکھوں گا کہ ان کے ارادے کیا ہیں؟“

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی اور جیسے ہی وہ اگلے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہوئی ویسے ہی پچھلے موڑ سے ایک خاصا قدآور آدمی درمیانے قد کے دو مضبوط آدمیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ قدآور نوجوان نے بوسکی کا کڑھائی والا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ باقی دو آدمی پگڑیوں والے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں جن کے سروں پر چمکتا لوہا منڈھا ہوا تھا۔ میرے قریب آ کر وہ رک گئے۔ قدآور نوجوان نے جو میرے اندازے کے مطابق چودھری تھا بڑے خطرناک لہجے میں پوچھا۔ ”لالی کہاں ہے؟“

”کون لالی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بننے کی کوشش نہ کرو۔ اس کے گھر میں گھس کر اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہو اور پھر پوچھتے ہو لالی کون ہے۔ مجھے جانتے نہیں ہو شاید۔“ لاٹھیوں پر دونوں آدمیوں کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور مجھے اپنے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں تصور میں ایک آدمی کو خون سے لت پت دیکھ رہا تھا جس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ساری پنجابی فلموں سے اس قسم کی سچویشنز جو میں نے یاد کی تھیں ذہن میں اتر گئیں اور قطعی یاد نہ رہا کہ پنجابی فلموں کا ہیرو ایسے موقعوں پر کیا کرتا ہے مگر میں نے اپنی کیفیت ان پر ظاہر نہیں ہونے دی اور بے پروائی سے ہنس کر کہا۔ ”ہاں جانتا ہوں تم چھوٹے چودھری ہو اور میں بھی اپنا تعارف کرا دوں......“

”تعارف کے بچے۔ تجھے لالی کی طرف بڑھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟“ اس نے اتنے بھیانک انداز میں دھاڑ کر کہا کہ اگر میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو ٹھٹک کر

کئی قدم پیچھے ہٹ جاتا۔

”جیسے تمہیں اسے چاہنے کی جرأت ہوئی ایسے ہی میں بھی چاہ سکتا ہوں۔ آخر مجھ میں تم سے کون سی چیز کم ہے۔ دو ہاتھ ہیں، دو پیر ہیں۔ تم سے زیادہ خوب صورت چہرہ ہے۔ پھر آخر میں کیوں نہ لالی کو چاہوں؟“

”ٹھیک ہے۔ پھر تمہارے ہاتھ پیر ہی توڑ دینے چاہئیں تاکہ تم اسے چاہنے سے باز آجاؤ۔“ اس نے کہا اور اس کے دونوں آدمیوں میں سے ایک میری طرف بڑھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ مجھ پر لاٹھی استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ میں نے اس طرح گھونسا تانا جیسے اس کے منہ پر ماردوں گا مگر جیسے ہی اس نے لاٹھی سنبھالنا چاہی تو میں نے گھونسے کی بجائے پوری قوت سے لات اس کے پیٹ پر رسید کی۔ وہ دہرا ہو کر اپنے ساتھی پر جاگرا۔ وہ دونوں لڑکھڑائے۔ تو چودھری میری طرف جھپٹا۔ اس سے پیشتر کہ وہ سنبھلتے اور میرا حلیہ بگاڑتے میں نے قد آدم کھڑی فصل میں چھلانگ لگا دی اور چاروں ہاتھ پیروں کے بل ایک طرف رینگنے لگا مگر پھر خیال آیا کہ ہلتے ہوئے پودوں سے وہ مجھے ڈھونڈھ لیں گے۔ میں اپنی جگہ ساکن ہوگیا۔ چودھری دہاڑ کر کہہ رہا تھا۔ ”ڈھونڈو اسے۔ نہ ملے تو فصل میں لاٹھیاں برساؤ۔“

یہ حکم سن کر میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ اگر وہ اندھا دھند لاٹھیاں برساتے تو لازماً کوئی نہ کوئی لاٹھی مجھ پر پڑ ہی جاتی۔ اتفاقاً قریب ہی میرا ہاتھ مٹی کے ایک بڑے سے تودے سے ٹکرایا اور میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے زمین سے تھوڑا سا اونچا اٹھا کر فصل کے اندر ہی اندر زور سے مخالف سمت میں پھینکا تو دا فصل کو چیرتا ہوا کچھ آگے جا کر گر گیا۔ وہ لوگ ادھر کے پودے ہلتے دیکھ کر لپکے اور میں رینگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہ جوش میں اندھے ہو کر فصل کو چھانتے پھر رہے تھے۔ میں پگڈنڈی پر فصل کی آڑ میں چھپا ہوا چوپایوں کی طرح چل کر اپنے مکان کی دوسری سمت میں آگیا اور ادھر کا دروازہ کھول کر اندر چلا آیا اور اپنے کمرے میں گھس کر کنڈی لگا کے اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گیا اور پھولی ہوئی سانس درست کرنے لگا۔ کافی دیر تک باہر چودھری کے گرجنے برسنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر میں نے سنا۔ وہ گھر کے عقبی دروازے پر رحمو سے کہہ رہا تھا۔

”اپنے اس بے وقوف مالک کو سمجھاؤ۔ مجھ سے الجھ کر بہت نقصان اٹھائے گا۔ اس سے کہنا لالی کا خیال چھوڑ دے۔“

رحمو بالکل میری طرح ہنس کر بولا۔ ”اگر یہ بات تم دوستانہ فضا میں کہہ رہے ہو تو شاید میں اپنے مالک کو سمجھانے کے متعلق غور کروں اور اگر تم یہ ایک چیلنج دے رہے ہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ میرا مالک بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ خوامخواہ یہاں ایک معمولی لڑکی کے لیے خون خرابہ ہوگا۔ اس لیے دوستانہ فضا پیدا کر کے بات کرو تو شاید میرا مالک مان جائے۔“

میں نے محسوس کیا کہ باہر کچھ خاموشی چھا گئی ہے یعنی رحمو کی باتوں نے کچھ نہ کچھ تاثیر ضرور دکھائی تھی۔

”خیر آج تم اسے سمجھاؤ۔ کل میں جو مناسب سمجھوں گا کروں گا۔“ چودھری کے لہجے میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔

پھر ان کے قدموں کی دھب دھب دور ہوتی گئی اور رحمو پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے کنڈی کھولی تو دیکھا کہ وہ اپنے چاقو کی دھار دیکھتا آرہا تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں موجود پا کر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”واہ صاحب جی! تم یہاں چھپے بیٹھے ہو اور وہ تمہیں باہر ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے تمہیں پالیا تو یہاں خون خرابہ کرنا ہی پڑے گا۔“

پھر وہ اپنی اور چودھری کی گفتگو دہرانے جا رہا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں نے سب کچھ سن لیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کل چودھری کیا کرتا ہے؟“

اگلے دن میں دوپہر کو بیٹھا سوچ رہا تھا کہ آج لالی آئے گی یا نہیں دفعتاً لالی کی بجائے اس کا بابا ہانپتا کانپتا اندر گھستا چلا آیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا جیسے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو پھر گلوگیر لہجے میں بولا۔ ”بابو! میں نے کون سا جرم کیا ہے کہ تم میری عزت تباہ کرنے پر تل گئے ہو؟“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا چاچا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”تم پڑھے لکھے شہری لوگ ہمیشہ سے یہی کرتے آئے ہو کہ ہم دیہاتیوں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر سنہرے خواب دکھا کر ان کی جوانیوں سے کھیلتے ہو اور ایک دن خاموشی سے چلے جاتے ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے بابو۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے یہ نہیں ہونے دوں گا۔“

”آپ غلط سمجھے ہیں چاچا۔“ میں نے قدرے کھلتے ہوئے کہا۔ ”میں لالی سے شریفانہ طریقے سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور آپ کی اجازت سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اگر آپ کہیں گے تو میں یہیں گاؤں میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور اگر آپ کو چودھری سے کوئی خطرہ ہے تو میں شادی کے بعد آپ دونوں کو ساتھ لے کر شہر چلا جاؤں گا اور وہاں پر ہم تینوں ایک گھر میں پُرسکون زندگی گزاریں گے۔ میرا کوئی برا ارادہ نہیں ہے چاچا۔ ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوتا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں شہر کی پڑھی لکھی لڑکیوں سے بے زار ہوں اور چاہتا ہوں کہ گاؤں کی کسی سیدھی سادی نیک سیرت لڑکی سے شادی کر کے پُرسکون زندگی بسر کرسکوں۔ میں مذہبی طریقے سے لالی کو اپنانا چاہتا ہوں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔“

میری باتوں سے لالی کا بابا کچھ نرم پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ بھرائی آواز میں بولا۔ ”بیٹے! میں چودھری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کل اس نے مجھے حویلی پر بلوایا تھا اور کہا تھا اپنی بیٹی کا چال چلن درست کرو ورنہ سارے گاؤں کو اس کے اور شہری بابو کے تعلقات کے بارے میں بتا کر تمہارا بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔ بڑے چودھری کی وفات کے بعد سے پورے گاؤں کو اس لڑکے نے گرفت میں لے رکھا ہے۔ کوئی اس کے حکم کے خلاف اف بھی نہیں کرسکتا۔ میں بڑی الجھن میں ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟“

”چاچا! تم بڑی سادگی سے لالی کی شادی مجھ سے کر دو شادی کے اگلے روز ہم یہاں سے شہر چلے جائیں گے۔ جہاں میرا اپنا گھر ہے وہاں کوئی ہمارا بال بیکا نہ کرسکے گا۔“

”میں ڈرتا ہوں کہ...... عین شادی کے موقع پر کوئی ہنگامہ نہ ہو جائے...... میں ڈرتا ہوں......“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر سوچ میں ڈوب گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”مجھے سوچنے کی مہلت دو، اف خدایا میں پاگل نہ ہو جاؤں۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

چودھری اس دن نہیں آیا، میں اپنا لوڈڈ ریوالور تکیے کے نیچے رکھے اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آیا حتیٰ کہ رات ہوگئی اور میں سو گیا۔

کوئی آدھی رات کا وقت ہوگا کہ کسی قسم کے کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ کان لگا کر سنا کوئی باہر کے دروازے پر ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ میں نے ریوالور ہاتھ میں دبائی اور دروازے کے قریب جا کر درز سے باہر جھانک کر دیکھا۔ چاندنی میں کوئی نسوانی سایہ نظر آیا۔ وہ یقیناً لالی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا اور لالی میرے سینے سے آلگی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا گویا ابھی سینے سے باہر آجائے گا۔ سانسیں مرتعش اور جسم تپ رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ”بڑی مشکلوں سے موقع نکال کر آئی ہوں۔ بابا کو آج جیسے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔“

ہم چارپائی پر آبیٹھے۔

”اب کیا ہوگا بابو؟“ اس نے پوچھا۔

”پگلی! تو ڈرتی کیوں ہے۔ میں تجھے شہنائیوں کی گونج میں سہرا سجا کر یہاں سے لے جاؤں گا کیا سمجھی؟“

”چودھری کی موجودگی میں ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا بابو۔ کیوں نہ ہم رات کو یہاں سے نکل چلیں۔“ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

”میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ غلط ہے۔“ وہ کسی قدر اداس ہوگئی جیسے کسی بچے کی پسندیدہ چیز اس کے قریب لا کر چھین لی گئی ہو۔

اس کے بعد ہم باتیں کرتے رہے۔ اپنی آیندہ زندگی کی باتیں محبت کی باتیں اور بہت سی بے عنوان باتیں۔ پھر وہ چلی گئی اور میں یوں تنہا رہ گیا جیسے پھول سے خوشبو جدا ہو گئی ہو۔

اگلی رات میں لالی کے انتظار میں دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ دستک سن کر میں نے دروازہ کھولا، لالی اندر آگئی اور کائنات مسکرا اٹھی۔ کیروسین لیمپ کی زرد زرد روشنی میں، میں نے دیکھا۔ آج اس کے چہرے پر پھولوں جیسی شگفتگی اور آنکھوں میں شبنم کا سا نکھار تھا جس سے خوشبو امڈ رہی تھی۔ آنکھوں میں کھنچے ہوئے کاجل کے ڈورے اور کلائیوں پر بندھے ہوئے چنبیلی کے گجرے آج اس کے خصوصی اہتمام کی نشاندہی کر رہے تھے۔

وہ چارپائی پر میرے برابر آبیٹھی اور باتیں کرنے لگی۔ آج اس کی باتوں میں بڑا نشیلا پن تھا۔ انگ انگ سے زندگی کی بھرپور توانائی جھلک رہی تھی۔ وقت رینگتا رہا۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے وہ غیر محسوسانہ طور پر میرے اتنے قریب آگئی تھی کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ میں اس کے جسم کی آگ میں جل کر نہ رہ جاؤں۔

اس نے بڑی سپردگی سے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ”تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا بابو؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟“

”تم مجھ سے شادی کرو گے نا؟“

”ہاں۔“ مجھے اس کے تپتے ہوئے مرتعش جسم اور

سینے کے زیر و بم کے لمس کی وجہ سے جواب دینا دوبھر ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر کچھ دیر مزید وہ میرے اتنے قریب رہی تو میرے اعصاب چٹخ جائیں گے۔ کنپٹیوں کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ خون رگوں میں پھنکارنے لگا تھا اور ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ادھر وہ مجھے اپنے جسم کی پگھلتی آگ میں سمولینا چاہتی تھی میرے گلے میں حمائل اس کی بانہیں آتش زنجیریں بن گئی تھیں۔ جنہوں نے مجھے جکڑ لیا تھا۔ میں نے اس آگ کو اپنے دامن سے آہستگی کے ساتھ الگ کرنا چاہا تو لالی نے اپنے دہکتے ہوئے ہونٹ میرے لبوں پر رکھ دیے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ آج میرے ارادوں کی مضبوط چٹانیں ریزہ ریزہ ہو جائیں گی طوفان کی شدت میں سب کچھ بہہ جائے گا اور کڑکتی بجلیوں کے کوندے ختم ہونے پر نظروں کے سامنے صرف تاریکی کی سیاہ چادر رہ جائے گی۔ گہری تاریکی کی چادر۔

لیکن رنگ و نور کی پاکیزہ دنیا میں بڑی مشکل سے قدم رکھ سکا تھا اور اب اس حسین دنیا سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ طوفان آئے اور سب کچھ بہا کر لے جائے اگر میں اس لڑکی کو پانے میں کامیاب نہ ہوسکوں تو کم ازکم اس کا مجرم تو نہ بنوں۔

میں نے اسے اپنے سے علیحدہ کرنا چاہا تو اس نے پوچھا۔ ''تم مجھ سے شادی کرو گے نا بابو؟''

''ہاں۔''

''پھر تم مجھے اپنے قریب کیوں نہیں آنے دیتے؟''

''اس لیے کہ تم ابھی میری محبوبہ ہو۔ بیوی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر میں تمہیں نہ بھی پاسکوں تب بھی میری وجہ سے تمہاری زندگی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ہر پردہ اپنے وقت پر اٹھنا چاہیے۔ اسی میں بہتری ہوتی ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے۔''

''نہیں بابو۔ مجھے اتنا قریب آجانے دو کہ تم اور میں ایک ہوکر رہ جائیں۔ آج سب پردے اٹھ جانے دو۔''

مگر میں اپنے اصولوں اور محبت کی لاش کو برہنہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا وہ بہک رہی تھی۔ اس کے جسم کی آگ کے گلابی ڈورے اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ میں نے اپنے مشتعل اعصاب کو بمشکل تمام قابو کیا اور اسے قدرے سختی سے علیحدہ کر کے کہا۔ ''لالی! ہوش میں آؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں پا نہ سکوں اور تم بھی کچھ پانے سے پیشتر ہی سب کچھ گنوا بیٹھو۔''

اس نے زخمی شیرنی کی طرح میری طرف دیکھا اور عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

''ہاں ہاں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''مگر تم کیا محبت کرو گے۔ تم تو مرد ہی نہیں ہو۔''

میرے سلگتے اعصاب پر گویا برف کی بوچھاڑ پڑ گئی اور میں سر سے پیر تک سن ہو کر رہ گیا۔ اس کا جملہ نہیں بجلی کا کوندا تھا جو ذہن کو خاکستر کر گیا۔ زہر تھا جو نس نس میں پھیل گیا۔ تب میں نے بڑے دکھ سے سوچا کہ میں اب تک محض سراب کا تعاقب کرتا رہا ہوں۔ اس بے چاری دیہاتی لڑکی کو کیا معلوم کہ جنسیت سے بھی اعلیٰ و ارفع ایک جذبہ ہوتا ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ اس کے نزدیک تو براہِ راست جسمانی ملاپ ہی محبت ہے۔ وہ تو یہی جانتی ہے کہ جب دو جوان جسم چاندنی رات کو تنہائی میں ملتے ہیں تو کون سی محبت جنم لیتی ہے۔ میں پاگل تھا جو اسے خوابوں کے اتنے نازک شیش محل میں بٹھا کر اس کی پوجا کر رہا تھا۔ کیا پتا اس سے پہلے بھی ایسی ہی محبت کی وادی میں اس نے کوئی ادھورا سفر کیا ہو اور اسے بس یہی معلوم ہو کہ جنس محبت کی معراج ہے اور بس۔

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی چال میں چوٹ کھائی ناگن جیسا لہراؤ تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اپنے تھکن آلود ذہن کو لے کر باہر آ گیا۔ باہر دھیمی دھیمی خنک ہوا کی سرسراہٹ میں زخمی گیتوں کا کرب پھیلتا رہا۔

کئی راتوں تک چاندنی کی سندر جھیل سسکتی رہی اور میں کھڑکی میں بیٹھا حسرت سے اس کہکشاں کو دیکھتا رہا جو لالی کی رہ گزر تھی مگر یہ رہ گزر سنسان پڑی رہی۔ اس پر لالی کا سایہ نہ لہرایا۔

تین راتیں گزر گئیں۔ لالی اس کا بابا یا چودھری کوئی بھی تو دکھائی نہ دیتا تھا۔ بس ایسا ہی لگتا تھا جیسے شدید طوفان آنے کے بعد سکوت چھا گیا ہو۔ ایسا سکوت جس میں موت کی سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ حادثوں کا ابال ختم ہو گیا تھا اور حالات کی سطح اب بالکل پُرسکون تھی اور اسی سکوت سے اکتا کر میں نے بڑے دکھ سے سوچا کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں! کیوں کہ میں اس کے معیار محبت پر پورا نہیں اترا تھا۔ وہ معیار جسے میں نے جان بوجھ کر بھلا دیا تھا۔

اس سوچ نے یہاں کی ہر چیز سے میرا دل اچاٹ کر دیا۔ اس جگہ کا ذرہ ذرہ مجھے ڈسنے لگا۔ جانے کیوں مجھ میں حالات سے ٹکر لینے، جستجو کرنے اور گاؤں میں جا کر صورتِ حال جاننے کا حوصلہ ماند سا پڑ گیا۔

پانچویں دن میں نے موٹر سائیکل سنبھالی اور رحمو سے کہا کہ تم آج شام تک سامان سمیت کر ٹرین سے آجانا، میں جا رہا ہوں اور میں خود چند خلش آمیز سی یادوں کا سرمایہ دامن میں سمیٹ کر یہاں سے رخصت ہو لیا۔

نغمہ کا دوسرا روپ بھی مجھے راس نہ آیا تھا اور ایک بار پھر میں اس پُرہجوم شہر کی طرف لوٹ آیا جہاں میری قسمت کی تنہائیاں میرا انتظار کر رہی تھیں۔

☆......☆

تقریباً ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میں اپنے تھکے تھکے جسم و ذہن کے ساتھ زندگی کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ تنہا بالکل تنہا زندگی کی...... خار زار راہوں پر مجروح سے قدموں کے ساتھ گھسٹ رہا تھا۔

یہ ایک دھندلی سی شام کا ذکر ہے۔

میں ایڈورٹائزنگ کمپنی کی طرف سے دیے جانے والے ایک ڈنر میں شرکت کرنے کے لیے فلیٹیز ہوٹل میں آیا تھا۔ حال ہی میں خریدی ہوئی اپنی چھوٹی سی فیٹ کو پارکنگ شیڈ میں روک کر اترا ہی تھا کہ برابر کھڑی ہوئی سیاہ شیورلیٹ کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے بڑے اناڑی پن سے جدید اسٹائل پر بال بنانے کی کوشش کی تھی اور کچھ یونہی بے سلیقگی سے میک اپ کر رکھا تھا۔ میں نے گاڑھے میک اپ اور لپ اسٹک کی تہوں میں دفن شدہ چہرے کے نقوش پہچاننے کی کوشش کی تو ذہن میں یک لخت کوندا سا لپکا اور یادوں کے سلسلے عریاں ہو کر سامنے آگئے۔

میں نے پہچان لیا۔ وہ لالی تھی اور کافی ترقی کر گئی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت دفن ہو گئی تھی اور بڑی بڑی کنول جیسی آنکھوں میں دیہاتی لالی جیسی سادگی نہیں قلوپطرہ کی آنکھوں جیسی گرسنہ چمک تھی۔

ابھی میں اس انقلاب پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک قد آور آدمی ڈھیلے ڈھالے میرون سوٹ میں ملبوس کچھ پیک کی ہوئی چیزیں اٹھائے ہوئے آیا اور کار کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر وہ چیزیں لالی کے برابر رکھ دیں۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے وقت اس کی نظر مجھ پر پڑی اور اس کا ہاتھ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ چودھری تھا۔

وہ بڑے فتح مندانہ انداز میں مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور قریب آ کر بولا۔ ''پہچانا مجھے؟''

''کیوں نہیں۔ بھلا میں اپنے ہاتھ پیر توڑنے والے کو نہیں پہچانوں گا۔''

وہ بڑے زور سے ہنسا۔ ''اس روز تمہاری قسمت اچھی تھی جو بچ گئے ورنہ واقعی تمہارے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے۔ بہر حال اب تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کس بارے میں؟''

''اسی کے بارے میں۔'' اس نے بائیں آنکھ کا گوشہ دبا کر اپنے پیچھے کار میں بیٹھی لالی کی طرف اشارہ کیا۔

''واقعی۔ خاصی ترقی کر گئی ہے لالی۔ اسے تم جیسے شوہر کی سخت ضرورت تھی۔''

''ہش بے وقوف! میں اس کا شوہر نہیں ہوں بس سمجھ لو کہ یونہی کام چلا رہا ہوں۔ ویسے تمہیں یہ تو ماننا پڑے گا کہ تم ہار گئے۔''

''ہاں میں ہار گیا۔ بڑی پیاری شکست قبول کی ہے میں نے۔''

اس نے زور دار قہقہہ لگایا اور اپنا بھاری بازو میرے کندھے پر ٹکا کر بولا۔ ''اب تم دیکھنا میں اسے اے کلاس ہیروئن بنانے والا ہوں۔ میں نے اپنے ایک فلم ساز دوست سے بات کی تھی۔ اس نے کہا یار اس ہیرے کو تم نے کہاں چھپا رکھا تھا۔ یہ تو دھانسو ہیروئن بنے گی۔ سب ہیروئنیں اس کے سامنے دھری رہ جائیں گی۔ پلاٹینم جوبلی سے کم تو اس کی کوئی فلم ہوگی ہی نہیں۔ کیا سمجھے؟'' یہ کہہ کر اس نے پھر ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا جیسے میری شکستہ دلی پر جی بھر کے ہنسنا چاہتا ہو۔

''بڑا نیک ارادہ ہے۔'' میں نے بظاہر مسکرا کر اس سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا مجھے ایک ڈنر اٹینڈ کرنا ہے۔''

ہال کے دروازے پر رک کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ پارکنگ شیڈ سے نکلتی ہوئی شیورلیٹ کی چوڑی پشت پر دو سرخ بتیاں ایک لمحے کے لیے چمک کر یوں غائب ہو گئیں جیسے لالی نے مجھے شعلہ بار نظروں سے گھور کر منہ پھیر لیا ہو۔ میں بوجھل قدموں سے اندر آ گیا۔

☆......☆

وقت گزر جاتا ہے لیکن یادیں زخم بن کر ہمیشہ مہکتی رہتی ہیں یا انگارے بن کر روح کو جلاتی رہتی ہیں۔ اپنی امر روایت کے مطابق وقت گزر رہا تھا۔ چودھری اور لالی کے اس ٹکراؤ کو تقریباً چار سال گزر چکے تھے اور اب میں ایک مثالی بیوی کا شوہر اور ایک بچے کا باپ تھا۔ عالیہ بہت اچھی
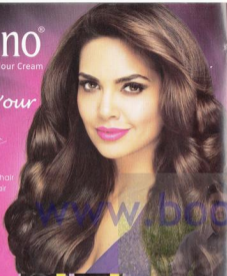
بیوی ثابت ہوئی ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اگر راہِ حیات میں عالیہ میری ہم سفر نہ بن جاتی تو شاید تنہائی کے جان لیوا عذاب سے شکست کھا کر میں موت کی آغوش میں پناہ لیتا۔

وسط دسمبر کے دن تھے۔ میرے ایک دوست ارشد کے چھوٹے بھائی کی شادی تھی میرے نام جو دعوتی کارڈ آیا تھا اس میں مجھے اور میری بیوی دونوں کو مدعو کیا گیا تھا اس لیے میں عالیہ کو شام میں تیار رہنے کا کہہ کر آفس چلا گیا۔

چار بجے میں آیا تو وہ تیار تھی۔ ہم منے کو ساتھ لے کر ارشد کے گھر چل دیے۔ ارشد کا بنگلا خوب سجا ہوا تھا اور شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ عالیہ منے کو لے کر عورتوں میں چلی گئی اور میں اپنے چند بے تکلف دوستوں کے ساتھ ایک کمرے میں جا بیٹھا۔

ہم لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ ایک ملازم نے اندر آ کر ارشد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''صاحب وہ لڑکیاں آ گئی ہیں۔''

''یہیں بھیج دو انہیں۔'' ارشد نے کہا۔

ملازم چلا گیا تو میں نے ارشد سے پوچھا۔ ''کون سی لڑکیوں کا ذکر ہو رہا ہے؟''

''ارے یار۔ شادی کی تقریب کو ذرا رنگین بنانے کے لیے میں نے فلموں کے ایک ایکسٹرا سپلائر سے معاوضے پر کچھ لڑکیاں ڈانس کے لیے یہاں بلوائی ہیں۔''

کچھ دیر بعد ایک ایک کر کے لڑکیاں اندر آنے لگیں اور سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہونے لگیں۔ آخر میں ایک لڑکی سنہری جھلملاتی قمیص اور پی آئی اے کٹ پاجامہ پہنے قدرے غیر متوازن سے قدموں سے اندر آئی اور جیسے ہی اس نے سلام کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میں اس کا چہرہ دیکھ کر یوں لڑکھڑا گیا جیسے کسی نے میرے پہلو میں چھری گھونپ دی ہو۔

وہ لالی تھی۔

ایک لمحے کے اندر میں نے دیکھا۔ اس کے پھولوں جیسے رخسار مرجھا گئے تھے۔ لبوں کی پنکھڑیاں خشک ہو گئی تھیں اور ان پر گہری لپ اسٹک جمی تھی۔ آنکھوں میں بھیانک کھنڈروں جیسی ویرانی اور گھنے جنگلوں کا سا سناٹا منجمد تھا۔ اس کی لمبی لمبی حسین زلفیں کٹ کر شانوں تک آ پہنچی تھیں۔ جسم، گلاب کی ایسی شاخ محسوس ہو رہا تھا۔ جس پر سے سب پھول نوچ لیے گئے ہوں۔

میرا جی چاہا کہ اسے جھنجوڑ کر پوچھوں۔ ''لالی وقت نے تم سے یہ کیسا انتقام لیا ہے؟ تمہارے رخساروں کی تازگی کس نے چھین لی ہے؟ تمہارے لبوں کی شیرینی کس نے چوس لی؟ تمہاری آنکھوں میں ویرانیاں کس نے بھر دیں؟ کس نے تمہارے جسم سے رعنائیوں اور زندگی کی امنگوں کے خزانے لوٹ لیے؟''

تب مجھے محسوس ہوا جیسے لالی بڑے کرب سے کہہ رہی ہے۔ ''کوئی ایک لٹیرا ہو تو بتاؤں۔ یہاں تو ایک لٹیرا آتا ہے اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتا ہے۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا اب تو یاد ہی نہیں کہ زندگی کی بربادیوں کا خون کتنے لٹیروں کے ہاتھوں ہوا میرا جی چاہا کہ اتنے قہقہے لگاؤں کہ دیوانہ ہو جاؤں تاکہ لالی سے یہ نہ پوچھ سکوں۔ پلاٹینم فلموں کی دھانسو ہیروئن! تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ چودھری تمہیں حالات کے کس موڑ پر چھوڑ کر رخصت ہو گیا؟

ایکسٹرا سپلائر اندر آ کر ارشد کو بتا رہا تھا۔ ''اس لڑکی کا نام چمپا ہے۔ وہ نوری ہے۔ یہ نجمہ ہے۔ اسے بجلی کہتے ہیں۔'' پھر اس نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام کناری ہے۔ یہ بے چاری ایک فلم کی ہیروئن بنتے بنتے رہ گئی۔'' یہ کہہ کر وہ ارشد کو آنکھ مار کر مسکرایا۔

میں نے لالی کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں جیسے اعتراف کر رہی ہو کہ ہاں ہیروئن بننے کا خواب دیکھتے دیکھتے میرا نام بھی لٹ گیا۔ جو میری آخری پونجی تھا۔ اب میں لالی نہیں۔ کناری ہوں کناری۔

اسی اثناء میں میری بیوی عالیہ منے کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی اور مجھے دیکھ کر منے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''لو یہ کھڑے ہیں تمہارے ابو۔'' پھر مجھ سے بولی۔ ''کب سے رو رہا ہے کہ میں تو ابو کے پاس جاؤں گا۔ اب سنبھالیے اسے۔'' یہ کہہ کر وہ منے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے منے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر میرے گال سے گال ملا کر معصومانہ انداز میں ہنسنے لگا۔

میں نے پھر لالی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل پھیلنے لگا تھا۔ پھر وہ پلٹی اور بڑے شکست خوردہ انداز میں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ایکسٹرا سپلائر حیران سا ہو کر اس کے پیچھے لپکا۔

کچھ دیر بعد ایکسٹرا سپلائر واپس آیا اور پریشان سے لہجے میں بولا۔ ''جناب پتا نہیں کیوں وہ واپس چلی گئی ہے۔ کہتی ہے میں اس شادی میں نہیں ناچوں گی۔''